نئے اُفق
سال مبارک

إنا للہ وإنا الیہ راجعون

ہمارے پیارے والد ڈاکٹر محمد ہاشم مرزا 75 برس کی عمر میں بروز بدھ مورخہ 9 نومبر 2016ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔تمام قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

ڈاکٹر صاحب (مرحوم) 50 سال سے زائد عرصہ طب کے شعبے سے وابستہ رہے اور 20 سال سے زائد عرصہ "ماہنامہ آنچل" کے معروف سلسلے "آپ کی صحت" کے ذریعے قارئین کو ہومیو پیتھک طریقہ علاج کے مطابق طبی مشورے فراہم کرتے رہے۔جس سے یقیناً عوام الناس کی ایک بڑی تعداد نے استفادہ حاصل کیا۔

ان خدمات کے علاوہ ڈاکٹر صاحب (مرحوم) نے مردوں اور خواتین کے بالوں کے مسائل کے حل کیلئے بھی 2 دوائیں Aphrodite Hair Inhibitor غیر ضروری بالوں کے خاتمے کیلئے جبکہ Aphrodite Hair Grower سر کے بالوں کے مسائل، خاص کر گنج پن کے حل کیلئے متعارف کرائیں جو کہ بہت کامیابی کے ساتھ بالوں کے مسائل کے حل کیلئے استعمال کی جارہی ہیں۔

ہم اپنے والد مرحوم کے شروع کئے گئے کاموں کو جاری رکھنے کا عزم رکھتے ہیں۔ ہماری پوری کوشش ہوگی کہ مستند ہومیو ڈاکٹر کی مدد سے کلینک پر علاج کی سہولیات، Aphrodite Hair Inhibitor اور Aphrodite Hair Grower کی فراہمی کو یقینی بنائیں۔

دعاؤں کے طالب

محمد عاصم مرزا

محمد آصف مرزا

محمد عامر مرزا

ہومیو ڈاکٹر محمد ہاشم مرزا کلینک

ایڈریس: دکان نمبر C-5، کے ڈی اے فلیٹس فیز 4،

شادمان ٹاؤن نمبر 2، سیکٹر B-14، نارتھ کراچی۔75850

فون نمبر 021-36997059

صبح 10 تا 1 بجے، شام 6 تا 9 بجے۔

نئے افق
مدیر اعلیٰ
مشتاق احمد قریشی
مدیر
اقبال
طاہر احمد قریشی
نورالدین
جلد	41
شمارہ	02
جنوری	2016
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹر
رکن چیمبر آف کامرس
NAEYUFAQ PUBLICATION
پاکستان (فی پرچہ)..........50 روپے
پاکستان (سالانہ).........600 روپے
اشتہارات اور دیگر معلومات
0300-8264242
aanchalpk.com
aanchalnovel.com
naeyufaqonlinemagzine
aanchal.com.pk/blog
onlinemagazinepk.com/recipes
editorufaq@aanchal.com.pk

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی

خط وکتابت کا پتہ: آنچل پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی 74200 فون: 021-35620771/2
فیکس: 021-35620773 ای میل info@aanchal.com.pk

مشتاق احمد قریشی

یہ تو ہونا ہی تھا.....!!

بھارتی وزیراعظم نریندر مودی نے جب سے وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھالا ہے ان کی متنازع شخصیت کی وجہ سے بھارت کی جو جگ ہنسائی ہورہی ہے وہ کیا کم تھی کہ ان کے دہشت گردانا رویے اور ذہنیت نے بھارت کے سیکولر چہرے کو بے نقاب کردیا ہے۔ وہ اب خالص ایک ہندو مذہبی ملک بن چکا ہے۔ یہ بات خود بھارت کے ایک بزرگ ناگرک (شہری) نے سوشل میڈیا پر کہی۔ ان کا کہنا تھا کہ جب سے یہ چائے بیچنے والا وزیراعظم کی گدی پر براجمان ہوا ہے تب سے ملک میں ہر طرف دنگے فسادات ہورہے ہیں' اقلیتوں کی زندگی اجیرن کردی گئی ہے۔ نریندر مودی دراصل نریندر موذی ہے یہ شخص بڑا ہی موذی اور خطرناک ہے اور جنتا جب جاہل اور بے پڑھے لکھوں کو اقتدار کے سنگھاسن پر بٹھائے گی تو جنتا کی یوں ہی بدنامی و رسوائی ہوگی۔ تمام بھارتی ٹی وی چینلز اور اخبارات نے بھارتی جنتا کو جنگ کے خوف میں مبتلا کردیا ہے جبکہ بھارتی سینا کے بڑے لوگوں کا کہنا ہے کہ بھارتی سینا فی الحال جنگ کے لیے تیار نہیں لیکن بھارتی میڈیا زور وشور سے جنگ کرا رہا ہے دونوں طرف سے میڈیا والے ایک دوسرے کے ملک پر اور لوگوں پر زبانی کلامی حملہ کررہے ہیں۔ سب کا دماغ خراب ہورہا ہے' اتنا شور مچا رکھا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی۔ نریندر مودی تو مسلمانوں کا ازلی دشمن ہے جب وہ گجرات کا مکھ منتری تھا تب اس نے گجرات میں مسلمانوں کا قتل عام کیا تھا اب اس نے اپنی خون کی پیاس بجھانے کے لیے کشمیر میں دنگا فساد شروع کررکھا ہے اسے نہ عقل ہے نہ سمجھ اب بیٹھے بٹھائے پاکستان کا رخ کرلیا ہے وہ جو کہتے ہیں کہ گیدڑ کی جب موت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے ایسے ہی اس موذی نے پاکستان کا رخ کرلیا ہے لیکن پہلے ہی ہلے میں اسے منہ کی کھانی پڑی' اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ سلامتی کونسل میں جاکر بھارت پر لگے آروپوں کا جواب دے سکتا' اول تو اسے انگریزی اتنی ہی آتی ہے جتنی چائے کے گلاس میں چائے آتی ہے۔

یہ تو تھی ایک بھارتی بزرگ شہری کی سوشل میڈیا پر ایک پوسٹ۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ تمام بھارتی ذرائع ابلاغ نے اپنے طور پر طبل جنگ بجا رکھا ہے خصوصاً ''زی نیوز'' سے ایسی ایسی رپورٹ نشر کی جارہی ہیں کہ جن کا نہ سر ہے نہ پیر' بلا سوچے سمجھے زہر بھرے جملے ادا کیے جارہے ہیں گزشتہ دنوں زی نیوز سے ایک رپورٹ دکھائی گئی جس میں پاکستان کے پانچوں صوبوں میں شورش احتجاج دکھایا اور بتایا گیا کہ وہاں آزادی کی تحریک چل رہی ہے' سندھ' بلوچستان' خیبر پختونخوا اور پنجاب کے علاوہ ایک صوبہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر کو بھی بتایا گیا ہے۔ حیرت ہے کہ کشمیر جسے بھارتی حکمران بھارت کا اٹوٹ انگ کہتے نہیں تھکتے اسے ان کا ہی ایک چینل پاکستان کا ایک صوبہ بتا رہا ہے گو کہ یہ ایک اچھی خبر ہے لیکن خبر دینے والا خود کتنا باخبر ہے اس سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ بھارتی سرکار کا شاید خیال ہو کہ وہ اپنی زبانی مہم جوئی کے ذریعے پاکستان کو عالمی سطح پر تنہا کردیں گے لیکن ایسا ہونے کی بجائے خود بھارت اپنے حکمرانوں کے اوٹ پٹانگ بیانات وحرکات سے بتدریج تنہائی کا شکار ہورہا ہے۔ بھارت نے اپنے

سب سے بڑے اور اہم سرپرست روس کی ہمدردی اور تعاون کو کھو دیا ہے' آخر وہ کیا بات ہے جس نے روس کو پاکستان جیسے حریف جس کی وجہ سے نہ صرف روس کو افغانستان سے نکلنا پڑا تھا اور خود روس کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا تھا سے مشترکہ جنگی مشقوں کے لیے آمادہ کر دیا۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ ایران جس سے بھارت اور افغانستان چاہ بہار کا معاہدہ کر چکے ہیں اس نے بھی بھارت کو جھنڈی دکھا دی اور اس کی بحریہ بھی پاکستان سے مشاورت کے لیے اپنے جہازوں کے ساتھ پاکستان پہنچ چکی ہے اور خود ایرانی حکمرانوں نے پاکستان سے سی پیک' پاک چین راہداری میں شرکت کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ بھارت امریکی شہ پر ہی سینہ پھلا کر بات کر رہا ہے لیکن اس کا منہ توڑ جواب چین نے دے دیا ہے۔ بھارتی حکمران اور میڈیا سندھ طاس معاہدہ کو ختم کرنے کی بات کر رہے ہیں' ان کا خیال ہے کہ پاکستان کو شاید اس طرح بلیک میل کیا جا سکے اگر پاکستان کا پانی روک دیا جائے تو پاکستان بے بس ہو کر گھٹنے ٹیک دے گا لیکن پاکستان کے دوست چین نے اس کے جواب میں بھارتی دریا جو چین کے علاقے سے نکلتے ہیں کا پانی روکنے کی دھمکی دے دی ہے' اس طرف سے بھی بھارتی مہم جوئی ناکام ہو گئی ہے۔

پاکستان کو عالمی سطح پر بدنام کرنے کی ایک اور کوشش اڑی حادثے کے بعد بھارت نے سارک سربراہ کانفرنس سے بھاگ کر کی ہے اپنے ساتھ اپنے حلیف اور پڑوسی ممالک کو بھی سارک کانفرنس میں آنے سے روک دیا ہے ایسا بھارت پہلے بھی کئی بار کر چکا ہے اس سے اس کی اپنی بدنامی اور رسوائی ہوئی ہے پاکستان کی نہیں۔ بھارت پاکستان کا سامنا کرنے سے نہ صرف میدان جنگ سے بلکہ سفارتی سطح اور حکومتی سطح پر بھی بھاگ رہا ہے۔ بھارتی حکمرانوں کا جھوٹ مکروفریب کھل کر اقوام متحدہ کے سامنے خود بخود آتا جا رہا ہے۔ گزشتہ دنوں سلامتی کونسل کے اجلاس میں بھارتی وزیراعظم نے اپنی جگہ اپنی وزیر خارجہ سشما سوراج کو بھیجا ان خاتون نے اقوام عالم کو بے وقوف سمجھتے ہوئے وہ کچھ ہرزہ سرائی کی کہ جس کا نہ سر تھا نہ ہی پیر۔ ان سے پہلے پاکستانی وزیراعظم نے بہت دھیمے مگر پُراثر لہجے میں کشمیر میں بھارتی مظالم کو واشگاف الفاظ میں پیش کر کے اقوام عالم کو پوری طرح باخبر کر دیا تھا کہ بھارت کشمیر میں کیا کچھ کر رہا ہے کیسے کیسے مظالم نہتے کشمیریوں پر ڈھا رہا ہے اس کے باوجود بھارتی وزیر خارجہ نے آنکھیں بند کر کے وہ وہ سفید جھوٹ بولا کہ دنیا دیکھتی رہ گئی اس طرح بھارت نے اپنی اوقات بتا دی کہ وہ کس دیدہ دلیری سے جھوٹ پر جھوٹ بول سکتا ہے۔ سلامتی کونسل میں بیٹھے اقوام عالم کے نمائندے نہ تو بے وقوف ہیں نہ ہی بے خبر آج کی دنیا جو ذرائع ابلاغ کے باعث سمٹ کر رہ گئی ہے وہ کیسے کسی خبر سے بے خبر رہ سکتی ہے یہ اور بات ہے کہ کچھ ممالک اپنے اپنے حلیفوں کی حمایت کے باعث اپنی آنکھیں اور کان بند کر لیں۔ بھارت جو امریکی شہ پر ناچ رہا ہے اپنی پالیسیوں کے باعث بتدریج تنہا ہوتا جا رہا ہے حیران کن بات یہ ہے کہ بھارت کے سب سے بڑے اور اہم حلیف و سرپرست روس نے بھارت کے بجائے اپنے دشمن پاکستان سے ہاتھ ملانا پسند کیا اور بھارت کے تمام تر احتجاج کے باوجود پاکستان کے ساتھ مشترکہ جنگی مشقوں کو ترجیح دی یقیناً یہ پاکستانی سفارت کاری اور اقوام عالم میں افواج پاکستان کی مقبولیت و اہمیت کا منبع ہے۔ بھارت جو گڑھا پاکستان کے لیے کھود رہا ہے اب خود اس میں گر رہا ہے۔ بھارتی حکمرانوں اور خصوصاً نریندر مودی کے رویوں کے باعث بھارت بدنامی اور تنہائی کا شکار ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ پاکستان کی حفاظت اور مدد کر رہا ہے' ان شاءاللہ پاکستان ہمیشہ کی طرح ہر میدان میں سرخرو اور کامران رہے گا' دشمن اپنا سا منہ لے کر رہ جائے گا ان شاءاللہ۔

اقبال بھٹی

"حضرت انسؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں۔ فرمایا کہ جس شخص میں تین باتیں ہوں گی وہ ایمان کا مزہ پائے گا۔ ایک یہ کہ اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس کو سب سے زیادہ ہو دوسرے یہ کہ صرف اللہ کے لیے کسی سے دوستی رکھے تیسرے یہ کہ دوبارہ کافر بننا اسے اتنا ناگوار ہو جیسے آگ میں جھونکا جانا۔"
(البخاری' باب حلاوۃ الایمان)

عزیزان محترم...... سلامت باشد۔

سال نو یعنی 2017ء کا پہلا شمارہ حاضر مطالعہ ہے تمام قارئین کو عیسوی سال نو مبارک ہو، اللہ تعالٰی سے دعا ہے کہ یہ سال امن وسکون کا سال ثابت ہو، خاص طور پر دنیا بھر کے مسلمان جن مسائل کا شکار ہیں اللہ رب العزت انہیں مشکلات سے نجات دلائے اور ہم سب کو یہ ہمت دے کہ ہم اس کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھیں کیونکہ ہمارے دشمن یہود اور ہنود تو ہمیں اتنا نقصان نہیں پہنچا رہے جتنا ہم خود ایک دوسرے کو پہنچا رہے ہیں یمن ہو شام ہو یا عراق پاکستان ہو یا ایران د افریقہ جتنا قتل عام مسلمان ایک دوسرے کا کر رہے ہیں اتنا اسرائیل امریکا اور بھارت نہیں کر رہے ایسا صرف اس لیے ہو رہا ہے کہ ہم نے اللہ کی رسی کو چھوڑ دیا ہے اللہ تعالٰی ہمارے حالوں پر رحم کرے، ہمیں اچھے اور برے کو سمجھنے کی توفیق دے۔

اس ماہ معروف ڈرامہ نگار امجد بخاری کی ایک پراسرار کہانی "دام اجل" شامل اشاعت ہے۔ یقیناً یہ کہانی آپ کے معیار پر پورا اترے گی، امجد بخاری نئے افق کے لیے ایک سلسلے وار کہانی بھی تحریر کر رہے ہیں جو ان شاء اللہ بہت جلد نئے افق کی زینت بنے گی اس کے علاوہ ہمارے محترم قاری عمر فاروق نے شکایت کی ہے کہ مجید احمد جائی نے ان کی ایک کہانی جو نئے افق میں شائع ہوئی نقل کر کے کچھ قطع و برید کر کے ایک اور رسالے میں شائع کرا دی، اس حوالے سے انہوں نے کچھ شواہد بھی بھجوائے ہیں، ہمیں یہ پڑھ کر بڑا دکھ ہوا اس حوالے سے مجید جائی صاحب وضاحت فرمائیں،

اب آیئے اپنے خطوط کی طرف۔

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم سے فرماتے ہیں۔ لائق صد احترام جناب اقبال بھٹی صاحب سلام محبت امید ہے کہ آپ اور آپ کے دست و بازو خیریت سے ہوں گے دسمبر 2016ء کا شمارہ میرے سامنے ہے، پھولوں سے سجایا ہوا ٹائٹل بہت پسند آیا دستک میں محترم و مکرم جناب مشتاق احمد قریشی صاحب نے قوم کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا ہے یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ ہم خود ہی اپنے آپ کو اقوام عالم کے سامنے رسوا کر رہے ہیں اور ہمارا میڈیا اپنی ریٹنگ بڑھانے کے لیے مختلف پروگرامز میں ایک دوسرے کے جانی دشمنوں کو بلاتے ہیں اور وہ سب ایک دوسرے پر اس طرح کیچڑ اچھالتے ہیں کہ خدا کی پناہ، وہ یہ

نہیں سوچتے کہ یہ پروگرامز باہر کے ملکوں میں بھی دیکھے جاتے ہیں اور ان کے منہ سے نکلے ہوئے زہریلے الفاظ قوم کے امیج کو کس طرح خراب کررہے ہیں اور در پردہ ملک کی نیک نامی کو کس طرح داغ دار کررہے ہیں اللہ تعالیٰ ہمیں ان نام نہاد رہنماؤں کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رکھے، آمین۔ ایک روایت ہے کہ کسی بادشاہ نے اپنے وزیر سے کہا کہ میں عوام میں اپنی مقبولیت جاننا چاہتا ہوں کوئی طریقہ بتاؤ وزیر با تدبیر نے ایک تالاب بنوایا اور بادشاہ سلامت کی طرف سے اعلان کیا کہ عوام کا ہر فرد رات کے اندھیرے میں ایک گلاس دودھ کا اس تالاب میں ڈالے سب نے سوچا ہر بندہ اس میں دودھ ڈالے گا میں اس بادشاہ کے لیے دودھ کا گلاس کیوں ضائع کروں اتنے دودھ میں اگر میرا ایک گلاس پانی پڑ جائے گا تو کیا فرق پڑے گا سب نے ایک گلاس پانی کا ڈال دیا صبح کی روشنی میں دیکھا گیا کہ تالاب خالص پانی سے بھرا ہوا تھا تو بادشاہ سلامت کو اپنی مقبولیت کا اندازہ ہوگیا۔ یہی کچھ میرے ساتھ ہوا میں قارئین کرام سے درخواست کر بیٹھا جواباً کسی بھی قاری پر میری درخواست کا کچھ اثر نہ ہوا اور کسی قاری نے اگست کا نئے افق کا شمارہ نہیں بھیجا جس سے مجھے اپنی مقبولیت کا اندازہ ہوگیا۔ گفتگو کے آغاز میں آپ نے ایک پیاری سی حدیث ہم تک پہنچائی ہے گفتگو میں آپ نے بہت عمدہ بات چیت فرمائی ہے محترم ایم اے راحیل صاحب کرسی صدارت پر براجمان ہیں ان کا خط اور تبصرہ واقعی اس لائق تھا راحیل بھائی آپ نے میرے تبصرے کو پسند کیا شکریہ احسن ابرار رضوی صاحب کا خط بھی قابل ستائش ہے رضوی بھائی جو کچھ آپ نے محسوس کیا وہ عوام کا ہر بندہ محسوس کررہا ہے مگر مجبوری ہے بولتا نہیں خط پسند فرمانے کا شکریہ۔ بھائی مجید احمد جائی نے اپنے خط میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے اس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں میرے لیے آپ کے خیالات قابل ستائش ہیں میں آپ کا شکر گزار ہوں محترمہ صائمہ نور صاحبہ کا خط منفرد ہے ان کے خیالات بڑے مثبت اور قابل غور ہیں کاش ہم سمجھ پائیں محمد رفاقت مختصر مگر اچھے تبصرے کے ساتھ تشریف لائے ہیں محترم ریاض بٹ صاحب آپ کا خط بہت خوب صورت ہے اور آپ کی کہانی وبجلی والا اس سے بھی خوب صورت ہے اللہ کرے زور قلم اور زیادہ میرے بارے میں آپ کے خیالات بڑے حسین اور قابل قدر ہیں شکریہ، محترم پرنس افضل شاہین اس بار قدرے مختصر تبصرے کے ساتھ تشریف لائے ہیں بھائی کسی بھی پسندیدہ چیز کو پسند کرنا چاہیے بہت ہی پیارے بھائی عمر فاروق ارشد صاحب آپ بھولنے والی شخصیت نہیں ہیں آپ میرے دل کی دھڑکنوں میں بستے ہیں میں بے وفائی کے لفظ سے بھی آشنا نہیں ہوں شمارہ بھیجنے کا وعدہ خوش آئند ہے محترم جناب عبدالجبار روی کا خط قابل ستائش ہے اقرا میں پیارے اللہ کی نثری حمد نے ہمارے ایمانوں کو تازہ کیا، اللہ ان کی اس کاوش کو قبول فرمائے آمین، باقی سب کہانیاں اپنی اپنی جگہ قابل ستائش ہیں ذوق آگہی انتخاب خوب ہے خوش بوئے سخن میں کلام کا انتخاب بہترین ہے رب کریم ہمارے اس پیارے جریدے کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے آمین۔

حسن ابدال کی پر رونق وادی سے **ریاض بٹ** کا محبت نامہ۔ اس بار ایک خوشگوار حیرت کا جھٹکا اس وقت لگا جب 21 نومبر کو پوسٹ مین نے سال 2016ء کا آخری پرچہ مجھے دیا۔ یعنی اس بار جلد ہی پرچہ مل گیا سرورق دیکھ کر ایک شعر ذہن سے نکل کر نوک قلم پر آ گیا۔ وقت کے سامنے تصویر بنے بیٹھے ہیں

آئینہ گردش دوراں کو دکھانے والے
مشتاق احمد قریشی صاحب حسب معمول سوچ کے در وا کرتی تحریر کفر کا بھیدی لنکا ڈھائے لے کر آئے واقعی سوچنے کی بات ہے کہ آخر یہ سب کیسے اور کیوں ہوا؟ اور اس کے پیچھے کون ہے مقصد کے اوپر تو اقبال بھٹی صاحب نے بڑی تفصیل اور ہر پہلو سے روشنی ڈالی ہے اب بات ہو جائے گفتگو پر پہلا خط ہے ایم اے راحیل کا بھائی تبصرہ خوب ہے میرا خط اور تفتیشی کہانی پسند کرنے کا شکریہ احسن ابرار رضوی آپ کی باتیں بالکل صحیح ہیں ارباب اختیار رو دو دن بیان دیتے ہیں پھر سو جاتے ہیں میرا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ مجید احمد جائی بھائی حسب معمول آپ کا تحریر کردہ خط بہترین ہے سب باتوں کا بڑے اچھے اور موثر انداز میں احاطہ کیا ہے آپ کو بھی میری کہانی ''پس پردہ'' ہمیشہ کی طرح پسند آئی مہربانی صائمہ نور بہن آپ نے بھی حالات حاضرہ کا بڑے اچھے انداز میں ذکر کیا ہے حالات کے متعلق اخبارات میں پڑھ کر اور مختلف چینلو پر دیکھ کر دل دکھی ہو جاتے ہیں میری کہانی ''پس پردہ'' آپ کو بھی متاثر کر گئی، مہربانی محمد رفاقت صاحب آپ کا مختصر تبصرہ پرچے میں آپ کی موجودگی کا احساس دلا رہا ہے اور ساتھ ہی مجھے بھی یہ احساس دلایا ہے کہ آپ کو میری تفتیشی کہانیاں پسند آرہی ہیں، جو میرے لیے باعث اطمینان ہے آپ سے گزارش ہے کہ ذرا بھرپور تبصرے کے ساتھ آئیں، مہتاب خان آپ نے مجھے اپنا پسندیدہ رائٹر لکھا بہن یہ آپ کے اعلیٰ ذوق کی نشانی ہے آپ کا تبصرہ بھی خوب ہے ریاض حسین قمر بھائی حسب معمول خوب صورت مدلل اور لاجواب تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں، خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے اور اسی طرح بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر محفل ہوتے رہیں میرا تبصرہ اور کہانی پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ پرنس افضل شاہین آپ کا شعر اس بار بھی خوب ہے اور خط بھی اللہ کرے زور قلم اور زیادہ میری کہانی اور ذوق آگہی میں انتخاب پسند کرنے کا بے حد شکریہ، عمر فاروق ارشد بھائی کیسے ہو، آپ نے مجھے نظر انداز کر دیا مولا آپ کو خوش رکھے ویسے آپ کی باتوں کا جواب تو زرین قمر ہی دے سکتی ہیں۔ عبدالجبار روی انصاری میرا تبصرہ پسند کرنے پر مہربانی آپ کا خط بھی بہترین ہے اب بات ہو جائے کہانیوں کی امین صدرالدین بھایانی کی کہانی محبت سے نفرت پاک بھارت تعلقات (آج کل کے) کی صحیح عکاسی کر رہی ہے خطے پر ایٹمی جنگ کے خطرات منڈلا رہے ہیں اور اس آگ کو چند عاقبت نا اندیش لوگ ہوا دے رہے ہیں یہ مٹھی بھر شرارتی لوگ ہیں ورنہ دونوں طرف کے زیادہ تر لوگ ان باتوں کو نہ صرف تشویش کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں بلکہ دونوں ملکوں کو ہوش کے ناخن لینے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ کیونکہ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم کی تباہ کاریوں سے کون واقف نہیں ہے جنگ اور وہ بھی ایٹمی جنگ کسی کے بھی مفاد میں نہیں ہے اللہ کرے معاملہ افہام و تفہیم سے حل ہو جائے آمین۔ رزاق شاہد کوہلر کی جال بھی ایک بہترین تحریر ہے میرے خیال میں سلیم اختر ایک منجھے ہوئے رائٹر ہیں ان کی کہانی انصاف زن زر اور زمین کی تکون کے گرد گھومتی ہوئی کہانی ہے جو اچھا تاثر چھوڑ گئی کہانی پر مصنف کی گرفت مضبوط ہے یاسین صدیقی کی وارے ایک بہترین اور ہر طرح سے پرفیکٹ کہانی ہے مصنف کی کہانی پر گرفت کہیں بھی کمزور نہیں ہوئی ویل ڈن عشنا کوثر سردار کی ایک سو سولہ چاند کی راتیں بھی خوب آگے بڑھ رہی ہے عمر

فاروق ارشد بھائی آپ نے تو ہیرا پھیری میں کمال کر دیا میرا مطلب ہے کہانی ہیرا پھیری اس میں مزاح بھی ہے جو اعلیٰ پائے کا ہے اور ساتھ جاسوسی بھی ہے، ذہانت بھی ہے اور چوروں کو موڑ نے والی بات بھی ہے آئندہ بھی ایسی ہی کہانیوں کا انتظار رہے گا، آپ تو چھپے رستم نکلے میرا مطلب قلم کے رستم سے ہے رستم وسہراب سے نہیں، خوش رہیں۔ قفس بھی ایک اچھی کہانی ہے ڈیول بھی اچھی جا رہی ہے بے سائبان لوگ میں ناظم بخاری صاحب نے ایک حساس اور دکھی موضوع پر قلم اٹھایا ہے یہ ابھی جا رہی ہے اس لیے مزید تبصرہ پھر ذوق آ گہی میں چیونٹی کا توکل (فلک شیر ملک) پرنس افضل کی اچھی باتیں اور جاوید احمد صدیقی کی ایک خاص دعا بہترین ہیں باقی سارا انتخاب بھی اپنی مثال آپ ہے خوش بوئے سخن میں بھی سارا کلام اور انتخاب دل کو چھو گیا اب اجازت دیجیے، خدا حافظ۔

سدرہ عاقب...... لاہور بحریہ ٹاؤن سے رقم طراز ہیں، میں ماہنامہ نئے افق کی مستقل قاریہ ہوں بہت ہی معیاری رسالہ ہے کہانیوں کا انتخاب عمدگی سے کیا جاتا ہے مگر پچھلے کچھ عرصے سے یہ مشاہدہ میں آ رہا ہے کہ میگزین میں نقل شدہ مواد کافی شائع ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ رائٹرز نئے افق سے مواد چوری کر کے دوسرے رسالوں میں شائع کرا رہے ہیں اس کی تازہ مثال نئے افق کی کہانی کا ماہنامہ سچی کہانیاں میں شائع ہونا ہے۔ اس طرح کی کئی اور مثالیں موجود ہیں۔ اس پر قابو پائیں اللہ میگزین کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔

☆ اگر آپ ان کہانیوں اور رائٹرز کے نام بھی لکھ دیتی تو زیادہ بہتر تھا۔

محمد رفاقت...... واہ کینٹ۔ محترم و مکرم جناب عمران احمد صاحب السلام علیکم جناب آپ اور آپ کی تمام ٹیم کو بہت بہت مبارک باد ہو نئے افق کو اتنے اچھے انداز میں پیش کرنے پر اس دفعہ کہانیاں بہت معیاری اور سبق آموز تھیں دستک میں ملکی مسائل کے بارے میں پڑھا اور اس طرح سے حالات کا علم ہوا ویسے اخبار اور ٹی وی سے بھی معلومات مل جاتی ہیں یہ بات بھی درست ہے کہ عوامی نمائندے بھی اپنے مفاد کے لیے کام کر رہے ہیں ان کو عوام کی فکر نہیں ہے ادھر لائن آف کنٹرول پر بھارتی افواج فائرنگ کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہے اور اس میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے اب تو شہری آبادی کو بھی نشانہ بنانا شروع کر دیا ہے یعنی ایک طرح کی جنگ چھیڑ دی ہے پاک فوج بھی بھرپور کارروائی کر رہی ہے اور حساب چکتا کرنے میں کوئی کسر نہیں رکھی جا رہی پاکستان کا دفاع مضبوط ہاتھوں میں ہے اور تمام پاکستانی اپنی افواج کے ساتھ ہیں، اقوام متحدہ بھی اپنے حامی آقاؤں کی سنتا ہے اور اسے کشمیریوں کی نسل کشی نظر نہیں آتی ان شاء اللہ وہ دن دور نہیں جب کشمیر آزاد ہوگا اور کشمیری آزادی کا سانس لیں گے، بھارت کا پتا چل چکا ہے کہ اب کشمیر ان کے ہاتھ سے نکل رہا ہے جس کی وجہ سے یہ فائرنگ کا سلسلہ تیز کر رہا ہے آتے ہیں کہانیوں کی طرف تو جناب اس دفعہ بھی ریاض بٹ صاحب نمبر لے گئے ہیں پچاسویں کہانی بھی خوب لکھی ہے بٹ صاحب مبارک ہو اور دوسری کہانیوں میں محبت سے نفرت محترم امین صدر الدین بھایانی، انصاف، سلیم اختر صاحب، جال، رزاق شاہد کوہلر صاحب، دائرے جناب یاسین صدیق، بے سائبان لوگ جناب ناظم بخاری، قفس نسیم سکینہ صدف اور ہیرا پھیری

محترم عمر فاروق ارشد صاحب کی بہت پسند آئیں اور بھی لکھنے والوں نے اچھا لکھا ہے میری طرف سے سب کو مبارک باد قبول ہو۔

عمر فاروق ارشد فورٹ عباس سے سلام آپ لکھتے ہیں۔ محترم مشتاق قریشی، طاہر بھائی اور اقبال بھٹی صاحب کیسے مزاج ہیں آپ کے امید واثق ہے کہ بخیریت ہوں گے دسمبر کا شمارہ ملا تو دل میں ارمان تھا کہ کافی عرصے بعد دل لگا کر تبصرہ کروں گا اور پرانے ساتھیوں سے دل کی باتیں ہوں گی مگر وہ کہتے ہیں کہ دل کے ارمان آنسوؤں میں بہہ گئے، محترم اس دوران مجھے ایک ایسا دھچکا لگ گیا کہ میرے سارے ارمانوں پر اوس پڑ گئی میں اپنی بات دلائل اور ثبوت کے ساتھ کروں گا اور آپ پر واجب ہوگا کہ حق پر فیصلہ کریں ادبی دنیا میں کسی بھی ڈائجسٹ یا کتاب کے آغاز میں ایک بات لازمی واضح کی جاتی ہے جملہ حقوق بحق پبلشر محفوظ ہیں۔ اس کا کیا مطلب ہوتا ہے یہ آپ بھی بخوبی جانتے ہیں ادارہ اپنے رسالے میں شائع شدہ مواد کے تحفظ کا ذمہ دار ہوتا ہے کجا یہ کہ اپنا ہی ایک بندہ اٹھ کے اپنے رسالے سے مواد چوری کر کے کسی دوسرے میگزین میں جا کے براجمان ہو جائے مجید احمد جائی جی ہاں ان صاحب پر پہلے بھی چربہ سازی کے ثبوت مل چکے ہیں اور اس کے باوجود ادارہ نے ان کو ایک موقع دے کر بہت بڑی غلطی کی بھی قصہ یہ ہے کہ دسمبر 2015 کے نئے افق میں شائع ہونے والی میری لغزش نامی کہانی کو ان جناب والا نے اکتوبر 2016ء کے ماہنامہ سچی کہانیاں کے شمارے میں نام اور ابتدائی ایک صفحہ کی تبدیلی کے بعد ہو بہو اپنے نام سے لکھوا لیا ہے میں اس شخص کو بہت بڑا ادیب سمجھتا تھا اس لیے جب نئے افق میں ان پر الزامات لگے تو میں نے ان کا دفاع کیا تھا مگر وہ کہتے ہیں ناں کہ راہ پیا جانے جس کو ٹھیس لگتی ہے وہ جانتا ہے میں نے سارے ثبوت اقبال بھٹی صاحب کو بھیج دیے تھے تا کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں ان صاحب کو جب پہلے بلیک لسٹ کرنے کا اعلان کیا گیا تھا تو انہوں نے نہایت ہی جذباتی اور چرب زبانی سے رو دو کر مدیر صاحب کو رام کر لیا تھا مگر اب میں سمجھتا ہوں کہ یہ ادارے کی ساکھ کا سوال ہے یہ صرف میرا ذاتی معاملہ نہیں ہے، میں نئے افق کے لکھاریوں سے بھی التماس کرتا ہوں کہ کل آپ کے ساتھ بھی اس طرح کی دو نمبری ہو سکتی ہے اس لیے براہ کرم آپ رحم کی اپیل کرنے سے گریز کیجیے گا مجھے یقین ہے کہ مجید احمد جائی صاحب پورا زور لگائیں گے اِدھر اُدھر کی چھوڑیں گے کوہ قاف سے بھی دور کی کوڑی لائیں گے اور اپنے مخصوص ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے بری الذمہ ہونے کی کوشش کریں گے مگر اس دفعہ میں نے پورے ثبوتوں کے ساتھ پکڑا ہے اور میں اس شخص کو بچ کے نہیں جانے دوں گا یہ نئے افق میں شائع ہونے والی ہر معیاری تحریر کا تیا پانچہ کر کے اپنے نام سے چھپوانے کے عادی ہو چکے ہیں اور یہ چیز نئے افق کے لیے نقصان دہ ہے میں نے اقبال بھٹی صاحب کو جو ثبوت دیے ہیں میں نہیں سمجھتا کہ ان ثبوتوں کے ہوتے ہوئے مجید احمد جائی کو صفائی میں کچھ کہنے یا جذباتی ڈائیلاگ مارنے کا موقع دیا جانا چاہیے۔ میں امید کرتا ہوں کہ ادارہ انصاف کرے گا اور اپنی ساکھ کا خیال رکھے گا، والسلام۔

عنبرین اختر ...... لاہور۔ السلام علیکم امید کرتی ہوں آپ سب خیریت سے ہوں گے ماہ اکتوبر کا نئے افق ملا سرورق بہت اعلیٰ بنایا گیا ہے دل کش اور دل کو لبھانے والا سب سے پہلے تو آپ کا شکریہ

ادا کرنا چاہوں گی کہ آپ نے میرا تعارف شائع کر کے میری حوصلہ افزائی کی عشنا آپی کا انٹرویو پڑھا بہت اچھا لگا آب اور آتش، میلے ہاتھ، احمقوں کا ٹولہ، ایک سو سولہ چاند کی راتیں، بے خودی کس کال معیاری اور اچھے ناول اور افسانے تھے باقی سلسلے بھی خوب جا رہے ہیں اللہ آپ سب کو زندگی کی بھرپور خوشیاں نصیب کرے اور محبت کاملہ کی دولت سے شاداب رکھے، آمین۔ اب اجازت چاہوں گی میری طرف سے نئے افق کی پوری ٹیم کو سلام دعا قبول ہو۔

غلام اویس ...... سید پورہ سے لکھتے ہیں سلام عرض محترم جناب اقبال بھٹی صاحب۔ اس سال کا آخری نئے افق میرے ہاتھ میں ہے سرورق سے لے کر (باقی آئندہ) تک شمارہ اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتا۔ جناب مشتاق احمد قریشی صاحب دستک میں بجا فرماتے ہیں محفل گفتگو میں ماحول گرم تھا اور بہت سے احباب غیر حاضر بھی تھے اب کس کس کا نام لو اور کس کس کو واپس آنے کو کہو قبلہ بھٹی صاحب یہ جو آج کل محفل میں ناگوار تہمت کا سلسلہ چل رہا ہے اس کو ذرا کنٹرول کریں اگر خطوط کا جواب آپ ہی دیں تو بہتر ہے مجھ جیسے اور بھی بہت سے جاہل لوگ محفل کا انچارج بننے کی کوشش کر رہے ہیں جناب بھٹی صاحب مجھے آپ سے بہت امیدیں ہیں تمام معزز قارئین کرام سے گزارش ہے کہ پلیز میرے خط پر کوئی تبصرہ نہ کریں اہل علم کی عین نوازش ہوگی۔

غلام یاسین نوناری ...... مظفر گڑھ، السلام علیکم ...... سال کا آخری شمارہ 24 نومبر کو پوسٹ مین کے ہاتھوں وصول پایا۔ سرورق خوش نما پھولوں سے سجا دلکش لگا۔ حسینہ کے گلابی چہرے غزالی آنکھوں میں حیرت مترشح تھی۔ سر پہ گلاب کے پھول سجے ہوئے تھے۔ بے شک یہ اس سال کا بہترین سرورق ہے۔ اس کے بعد فہرست کا سرسری جائزہ لیا۔ رزاق شاہد کوہلر کی واپسی خوش کر گئی۔ شکر ہے اب ان کی تحریریں تو پڑھنے کو ملیں گی۔ یہ بہت ہی اچھا لکھتے ہیں... دستک سیاسی چالوں اور چھپے رازوں کو بے نقاب کر رہی تھی۔ مشتاق احمد قریشی بہت مدلل انداز میں کالم لکھتے ہیں... گفتگو اقبال بھٹی بھائی کا اداریہ خوب رہا۔ یہ جان کر ازحد خوشی ہوئی کہ جلد معروف مصنف جناب امجد بخاری کی سلسلہ وار کہانی نئے افق کے صفحات کی زینت بننے جا رہی ہے۔ یقیناً زبردست کہانی ثابت ہوگی۔ اب خطوط پہ بات کرتے ہیں۔ ایم اے راحیل اس بار صدارت کی کرسی پہ فائز تھے۔ آپ نے دعا دی اس کا شکر گزار ہوں۔ انسان کو دوسروں کے لیے دعا کرتے رہنا چاہیے۔ کیا پتا ہماری دعاؤں سے کسی کا بھلا ہو جائے اللہ تمام مسلمانوں کو حفظ وایمان میں رکھے اور کشمیر وفلسطین کے مظلوم مسلمانوں کو باطل کے شر سے نجات بخشے۔ آمین۔ اور راحیل بھائی! آپ نے مسکان بھٹی پہ جو الزام لگایا اس کا آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے۔ بغیر ثبوت کے الزام تراشنا گناہ ہے۔ احسن ابرار بھائی۔ وعلیکم السلام بھائی۔ درست کہا عصر حاضر خزاں کی لپیٹ میں ہے۔ ہر چہرہ اداس ہے... اس یاسیت بھرے موسم میں کسی کے دل میں مسرت پیدا کرنا نیکی کا کام تو ہے ... آپ کا خط بہت پسند آیا۔ خوش رہیے ... مجید احمد جائی بھی دس مرلے کے خط کے ساتھ حاضر ہیں جناب من! آپ کا ایک جملہ کہ... الزام لگتے رہتے ہیں بندے کو اپنا کام کرتے رہنا چاہیے... معذرت کے ساتھ عرض کروں گا کہ بندہ اگر غلط کام کرے تو اس پہ الزام لگے اور پھر وہ ڈھیٹ بن کر

دوبارہ وہی کام کرتا رہے تو اس کا کوئی علاج ہونا چاہیے... صائمہ نور۔ ملتان... آپ کا انداز تحریر مجید احمد جائی سے مماثلت رکھتا ہے... شاید آپ ان کے خطوط کو دیوانگی سے پڑھتی ہیں۔ ویسے آپ کا خط بھی مجید صاحب کی طرح کمال ہوتا ہے۔ ریاض بٹ بھائی آپ کے پاس محبت سے بھرپور الفاظ کہاں سے آجاتے۔ بہت خوبصورت محبت بھرا خط لکھا۔ علاوہ ازیں ریاض حسین قمر، عمر فاروق ارشد اور عبدالجبار رومی انصاری کے خطوط زبردست تھے۔ اقراء میں اسم اللہ کی صفات و فوائد بیان ہوئے اس کے بعد انٹرویو دیکھا۔ اس بار صبا ایشل نے انٹرویو کیا۔ اشفاق احمد خان کے بارے بہت کچھ جاننے کو ملا... شہباز اکبر اور سنبل بٹ کے سوالات پسند آئے۔ اب چلتے ہیں کہانیوں کی رنگا رنگ دنیا میں۔ امین بھایانی نے مستقبل قریب کو مدنظر رکھ کر ایک بہت اعلیٰ کہانی لکھی.... بے شک ایک ادیب نفرت کو محبت میں بدلنے کا ہنر رکھتا ہے۔ ماتا جی کا کردار بھی خوب رہا۔ افلاکی نے بھی خوب ساتھ دیا۔ اپنے فیس بک فرینڈ اور مشہور رائٹر رزاق شاہد کوہلر کی کہانی "جال" دلچسپ ثابت ہوئی... عماد احمد باپ کی بات نہ مان کر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ انسپکٹر کرمانی اور پاشا نے عماد کی بجائے عاجی استاد کو مار دیا ہوتا شاید برے انجام سے بچ جاتے۔ مگر جو کسی کے لیے گڑھا کھودتا ہے خود گر جاتا ہے... ہیرا پھیری نے مسکراہٹیں بکھیر دیں...... ناظم بخاری کی کہانی سیکس اور چرس کے گرد گھومتی رہی...... اس لیے درمیان سے ہی چھوڑنی پڑی... اللہ معاف کرے فن پارے میں ناقابل فراموش اور تماشائے اہل کرم خاصے کی شے ثابت ہوئیں... ڈیول مکمل ہو جائے تب پڑھوں گا...... تاکہ انتظار کی زحمت سے صاف بچ نکلوں...... آخر میں تمام دوستوں کو نیا سال مبارک۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ یہ سال امن وامان سے گزرے۔

صائمہ نور...... ملتان آداب! اس دُعا کے ساتھ اپنے خط کا آغاز کرنا چاہوں گی کہ اللہ تعالیٰ اہل اسلام کا بول بالا فرمائے اور سبھی کو صحت وتندرستی کے ساتھ شاد اور آباد رکھے آمین۔ ماہ دسمبر 2016 کا آخری مہینے اور اس سال کا آخری نئے اُفق۔ دسمبر خراماں خراماں رخت سفر کی طرف رواں دواں ہے اور نئے اُفق پوری آب وتاب کے ساتھ میرے نرم گداز ہاتھوں میں پھڑ پھڑا رہا ہے۔ سرورق زبردست ہے۔ سب سے پہلے میں مبارک باد پیش کروں گی اُن ساتھیوں کو جن کی تحاریر اس سال پڑھنے کو ملی۔ سبھی نے شاندار اور کمال لکھا اور اُمید کرتی ہوں اسی طرح پیاری، اُچھوتی اور جاندار تحریریں پڑھنے کو دیں گے۔ میں بحیثیت تبصرہ نگار آپ کے ساتھ ساتھ رہوں گی۔ زندگی کا بھروسہ اتنا ہے کہ لحہ لحہ موت کی طرف جا رہے ہیں۔ اگلی سانس کا بھروسہ نہیں آئے یا نہ آئے۔ 2016ء الوداع ہونے کو ہے۔ اس سال ہم سے بھول چوک، جان بوجھ کر بہت سے گناہ سرزد ہوئے ہوں گے۔ گزرا پل ماضی کا حصہ بن جاتا ہے۔ یہ سال بھی ماضی کا حصہ بننے جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے توبہ کا آپشن رکھا ہوا ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے توبہ کرلیں۔۔۔ اور توبہ کرتے رہا کریں۔ اِنسان خطا کا پتلا ہے غلطیاں ہو جانا بڑی بات نہیں۔ غلطیوں کو دُہرانا بُری بات ہے۔ ہمیں اپنی غلطیوں کو دُہرانا نہیں ہے۔ خود اپنے آپ کا احتساب کرنا ہے۔ دن بھر کی مصروفیات کے بعد سونے سے پہلے چند لمحے اپنی زندگی کو دیا کریں اور سوچا کریں آج ہم نے کتنی نیکیاں کیں، کیا غلطیاں ہوئیں، ہمارے اعضاء نے کیا کیا کارنامے سرانجام دیئے

۔رب تعالیٰ کی طرف سے بلاوا آیا۔ہم رب کے حضور سربسجود ہوئے کہ نہیں۔۔۔؟ چند لمحے روز کا احتساب آپ کی دُنیا اور آخرت سنوار دے گا۔سال نو کی مبارک باد پیش کروں گی۔اللہ کرے آنے والا سال ہمارے لیے باعث نجات ہو، بیماریوں، تکلیفوں اور پریشانیوں سے محفوظ رہیں اور حق اور سچ کے ساتھ دینے والے بن جائیں۔خود اپنے ساتھ انصاف کرنے لگ جائیں اور آخرت کی فکر والے بن جائیں۔آخری ماہ دسمبر کا تبصرہ اُدھار رہا کیونکہ ابھی پڑھنا باقی ہے، میں لاہور گئی ہوئی تھی۔اس لیے مطالعہ لیٹ ہو رہا ہے۔حاضری لگوانی تھی، سو حاضر ہو گئی۔

پرنس افضل شاہین...... بہاولنگر سے اس بار دسمبر کا نئے افق 24 نومبر کو ہی مل گیا، سرورق دیکھ کر فوراً یہ قطعہ ذہن میں آیا۔

تو نے یہ پھول جو زلفوں میں لگا رکھا ہے
اک دیا ہے جو اندھیروں میں جلا رکھا ہے
جیت لے جائے کوئی مجھ کو نصیبوں والا
زندگی تو نے مجھے داؤ پر لگا رکھا ہے

دستک میں آپ نے کہا ہے کہ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے جی ہاں انگلش اخبار کے رپورٹر نے بہت ہی غلط کیا ہے۔ایسے رپورٹر اور اس کو وہ اسٹوری دینے والوں کو سزا ضرور ملنی چاہیے تا کہ آئندہ قومی سلامتی کو خراب کرنے والوں کو ہزار بار سوچنا چاہیے اور سوچنا پڑے اللہ کرے آرمی چیف قمر جاوید باجوہ راحیل شریف کی پالیسیاں جاری رکھیں گے اور دہشت گردوں کا صفایا کرتے رہیں، آمین۔اقرا میں طاہر بھائی نے اللہ کے نام کی صفات بیان کی ہے اور اس کے پڑھنے سے جو فوائد اور برکتیں ہوں گی وہ بھی بتایا ہے۔گفتگو میں شکر ہے اس بار ناچیز کا خط شامل تھا کیونکہ پچھلی بار میرا خط ردی کی ٹوکری کی نذر ہو گیا تھا یا پھر لیٹ پہنچا ہو گا، اس بار کسی نے بھی میری غیر حاضری کو نوٹ نہیں کیا اس کا مطلب ہے کہ ناچیز ایک گمنام لکھاری ہے ایم اے راحیل، احسن ابرار رضوی، مجید احمد جائی، صائمہ نور، ریاض بٹ، ریاض حسین قمر، عمر فاروق ارشد، عبدالجبار روی انصاری کے خطوط زبردست رہے ہمیں حسن نظامی، ریاض حسین کی کمی محسوس ہوئی، جائی صاحب غائب نہیں ہونا حاضری ضرور لگوانا چاہیے چار لائنوں کا خط ہی لکھنا کیونکہ مستقل لکھاریوں کی کمی ہمیں شدت سے محسوس ہوتی ہے، عمر فاروق آپ نے ایم اے راحیل سے اچھا نہیں کہا کہ ایڈریس بھیج دو میں آپ کو رقم بھیج دوں گا ایم اے راحیل کا حق ہے کہ انہیں انعامی رقم ملے وہ بھی نئے افق کے دفتر سے آپ نے حسین جاوید کو غلط کہا ہے کہ مدیر کے سر پر بم پھوڑنے میں انہیں مزا آتا ہے وہ تو اپنے خط میں یہ بات تحریر کرکے یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ انہیں کتنا پیار لوگ کرتے ہیں اور یاد کرتے ہیں ذوق آگہی میں ریاض بٹ، حسین خواجہ، جاوید احمد صدیقی، ہمیرا لتعبیر، روبی علی، خوش بوئے سخن میں لیہا سیال آبی، ملک جواد نواز، نسرین اختر، ایم حسن نظامی، نوشین اقبال نوشی چھائے رہے، افسانوں میں محبت سے نفرت، جال، ونجلی والا، انصاف، ہیرا پھیری، سلسلے وار ناولز تو خوب جا رہے ہیں، صبا عیشل نے اشفاق احمد خان کا خوب انٹرویو لیا، انٹرویو میں تشنگی رہی انٹرویوز تفصیلی ہونا چاہیے تھا کیونکہ

آنکھ مچولی میں ہم بھی لکھتے رہے ہیں ان کا انٹرویو پڑھ کر آنکھ مچولی کی یادیں تازہ ہوگئیں، آپ سے پہلے بھی گزارش کی تھی کہ اشعار کا سلسلہ شروع کریں اگر سرورق پر اشعار کا سلسلہ شروع ہوجائے تو سونے پر سہاگہ ہوجائے، نئے افق کو سجانے والوں اور اس میں لکھنے والوں کے لیے کہوں گا۔

میری رہ گزر میری منزلیں، میری محفلیں تیری ذات تک
میری خواہش میری جستجو میری ہر خوشی تیرے نام تک
ہو تیری سوچ میری یاد تک گفتگو میری بات تک
ہو میرے ساتھ کی آرزو میری زندگی کے بعد تک

ظہور احمد صائم ...... مانگا منڈی لاہور۔ السلام وعلیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ امید کرتا ہوں کہ خیریت سے ہوں گے ماہ دسمبر کا نئے افق کافی دیر سے ملا امید پر دنیا قائم ہے اس لیے تبصرہ لکھ رہے ہیں ورنہ دیر کافی ہوچکی ہے، سرورق واقعی سال کا الوداعی سرورق کہلانے کے قابل ہے۔ مصور صاحب کی کاوش قابل داد ہے، گفتگو میں داخل ہوئے تو دل اداس ہوگیا ہمارا خط پھر بلیک لسٹ میں تھا، بہرحال تمام دوستوں کے تبصرے عمدہ تھے مجید جانی صاحب آپ بہت اچھی باتیں کرتے ہیں اور عمر فاروق ارشد کی پیٹھ میں چھرا ابھی بہت اچھی طرح گھونپا ہے آپ بھی کہانیاں نقل کرتے ہوں گے میں نے بھی سوچا تک نہیں تھا، ریاض قمر بھائی کیا حال ہے آپ نے اس وقعہ سانحہ کوئٹہ پر بڑا ہی عمدہ لکھا اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ریاض بٹ صاحب کو سلام آپ کی تفتیشی کہانیاں نہایت اچھی ہوتی ہیں، دیگر کہانیاں بھی بھی اچھی تھیں، آخری صفحات پر زریں قمر کی ڈیول خوب جارہی ہے اتار چڑھاؤ متاثر کن ہے ناصر ملک صاحب کو ایک آدھ بار لانے کے بعد آپ نے غائب کردیا ہے براہ کرم ان سے مسلسل لکھوائیں، خوش بوئے سخن بھی دل دکھانے والا سلسلہ ہے کیونکہ ہمیں یہاں شاذونادر ہی موقع دیا جاتا ہے خیر ہم بھی لگے ہوئے ہیں کبھی تو امید برآئے گی باقی تمام شمارہ عمدہ تھا اللہ مزید ترقی دے، والسلام۔

شجاعت حسین شجاع بخاری جعفری ...... چکوال۔ السلام علیکم ابتدا ہے رب جلیل کے بابرکت نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔ محترم عمران بھیا کیسے مزاج ہیں آپ کے امید کرتا ہوں کہ خیریت سے ہوں گے آپ اور آپ کی پوری ٹیم اور قارئین کرام کو میری طرف سے سلام 2017ء مبارک، سرورق بس اچھا ہی تھا دستک میں مشتاق احمد اچھا تھا تمام کہانیاں اچھی تھیں، جال، انصاف، ایک سو سولہ چاند کی راتیں اچھی جارہی ہے وبجلی والا ریاض بٹ صاحب کی تحریر اچھی تھی، اقرا میں طاہر قریشی کا مضمون پڑھ کر ایمان تازہ ہوا، گفتگو میں اقبال بھٹی کی انتخاب کردہ حدیث اچھی تھی، پہلا خط ایم اے راحیل صاحب کا سلام مجید احمد صاحب نے خوب پر حاصل گفتگو کی، اس کے بعد آپی صائمہ نور صاحبہ سلام آپی جی حکمرانوں کے لیے سب کچھ پیسہ ہی ہے انہوں نے کچھ اور کوئی نہیں سوچنا جی محمد رفاقت، مہتاب خان کے تبصرے خوب تھے، ریاض بٹ اور ریاض حسنین قمر صاحب سلام مسنون آپ نے رسالہ پر خوب سیر حاصل اور مدلل تبصرہ کیا پرنس افضل، عمر فاروق، عبدالجبار صاحب نے بھی خوب صورت گفتگو کی، ذوق آگہی میں فلک شیر، پرنس افضل، ریاض بٹ، اویس اویسی، عبدالجبار، جاوید احمد، نثار ریاض، بتول کائنات کا تمام ہی

انتخاب اچھا تھا، خوش بوئے سخن، آبرو نبیلہ اقبال، ریاض قمر، محمد اسلم جاوید، نوشین اقبال نوشی کا کلام اچھا تھا اور پرنس افضل کا انتخاب اچھا تھا، باقی تمام شعرا کا کلام اچھا ہی تھا، فن پاروں میں تمام تحریریں اچھی تھیں، آخر میں دعا ہے اللہ تعالیٰ اسرائیل و بھارت کے ناپاک ارادے خاک میں ملائے اور ان دشمنانِ اسلام و پاکستان کو نیست و نابود کرے اور کشمیر و فلسطین کو آزادی عطا کرے، آمین۔

مسکان ظفر بھٹی...... شام کے بھٹیاں۔ سرورق کی کومل سی گلاب کی پتیوں کی طرح نرم و نازک لڑکی کسی اجنبی ملک کی باشندہ لڑکی ہے دستک پر سچے پاکستانی کے دل کی آواز ہے ایک ہندو باقی سارے مسلمان ہیں جو ہندو کی خوشنودی کے لیے اپنوں کے خون سے نہا رہے ہیں۔ گفتگو میں انکل اقبال بھٹی نقیب صداقت کے فرائض کے انجام دے رہے تھے، احسن ابرار رضوی کے حکم پر تبصرہ کرنے کی کوشش کر رہی ہوں، ایم اے راحیل نامی کوئی لکھاری ہو تو ادارہ اسے انعام بھیجے، ایڈریس کے ساتھ شناختی کارڈ کی کاپی بھیجو انعام کی ذمہ داری میری ٹھہری۔ ایم اے راحیل ایک طرف تو ریاض قمر کے ممنون ہیں دوسری طرف بزرگ ہستی میاں کرامت حسین سے بے ہودگی سے بول رہے ہیں، گھر میں باپ اور دادا کو بھی ایسے ہی بولتے ہوں گے۔ مسکان بھٹی آداب عرض کے ادیب کی بیٹی ہے ہمیشہ چور ٹھگ فراڈیے اور دو نمبری کرنے والے گھر کا پتا نہیں دیتے سترہ خطوط میں سے صرف ایم اے راحیل کے شہر کا نام نہیں لکھا آخر کیوں؟ بھائی عبدالمجید ٹوٹے پھوٹے لفظوں کو پسند کرنے کا شکریہ۔ ممتاز احمد نے گزارش کی تھی کہ حسد، بغض، منافقت، رقابت جیسے لفظوں کو معانی دے دو تم واقعی طفل مکتب ہو، کہانی لکھنا تمہارے بس کا روگ نہیں اس کے لیے سوچ فکر اور تخیل کی ضرورت ہوتی ہے تم نے ساری خوبیاں خطوط میں گالیاں لکھ لکھ کر ضائع کر دی ہیں، اقرا پڑھ کر مسلمان ہونے کا احساس ہوتا ہے برہان وانی کی شہادت اور والدین کی قربانیوں پر خوب روشنی ڈالی گئی، انتقام میں جیکی نے بڑے طریقے سے بیوی کی جان چھڑائی۔ قافلہ شہیدوں کا جذبہ حب الوطنی پر خوب تحریر تھی بھائی مجید جانی نے ڈائن نما بدکردار عورت کے روپ پر کمال لکھا، ریاض بٹ کی تفتیش کا کیا کہنا جن پر شک تھا وہ معصوم نکلے صداقت حسین کی تحریر خوب تھی انسپکٹر کی محبت نے رونے پر مجبور کر دیا عارف شیخ نے راشی افسر کو خوب سزا دی کرن میں کوئی خاص بات نہ تھی، نوشین اقبال، فریحہ چوہدری اور حمیرا قریشی کی شاعری بہت پسند آئی۔

عبدالجبار رومی انصاری...... لاہور

گلابوں سے مہکتی ہوئی شوخ حسینہ
آنکھیں نظر آتی ہیں جس کی نگینہ
ماحول میں بے خودی کا سا عالم ہے ردی
نئے افق پہ سجا ہے کیا خوب قرینہ

گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے، ہمارے سپہ سالار جنرل راحیل شریف تو اب سابق ہوئے ان کی خدمات عظیم تر جنہیں دنیا یاد رکھے گی اور ان کی جگہ سپہ سالار آئے جنرل قمر جاوید باجوہ ماشاء اللہ سے وہ بھی ان سے کم نہیں دکھتے ہم تو انہیں جنرل راحیل سے بھی بڑھ کر دیکھنا چاہتے ہیں اور جنہوں نے خبر لیک کر کے لنکا

ڈھانے کی کوشش کی ہے فوج کی ان پر بھی نظر ہے اور ہمارے سابق سپہ سالار نے اپنے آخری خطاب میں جن مسائل کا ذکر کیا ہے خاص کر مقبوضہ کشمیر میں بھارتی وراندازی، کرپشن اور دوسرے اہم مسائل جن سے نمٹ بھی رہے ہیں اور آگے ان کا خاتمہ بھی کرنا ہے اب عوام کی نظریں نئے سپہ سالار پر ہیں امید ہے وہ بھی ایک بہترین جنرل ہوں گے اور دنیا کی عظیم فوج کے سپہ سالار بن کے خود کو اور بھی عظیم ترین منوائیں گے۔ حضرت ام سلمیٰؓ کی روایت میں آپ کا فرمان امت کے لیے غور وفکر کی دعوت دیتا ہے خصوصاً اس دور میں جہاں گناہوں کی کثرت ہی نظر آتی ہے ضرور بچنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ بھی ہمیں ہر طرح کے گناہوں سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ امین بھایانی کا خوب صورت افسانہ محبت سے نفرت بہت اچھا لگا اور واقعی سچی بات ہے بھارت میں ایسی جانے کتنی باتا جی ہوں گی جن کے جوان بھارتی ہٹ دھرم سرکار کی بھینٹ چڑھ رہے ہیں اور کشمیر سمیت بھارت کے اندر بھی مسلمان اور دوسری اقلیتیں بھی ان کا ظلم وستم برداشت کر رہی ہیں جہاں عدم مساوات کی بنا پر کمزور لوگ ظلم سہنے پر مجبور ہیں، اللہ کرے ایسا ہو جب کشمیر کشمیریوں کی خواہش کے مطابق آزاد ہو اور دونوں ممالک کے عوام ایک دوسرے کے قریب آئیں اور سرحدوں پر ہی انٹری ویزا جاری ہو کاش ایسا ہو اور ہر طرف امن وامان کا ہی دور دورہ ہو ایم اے راحیل کا تبصرہ بھی خوب رہا آپ نے بجا فرمایا کہ امریکا میں الیکشن کی ہار جیت کو تسلیم کیا جاتا ہے لیکن اس دفعہ ڈونلڈ ٹرمپ کے جیتنے پر تو امریکی عوام ہی سراپا احتجاج بن گئی کہ ٹرمپ کیوں جیت گئے احسن ابرار آپ کی دعا پہ آمین کہتے ہیں اللہ کرے ہر جگہ ہی امن قائم ہو، اس دفعہ کوئٹہ کے بعد بلوچستان کے پسماندہ علاقے شاہ نورانی کے مزار پر دھماکے نے بھی ہلا کر رکھ دیا اب تو حکومت سے یہی گزارش ہے کہ پورے ملک میں جہاں کہیں بھی جلسے وغیرہ ہوں یا چھوٹے بڑے اجتماع ہوں ہر جگہ پر عوام کی سیکورٹی کا پورا پورا بندوبست کرے تاکہ بعد میں نقصان نہ اٹھانا پڑے، بھائی مجید احمد جائی آپ کی خدمات پر خلوص ہیں اور تبصرہ بھی خوب ہے پر یہ آخری خط والی بات نہ کریں، پلیز، صائمہ نور نے بھی اس دفعہ بھرپور خط لکھا بہت اچھا لگا اور ایسی نہروں کی بدولت ہی تو چاند میری زمین پھول میرا وطن ہے نا فیملی کا حصہ بنتی مہتاب خان کا تبصرہ بھی بہت عمدہ رہا (بہتی ندی کا پانی واپس نہیں آتا جیسے جوانی) اور دلجھلی کے بہتے سروں نے کئی پیار کرنے والوں کی جوانیوں کو ڈبو دیا تھا، شیریں، وقار، زیبا، اختر سب اس کی بھینٹ چڑھ گئے اور پھر جا کے خالد انسپکٹر نے دلجھلی کا راز بھی پالیا، ریاض بٹ کی کہانی تجسس سے بھرپور بہت اچھی لگی اور آپ کا تبصرہ بھی ایک دم زبردست تھا ریاض حسین قمر کا فرداً فرداً سب سے حال احوال پوچھنا بہت ہی اچھا لگا اللہ تعالیٰ آپ کو بھی اپنے حفظ وامان میں رکھے اور صحت قائم رکھے آمین، شکریہ پرنس افضل شاہین بھائی آپ سے بھی ضرور ملاقات رہے گی اور شعر کے ساتھ آپ کا تبصرہ بہت اچھا لگا، ارے عمر فاروق ارشد بھائی آپ شام کے بٹھیاں گھومتے رہے تھوڑی چہل قدمی کر کے آگے چوہنگ آجاتے تو ہمیں بھی آپ کی خدمت کا موقع مل جاتا اور آخر یہ عبدالجبار روی انصاری جھنگ میراثی تو چوہنگ ہے لاہور میں خیر کوئی بات نہیں ایسا ہو جاتا ہے کرمانی اور پاشا کے بچھائے جال میں بے چارہ عماد تو بے موت مارا گیا لیکن اسی جال نے کرمانی اور پاشا کو بھی گھسیٹ لیا اور پھر عامر عرف عامی اور ظہیر صدیقی نے مل کر خوب بدلہ لیا اور پھر زارا کے تینوں

کی فیملی بھی مکمل ہوگئی کہانی بہت اچھی تھی پڑھ کر مزہ آ گیا محبت دور ستاروں کی کہکشاؤں پہ بنا گھر لگتا ہے۔
عین محبت میں جذبہ صادق ہو تو خیال حقیقت بھی بن جاتے ہیں تیمور لفظ لفظ محبتوں سے گندھی پر اثر تحریر
ایک سو سولہ چاند کی راتیں بہت عمدہ جا رہی ہے، دادا جی سے ڈرتے انہی کے ساتھ ہیرا پھیری کرتے ٹوٹی
اور فضلو مزاحیہ فلمی اداکاروں کی طرح جملے بولنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانا چاہتے ہیں یوں وہ
دونوں ہی ایک دوجے کے لیے نہلے پہ دہلا ثابت ہوتے ہیں اور جب موقع ملتا ہے تو دیا جی انہیں ہاتھ دکھا
جاتی ہے ہیرا پھیری اچھی رہی شرزا غلط تو کرنے جا رہی تھی لیکن اس کی یہ سزا کہ اسے قتل ہی کر دیا یہ انتہائی
غلط ہے اور نام آ گیا غیرت کا قتل ایک انسان جان سے گیا دوسرے جیل میں اگر شرزا کو سزا دینی تھی تو اس
کے پاسپورٹ وغیرہ ضبط کر لیتے، پتا چل گیا تھا اور اسے جانے ہی نہ دیتے بڑوں کے سامنے پیش کر دیتے
وہ خود ہی شرم سے خاموش ہوتی یا رو دھو کے چپ ہو جاتی لیکن کہتے ہیں غصہ عقل کو کھا جاتا ہے اب قفس
عبرت اثر کہانی تھی سوا تناہی کہیں گے۔ ڈیول میں خلیل کامران مقابلے میں جانبر نہ ہو سکا سمیر جہان دماغی
صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اچھا فائٹر بھی ہے تو خلیل کی بیٹی عالیہ بھی کچھ کم نہیں ہے دہشت گردوں کا مقابلہ
کرنا خوب جانتی ہے اس لیے سمیر کو اسے بھی ساتھ رکھنا چاہیے باقی کہانی زبردست ہے فن پارے بھی
خوب رہے انو پڑھ تو لی پر سمجھا نہیں یہ کیا ہے۔ بس پاگل بن محمد خالد جاوید کی ناقابل فراموش پڑھ کر متاثر
ہوئے بنا نہ رہ سکا زبردست پاک فوج پاکستان زندہ باد، باقی کہانیاں بھی اچھی رہیں، ذوق آگہی سے فلک
شیر ملک، حسین خواجہ اور سمیر تعبیر کی باتیں اچھی لگیں اور خوش بوئے سخن سے لیہا سیال، ریاض حسین قمر، احمد
رضا انصاری اور نوشین اقبال نوشی بیسٹ رہیں۔

ناقابل اشاعت:

مجھے فرشتوں نے لوٹا، خونی مہندی، بہار لوٹ آئی، عورت، جیت رشتوں کی، نور ہدایت، بلا عنوان،
چپ بی، بنت عبداللہ، بچی والی، پنچھی واس، سفر نامہ، کیسے کیسے لوگ، ازلی تضاد، روشنی کی لکیر، قتل کا کوڈ،
خواب تعبیر، مایوسی، اپنا گھر، معاف، ارادہ، پہچان۔

مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔
☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیڑھ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔
☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں صرف نیلی یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں
☆ خوشبوئے سخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔
☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔
☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں
کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔
☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔
☆ ''گفتگو'' کے لیے آپ کے ارسال کردہ خطوط ادارہ کو ہر ماہ کی 3 تاریخ تک مل جانے چاہیے۔
☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔ 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی۔

ترتیب: طاہر قریشی

الرب

(پالنے والا۔ پروردگار)

الرّب کے معنی پالنے والا زندگی کے ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے تک لے جانے والا ہر مرحلے کے لیے سامانِ زیست مہیا کرنے والا بہت سے لاحقوں کیساتھ ''رب'' کی صفت قرآن حکیم میں آئی ہے۔ رب العلمین' رب رحیم' رب العرش العظیم' رب السمٰوٰت والارض' رب المشرق' رب المغرب' رب ہذا البیت' تقریباً اٹھائیس آیات میں صفتِ رب کا ذکر ہوا ہے۔

رب' پروردگار' مالک' صاحب' یہ اصل میں رب' یرُبُّ کا مصدر ہے جس کے معنی تربیت کے ہیں اور پھر مبالغہ کے لئے عدل کی طرف بطور وصف استعمال کیا جانے لگا اور بعض علماء کے قول کے مطابق بر کی طرح صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ امام راغب کا قول ہے کہ رب مصدر ہے جو فاعل کے لئے مستعار ہے۔ تربیت کی تعریف امام راغب نے اس طرح کی ہے ''کسی چیز کو یکے بعد دیگرے ایک حالت سے دوسری حالت میں اس طرح نشوونما دیتے رہنا کہ وہ حد کمال تک پہنچ جائے' امام حلیمی نے بھی رب کی تعریف انہی الفاظ میں کی ہے۔

امام بیہقی' کتاب الاسماء والصفات میں یوں رقمطراز ہیں۔ ''حلیمی'' نے رب کے معنی میں فرمایا ہے کہ ''رب'' وہ ہے جو ہر چیز کو جسے اس نے ایجاد کیا ہے' کمال کی اس حد تک پہنچا دیتا ہے' جو حد اس چیز کے لئے مقرر فرمادی ہے' پس وہ نطفہ کو پشت سے نکالتا ہے' پھر اس کو پھٹکی بناتا ہے پھر پھٹکی کو بوٹی پھر بوٹی سے ہڈیوں پر گوشت چڑھاتا ہے پھر بدن میں جان ڈالتا ہے' اور اس کو ایک نئی صورت میں جبکہ وہ ناتواں بچہ ہوتا ہے نکال کھڑا کرتا ہے اور برابر اس کی نشوونما کرتے رہنا' یہاں تک کہ اس کو پورا مرد کردیتا ہے۔ اور ابتداء حال میں وہ جوان ہوتا ہے پھر اس کو ادھیڑ پھر بوڑھا بنا دیتا ہے' اور جو چیز بھی اس نے پیدا کی اس کا یہی طور و معمول ہے' اس لئے رب وہ ہے جو اس کا نگران اور اس حد پر اس کو پہنچانے والا ہے جو حد اس کے لئے مقرر کی گئی ہے۔

ابن خالویہ لغوی نے تصریح کی ہے کہ رب کے معنی لغت میں سید اور مالک کے ہیں۔ (کتاب الاسماء

والصفات) اپنی اسی کتاب میں امام بیہقی امام خطابی کا قول نقل کرتے ہیں' کہ اگر کسی اضافت کے ساتھ رب بولا جائے تو رب بمعنی سید (آقا' خاوند) ہے اور کچھ کے نزدیک رب بمعنی مالک ہے۔ جبکہ امام راغب اصفہانی نے تحریر کیا ہے کہ ''رب'' مطلقاً یعنی بغیر کسی شرط کے اگر استعمال ہو تو سوائے اللہ تعالیٰ کے جو مصالح موجودات کا کفیل ہے' اور کسی کے لئے نہیں بولا جاتا جبکہ اکثر علماء کا اجماع ہے کہ ''رب'' سے مراد اللہ تعالیٰ ہے۔ (نوٹ) اللہ تعالیٰ کی صفت ''رب'' نہ تو حضرت امام جلال الدین سیوطیؒ کی کتاب اسماء اعظم کی فہرست میں اور نہ ہی امام محمد الغزالی کی تصنیف شرح اسماء الحسنیٰ میں ہے۔

ترجمہ:۔ سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے' جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔ (الفاتحہ۔۱)

تفسیر:۔ رب' اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفت ہے' جس کے معنی ہر چیز یعنی ہر مخلوق کو پیدا کر کے اسے اس کی ضروریات مہیا کرنے والا اور تکمیل تک پہنچانے والا' اللہ کی اس صفت ''رب'' کا استعمال بغیر اضافت کے کسی اور کے لئے استعمال کرنا قطعی جائز نہیں ہے۔ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں صرف اسی کے لئے خاص ہیں ہر قسم کی تعریف کا حقیقی مستحق وسزاوار صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ کسی بھی چیز میں جو حسن وخوبی ہے یا حسنِ کمال ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کا ہی پیدا کیا ہوا ہے۔ لفظ اللہ اس خالق کون ومکاں کا ذاتی نام ہے جو کسی بھی طرح کسی اور کے لئے استعمال نہیں ہو سکتا۔

ترجمہ:۔ ترے رب کی طرف سے حق یہی ہے' خبردار شک کرنے والوں میں (شامل) نہ ہونا۔ (آل عمران۔۶۰)

ترجمہ:۔ اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو' جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا۔ (النساء۔۱)

ایک جان سے مراد ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ آیت میں مزید ارشاد ہوا ہے ''اسی سے' ان کی بیوی حضرت حواؑ کو پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پیدا کر کے دنیا میں پھیلا دیے۔ وہی سب کا مالک حقیقی اور نگہبان ہے' صرف اس سے ڈرنا چاہئے اور اس کی ہی عبادت کرنی چاہئے۔

ترجمہ:۔ آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں اور مشرقوں کا پروردگار وہی ہے۔ (الصّٰفّٰت۔۵)

ترجمہ:۔ وہی (اللہ) پروردگار ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے' وہ زبردست اور بڑا بخشنے والا ہے۔ (صٓ۔۶۶)

اللہ تعالیٰ کی صفتِ رب قرآن حکیم میں تقریباً اٹھاسی مقامات پر استعمال ہوئی ہے۔

یاسین صدیق

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں۔اس وقت ڈائجسٹوں کی دنیا میں صف اول کے مصنف ہیں۔اب تک غالباً 30 سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔اردو کے تمام قابل ذکر رسائل میں کہانیاں لکھ چکے ہیں۔ 20 سال سے زائد ہوئے جب لکھنا شروع کیا تھا۔انہوں نے ہمہ اقسام کا ادب لکھا ہے۔اور ہر ایک میں خود کو منوایا ہے۔ان کے اس انٹرویو سے ہم سب کو ان سے بہت کچھ جاننے اور سیکھنے کو ملے گا۔

کہتے ہیں صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔شائد اس لیے کہ ترس ترس کر ملتا ہے۔میرا اشارہ جناب محترم ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے اس انٹرویو کی طرف ہے۔ایک صبر آزما انتظار کے بعد ہم ان کا یہ انٹرویو کرنے میں کامیاب ہوئے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا سوشل میڈیا پر کوئی اکاونٹ نہیں تھا(تھا تو اسے ڈی ایکٹیو کیا ہوا تھا)۔سوچا کال کر کے ریکارڈنگ کر لوں جیسا محی الدین نواب (مرحوم) کا انٹرویو کیا تھا۔انہیں فون پر یہ بات بتائی تو انہوں نے چند دن بعد اپنا فیس بک اکاونٹ ایکٹیو کرنے کا وعدہ کیا۔یہ چند دن چند ماہ میں بدل گئے۔ہم بھی ہر پندرہ بیس دن بعد ان کو یاد دلاتے رہے۔جولائی 2016 کا ایک خوبصورت دن تھا جب انہوں نے اپنا وعدہ پورا کیا(یہ انٹرویو پندرہ دن جاری رہا)۔یہ خوبصورت ،معلوماتی ،انٹرویو کرنے میں ہمارا انٹرویو چینل (ظفر علی ،قاری ابو بکر، عاصم سعید ،نعمان عظیمی ،عدیل عادی ،شہباز اکبر الفت ،شبیر اعوان علوی ،عطا المصطفےٰ ،آصف بھٹی ،بندہ ناچیز) کے علاوہ محترم امجد جاوید صاحب ،جناب رزاق شاہد کوہلر ،سید بدر سعید ،جناب حمید اختر ،ایم اکرم مپال ،صداقت حسین ،وقار حسین ،تفسیر عباس بابر ،اعجاز راحیل ،رضوان سلطان ،یاسین نوناری ،جیسے دیگر دوستوں نے ساتھ دیا۔ان سب کا میں مشکور ہوں۔

(س) اسلام علیکم محترم جناب عبدالرب بھٹی صاحب خوش آمدید ،جی آیاں نوں۔لیکن بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔

(ج) معذرت خواہ ہوں کہ آپ کو انتظار کی زحمت سے گزرنا پڑا ،دراصل ہم ڈاکٹروں کی لائف اپنے لیے کم اور دوسروں کے لیے زیادہ ہوتی ہے ،میں آپ سب کا خاص طور پر یاسین صدیق بھائی کا مشکور ہوں انہوں نے مجھے آپ احباب سے باتیں کرنے کا موقع دیا ہے۔

(س) یعنی قاری اور لکھاری کو آمنے سامنے کر دیا ہے۔

(ج) جی ہاں

(س) آپ کا نام کس نے رکھا؟

(ج) میرا نام میری والدہ نے رکھا۔عبدالرب۔قوم بھٹی ہے اور ڈاکٹر پیشہ۔

(س) آپ کی تاریخ پیدائش کیا ہے۔جائے پیدائش کون سی ہے؟

(ج) میری تاریخ پیدائش اٹھارہ ،چھ ،1969 ہے ، اور جائے پیدائش جیکب آباد سندھ ہے۔

(س) آپ کے کتنے بہن بھائی ہیں؟ ان میں آپ کا نمبر کون سا ہے ان کا مختصر تعارف۔؟

(ج) ہم ماشااللہ نو بہن بھائی ہیں ،میں سب سے چھوٹا ہوں باقی سب بہن بھائی ،بھی اچھے عہدوں پر ہیں ،یعنی

ڈاکٹرز، انجینئرز، اور پروفیسرز۔

(س) بچپن میں پٹائی ہوتی رہی ہے؟۔ کس وجہ سے؟

(ج) میں بچپن میں بہت شرارتی تھا، پڑھنے کا کوئی شوق نہ تھا۔ آوارہ گردی کرتا تھا۔ گھر والوں سمیت آ لے دوالے سب کی ناک میں دم کرتا تھا۔ امی ابو سے پٹتا بھی تھا، لیکن پھر وہی شرارتیں اور اچھل کود۔

(س) آپ کی شادی کہاں ہوئی خاندان میں یا خاندان کے باہر۔۔ کیا والدین کی پسند کی تھی۔ کب ہوئی۔ شادی سے پہلے بیگم کو دیکھا تھا۔ ان کی تعلیم کیا ہے؟ ان کی ادب سے دلچسپی کے بارے بتائیں۔

(ج) شادی خاندان سے باہر ہوئی۔ والدین کی پسند تھی۔ 1998 میں ہوئی۔ شادی سے پہلے بیگم کو دیکھا تھا۔ وہ گھریلو خاتون ہیں۔ ٹھیک ٹھاک پڑھی لکھی ہیں۔

بیگم نے کبھی کتابوں کو سوکن نہیں سمجھا اس لیے کہ وہ خود بھی شوق سے پڑھتی ہیں، مزے کی بات یہ ہے انہیں یہ سروکار نہیں ہوتا کہ کس ادیب نے لکھی ہے، بس کہانی اچھی ہونا چاہیے۔۔ ایک بار میں کہانی لکھنے میں محو تھا، بیگم ایک ڈائجسٹ پڑھنے میں، کہانی پڑھنے کے بعد وہ اس کہانی کی تعریف میں بولنے لگیں، بولیں، یہ بہت اچھی لگی مجھے۔ کیا آپ نے پڑھی یہ کہانی؟ میں نے نام پڑھا وہ میری تھی، مگر مزے کی بات، میں نے ان سے یہ نہیں کہا کہ یہ تو میری ہی لکھی ہوئی ہے۔ اللہ کا شکر ہے مجھے اچھی وائف ملی ہر طرح سے میرا ساتھ دیتی ہیں۔ ہم انجوائے کرنے کے لیے فیملی سمیت ہوٹلنگ کرتے ہیں اور گھومتے پھرتے ہیں بچوں کے ساتھ، انہیں خوش دیکھ کر میں بھی خوش ہوتا ہوں

(س) آپ کے بچے کتنے ہیں۔

(ج) ماشاءاللہ تین بچے ہیں، دو بیٹے اور ایک بیٹی۔

(س) آپ کی عمر کیا تھی جب آپ نے ادب کا مطالعہ شروع کیا؟

(ج) بارہ تیرہ سال سے مطالعہ شروع کیا تھا۔

(س) وہ کون سی کہانی یا ناول تھا جو سب سے پہلے پڑھنے کا اتفاق ہوا؟

(ج) خدا کی بستی۔ پریشر ککر، ایمرجنسی اور بہت سے ناول تھے جو ابتدا میں ہی پڑھنے کا موقع ملا۔

(س) آپ کی تعلیم کیا ہے؟ کس کالج سے حاصل کی؟۔ کالج دور کے کسی استاد کا تعارف کروائیں جنہوں نے آپ کو متاثر کیا؟۔

(ج) ایم بی بی ایس کیا ہے، میڈم رخسانہ نے مجھے بہت متاثر کیا تھا، وہ اچھا پڑھاتی تھیں۔

(س) M.B.B.S کہاں سے کیا تھا۔؟

(ج) لاڑکانہ چانڈکا میڈیکل کالج سے بعد میں کراچی سے۔

(س) کالج لائف میں آپ کے بہترین دوست اب وہ کہاں ہیں؟

(ج) بہت سے دوست تھے، اب بھی کبھی کبھی ملاقات ہو جاتی ہے۔

(س) آپ کے خاندان میں اور کوئی ادیب ہے۔ اگر ہے تو ان کا تعارف چند سطروں میں؟۔

(ج) کوئی نہیں

میرے سواء

(س) سر آپ پہلے ڈاکٹر بنے یا مصنف۔ ڈاکٹر بننا آپ کی خواہش تھی یا آپ کے والدین کی۔

(ج) میں پہلے رائیٹر بنا پھر ڈاکٹر، یہ خواہش میرے والدین کی تھی، رائیٹر بننے کی میری خواہش تھی۔

(س) مطالعہ کا شوق کیسے پڑا؟ اسکول لائف بچپن کی کچھ یادیں شیئر کریں۔
(ج) بڑے بھائیوں کا شوق تھا یہ، وہی ناول کہانیاں لاتے تھے، جنہیں بعد میں میں بھی شوق سے پڑھنے لگا۔ بچپن کی بہت سی یادیں ہیں، کیا کیا شیئر کروں؟
(س) ادب اور فکشن میں کس کس رائٹر کو پڑھا؟ آپ کا پسندیدہ ترین افسانہ اور ناول کون سا ہے؟ پسندیدہ رائٹر جس سے متاثر ہو کر کہانیاں لکھنے کا شوق پیدا ہوا؟
(ج) تقریباً سب کو ہی پڑھا ہے، پسندیدہ افسانہ احمد ندیم قاسمی کا تھا، شاید رنگ حنا نام تھا، پسندیدہ رائٹرز میں کرشن چندر سعادت حسین منٹو قاسمی اور شوکت صدیقی شامل ہیں۔
منٹو، چندر اور شوکت صدیقی کی کہانیوں نے مجھے متاثر کیا ہے، ان کی کہانیاں بولتی تھیں۔ میں بھی ایسا لکھنا چاہتا ہوں۔
(س) آپ کی سب سے پہلی کہانی کون سی تھی اور وہ کہاں شائع ہوئی؟
(ج) میری پہلی کہانی نونہال اور افسانہ کہانی اخبار جہاں کے ایک چھوٹے سے سیکشن میں چھپی تھی۔
(س) ڈاکٹر صاحب آپ نے پہلی کہانی کب لکھی تھی؟
(ج) شاید 1985 میں، بے حد خوشی ہوئی تھی۔ لکھنے کا اعتماد بڑھا تھا خوداعتمادی میں اضافہ ہوا تھا۔
(س) سر جس کہانی کا سب سے پہلے اعزازیہ ملا کس رسالہ میں شائع ہوئی کس سال؟
(ج) سچی کہانیاں، غالباً 1998
(س) پہلی بار کب اور کتنا اعزازیہ ملا جسے آپ محنت کا صلہ سمجھے؟
(ج) اخبار جہاں سے ایک کہانی پر تین ہزار، یہ غالباً 1998 کی بات ہے۔
(س) سر سب سے زیادہ معاوضہ اب تک آپ کو کس کہانی کا ملا؟
(ج) سودائے جنوں، کفن بدوش، آوارہ گرد وغیرہ
(س) آپ کی سب سے زیادہ کون سی کہانی پسند کی گئی؟
(ج) برگ خزاں، خارزار، شکستہ گھروندے، سودائے جنوں، صحرا گرد، آوارہ گرد، کفن بدوش وغیرہ ایسی کہانیاں ہیں جن کو بہت پسند کیا گیا۔
(س) اب تک آپ کی سب سے طویل کہانی کون سی ہے؟
(ج) بہت سی ہیں، کمین گاہ، کالاز، آوارہ گرد وغیرہ
(س) آپ نے بچوں کے لیے بھی لکھا ہے سنا ہے کہ ایک وقت تھا، جب انوکھی کہانیاں سے آپ کی کہانی ریجیکٹ ہوئی تھی اب جب آپ اس بلند ترین مقام پر کھڑے ہیں، تو پیچھے مڑ کر دیکھنے پر وہ وقت اب کیسا لگتا ہے۔
(ج) ہاں! نونہال ٹوٹ بٹوٹ میں لکھا، انوکھی کہانیاں میں ایک ہی کہانی بھیجی تھی، پہلا حصہ تھا، اسی لیے ریجیکٹ ہو گئی تھی۔ باقی پیچھے مڑ کر میں کم ہی دیکھتا ہوں۔
(س) کوئی ایسا موضوع جس پر لکھنا آپ کو بہت پسند ہو۔
(ج) جذبہ حب الوطنی اور اسلام کی تبلیغ نیز مسلمانوں کے خلاف عالمی سازشوں کے تحت جس طرح اس کا تشخص بگاڑا گیا ہے، اسے بے نقاب کرنے کی میری بھرپور خواہش ہے
(س) کوئی ایسا موضوع جس پر آپ نے لکھنا چاہا ہو اور لکھ نہ سکے ہوں؟

(ج) میرے تو خیال میں ایسا کوئی موضوع میں نے نہیں چھوڑا، کوئی رہ گیا ہو، تو سوچ لیتا ہوں۔ یوں بھی مجھے ایک ہی موضوع پر لکھنے سے اکتاہٹ ہوتی ہے، میں موضوع بدلتا رہتا ہوں۔
(س) کوئی ایسا شعر سنائیں جو ہر دور میں آپ کو پسند رہا ہو۔ سدا بہار آپ کا پسندیدہ شعر۔
(ج) اچھا خاصا بیٹھے بیٹھے گم ہو جاتا ہوں۔۔۔۔۔اب میں اکثر میں نہیں تم ہو جاتا ہوں
(س) علامہ اقبال، غالب کے علاوہ بتائیں آپ کو کون سا شاعر پسند ہے۔
(ج) شاعر بہت سے پسند ہیں
(س) کیا آپ نے شاعری کی۔ اگر کی ہے تو اپنا ایک شعر۔
(ج) حسین اک خواب لیے بیٹھا ہوں
خود کو عذاب دیئے بیٹھا ہوں
(س) آپ کے نزدیک جمہوریت اسلام کے مماثل ہے یا متصادم؟
(ج) جمہوریت اگر اپنے تمام تر مثبت لوازمات کے ساتھ ہو تو یہ میرا خیال ہے کہ یہ اسلام کے متصادم نہیں ہو سکتی۔
(س) کیا ایک ادیب کا یہ حق نہیں بنتا کہ وہ اسلام کی تبلیغ کرے اور قلم کے ذریعے سے جہاد کرے؟
(ج) بالکل حق پہنچتا ہے، ایک ادیب کا بلکہ ایک مسلم ادیب کا تو فرض ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں اسلام کی بھی تبلیغ کرے اور ایسا کرتے بھی ہیں دیگر ادیب، میری کہانی سودائے جنوں، کفن بدوش اس کی مثال ہیں۔
(س) آپ کیا کہتے ہیں کہ اس مسئلے کے بارے میں کہ انسانیت سب سے بڑا مذہب ہے جب کہ صرف اسلام ہی مکمل ضابطہ حیات ہے۔
(ج) انسانیت کو تو مذہب نہیں کہہ سکتے یہ ایک جذبہ ہے، جبکہ اسلام تو انسانیت کی قدر کا درس دیتا ہے۔
(س) آپ کی کوئی ایسی تحریر جسے آپ سمجھتے ہوں کہ ہو سکتا ہے یہ میری بخشش کا ذریعہ بن جائے؟
(ج) ''نیند'' نامی میرا ایک ناول اخبار جہاں میں چھپا تھا، اس میں ایک گناہ گار شخص بستر مرگ میں پڑا گڑ گڑا کر اللہ سے زندگی کی بھیک مانگتا ہے کہ اس بار اسے صحت یاب کر دے اور نئی زندگی دے دو دوبارہ برے کام نہیں کرے گا، تب اس کی آنکھ کھل جاتی ہے، وہ خواب دیکھ رہا ہوتا ہے۔
(س) کوئی ایسی یاد جو کبھی رُلا دیتی ہو؟
(ج) کسی مظلوم کو ناحق مار کھاتے ہوئے نہیں برداشت کر سکتا تھا، میرا ایک بچپن کا دوست تھا، وہ جاگیر دار گھرانے سے تعلق رکھتا تھا، میری اس سے دوستی ہمیشہ کے لیے اسی لیے ختم ہوگئی تھی جب میں نے اسے ایک غریب ہاری کے بچے پر تشدد کرتے دیکھا۔
(س) ملک کے پرخطر حالات احساس عدم تحفظ، لاقانونیت، دہشت گردی، منافقین کے گروہ، سیاسی بازیگریاں، عوام کا جذباتی استحصال، سیاستدانوں کی بے حس خاموشی، آپ اس ضمن میں کیا کہیں گے؟
(ج) عوامی اتحاد اجتماعی سوچ، ذاتی مفادات سے بالاتر ہو کر صرف وطن کی خدمت کے جذبے کو پروان چڑھنا چاہیے، تب ہی حالات میں بہتری آ سکتی ہے۔
(س) جتنا بھی بڑا سانحہ ہو۔ میڈیا کا واویلا دو دن بعد جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا ہے، میڈیا کی اس پالیسی کو آپ کیا کہیں گے؟

(ج) یقیناً، یہ سب ریٹنگ کا چکر ہے۔ زرد صحافت ہی کہوں گا میں اسے، خبر کو صرف خبر نہیں بلکہ ان کا کام ہے کہ وہ اسے عملی اور منتقی انجام تک بھی پہنچائیں۔

(س) زندگی کے کٹھن شب روز کا احوال سنائیں کچھ؟

(ج) ایک وقت تھا، میں کسی کلینک پر ڈسپنسر کی حیثیت سے کام کرتا تھا، آج میری کلینک میں 7 ڈسپنسر کام کرتے ہیں۔۔۔

(س) کسی کو آٹو گراف دیتے ہوئے سب سے زیادہ کون سا جملہ شعر یا قول لکھتے ہیں؟

(ج) خوش رہو خوش رہنے دو

(س) آپ کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟

(ج) ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔

(س) محبت آپ کی نظر میں کیا ہے؟

(ج) مرجذبہ۔

(س) قریبی لوگوں کے بدلتے ہوئے رویوں پر کیا احساسات ہوتے ہیں؟

(ج) ٹھنڈی سانس بھر کے رہ جاتا ہوں۔

(س) آپ میرے پسندیدہ قلمکار ہیں آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے سیکھ رہا ہوں آپ کے سلسلے وار کہانی خارزار سے آپ سے شناسائی ہوئی تھی۔ خارزار بہترین کہانی تھی۔ اس میں ایک چیز جو میں نے نوٹ کی وہ حقیقت کے بہت قریب تھی۔ خاص کر وڈیروں کا غریب ہاریوں پر ظلم، ناانصافی اور ان کی بہو، بیٹیوں، بہنوں کی عزت پامال کرنا وغیرہ وغیرہ۔ کیا آپ اندرون سندھ کی گوٹھوں میں گئے ہیں؟ یا پھر سنے سنائے واقعات رقم کیے تھے؟

(ج) ارے بھائی! میں تو پیدا ہی ان کے درمیان ہوا ہوں۔

(س) آپ کی زندگی میں ایسا کوئی ناخوشگوار واقعہ جس نے آپ کو پہلی مرتبہ اپنی سوچ تبدیل کرنے کا موقع دیا ہو؟

(ج) سندھ میں مظلوم ہاریوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور خود ساختہ رسموں پر لکھا، ان پر ہونے والا ظلم آنکھوں دیکھا ہے اسی طرح کاروکاری کے ایک ناخوشگوار آنکھوں دیکھے واقعے نے مجھے لکھنے پر اکسایا۔

(س) حال ہی میں آپ کا ایک سلسلہ فلسطین کے بارے میں شائع ہوا (سودائے جنوں) چند اقساط میں ایک ناآموز ادیب ہونے کے باوجود میرا خیال ہے کہ آپ کو وہ کسی وجہ سے سمیٹنا پڑا حالانکہ اس کا کینوس بہت وسیع تھا آخر وہ وجہ کیا تھی؟

(ج) جی ہاں "سودائے جنوں" بہت پسند کیا جا رہا تھا، میں اسے آگے بڑھانے کا ارادہ رکھتا تھا، مگر۔؟

(س) اسی "مگر" کے لیے تو یہ سوال پوچھا ہے؟۔

(ج) مگر ایسا نہ ہوسکا۔

(س) فلسطین اور کشمیر کے موضوعات کے بعد اب کس پر لکھنا چاہیں گے؟ مثلاً برما کے مظالم، شام میں ظلم و بربریت؟

(ج) ہاں! میری بڑی خواہش ہے کہ میں برما کے مسلمانوں پر ہونے والے مظالم پر لکھوں، لیکن ایسی تحریریں مخصوص پلیٹ فارم اور ہوم ورک کے بعد ہی لکھی جاتی ہیں، تاکہ اس کی حقیقت کہانی میں کہانی نہ بن جائے، ممکن ہے آپ آوارہ گرد میں اس کی جھلک عنقریب ملاحظہ فرمائیں

(س) آپ کی ایک کہانی پر بہت زیادہ تنقید برائے تنقید ہوئی؟

(ج) میں فقط اتنا ہی کہوں گا کہ بسا اوقات تنقید کے پیچھے دوسرے عوامل کارفرما ہوتے ہیں، کمال تو یہ ہے کہ اس "قسم" کی تنقید کا مجھے ہی نہیں پڑھنے والوں کو بھی پتہ لگ جاتا ہے کہ اس کا مقصد کیا ہے پھر وقت نے ثابت کر دیا کہ مذکورہ کہانی کیسی ہے۔

(س) آوارہ گرد پر کچھ لوگ تنقید کر رہے ہیں کہ بہت تیز رفتار ہے وغیرہ وغیرہ

(ج) یہ اس کہانی کا تقاضا ہے، ورنہ انہی لوگوں کو سلو اور جمود کی شکایت ہوتی۔ یہ کہانی اس قبیل کی نہیں ہے کہ اس میں ٹھہراؤ لایا جائے۔ اگرچہ میں کوشش بھی کرتا ہوں اس کی مگر نہیں ہو پاتی یہ شاید اس کی ڈیمانڈ ہے۔

(س) کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ آوارہ گرد کا ہیرو شہزی اطفال گھر سے نکلا۔ نہ کوئی تربیت لی، نہ فائٹ کے داؤ پیچ سیکھے۔ اچانک شوٹر بن گیا۔ جبکہ میرے خیال میں وقت اور حالات انسان کو بہت کچھ سکھا دیتے ہیں۔ آپ کیا کہتے ہیں؟؟؟

(ج) جو چند لوگ ایسا سمجھتے ہیں، ان پر مجھے حیرت سی ہوتی ہے کہ وہ پھر اب تک کیا پڑھتے آئے ہیں؟ کہ انہیں یہ بھی نہیں پتہ کہ حالات انسان کا سب سے بہترین استاد ہیں، آپ کو کوئی گھونسہ مارے تو کیا آپ بچاؤ کے لیے اپنا ہاتھ نہیں اٹھائیں گے؟ شہزی اول خیر جیسے لوگوں کے ساتھ رہا، پاور کے بیڈ کوارٹر میں تربیت لی۔ اطفال گھر ایک جدید یتیم خانے کی شکل ہے، وہاں بھی اس نے بہت کچھ دیکھا اور سیکھا۔ اس کے دوست اشرف وغیرہ اور استاد گگل کے ساتھ چپقلشیں، یہ اس کی زندگی کا حصہ رہا۔ مگر جو زیادہ فطرتاً" حساس ہوتا ہے وہ خود سے بھی بہت کچھ سیکھ لیتا ہے۔

(س) آوارہ گرد آپ کی سب سے اچھی اسٹوری ہے آپ کو خود اپنی کونسی کہانی اچھی لگتی ہے۔

(ج) جو آپ لوگوں کو اچھی لگے وہی اچھی لگتی ہے۔ میں ہر کہانی کو اچھا سمجھ کر ہی اس میں ڈوب کر لکھتا ہوں۔

(س) کسی شعر کے ایک فقرے کا۔ فلم کے کسی ڈائیلاگ کا ضرب المثل۔ محاورہ۔ یا عام افراد کے بول چال کا حصہ بن جانا ادیب کے لیے بہت خوش قسمتی کی بات ہوتی ہے۔ آپ کی کہانی آوارہ گرد کا "اوخیر کا کا" یہ مقام حاصل کر رہا ہے

(ج) اللہ کا شکر ہے۔ جی ہاں! آپ کی بات درست ہے۔

(س) ایک کامیاب رائٹر کو کامیاب کونسی چیز بناتی ہے؟

(ج) مخصوص حدود میں ان تینوں عوامل کا دخل ہے۔ مگر تجربہ اور مطالعہ بھی اپنی جگہ ہے

(س) ادب میں کونسی چیزیں انسان کو اخلاقی بلندیوں پر لے جاتی ہے

(ج) قلم کی حرمت

(س) ادب پڑھنے کے لیے قاری کا ادبی ہونا ضروری ہے یا بے ادب بندہ بھی ادب کا مطالعہ کر سکتا ہے؟

(ج) کوئی ضروری نہیں۔

(س) ایک گروپ میں ایک قاری ولکھاری نے پوسٹ لگائی جس کا مفہوم یہ ہے کچھ شرپسند عناصر نے لکھاریوں کے دماغ پر قبضہ جما کے لکھاریوں کو یرغمال بنایا ہوا ہے

(ج) بھئی میرے دماغ میں تو کبھی شرپسندوں نے قبضہ جما رکھا ہے اور یرغمال بھی۔۔ شاید اسی لیے آج میں اس مقام پر کھڑا ہوں۔ ایک ڈاکٹر۔ ایک رائیٹر۔ ایک خوشحال گھرانے کا سربراہ۔ بنانے میں اگر ان "شرپسندوں" کا کام

ہے تو مجھے یہ "شرپسند" قبول ہیں۔ دل وجان کے ساتھ۔

ایک رائٹر کے لیے ویسے تو اس کے سب قارئین قابل احترام ہوتے ہیں مگر رائٹر بھی چونکہ انسان ہونے کے ناتے احساسات وجذبات کا مجموعہ ہوتا ہے اس لیے کسی قاری کا والہانہ لگاؤ دیکھ کر وہ اسے خصوصی عزت تو دے سکتا ہے لیکن کوئی قاری اسے یرغمال بنا کر اپنی من مانی نہیں کرا سکتا۔ جو ایسا سوچتا ہے وہ غلط فہمی کا شکار ہے۔

(س) کیا آپ نے فلم یا ڈرامے لکھے یا نہیں اگر لکھے ہیں تو نام بتائیں اگر نہیں لکھے تو کیوں نہیں لکھے؟

(ج) ڈرامے لکھنے کا ارادہ ہے، مگر اس میں بک ہونا پڑتا ہے۔

(س) کوئی ایسا پلیٹ فارم ہونا وقت کی ضرورت ہے جہاں قاری و لکھاری مل بیٹھیں؟

(ج) لکھاری اور قاری کی ملاقاتیں ہونی چاہیں، شرکت کرنے کی کوشش کروں گا۔

(س) کیا آپ نے دیگر بہت سے رائیٹرز کی طرح کسی اور نام سے بھی لکھا ہے؟

(ج) صرف اے آر بھٹی اور اے آر راجپوت کے نام سے لکھا، مگر بہت کم کم۔

(س) آپ کہانی کس پر لکھتے ہیں۔؟

(ج) میں کمپیوٹر یا لیپ ٹاپ جس میں موقع ملے لکھتا ہوں اور کہانی اداروں کو ای میل کر دیتا ہوں۔

(س) جب آپ ایک کہانی لکھتے ہیں تو کیا مکمل کہانی آپ کے ذہن میں ہوتی ہے؟ یا آپ لکھتے جاتے ہیں اور کہانی بنتی جاتی ہے یعنی کہانی خود کو خود لکھواتی ہے۔ کیا آپ پہلے پلاٹ لکھتے ہیں؟

(ج) میں پہلے کہانی کا ایک خاکہ بناتا ہوں، پھر اس کے ابواب بناتا ہوں، اور لکھتا چلا جاتا ہوں۔

(س) کہانی کو لکھتے ہوئے کن باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ کس کی پسند کو سامنے رکھنا چاہیئے ایڈیٹر، قاری یا اپنی پسند پر لکھنا چاہیئے؟

(ج) بہت ہی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے، سب کی پسند بھی دیکھی جاتی ہے اور ایڈیٹر کی "پسند" بھی۔

(س) اگر ہمارے پاس ایک اچھا پلاٹ ہو، کردار وغیرہ سب کچھ، ہم لکھنا چاہیں پھر بھی نا لکھ پائیں تو ایسی صورتحال میں کیا کرنا چاہیے۔

(ج) کوشش ترک نہ کریں، ایک دن آپ لکھ لیں گے۔

(س) کس موضوع پر کہانیاں آپ کو پسند ہیں۔ کیسا ادب وقت کی ضرورت ہے۔

(ج) مجھے تو ہر موضوع اچھا لگتا ہے، مگر آج کے حالات کے مطابق مجھے ایسے موضوع اچھے لگتے ہیں جو عالمی سازشوں کو بے نقاب کرتے ہوں، بہت سے قارئین نے آوارہ گرد میں یہ بات محسوس کی تھی کہ جن کی نشاندہی کی گئی تھی کہانی میں، بعد میں وہی کچھ حقیقت میں بھی نظر آیا۔

(س) ناول لکھتے ہوئے کن باتوں کو مدنظر رکھنا چاہیے؟؟؟

(ج) ناول کے سلسلے میں بنیادی بات اس کا فارمیٹ ہے۔ آپ کیا لکھنا چاہتے ہیں؟ ناول کی روح کیا ہے۔ آپ کا مقصد صرف تفریح پہنچانا ہے یا کوئی پیغام بھی ہے، لیکن اگر آپ آگاہی کا پہلو ناول میں شامل رکھیں گے تو آپ کا ناول کبھی ناکام نہیں ہوگا۔

(س) آپ اپنی بہترین دس کہانیوں یا ناولز کے بارے میں بالترتیب بتائیں جو سب سے زیادہ پاپولر ہوئے۔

(ج) کتابیں علی میاں اور القریش پبلشرز لاہور سے مل سکتی ہیں، میں نے سبھی ناول اچھے ہی لکھنے کی کوشش کی ہے اور کرتا ہوں۔

(س) آپ نے کوئی کتاب، کہانی دوبارہ پڑھی ہو جیسے میں نے بازیگر، دیوتا، گمراہ، داستان ایمان فروشوں کی دوبار پڑھی ہیں۔

(ج) خدا کی بستی جانگلوس، robberytraingreatthe

(س) آپ کی کوئی ایسی کہانی جس پر سرقہ، چربہ کاپی کا الزام لگا ہو

(ج) کبھی نہیں لگا

(س) انداز بیاں سے لا دیب اپنی پہچان بناتا ہے۔ آپ کے انداز بیاں میں کسی کا رنگ تو جھلکتا ہوگا۔۔

(ج) میرے لکھنے کا اپنا انداز ہے، ہاں! آج کے ادیب میرا انداز بیاں اپناتے ہوئے نظر آئیں گے آپ کو۔

(س) آپ کا بہت سے رسائل کے مالک و مدیران سے واسطہ رہا مدیرین کے بارے میں بتائیں آپ نے انہیں کیسا پایا؟۔

(ج) بھئی مدیر سب ہی اچھے ملے، انہیں اچھا کام پسند ہے اور بس۔

(س) کیا لکھنے لکھانے سے ایک درمیانہ درجے کا ادیب مالی آسودگی حاصل کر سکتا ہے۔۔

(ج) کر سکتا ہے، محنت اور لگن سے مالی مسائل بھی حل ہو جاتے ہیں۔

(س) کبھی آپ نے بار رٹا یک ٹرائی کیا ہے۔؟

(ج) بارر بھی بہت لکھا ہے، کھنڈر، آخری رات، بدروح، ویرانہ وغیرہ میرے ناول اور مختصر کہانیاں ہیں۔

(س) اگر کوئی ایک دو اچھی تحریریں لکھ لے تو کیا اسے سمجھ لینا چاہیے کہ اس میں لکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔۔

(ج) جب آپ نے کہانی لکھنے کا ارادہ باندھ لیا تو سمجھو آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے، آگے آپ کی محنت، مستقل مزاجی اور لگن پر منحصر ہے۔

(س) آپ کی کہانیاں کن رسائل میں مستقل شائع ہو رہی ہیں

(ج) جاسوسی، سسپنس، سرگزشت، اخبار جہاں۔ نئے افق، ہسٹری میگزین، ایڈونچر ڈائجسٹ، عمران ڈائجسٹ میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

(س) دس کتابوں کے نام بتائیں جو آپ کو ترتیب سے پسند ہوں۔

(ج) خدا کی بستی، جانگلوس، پریشر کگر، ایمرجنسی، اداس نسلیں، آواز دوست۔ کچرا گھر، ایمان کا سفر۔ لاڈلی۔

(س) آپ کی تحریر اموشنل تاثر بہت دیتی ہے کوئی جذباتی سین آجائے تو آپکی کہانی کا کردار حالات کو اسطرح برداشت کرتا ہے کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ یہ میرا خیال ہے۔

(ج) یہ حقیقت ہے کہ جب انسان کا جوش اور جذبہ فزوں تر ہونے لگے تو وہ پھر اس آتش جوش کے سامنے بڑی سے بڑی تکلیف برداشت کر لیتا ہے۔

(س) بطور رائٹر آپ ہم عام لوگوں سے بہت بلند ہیں آپ کے نزدیک کونسا جذبہ زیادہ طاقتور ہے محبت یا نفرت؟۔

(ج) اپنے اپنے طور پر دونوں جذبے طاقت رکھتے ہیں۔ فرق صرف مثبت اور منفی، اچھے اور برے کا ہوتا ہے، لیکن محبت کا جذبہ زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔

(س) ہمارے ہاں محبت پر لکھنے والے محبت کو پاکیزگی سے مشروط کر دیتے ہیں۔ جسم کی ہوس سے پاک محبت ہی سچی محبت ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ انسانی فطرت میں جنس بھی شامل ہے اور محبت ہوتی بھی خوب سے خوب تر کے ساتھ

ہے

(ج) جذبات کی حقیقت تخیلاتی عمل ہے، جبکہ فطرت ایک اٹل حقیقت ہے۔ فطرت سے منہ موڑ کر محض جذبات کے سہارے محبت میں چاشنی پیدا نہیں ہوسکتی۔

(س) عشق کرنا چاہیے؟ یاد رہے یہاں بات عشق کی ہو رہی ہے نہ کہ محبت اور پیار کی۔ لائف میں خود سے عشق کیسے ضروری ہے؟؟

(ج) خود سے عشق میں خود غرضی پروان چڑھنے کا اندیشہ ہے

(س) پزیرائی کا سب سے خوب صورت لمحہ؟

(ج) قارئین تو تنقید و تعریف کرتے ہی رہتے ہیں، لیکن جب ایک بڑے اور کثیر الاشاعت رسالے کے ایڈیٹر نے میری ایک کہانی کی بہت تعریف کی، حالانکہ وہ کسی کو خاطر میں لانے والے ایڈیٹر نہیں تھے، مگر میری پہلی ہی ایک کہانی سے وہ بہت متاثر ہوئے اور کہا کہ تم آگے چل کر بہت لکھو گے اور اچھا لکھو گے۔ یہ میری زندگی کا بہت خوبصورت لمحہ تھا

(س) ضرورت مندوں کی مدد کرتے ہیں یا وعدے وعید کر کے ٹرخا دیتے ہیں؟

(ج) اپنی حیثیت کے مطابق کر دیتا ہوں

(س) آج اس مادہ پرستی کے دور میں کسی سے سچی محبت ہوسکتی ہے۔ میں جنس مخالف سے محبت کی بات کر رہا ہوں ؟

(ج) سچی محبت اور سچا جذبہ اور ہر دور میں سچا ہی رہتا ہے، اور نہیں تو سمجھو وہ کبھی سچا تھا ہی نہیں۔

(س) اپنی اچھی اور بری ایک ایک عادت بتائیں۔ غصہ کس بات پر آتا ہے۔

(ج) دوسرے کی بات پر جلدی بھروسہ کر لیتا ہوں، غصہ جلدی آجاتا ہے۔ جذباتی سا ہوں، غصہ انسان کے بدل جانے پر آتا ہے، بالخصوص مطلبی مفاد پرست لوگوں پر

(س) جھوٹ کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں اس کی تفصیل سے وضاحت کریں کہ جھوٹ ہوتا کیا ہے

(ج) جھوٹ اپنا جرم چھپانے یا کسی غلطی کو ڈھانپنے کی ایک قبیح کوشش ہے اور نا کامی بھی۔

(س) میڈیکل میں کیا کوئی ایسی میڈیسن موجود ہے جس سے چار یا پانچ نمبر تک بینائی کی کمزوری کا مکمل علاج ممکن ہو؟

(ج) وٹامن اے کے کیپسول تھیرا گران ایم یا الٹرا، بادام اور سونف ملا کر کھانے سے بھی نمبر کم ہوتا ہے۔

(س) جدید تحقیقات کی رو سے عورت کو مرد اور مرد کو عورت میں چینج کیا جا سکتا ہے کیا ایسا ممکن ہے؟ اگر ہاں تو کیسے؟

(ج) کسی حد تک ممکن ہے مگر بعد میں پیچیدگیاں پیدا ہوجاتی ہیں، مریض جانبر نہیں رہتا۔

(س) اسپتال میں ہونے والا کوئی عجیب واقعہ جو آج بھی حیرت کا باعث ہو۔

(ج) پولیس سرجن کی حیثیت سے پہلی بار ایک لاش کا پوسٹ مارٹم کیا تھا۔ اور اس کے اندرونی اعضا نکالے تھے باہر پیٹ چیر کر یہ نا قابل فراموش واقعہ ہے۔

(س) انٹرویو دیتے ہوئے کیسا محسوس کر رہے ہیں؟

(ج) اچھا محسوس کر رہا ہوں تنگ کیوں ہوں گا بھلا؟ ہاں بس آپ کو کوفت ہو رہی ہوگی کہ میں جواب دیر دیر سے

دے رہا ہوں۔ وجہ آپ کو معلوم ہی ہوگی۔

(س) زندگی کیا ہے؟

(ج) ایک مقصد ہے، عظیم مقصد، بے مقصد زندگی، زندہ موت ہے۔

(س) انسان کی کامیابی یا ناکامی میں قسمت یا تقدیر کا کتنا عمل دخل ہے۔ کیا انسان جبریہ زندگی گزارنے پہ مجبور ہے جیسی لکھ دی گئی ہے۔ یا تقدیر یعنی اس میں اپنی کوشش سے تبدیلی کر سکتا ہے۔ لفظ تقدیر کی مختصر تعریف۔

(ج) میں سمجھتا ہوں کہ اس سوال کا جواب وہی انسان بہتر طور پر دے سکتا ہے جو، زندگی کے ایک طویل تلخ و شیریں تجربات سے گزرا ہو۔ چلیں میں اپنی مثال پیش کیے دیتا ہوں، میرے مطابق تقدیر تدبیر کے تابع ہے، آپ اچھی تدبیر کریں گے آپ کو اس کا اچھا صلہ ملے گا، اب آپ کے ذہن میں یہ سوال ابھرے گا کہ ایسے لوگوں کو بھی تو ہم نے دیکھا ہے کہ جو پوری دیانت داری اور لگن کے ساتھ محنت کرتے ہیں، یعنی تدبیر کرتے ہیں۔ وہ کیوں ناکام رہتے ہیں، ممکن ہے آپ اسے قسمت کا نام دیں، لیکن میرے نزدیک یہ اس ناکام انسان کی یہ دیانت دارانہ محنت، بدقسمتی نہیں کہلائے گی، بلکہ یہ اس کے اچھے اعمال نامے میں اضافے کا باعث بنے گی۔ جس کا صلہ اسے آخرت میں ملے گا اور اس سے بھی زیادہ ملے گا، جس کی وہ دنیا میں توقع کی ہوئی تھا۔ اس لیے تقدیر کو کوسنا جائز ہی نہیں۔

(س) ادب میں ہیرو بہادر، نڈر، یعنی مردانہ خوبیوں کا مالک ہوتا ہے کیوں؟

(ج) کیا اصل زندگی میں ایسا نہیں؟ بالکل ہیں، لیکن میری کئی کہانیوں میں ڈرپوک، سادہ فطرت اور عام انسان بھی ہیرو کے طور پر آئے ہیں۔

(س) حقیقی زندگی میں ولن ہی ہیرو ہوتا ہے۔ وہ جو ظلم وستم کرتا ہے۔ اس کا بدلہ نہیں ملتا۔ ہیرو یا جس کے ساتھ ظلم ہوا ہو وہ ایسے ہی دنیا سے سدھار جاتا ہے۔

(ج) ہاں، میں اس بات سے متفق نہیں ہوں کہ صرف ہیرو ہی اچھا ہو۔ ولن میں بھی بہت سی باتیں اچھی ہوتی ہیں، اس کا پس منظر بیان کر کے، ہم ولن کے کردار کو بھی سبق آموز بنا سکتے ہیں اور میں نے اپنی کہانیوں میں ایسا کیا بھی ہے جنھیں ہیرو سے زیادہ ولن کو پسند کیا گیا، گھیلی دادا اس کی مثال ہے۔

(س) اردو فکشن کا کیا مستقبل نظر آ رہا ہے آپ کو جبکہ اردو فکشن کے بڑے بڑے نام نواب صاحب کاشف زبیر، اقبال کاظمی وغیرہ ہمیں چھوڑ کر جا چکے ہیں؟

عارضی طور پر خلا ضرور آتا ہے، لیکن میں یہی کہوں گا کہ اردو فکشن کا مستقبل ہے۔

(س) کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ایک ادیب کو گروپنگ میں نہیں پڑنا چاہیے؟

(ج) سو فیصد متفق ہوں، ایک ادیب سب کے لیے ہوتا ہے۔ پھر بھلا وہ کیوں گروپنگ میں پڑے، لیکن یہاں یہ دیکھنے میں آیا ہے، کہ کوئی اگر کسی وجہ سے کسی سے ناراض ہے تو وہ ادیب سے بھی ناراض ہو جاتا ہے، حالاں کہ اس میں اس بے چارے ادیب کا کیا قصور؟ مخالفت کرنے والوں کو اپنے اختلافات اپنے تک محدود رکھنے چاہیے، ادیبوں کو کسی صورت میں نہیں گھسیٹنا چاہیے۔

(س) اردو ادب میں تنقید ایک اصطلاح ہے۔ جس میں کسی بھی تحریر کے محاسن و نقائص پر بحث کی جاتی ہے۔ بہت کم رائٹر دیکھے ہیں جو کھلے دل سے تنقید برداشت کرتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

(ج) اس لیے کہ انہوں نے کہانی خود لکھی ہوتی ہے، اور وہ لکھنا جانتے ہیں، اور ان کے اس لکھنے کے پیچھے برسوں کی محنت اور تجربہ شامل ہوتا ہے جبکہ تنقید نگار کوئی محنت نہیں کرتا، نا ہی ایک ادیب یا شاعر کی طرح کسی تجربے سے

گزرتا ہے، ہاں! اصلاحی پہلو سے کی گئی تنقید بہتر ہوتی ہے۔
(س) اگر آپ پر کوئی تنقید کرے تو آپ کس طرح React کرتے ہیں؟
(ج) تحمل کے ساتھ جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں
(س) کوئی ایسا لمحہ جو چاہتے ہیں واپس آجائے..؟
جب ایک بڑے رسالے میں میری پہلی ہی کہانی نہ صرف چھپی تھی بلکہ بہت پسند بھی کی گئی تھی اور اس سے مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی۔
(س) کوئی ایسا لمحہ جب آپ نے خود کو بہت کمزور محسوس کیا ہو؟
(ج) اپنا محاسبہ کرتے ہوئے میں نے خود کو بہت کمزور محسوس کیا
(س) کبھی خود سے باتیں کی اگر کی تو خود سے باتیں کرنا کیسا لگتا ہے؟
(ج) کرتا ہوں، کبھی اپنی کہانی کا ایک کردار بنتے ہوئے اور کبھی اپنا آپ
(س) یہ ہمارا خیال ہے کہ طاہر مغل صاحب گاؤں کے ماحول میں رزاق شاہد کوہلر صاحب پختون ماحول میں اور آپ تھر یا سندھی ماحول میں کہانیاں لکھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔
(ج) میں ہر قسم کی کہانی لکھنے میں ایزی فیل کرتا ہوں، یہی وجہ ہے کہ میں نے ہر مزاج و ماحول کی کہانیاں لکھیں جو پسند کی گئیں۔ بسا اوقات کوئی ادیب ایک موضوع پر شہرت حاصل کر لے تو پھر وہ اسی کو ہی گھسیٹتا رہتا ہے، تب ایک وقت آتا ہے قاری اس سے بور ہونے لگتے ہیں، ہر قسم کے موضوع کو ٹچ کرنے والا ادیب کبھی قاری کی نظروں میں یکسانیت زدہ نہیں کہلاتا، سدابہار کہلاتا ہے۔
(س) جب آپ کوئی کہانی شروع کرتے ہیں تو کیا مکمل کہانی آپ کے ذہن میں ہوتی ہے یا لکھتے لکھتے کہانی آگے بڑھتی جاتی ہے
(ج) کافی سے زیادہ حد تک کہانی ذہن میں ہوتی ہے، باقی سوچ کر آئیڈاز بنا کر لکھتا جاتا ہوں۔
(س) نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے جبکہ نئے لکھنے والوں پر تنقید کی فائرنگ کروی جاتی ہے. سینئر رائٹرز نئے مصنف کی تحاریر پڑھنا گوارا نہیں کرتے۔؟
آپ کیا کہتے ہیں؟ کچھ بڑے بڑے صرف نام کے بڑے کیوں ہوتے ہیں؟
(ج) میری سوچ یہی ہے کہ نئے لکھنے والے آگے آئیں۔ ان کا راستہ روکنا ادبی خیانت ہے۔ نئے لکھاریوں کو ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ اس معاملے میں ہمارا دور زیادہ سخت گزرا ہے. کوئی راہنمائی نہیں کرتا تھا ہماری۔
(س) سب رنگ ڈائجسٹ کی مقبولیت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں. سب رنگ کے بعد اس جیسا کوئی اور ڈائجسٹ منظر عام پر کیوں نہیں آسکا؟ اور سب رنگ بند کیوں ہوا؟۔
(ج) مجھے اس کا واقعی کچھ خاص علم نہیں، البتہ اس سلسلے میں یہ شنید ضرور رہی ہے کہ جو ٹیم شکیل زادہ صاحب کے ساتھ رہی تھی وہ رفتہ رفتہ ساتھ چھوڑنے لگے تھے۔
(س) یہ انٹرویو ماہنامہ نئے افق کے لیے کیا جا رہا ہے آپ کی کہانیاں بھی نئے افق میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ نئے افق اردو ادب کے افق پر چمک جائے اس کے لیے مالکان کو کون سی تجویزات دیں گے آپ؟۔
(ج) منجھے ہوئے ادیبوں سے لکھوانے کے علاوہ، کچھ تبدیلیاں لائیں، مثلاً کچھ سیکشن مخصوص کہانیوں کے لیے مختص کریں۔؟

(س) نئے افق میں آپ نے کتنی کہانیاں لکھیں۔
(ج) نئے افق میں بھی میں نے بہت سی کہانیاں لکھیں ہیں، ایک سلسلے وار ناول صحرا گرد لکھا، جو بہت مقبول ہوا۔

(س) ایک ادیب کیسے اس معاشرے کی اصلاح کرسکتا ہے۔۔
(ج) اپنی تحریروں کے مثبت نفس مضمون کے ذریعے
(س) کیا کبھی یہ احساس ہوا کہ آپ کے لکھنے سے معاشرے اور لوگوں میں کچھ تبدیلی پیدا ہورہی ہے؟
(ج) تبدیلی کے عمل کو لانا ایک اجتماعی معاملہ ہے۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ ہی یہ احساس دلاتا ہے کہ ان کے اجتماعی عمل سے مثبت تبدیلی آئی ہے یا نہیں، ہاں ایک لکھنے والا اسی اُمید اور عزم سے لکھتا ضرور ہے، جس کے مطمع نگاہ یہ امر ہو کہ اس کی تحریر سے کسی کو اچھا سبق ملے اور وہ اس کا نہ صرف اچھا تاثر لے بلکہ عملی زندگی میں بھی وہ اس کا نمونہ پیش کرے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایک اکائی کی صورت تبدیلی کی طرف ایک قدم بڑھا چکا ہے، اس لیے اچھی اور نیک اُمید پر تائید غیبی بھی مدد کرتی ہے۔
(س) ادب کیا ہے؟ موجودہ دور میں ادیب کا کیا مقام ہے؟ اس معاشرے میں ادیب کو کن کن مشکلات کا سامنا ہے؟
درحقیقت علم وادب سے مقصود اس کا ثمرہ ہے، اور علم وادب کا ثمر اردو اسلوب کے مطابق فن نثر و نظم میں مہارت کا نام ہے، ادب کے معنی اصل میں بلانے اور دعوت دینے کے ہیں (عربی طرز و انداز و اسلوب کے مطابق) ادب کو بھی ادب اسلئے کہتے ہیں کہ وہ لوگوں کو بہتر اوصاف واخلاق کی دعوت دیتا ہے، لیکن اب اس میں اخلاق اور کمرشل ازم دونوں شامل ہو چکے ہیں۔ ادب ایک شعور اور آگہی کا نام ہے، ہمارے معاشرے میں ادیب کا مقام محدود ہے، مشکلات کے بارے میں سچ کہوں گا کہ مجھے نہیں پتہ۔
(س) عموماً دیکھا گیا ہے انسانی المیوں پر لکھا جانے والا ادب ہی مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ دیتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ادب کسی المیہ کا محتاج ہے؟
(ج) المیہ کسی بھی نوعیت کا ہو وہ انسانی جذبات واحساسات پر اثر پذیر ہوتا ہی ہے، مگر یہ کہنا کہ ادب کو مقبول ہونے کے لیے کسی المیے کی محتاجی ہے، غلط ہے، طربیہ بھی ادب نے بھی شہرت حاصل کی ہے۔
(س) عربی ادب پوری دنیا میں جانا مانا جاتا ہے، اور تعلیمی نصاب میں بھی شامل ہے۔ اکی وجہ کلام منظوم ومنثور میں انکی مہارت کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ وہ ادب میں زیادہ تر اپنی تاریخ کا ذکر کرتے ہیں اردو میں ایسا کیوں نہیں؟
(ج) اردو ادب میں تاریخ کو خشک موضوع سمجھا جاتا ہے اور لوگ تاریخ پڑھنے سے کنی کتراتے ہیں اس کی وجہ اردو میں تاریخ کو مخصوص اور محدود کر کے پیش کیا گیا ہے۔ آسان لفظوں میں سمجھ لیں کہ تاریخ کو صرف تاریخ کے "طالب علموں" کے لیے پیش کیا گیا ہے عام قاری کو جان کاری پہنچانے کا مقصد کم ہی ملحوظ رکھا گیا ہے، یہی سبب ہے کہ تاریخ کو اردو میں صرف "مخصوص" افراد کا حلقہ ہی شوق سے پڑھتا ہے، باقی لوگوں کے لیے یہ خشک موضوع ہو گیا ہے۔
(س) اردو ادب کے تنقید نگاروں نے اردو فکشن کو وہ مقام نہیں دیا جو اردو فکشن کا حق بنتا ہے۔ آپ کی نظر میں اس کی کیا وجہ ہے۔۔ کیا فکشن کا معیار ہی اس پائے کا نہیں تھا کہ کسی نوٹس میں آتا یا پھر کوئی اور وجہ ہے؟

(ج) اردو فکشن کو سب رنگ نے عروج دیا اور خوب دیا، جہاں اردو ادب کے جغادری ادیبوں کی کہانیوں کا انتخاب ہی نہیں بلکہ ان کے طویل ناول بھی چھپتے رہے ہیں، شوکت صدیقی کا جانگلوس اس کی مثال ہے، اس کے بعد جاسوسی سسپنس، نیا رخ، نئے افق اور مسٹری ایڈونچر اور بہت سے ڈائجسٹوں کی بھرمار نے ان "ٹھیکیداروں کو پریشان کردیا۔۔۔۔ کیوں کہ خود ان کا اپنا یہ حال تھا کہ ان کے ادبی جریدے ادب کے طالب علموں تک محدود تھے اور کوئی نہیں انہیں خریدتا تھا۔ یا پھر ان کی سرکولیشن اعزازی کاپیوں تک محدود رہتی تھی۔ جبکہ فکشن کو ادب کا قاری بھی اسی ذوق وشوق سے پڑھا کرتا تھا۔۔۔ یہ ایک "ادبی منافقت" تھی۔ ان ٹھیکیداروں کا تو یہ حال تھا کہ یہ لوگ آپس میں چندہ کرکے ادبی نشستوں کا انعقاد کیا کرتے تھے، جو زیادہ چندہ دیتا نشست میں اس کی کہانی یا غزل کی زیادہ تعریف کردی۔ باقی اردو فکشن میں اعلیٰ ادب پیش ہوتا رہا ہے۔ شکیل عادل زادہ، جبار توقیر، نواب صاحب، اظہر کلیم، ایم اے راحت، پرویز بلگرامی، انوار صدیقی، شکیل انجم، محمود احمد مودی، اقلیم علیم، احمد اقبال، اقبال کاظمی، ابوضیا اقبال، ناہید سلطانہ اختر، اقبال پاریکھ، اثر نعمانی۔۔۔ مشتاق احمد قریشی، علیم الحق حقی، غلام قادر، طاہر جاوید مغل، کاشف زبیر، ان سب نے نہ صرف اعلیٰ پائے کا ادب پیش کیا، بلکہ اردو کے قارئین کو "بھاگنے" نہیں دیا۔ وہ ان کی تحریروں کے سحر میں جکڑے رہے، یہی ان کی کامیابی کی سند ہے تو بھلا پھر انہیں ان "ٹھیکیداروں" سے سند لینے کی کیا ضرورت تھی؟؟ انہوں نے تو ابن صفی جیسے عظیم ناول نگار کو بھی تسلیم نہیں کیا، جن کی تحریروں نے چاروانگ تہلکہ مچا رکھا تھا۔

(س) ڈائجسٹس کا آج کل وہ معیار نہیں رہا جو آج سے پانچ سات سال پہلے ہوتا تھا. آپ کی نگاہ میں ڈائجسٹ مالکان کو اپنے اس رویہ پر نظر ثانی کی ضرورت ہے کہ نہیں؟

(ج) بہت سارے ڈائجسٹس نے تو منجھے ہوئے رائٹرز کو معاوضہ دے کر لکھوانے کی بجائے نو آموز لکھاریوں سے سچ بیانیاں ٹائپ کہانیاں لکھوانے کا سلسلہ شروع کررکھا ہے۔ مانا کی نو آموز رائٹرز کی حوصلہ افزائی ہو مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ڈائجسٹس کے معیار کا ہی خیال نہ رکھا جائے ڈائجسٹوں میں آج بھی معیاری لکھا جارہا ہے، فرق ہماری سوچ کا ہوگیا ہے، پہلے قاری جنونیوں کی طرح ڈائجسٹ لے کر بیٹھ جاتے تھے، اور رات سے صبح تک مسلسل پڑھتے رہتے تھے، لیکن اب وہ جلد بازی کرتے ہیں، اس لیے کہ اب انہوں نے انٹرنیٹ پر بھی بیٹھنا ہوتا ہے، اسمارٹ فون پر واٹس اپ چیٹنگ بھی کرنا ہوتا ہے، یوں وہ سرسری انداز میں مطالعہ کرتے ہیں تو انہیں کیا مزہ آئے گا تاہم اس میں فکشن رائیٹروں کا قحط الرجال کا بھی دخل ہے۔ کچھ تو ویسے ہی نہیں رہے، کچھ کو بھاری معاوضہ دینا پڑ رہا تھا، انہیں گھر بیٹھا دیا گیا۔ (ان میں، میں بھی شامل ہوں، جاسوسی سسپنس میں لکھنے سے پہلے میں دیگر ڈائجسٹوں میں لکھتا تھا، اور تب تک لکھتا رہا جب تک وہ میرا معاوضہ "برداشت" کرتے رہے۔۔۔ پھر انہوں نے نو آموز اور تارزین قسم کے رائیٹروں سے لکھوانا شروع کردیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ڈائجسٹ ہی بند ہونے لگے، ڈائجسٹوں پر کاروباری پوائنٹ آف ویو غالب آنے لگا، اگرچہ ڈائجسٹ کمرشل چیز ہے، سرمایہ اس کی مجبوری ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ پرانے اور منجھے ہوئے لکھاریوں کو محض اس لیے نظر انداز کردیں کہ انہیں بھاری معاضہ دینا پڑتا ہے، (جاسوسی سسپنس اور سرگزشت میں اس امر کا خیال رکھا جاتا ہے اور یہی سبب ہے کہ وہ آج بھی معیاری اور اچھا فکشن پیش کررہا ہے) بے شک نئے لکھنے والوں کی بھی حوصلہ افزائی ہونا چاہیے، کیوں کہ ہم بھی تو کبھی نو آموز تھے، لیکن اس کے لیے یہی روایت ہوتی تھی کہ ان کا سیکشن الگ ہوا کرتا تھا اور پرانے منجھے ہوئے رائیٹروں کا سیکشن الگ۔ جیسا کہ آج کل سرگزشت میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد انوار علیگی (اخبار جہاں) سید انور فراز، اقلیم علیم اور پرویز بلگرامی کی مہربانیوں سے میں پھر ابھرا) معاوضے کی بات کرنا ممکن ہے کسی کو بری لگی ہو مگر میں حقیقت کو نہیں چھپاتا، چاہے

میرے ہی متعلق کیوں نہ ہو، بھاری معاوضے کا مقصد لالچ نہیں اپنی اہمیت بھی ہوتا تھا، لیکن بیشتر ادیب ایسے تھے، جن کی روزی روٹی ہی لکھنا لکھانا رہی ہے۔

(س) آپ کی اب تک کی شائع ہونے والی کتابوں کے نام اوران کی سن اشاعت۔ کہانیوں کے مجموعے۔ ان کے نام۔اور یہ کہ سب کتابیں کہاں سے مل سکتی ہیں

(ج) کہانیوں کے مجموعے گردش، (تاجی کہانیاں) اپریل 2002 میں الجابد پبلشرنے گوجرانوالہ سے چھاپا تھا۔ پراسرار کہانیوں کے مجموعے "ویرانہ اور آخری رات القریش پبلیشر لاہور 2005 میں چھپے، خارزار 2007، بدروح 2007 بے پتوار 2005 علی میاں پبلشر لاہور میں چھپے، کھنڈر پراسرار ناول 2005 جاں فروش 2006 قیدی 2008، زنجیر 2007 کرب 2006 آخری بساط 2005، برگ خزاں 2006، زرد چاند 2006 ایندھن 2005، القریش پبلیشر لاہور۔ چاہ تمنا اور کٹھ پتلیاں 2015، باغگل 2001، کمین گاہ، کالازار 2003، حصار، 200، کراچی اردو بازار پبلشرز، صحرا گرد جیلانی پبلشر اوردو بازار کراچی، خوبصورت چڑیل، سکھر پبلشر، گورکھپل کی حویلی، حیدرآباد پبلشر

(س) آپ اپنے ایک دن کی روٹین بتائیں صبح بیدار ہوئے سب سے پہلے کون سا کام کرتے ہیں۔ کیا نماز پنج گانہ ادا کرتے ہیں۔

(ج) روٹین کا کیا بتاؤں بھائی! جو صبح سے میری "روزی" لگتی ہے، وہ نو بجے سے رات تین بجے ختم ہوتی ہے۔ صبح ایک سرکاری ہاسپٹل میں جاب، پھر دوپہر کو دو گھنٹے کا قیلولہ۔ اس کے بعد پرائیوٹ کلینک، رات کو واپسی، پھر کمپوٹر پر اسٹوری رائیٹنگ۔ نماز پڑھتا ہوں، جتنی پڑھ پاتا ہوں۔

(س) میری کافی عرصے سے خواہش تھی کہ آپ کا انٹرویو کرنے کی۔ اللہ کا شکر ہے پوری ہوئی۔ میں آپ کا بے حد مشکور ہوں جو آپ نے اپنا قیمتی وقت دیا۔ کڑوے کسیلے سوالات سنے اوران کے جواب دیئے۔ آپ کی قدر ہمارے دل میں پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ چکی ہے۔ اللہ آپ کو خوش رکھے اور مزید کامیابیاں عطا فرمائے۔ آپ یوں ادب کی خدمت کرتے رہیں۔

(ج) آپ کا بھی شکریہ۔ اچھا دوستو! میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا، میں عارضی طور پر (فیس بک پر) آن ہوا تھا، انتہائی معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ میری کچھ مجبوریاں ہیں، اسی لیے میں یہاں سوشل میڈیا میں نہیں رہ سکتا۔ اسی لیے میں نے اب تک کوئی پوسٹ ہی نہیں لگائی، امید ہے آپ اس بات کو دل پر نہیں لیں گے، آپ کی محبتوں کا مشکور رہوں گا۔ اللہ آپ سب کو خوش رکھے (آمین) ہاں جن کے پاس میرا فون نمبر ہے وہ مجھ سے بلا جھجک کسی بھی وقت بات کر سکتے ہیں۔

دامِ اجل

امجد بخاری

بھاگتی دوڑتی زندگی میں بعض واقعات کچھ ایسے بھی پیش آجاتے ہیں عقل جس کی توضیح پیش نہیں کرسکتی جس کے ساتھ ایسے حادثات ہوتے ہیں وہ تو وہ بلکہ سننے والا بھی اس پر یقین نہیں کرتا۔

معروف ڈرامہ نگار ٹی وی پروڈیوسر امجد بخاری کے قلم سے نئے افق کے قارئین کے لیے ایک پراسرار تحریر۔

ٹرین میں ایک خاتون کے اغوا سے شروع ہونے والے ڈرامے کی روداد

ٹن ٹن ٹن...... رات کی تاریکی اور سناٹے میں گونجنے والی آواز نے صور اسرافیل جیسا کام کیا اور زندگی جاگ اٹھی، چند لمحے قبل جہاں موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی اب وہاں یکایک چہل پہل نظر آنے لگی، ایک عجیب سی بھاگ دوڑ شروع ہوچکی تھی...... گڑگڑاہٹ کی تیز آواز سن کر اس نے چونک کر اپنی داہنی جانب دیکھا تو دو آدمی ایک ٹھیلا نما گاڑی کو دھکیلتے ہوئے نظر آئے جو کچھ ہی لمحوں میں اس کے قریب سے گزر کر آگے بڑھ گئے۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر نیم تاریک ماحول میں بغور دیکھتے ہوئے منظر کو سمجھنے کی کوشش کی تو اندازہ ہوا کہ اس ٹھیلا نما گاڑی پر خاصا سامان بھی لدا ہوا تھا۔ گاڑی کے آہنی پہیے فرش پر رگڑ کھا کر گڑگڑاہٹ کی یہ بے ہنگم آواز پیدا کرنے کا باعث بن رہے تھے، جسے سن کر وہ اس طرف دیکھنے پر مجبور ہوا تھا۔

”یار وہاں پہنچ کر سوچیں گے...... کچھ نہ کچھ بندوبست تو ہو ہی جائے گا۔“

اس کی نظریں ایک بار پھر سنائی دینے والی آواز کے تعاقب میں اپنے بائیں جانب اٹھ گئیں اور وہ تین چار آدمی آپس میں باتیں کرتے ہوئے اس کے قریب سے گزرتے چلے گئے۔ ٹھیک اسی لمحے زمین میں ہلکا ہلکا ارتعاش سا پیدا ہونے لگا، یوں جیسے زلزلے کے بعد کے آفٹر شاکس آنے لگے ہوں، اس نے اپنی پوری حسیات کو سمیٹ کر اس صورت حال پر غور کرنے کی کوشش کی لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر جب زمین کی لرزش اور اس کے وجود میں پیدا ہوتی وائبریشن مزید بڑھتی چلی گئی تو اس نے چاروں طرف نظریں گھمائیں۔ جب کچھ نظر نہیں آیا تو پلٹ کر اپنی عقبی جانب دیکھنے لگا، دور بہت دور دو روشن نقطے سے ہوا میں معلق نظر آئے، جن کا حجم آہستہ آہستہ بڑھتا چلا جارہا تھا اور پھر چند ہی لمحوں کے بعد وہ دیوہیکل عفریت اس کی نظروں میں واضح ہوچکا تھا۔

اس کے اردگرد پھیلی افراتفری میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوچکا تھا، بے ہنگم بھاگ دوڑ کے ساتھ ساتھ اب اس کے کانوں میں بھانت بھانت کی آوازیں بھی گونجنے لگی تھیں۔

”گرم انڈے...... چائے والا...... چائے گرم...... برگر والا...... انڈا برگر...... شامی برگر...... نان پکوڑے۔“

اس نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے بینچ پر پھیلی اپنی ٹانگوں کو سمیٹا، کمبل کو گھسیٹ کر اپنے اردگرد اچھی طرح لپیٹا اور پھر ڈھیلے ڈھالے سے انداز میں اپنے اکلوتے ہینڈ کیری کی جانب متوجہ ہوگیا۔

چند ہی لمحوں کے بعد اسے گھسیٹتے ہوئے وہ بھی لوگوں کے اس ہجوم کا حصہ بن گیا۔ اب وہ خراماں خراماں چلتا ہوا

پلیٹ فارم پر رکی ٹرین کی سمت بڑھ رہا تھا۔
جوں ہی وہ اپنے کمپارٹمنٹ کے دروازے پر پہنچا کوئی چیز پچھاک کی سی آواز کے ساتھ اس کی ٹانگوں سے آ ٹکرائی، وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹا اور بغور اس بلائے ناگہانی کی سمت دیکھنے لگا جو ایک خاصا بڑا اسٹری بیگ تھا۔ ابھی اس کا یہ جائزہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک چیختی ہوئی سی نسوانی آواز اس کی سماعتوں سے آن ٹکرائی۔

''اے ہے...... اب اونٹ کی طرح منہ اٹھائے ادھر ہی کھڑے رہو گے یا راستہ بھی دو گے؟ پتہ نہیں اس ملک کے لوگوں کو جلدی کس بات کی ہوتی ہے...... موئے منہ اٹھائے گھسے چلے آتے ہیں...... یہ بھی نہیں سوچتے کہ پہلے اترنے والوں کو تو موقع دیں......''

وہ حیرت سے منہ پھاڑے اس عجیب الخلقت بڑھیا کی جانب دیکھنے لگا جو پہلے اس کی ٹانگوں اور اب بے تکان اس کی سماعتوں کی خبر لے رہی تھی۔

لیکن وہ اس کی حیرانی سے یکسر بے نیاز رہتے ہوئے ایک بڑے اٹیچی سے گتھم گتھا دکھائی دی۔ بدقت تمام اس نے اٹیچی کو دھکیل کر نیچے اتارا جو موصوفہ کے قد سے کچھ ہی چھوٹا تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور پھرتی سے اٹیچی کو دھکیل کر دروازے کے سامنے سے دور ہٹا کر سیدھا بھی نہیں ہوا تھا کہ بڑھیا کی دہاڑ سنائی دی۔

''اے مردوے اب ادھر ہی اچھلتا رہے گا یا ہاتھ پکڑ کر نیچے اترنے میں بھی مدد دے گا؟ ڈھٹائی تو دیکھو...... بزرگوں کا تو کوئی احترام ہی نہیں آج کل کی نسل میں......''

وہ ہڑبڑا کر آگے بڑھا پھر ہاتھ پکڑ کر دنیا کے اس آٹھویں عجوبے کو نیچے اترنے میں مدد فراہم کرنے لگا۔

''ہاہ'' کی ایک کریہہ آواز نکالتے ہوئے بڑھیا نے پلیٹ فارم پر قدم رنجہ فرمایا اور وہ منہ کے بل نیچے گرتے گرتے بچا۔ کیوں کہ اس کے اندازے کے برعکس اس کثیر الجثہ بڑھیا کا وزن یقیناً پانچ سے چھ من کے لگ بھگ رہا ہوگا۔ اس نے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالا اور جھٹکا آجانے کے باعث تکلیف کے شکار اپنے بازو کو ایک دو بار فضا میں لہرانے کے بعد اپنے اکلوتے ہینڈ کیری کو مضبوطی سے پکڑا اور جان بچی سو لاکھوں پائے کے مصداق لپک کر بوگی میں گھس گیا۔ اور پھر اندر داخل ہونے کے بعد اسے جن حالات کا سامنا کرنا پڑا یہ اس کے لئے ہرگز غیر متوقع نہیں تھے۔ کیونکہ ملک کا ہر شہری ریلوے کے اس نظام سے بہ طریق احسن واقفیت رکھتا ہے۔ وہ فرش پر آڑے ترچھے بکھرے ہوئے ناجائز قابضین سے خود کو بچاتے اور پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے کسی نہ کسی طرح اپنی سیٹ تک پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ جو معجزانہ طور پر خالی ہی تھی اور یوں وہ مزید بدمزہ ہونے سے بچ گیا۔ اس نے ہینڈ کیری سیٹ کے نیچے دھکیلا اور دھم سے برتھ پر گر کر ایک گہری اور طویل سانس اپنے پھیپھڑوں میں اتاری اب وہ بالکل مطمئن تھا، یوں جیسے ابھی ابھی پانی پت کی لڑائی جیت کر آیا ہو۔

حواس قدرے بحال ہوئے تو اس نے اپنے ساتھی مسافروں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اس کی برتھ سب سے نیچے والی تھی جب کہ سینٹر والی اور اوپر والی دونوں برتھیں خالی تھیں۔ سامنے کی سیٹ پر دو دیہاتی ٹائپ خواتین بیٹھی آپس میں گپیں لڑا رہی تھیں۔ اس نے یہ تو سن رکھا تھا کہ خواتین میں ایک مخصوص حس بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے کہ اگر کوئی مرد نظریں جما کر دیکھے تو انہیں فوراً محسوس ہو جاتا ہے لیکن یہ حس عمر کے اس حصے میں بھی اتنی فعال ہوتی ہے اسے اس بات کا یکسر اندازہ نہ تھا۔ یہ انکشاف اس پر تب ہوا جب دونوں خواتین میں سے ایک بڑی بی نے حیرت انگیز طور پر اپنا آپسی سلسلہ کلام منقطع کرتے ہوئے اس کی جانب دیکھا اور پھر فوراً ہی سوال بھی داغ دیا۔

''پتر! نواب شاہ جاناں ایں؟''

بڑی بی کے اس اچانک سوال پر اس نے قدرے گڑبڑا کر جواب دیا۔

''جی نہیں! فیصل آباد جا رہا ہوں۔''

بڑی بی نے زور زور سے یوں سر ہلایا جیسے پوری بات سمجھ گئی ہوں۔ پھر قدرے توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوئیں۔

''پتر! ایہہ فیصل آباد نواب شاہ توں...... پہلے آوے گا یا بعد وچ؟''

اور وہ بے ساختہ آنے والی ہنسی کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

''جی اگر گاڑی ٹھیک چلی تو دو سے تین گھنٹے میں آجائے گا نواب شاہ...... میں تو کل صبح جا کر پہنچوں گا

کہیں۔“
بڑھیا نے ایک بار پھر زور سے سر ہلایا اور کہنے لگی۔
”ہلا پتر! نواب شاہ آوے تے مینوں دسیں!“
اس نے بڑھیا کی بات سنی اور پھر پوری سعادت مندی سے جواب دیا۔
”جی ضرور۔“
ٹھیک اسی لمحے خوش بو کا ایک خوش گوار جھونکا اس کے نتھنوں سے ٹکرایا جس نے اسے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا اور پھر اس کا پلٹ کر دیکھنا ہی تھا کہ گاڑی میں بہار آ گئی۔ خوب صورت تراش خراش اور جدید طرز کے سلے ہوئے پنک سوٹ میں ملبوس وہ شعلہ جوالہ جس کی اپنی رنگت بھی سرخی اور سفیدی کا حسین امتزاج لیے ہونے کی وجہ سے پنک دکھائی دے رہی تھی اپنی پوری آن بان کے ساتھ مجسم کھڑی تھی اور وہ وفورِ شوق و حیرت کے ملے جلے تاثرات سے مغلوب ہو کر دیدے پھاڑے اسے دیکھے چلا جا رہا تھا۔ وقت تھم سا گیا تھا اور اس کا پورا وجود بالکل ہلکا پھلکا ہو کر جیسے پرستان کی فضاؤں میں پرواز کرنے لگا لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکی۔ ادھر ہلکا سا جھٹکا لگنے کے بعد گاڑی نے پلیٹ فارم پر رینگنا شروع کیا ادھر اس کے سرخ یاقوتی لب وا ہوئے تو بارش کے پہلے قطرے کی مانند اس کی نقرئی آواز نے اپنے سفر کا آغاز کیا جس کا اختتام بالآخر اس کی سماعتوں پر ہوا۔
”آپ! پلیز ٹانگیں سمیٹیں گے...... تاکہ میں اپنی سیٹ تک پہنچ سکوں؟“
لہجے کا تاثر یقیناً سوالیہ ہی تھا...... اور وہ جو پاؤں پسارے چوڑا ہوا بیٹھا تھا جلدی سے سیدھا ہو گیا۔
”بہت شکریہ!“
مترنم آواز نے کانوں میں جلترنگ سے بجا دیے اور وہ پھر ماتھے پر بکھری لٹ کو جھٹکا دے کر ایک انداز کے ساتھ سیدھا کرتے ہوئے اس کے قریب سے گزری پھر دونوں خواتین کے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولی۔
”سوری! لیکن...... یہ سیٹ میری ہے، آپ اپنی سیٹوں پر جائیے۔“
بڑی بی نے خشمگیں نظروں سے اس قتالہ عالم کو گھورا پھر برا سا منہ بناتے ہوئے بولیں۔
”دھیئے توں کہڑا گھروں لے کے آئی ایں...... سیٹاں تے گڈی دیاں نیں۔“
خوب رو لڑکی نے حیرت سے بڑی بی کی جانب دیکھا پھر متانت سے بولی۔
”جی! میرے کہنے کا مطلب تھا کہ...... یہ سیٹ میرے نام پر بک ہے، آپ نے بکنگ نہیں کروائی؟“
جملے کا اختتام سوالیہ اور تخاطب کا ہدف بدستور وہ ہی بڑی بی تھیں۔
”لے کاہدی بکنگ......؟ ایہہ تے نواب شاہ کھڑا اے...... میں کہڑا لہور جاناں ایں...... تھوڑا صبر کر لے دھیئے۔“
خوب رو حسینہ نے برا سا منہ بناتے ہوئے جیسے بڑی بی کے جملے کو ہضم کیا پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ گاڑی اپنی پوری رفتار سے دوڑی چلی جا رہی تھی اور کھڑکی سے آنے والی ہوا کے شریر جھونکوں کو بھی جیسے مصروفیت مل گئی، وہ پروانہ وار اس کے بالوں کی لٹوں پر نثار ہونے لگے۔ چھکا چھک چھکا چھک کے ردھم پر رقص کرتی اس کی زلفوں کا یہ نظارہ اتنا دل فریب تھا کہ وہ مسحور ہو کر رہ گیا۔ ہوا سے اٹھکیلیاں کرتے ہوئے یہ شریر جھونکے وقتاً فوقتاً پھسل کر اس کی طرف آتے تو اس پری پیکر کے وجود سے چرا کر لائی جانے والی خوشبو سے اس کے مشامِ جاں کو معطر کر جاتے اور اس کے دل میں بے اختیار یہ خواہش انگڑائیاں لینے لگتی کہ کاش وہ بھی ہوا کا ایک جھونکا ہوتا۔ یہ منظر اتنا کیف آگیں اور دل کش تھا کہ وہ پلکیں جھپکانا تک بھول گیا لیکن وہ اپنی اس محویت کو زیادہ دیر تک برقرار نہیں رکھ پایا۔ کیونکہ سنائی دینے والی آواز نے اسے بے دردی سے گھسیٹ کر تصورات کی دنیا سے باہر لا پھینکا تھا۔ اس نے ناگواری سے اس شخص کی جانب دیکھا جو اس وقت اسے بالکل زہر لگ رہا تھا لیکن وہ اس کے جذبات و احساسات سے بے خبر اپنی ہی ہانکے چلا جا رہا تھا۔
”تکیہ چادر والا...... تکیہ چادر!“
اس نے گھور کر اسے دیکھا تو وہ براہِ راست اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔
”سر! تکیہ چادر چاہیے؟“
”کتنے پیسے لیتے ہو؟“
اس نے برا سا منہ بنا کر دریافت کیا تو وہ بولا۔
”سر! صرف ساٹھ روپے...... صبح آپ کے اٹھنے پر واپس لے جاؤں گا۔“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

بات اپنے آرام کی تھی اس لیے اس نے ساٹھ روپے ادا کر کے تکیہ اور چادر لے کر سیٹ پر رکھے اور لڑکی کی جانب متوجہ ہوا جو چند لمحوں تک ان دونوں کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد اب ایک بار پھر کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی اور وہ اسے۔ کافی دیر تک وہ اس منظر سے لطف اندوز ہوتا رہا لیکن لڑکی نے سرے سے اس پر کوئی توجہ نہ دی، شاید وہ اپنے ہی کسی خیال میں گم تھی۔ طویل اور صبر آزما انتظار کے بعد جب وہ مایوسی کا شکار ہو گیا اور قدرے تھکاوٹ بھی محسوس کرنے لگا تو اس نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے تکیہ کھڑکی والی سائیڈ پر لگایا اور پھر چادر اوڑھ کر لیٹ گیا لیکن اس کی ہر سوچ کا مرکز ومحور اب بھی وہ لڑکی ہی تھی جو اس کی اندرونی کیفیات سے بے خبر اب بھی بے پروا انداز میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

خیال اور خواب کے معاملے میں انسان شروع سے خود کفیل رہا ہے۔ یہ وہ نعمت ہے کہ جس کے بارے میں کوئی دوسرا شخص بھی کچھ جان ہی نہیں پاتا چاہے آپ کچھ بھی سوچتے رہو، کسی کے بارے میں کوئی بھی خیال قائم کرو۔ جس طرح آپ کے خیال کو کوئی نہیں پڑھ سکتا اسی طرح آپ کے خواب بھی صرف اور صرف آپ کی ذاتی ملکیت اور اپنی جاگیر ہوتے ہیں۔ کچھ بھی دیکھو، مجال ہے جو کوئی روک پائے۔ سو وہ بھی خیالوں کے مدو جزر میں ڈوبتے ابھرتے اور بہتے بہتے نا جانے کب خوابوں کے کھلے سمندر میں جا پہنچا اسے اندازہ ہی نا ہو سکا۔ یہاں ہواؤں میں بسی ہوئی مسحور کن مہک، اور ہر طرف نظر آنے والا، وہ ہی ایک چہرہ ...... جسے دیکھتے دیکھتے وہ نیند سے ہم آغوش ہوا تھا۔ نگاہوں کا دائرہ وسیع ہوا ۔ زندگی جیسے صرف دو انسانوں پر محیط تھی، تاحدِ نگاہ پرسکون سمندر اور اس کے نیلگوں پانی پر تیرتے وہ دو انسانی وجود جو آپس میں چہلیں کرتے آگے ہی آگے بڑھے چلے جا رہے تھے۔

زندگی مسکرا رہی تھی...... کیوں کہ وہ حسینہ اب جل پری کا روپ دھارے اس کے پہلو میں تھی۔ اس نے احساس ملکیت سے مغلوب ہو کر سرشاری سے اس کی جانب دیکھا۔ ٹھیک اسی لمحے نسوانی وجود نے ایک جھٹکا سا کھایا اور پھر ایک ہلکی سی چیخ کی آواز نے تو جیسے اس کا کلیجہ ہی چھلنی کر دیا۔ نسوانی وجود اب سمندر کی تہہ کی جانب کھنچا چلا جا رہا تھا۔ وہ تڑپ کر اس کے پیچھے لپکا تو اس کا سر کسی سخت سی چیز سے جا ٹکرایا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں، پھر اگلے چند ہی لمحوں میں اسے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا سر دونوں کھڑکیوں کے درمیان بنی اس ٹیبل سے ٹکرایا ہے جہاں مسافر دورانِ سفر پانی کا کولر اور دیگر چھوٹی موٹی اشیا خورد و نوش رکھتے ہیں۔

"چھوڑو مجھے...... ذلیل...... کمینے"

ایک سریلی لیکن گھٹی گھٹی سی آواز سنائی دی تو اس نے گھبرا کر ادھر دیکھا۔ چٹاخ کی ایک زناٹے دار آواز بلند ہوئی اور اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ جو کچھ دکھائی دیا اسے دیکھ کر اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ جہاں جذبہ ہمدردی عود کر آیا وہیں اسے ان دونوں آدمیوں پر شدید غصہ بھی آیا...... کیوں کہ وہ خوب صورت لڑکی اس وقت کسی معصوم فاختہ کی مانند ان دونوں تنومند آدمیوں کی گرفت میں بری طرح پھڑ پھڑا رہی تھی جو اسے گھسیٹتے ہوئے کہیں لے جانے کی کوشش کر رہے تھے جب کہ وہ کمزور اور ناتواں لڑکی بساط بھر احتجاج مسلسل جاری رکھے ہوئے تھی۔ اس کا پارہ ایک دم ہائی ہو گیا اور خون جیسے رگوں میں ٹھوکریں مارنے لگا۔

"اے...... چھوڑو اسے...... کون ہو تم لوگ؟"

اس نے کڑک کر کہا تو ان میں سے ایک آدمی سانپ کی سی پھرتی سے واپس پلٹا اور پھر ایک کھردری اور پتھریلی آواز سنائی دی۔

"اپنے کام سے کام رکھو...... ورنہ کسی بڑے سے اخبار میں...... چھوٹی سی خبر بن کر رہ جاؤ گے۔"

سانپ جیسی آنکھوں والے اس لمبے تڑنگے شخص کے چہرے پر فرنچ کٹ داڑھی اور لہجے میں سانپ کی سی پھنکار تھی، جب کہ لہجہ برف کی طرح سرد اور منجمد کر دینے والا تھا لیکن وہ ایک ایسی لڑکی کو بے یار و مددگار کیسے چھوڑ سکتا تھا؟ جسے دیکھتے ہی اس کے پورے وجود میں بجلیاں سی دوڑ جاتی تھیں۔ سو اس نے اپنے زمین بوس ہوتے حوصلے کو سنبھالا دیا اور اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"رک جاؤ...... تم کسی کے ساتھ ایسے کیسے......"

لیکن ابھی وہ پوری طرح اٹھ پایا تھا نا ہی اس کا جملہ مکمل ہوا تھا کہ اچانک وہ شخص بجلی کے کوندے کی طرح لپک کر اس پر آ رہا۔ سوچنے سمجھنے کا کوئی موقع دیے بغیر ہی وہ اسے رگیدتے ہوئے دوبارہ سیٹ پر گرا چکا تھا اور پھر کب

تکیہ اس شخص کے ہاتھوں اور پھر ہاتھوں سے اس کی ناک اور چہرے پر آ جما اسے اندازہ ہی نا ہو سکا۔ آخری احساس یہ ہی تھا کہ دو ہاتھوں نے اس کی ٹانگیں قابو کر رکھی ہیں اور دو ہاتھ اس کے چہرے پر تکیہ رکھے پوری قوت سے دبا رہے ہیں۔ باوجود تڑپنے اور پھڑکنے کی کوشش کے، وہ کچھ بھی نا کر پایا اور پھر اس کا ذہن گہرے اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔

تاریکی...... ایک لامحدود تاریکی...... اور گہرا سکوت!

پھر کہیں دور ایک جگنو سا ٹمٹمایا جو اندھیروں کا سینہ چاک کرتے ہوئے اس کی جانب بڑھنے لگا۔ مدھم سی یہ روشنی جوں جوں قریب آتی گئی اس کا حجم بڑھتا چلا گیا۔ اور پھر جب روشنی آنکھوں میں چبھنے لگی تو وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ گاڑی کی کھڑکیوں میں سے چھن چھن کر آنے والی سورج کی یہ روشنی چیخ چیخ کر دن نکل آنے کا اعلان کر رہی تھی۔ ویسے بھی ہر رات کے بعد دن اور تاریکی کے بعد روشنی کا وقوع پذیر ہونا قدرت کا قانون ہے۔ اس نے جب خود کو لمحہ موجود کا حصہ بنایا تو اندازہ ہوا کہ گاڑی اپنی پوری رفتار سے اڑی چلی جا رہی تھی۔ سامنے کی سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر آدمی اور ایک برقع پوش خاتون براجمان تھے۔ اس کی پھسلتی ہوئی نظریں ان کے چہرے پر سے ہوتے ہوئے کھڑکی والی سائیڈ میں خالی نشست پر رکھے اس پنک پرس سے جا الجھیں۔ ان کے ذہن میں ایک چھناکا سا ہوا اور گزرے ہوئے واقعات یکے بعد دیگرے کسی فلم کی طرح چلنے لگے۔ ذہن کے پردہ اسکرین پر نمودار ہونے والی یہ جلتی بجھتی شکلیں اسے گزشتہ رات کا قصہ سنا رہی تھیں۔ ٹرین میں اس خوب صورت لڑکی کی آمد، اس سے ہم کلامی، پھر کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بے اعتنائی کا مظاہرہ، اس کا خیالوں میں ڈوبنا اور پھر اسے ہی سوچتے ہوئے سو جانا۔ آنکھ کھلنے پر دو گیم آدمیوں کا نظر آنا، گھسیٹ کر لڑکی کو لے جانے کی کوشش کرنا، اس کا صدائے احتجاج بلند کرنا اور پھر ان کا اس پر حملہ آور ہونا۔ ایک کے بعد ایک اسے تمام تر واقعات یاد آتے چلے گئے۔ اس نے حیرت سے ایک بار پھر سامنے بیٹھے ادھیڑ عمر آدمی اور برقع پوش خاتون کا جائزہ لیا۔ اس کے اور ان کے علاوہ آمنے سامنے کی دونوں سیٹوں پر کوئی ذی نفس موجود نا تھا۔ سامنے نظر آتی سنگل سیٹوں پر بھی دو اجنبی چہرے تھے۔ کھڑکی سے آتی تیز دھوپ یہ مژدہ سنانے کے لیے کافی تھی کہ نیند یا پھر بے ہوشی کا یہ عرصہ خاصا طویل رہا تھا، کیوں کہ اب رات کی جگہ دن لے چکا تھا۔ اس نے دزدیدہ نظروں سے ایک بار پھر پنک کلر کے اس پرس کی جانب دیکھا جو گزری ہوئی رات کی کہانی سنانے اور اس کی یادداشت واپس لانے کا باعث بنا تھا۔ یقیناً کھڑکی والی اس سیٹ کے خالی رہ جانے کا سبب بھی وہ پرس ہی رہا ہوگا۔ جو رات کو وقوع پزیر ہونے والی اس واردات کا جیتا جاگتا ثبوت تھا۔ لازمی سی بات تھی کہ پنک کپڑوں والی حسینہ اس دھینگا مشتی اور زور زبردستی کی وجہ سے اپنا وہ میچنگ پرس نہیں لے جا پائی تھی۔ اس نے ایک بار پھر آپس میں گفتگو کرتے ہوئے اس ادھیڑ عمر شخص اور برقع پوش خاتون کی جانب دیکھا اور پھر ہاتھ بڑھا کر وہ پرس اٹھا لیا، ادھیڑ عمر شخص نے گھور کر اس کی جانب دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں، پھر وہ دوبارہ برقع پوش خاتون سے گپیں لگانے میں مصروف ہو گیا۔

اس نے تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل کو سنبھالا اور پھر پرس کھول کر اس کا پوسٹ مارٹم کرنے لگا۔ میک اپ کا سامان، ایک چھوٹا سا پرفیوم، ایک کی رنگ اور ریزگاری کے علاوہ کچھ نظر نہیں آیا۔ اس نے پرس کی اندرونی سائیڈ میں لگی زپ کو کھولا تو ہزار ہزار کے تین نوٹ، ریلوے ٹکٹ اور چند وزٹنگ کارڈ برآمد ہوئے۔ اس نے ٹکٹ کھول کر اس پر نظریں دوڑائیں اور پھر ٹکٹ پر لکھے پسینجر نیم کو زیر لب دہرایا۔

''نائلہ راجا!''

پھر اس نے بے صبری سے وزٹنگ کارڈ نکالے جنہیں دیکھ کر اسے یک گونہ تسلی محسوس ہوئی۔ کیوں کہ تمام وزٹنگ کارڈ ایک ہی ڈیزائن میں تھے اور ان پر لکھا ایک ہی نام اس کی نظروں کے سامنے جھلملا رہا تھا۔

''نائلہ راجا!''

اور نام کے نیچے ایک ایڈریس بھی موجود تھا۔ جسے دیکھ کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ لڑکی خاصی ماڈرن اور پڑھی لکھی نظر آ رہی تھی، یقیناً خاصی بولڈ بھی رہی ہوگی جس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ حیدر آباد سے فیصل آباد تک کا ٹکٹ لے کر ٹرین پر سوار ہوئی تھی اور حیران کن بات یہ تھی کہ اتنا لمبا سفر وہ اکیلے طے کرنا چاہتی تھی، یہ الگ بات کہ وہ اپنے اس

ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکی اور راستے میں ہی ایک عجیب و غریب حادثے کا شکار ہو گئی۔

مزید حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ پرس میں اپنے وزٹنگ کارڈز تو رکھے ہوئے تھی لیکن ان کارڈز پر کوئی فون نمبر، ای میل یا فیس بک آئی ڈی، یہاں تک کہ کوئی آفس ایڈریس، کسی فرم یا ادارے کا نام تک موجود نہ تھا، کارڈ پر صرف نام اور گھر کا ایڈریس درج تھا۔ وہ خاصا الجھ کر رہ گیا کیوں کہ اس کے خیال کے مطابق وزٹنگ کارڈز کی ضرورت صرف ان لوگوں کو پڑا کرتی ہے جو کسی نا کسی بزنس سے منسلک ہوں یا کسی فرم یا ادارے کے ورکرز ہوں۔ صرف گھر کا ایڈریس دے کر وزٹنگ کارڈ بنوانا چہ معنی دارد؟

اپنی وضع قطع اور حلیے کے اعتبار سے وہ کوئی خالصتاً مشرقی اور گھریلو لڑکی بھی نہیں لگی تھی۔ پھر کیا وجہ تھی کہ کارڈ پر صرف نام اور گھر کا ایڈریس تھا...... اور اگر اس بات کو ذہن سے جھٹک بھی دیا جائے تو گزشتہ رات وقوع پذیر ہونے والے چکر کو کس خانے میں فٹ کرے؟ اسے اس بے رحمانہ انداز میں گھسیٹ کر لے جانے والے کون لوگ تھے؟ کوئی خاندانی یا کاروباری دشمنی؟ یا کوئی اور چکر؟ آخر کیا ماجرا تھا؟ دماغ تھا کہ چرخ چوں بن کر رہ گیا تھا لیکن مجال ہے کہ کسی بھی بات کی کوئی سمجھ آ سکے...... اس کی یہ ذہنی جمناسٹک مزید نہ جانے کتنی دیر تک جاری رہتی لیکن ایک ہلکے سے جھٹکے کے بعد سنائی دینے والے ایک بے ہنگم شور نے اس کے غور و خوض کے تسلسل کو آنِ واحد میں توڑ ڈالا اور اسے خیال سے حقیقت کی دنیا میں واپس لا پھینکا۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر رک چکی تھی اور اشیائے خورد و نوش کی تجارت کرنے والے نرالے سوداگران اس ہاہاکار کی بنیاد تھے۔ جس نے اس کے خیالات کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ اور ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا تھا کیوں کہ کھڑکی سے باہر جھانکتے ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنی منزل پر پہنچ چکا ہے۔ اس نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے ایک انگڑائی لے کر اپنے وجود کو تازہ دم کیا پھر جھک کر سیٹ کے نیچے سے اپنے ہینڈ کیری کو باہر نکالا اور پھر ایک ہاتھ سے ہینڈ کیری اور ایک ہاتھ میں ''پنک پرس'' سنبھالتے ہوئے اس نے اپنی سیٹ اور ان ساتھی مسافروں پر الوداعی نظر ڈالی جو نجانے کب اس کے شریکِ سفر بن گئے تھے۔ وہ پلٹ کر آہستہ قدموں سے چلتا ہوا کمپارٹمنٹ کے دروازے تک پہنچا۔ اور پھر اگلے ہی لمحے اس کے قدموں نے فیصل آباد کے پلیٹ فارم کا بوسہ لیا۔

ذرا سی دیر کے لیے رک کر اس نے ادھر ادھر دیکھا پھر فضا میں رچی بسی اس جانی پہچانی مہک کو ایک طویل سانس کے ذریعے اپنے پھیپھڑوں تک منتقل کیا، جو اسے اپنائیت کا احساس دلا رہی تھی۔ یہ مہک اور یہ فضا میں اس کے لیے نئی نہیں تھیں۔ یہ اس کا اپنا شہر تھا اور اپنے شہر کی تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ یہاں کی ہر چیز اس کی جانی پہچانی تھی، اسی احساسِ طمانیت سے سرشار خراماں خراماں چلتے ہوئے وہ اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکل آیا۔ اب اس کی متلاشی نظریں ادھر ادھر گردش کرتے ہوئے کسی معقول رکشا ڈرائیور کی تلاش میں تھیں جو بالآخر اسے نظر آ ہی گیا۔ اس نے اشارے سے اسے اپنی جانب بلایا پھر کچھ ہی دیر کے مختصر سفر کے بعد وہ اپنی گلی کے کونے پر جا اترا جہاں سے صرف چند ہی قدموں کی دوری پر اس کا وہ گھر موجود تھا جو اس کے لیے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھا۔ اس نے جیب سے چابی نکالی اور تالا کھولتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ گھر کے در و دیوار سے لپٹی اداسی اسے دیکھ کر وجد میں آ گئی اور اپنے واحد مکین کی واپسی پر اسے خوش آمدید کہنے لگی۔ جب کہ فرش پر جمی گرد اس کے قدموں پر صدقے واری ہونے لگی جو صرف فرش پر ہی نہیں بلکہ گھر میں رکھی ہر چیز پر جم کر ایک دبیز چادر کی سی صورت اختیار کر چکی تھی۔ اس نے ایک خوش گوار مسکراہٹ کے ساتھ اپنے اس استقبال کو سراہا اور پھر اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا۔ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا، ہینڈ کیری کو مسہری کے نیچے دھکیلا، پھر دھم سے مسہری پر گرا تو گرد کا ایک طوفان سا اٹھا اور اس کی بلائیں لینے لگا، جس کے نتیجے میں اس کے حلق سے بے اختیار ایک چھینک برآمد ہوئی۔ وہ دھیرے سے ہنسا اور پھر اس کی بڑبڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔

''اوہو...... اب اتنی بے صبری بھی کیا؟ آ گیا ہوں تو کچھ سوچتا ہوں تمہارے بارے میں بھی۔''

چند لمحے ہاتھ کی مدد سے اڑتی ہوئی دھول کو اپنی ناک سے دور رکھنے کی کوشش کی پھر اٹھ کر واش روم میں گھس گیا۔ پندرہ سے بیس منٹ کے بعد وہ دوبارہ باہر نکلا تو نہا دھو کر فریش ہو چکا تھا۔ چند لمحے رک کر اس نے ایک نگاہ

غلط انداز کمرے کی حالتِ زار پر ڈالی اور پھر باہر نکل گیا۔
لیکن باہر نکلنے سے پہلے وہ اس پنک پرس کو اٹھانا نہیں بھولا تھا۔ گھر کو مقفل کرنے کے بعد اس نے ایک رکشا کو روکا اور پھر چند ہی لمحوں کے بعد وہ نشاط آباد روڈ کی جانب عازم سفر تھا۔ جہاں کا ایڈریس وہ پرس میں سے برآمد ہونے والے وزٹنگ کارڈ پر سے پڑھ کر اچھی طرح ذہن نشین کر چکا تھا۔ پندرہ سے بیس منٹ کے صبر آزما سفر کے بعد وہ رکشا سے اتر گیا۔ بھٹا اسٹاپ اور پھر اس سے آگے کا سارا محلہ کراس کرنے کے بعد وہ جس علاقے میں آن وارد ہوا تھا یہ شاید کوئی نئی آبادی تھی۔ وہ گھروں پر لکھے نمبروں کو پڑھتا ہوا بالآخر اس دروازے تک پہنچ گیا جس کے داہنی سائیڈ کے ستون پر 34-B لکھا ہوا تھا۔ اس نے ڈوربیل کے بٹن کو پش کیا اور انتظار کرنے لگا۔ لیکن کافی دیر انتظار کے بعد بھی جب کوئی نہیں آیا تو اس نے دوبارہ بٹن پر ہاتھ رکھا اور خاصی دیر تک دبائے ہی رکھا۔ اس بار نتیجہ خاطر خواہ نکلا اور دروازہ ایک جھٹکے سے کھلتا چلا گیا۔ اندر سے ایک دبلا پتلا سا شخص برآمد ہوا تھا۔ گندمی رنگت، کھڑی ناک، بڑی بڑی آنکھیں، قد تقریباً پانچ فٹ دس انچ اور عمر پینتیس سے چھتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی...... مجموعی طور پر اسے ایک خوب صورت آدمی کہا جا سکتا تھا۔
"فرمایئے...... کس سے ملنا ہے؟"
لہجہ اور نظریں دونوں ہی کا انداز سوالیہ تھا جس کے نتیجے میں اسے اپنا تجزیاتی مطالعہ مجبوراً بند کرنا پڑا۔
"جی! وہ...... مجھے آپ سے کچھ ضروری بات چیت کرنا تھی۔"
اس کے حلق سے ایک بے ساختہ سا جملہ آزاد ہوا۔
"کس سلسلے میں......؟"
جوابی سوال ہوا تو وہ قدرے سنبھل کر مضبوط انداز میں بولا۔
"نائلہ راجہ...... کے متعلق!"
اس نے پنک پرس اس کی نظروں کے سامنے لہراتے ہوئے ایک ایک لفظ پر زور دیا! لیکن باوجود کوشش کے وہ اس کے چہرے پر کوئی بھی تاثر تلاش کرنے میں ناکام رہا۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح سخت اور بالکل سپاٹ تھا۔ وہ قدرے مایوس سا ہوگیا! لیکن سنائی دینے والے الفاظ نے جیسے اس کے وجود میں پھر سے ایک نئی روح پھونک دی۔
"اندر آجاؤ......"
لہجہ تو کسی بھی قسم کے تاثر سے یکسر عاری تھا لیکن الفاظ اس کی توقع کے عین مطابق تھے۔ دبلا پتلا شخص اسے اندر آنے کا سندیسہ دینے کے بعد ایک سائیڈ پر ہٹ چکا تھا جو اس بات کا واضح اشارہ تھا کہ اس کا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا ہے۔ وہ نپے تلے قدموں سے چلتا گھر کے اندر داخل ہوا تو دبلے پتلے شخص نے دروازہ بند کردیا اور پھر اس کی راہ نمائی کرتے ہوئے گھر کے اندرونی حصے میں داخل ہوگیا۔ پھر کچھ ہی لمحوں کے بعد وہ دونوں آمنے سامنے صوفوں پر براجمان تھے اور یہ کمرہ یقیناً اس گھر کا ڈرائنگ روم تھا۔
کچھ دیر تک وہ دونوں جیسے نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کو تولتے رہے پھر آخر کار صاحب خانہ ہی کا پیمانہ صبر لبریز ہوا۔
"بولو...... کیا کہنا چاہتے ہو؟"
لہجہ استفسارانہ تھا لیکن انداز بدستور سپاٹ تھا۔
اس نے چند لمحوں تک جیسے واقعات کی کڑیوں کو ترتیب دیا اور پھر شروع سے آخر تک ساری داستان کہہ ڈالی۔ دبلے پتلے شخص نے پورے انہماک سے اس کی ساری بات سنی، لیکن اس دوران اس نے نا کوئی سوال کیا اور نا ہی کسی تاثر کا اظہار کیا۔ جب وہ اپنی ساری بات مکمل کر چکا اور اس کے بعد بھی سامنے سے کسی ردعمل کا مظاہرہ نہ ہوا تو وہ قدرے گڑبڑا سا گیا۔ عجیب سرد سا آدمی تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ سامنے والے شخص کا اس لڑکی سے کوئی تعلق یا رشتہ ہے بھی یا نہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ غلط گھر میں آگیا ہو، لیکن اگر ایسا ہوتا تو وہ پنک پرس کو دیکھنے کے بعد اسے اپنے گھر میں کیوں بلاتا......؟
اور پرس کا خیال آتے ہی وہ غیر ارادی سے انداز میں بول اٹھا۔
"شاید آپ کو میری بات پر یقین نہیں آیا...... لیکن کیا آپ اس پرس کو بھی نہیں پہچانتے؟ کیا آپ نائلہ راجہ کو نہیں جانتے؟"
اس کے اس بے ساختہ سوال کو سن کر سامنے والے شخص کے ہونٹوں پر ایک باریک سی لکیر کھنچ گئی، یوں جیسے وہ مسکرایا ہو لیکن یہ صرف اس کا احساس ہی تھا کیوں کہ مسکراہٹ نظر نہیں آسکی تھی۔

"پہچانتا ہوں...... جانتا ہوں......!"
اس کی غیر جذباتی سی آواز سنائی دی۔ پھر اچانک وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی اٹھاتے ہوئے اپنے ساتھ ایک دوسرے کمرے میں لے آیا۔ جہاں دیوار پر اسی خوبرو دوشیزہ کی ایک جہازی سائز تصویر آویزاں تھی۔ جسے دیکھ کر وہ تسلی آمیز انداز میں ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے دبلے پتلے شخص کی جانب متوجہ ہوا جو اس کے ہاتھ میں دبے پرس کو اچک کر کارنس پر رکھ رہا تھا۔

"کل شام تک یہ پرس یہیں رکھا تھا...... لیکن آج یہ تمہارے ہاتھ میں ہے...... میں اس بات کو کیا سمجھوں؟"

اور دبلے پتلے شخص کے اس سوال پر وہ گھن چکر بن گیا۔ عجیب آدمی تھا، یعنی اس کے لیے یہ بات کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی تھی کہ لڑکی کے ساتھ کیا حادثہ پیش آچکا ہے، وہ اسے یہ بتانے پر مصر تھا کہ پرس کل شام تک یہیں رکھا تھا اور یہ بھی نہیں، وہ اسی سے پوچھ رہا تھا کہ

"میں اس بات کو کیا سمجھوں؟"

یہ تو حد ہی ہوگئی۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا، یعنی اگر کل شام تک پرس یہیں موجود تھا تو رات حیدرآباد سے سوار ہونے والی اس لڑکی کے ہاتھ میں کیسے تھا؟ یہ سوچتے ہی اس کا منہ حیرت سے کھل گیا! لیکن اس کے ہونٹوں پر کسی سوال کے آنے سے پہلے ہی دبلا پتلا شخص گویا ہوا۔

"آؤ میرے ساتھ......"

اور وہ بے اختیار ایک بار پھر اس کے پیچھے چلنے لگا۔ اس دبلے پتلے شخص کا رخ اب بیرونی دروازے کی جانب تھا اس نے دروازہ کھولا اور پھر پلٹ کر اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

"چلو...... باہر نکلو!"

عجیب بے ہودہ آدمی ہے! اس نے ناگواری سے سوچا، یعنی کوئی تہذیب ہی نہیں ہے! وہ دروازے سے باہر نکلا تو دبلے پتلے شخص کی سرد اور سپاٹ آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

"نائلہ راجہ...... پانچ سال پہلے...... ٹرین سے گر کر...... مر چکی ہے......"

اور اس کے بعد دروازہ ایک دھماکے سے بند ہوگیا لیکن اس سے بھی بڑا دھماکا اس کے دماغ میں ہوا تھا اور یہ دھماکا اتنا زوردار تھا کہ اس کے چودہ طبق روشن کر گیا تھا۔ وہ اتنی زور سے لڑکھڑایا کہ گرتے گرتے بچا۔ اب وہ ہونقوں کی طرح منہ اٹھائے کھڑا کبھی بند دروازے کو دیکھ رہا تھا اور کبھی اس شخص کے کہے ہوئے آخری جملے پر غور کر رہا تھا۔ جب بات پوری طرح اس کی سمجھ میں آئی تو اس کے پاؤں کو جیسے پھرتی لگ گئی۔ وہ وہاں سے ایسا سرپٹ بھاگا کہ پلٹ کر دیکھا تک نہیں۔ گرتا پڑتا کسی نہ کسی طرح وہ بس اسٹاپ پہنچا اور پھر وہاں سے رکشا کر کے گھر کی جانب روانہ ہوگیا۔ گلی کے نکڑ پر اتر کر اس نے رکشا والے کو کرایہ ادا کیا اور گھر کی جانب چل دیا۔ ابھی چند ہی قدم چلا تھا کہ ایک شناسا سا آواز سنائی دی۔

"طاہر! اوئے طاہر......"

اس نے پلٹ کر دیکھا تو اس کا دیرینہ دوست عرفان لپکتے ہوئے اس کی جانب آرہا تھا۔ عرفان ایک مقامی روزنامے کے دفتر میں کام کرتا تھا اور اس کی طاہر سے خاصی پرانی یاد اللہ تھی۔

"کہاں غائب ہو یار...... بڑے طویل عرصے کے بعد نظر آئے ہو؟"

قریب پہنچتے ہی وہ اس کے کندھے پر دھپ رسید کرتے ہوئے بولا۔

طاہر پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے اس بے تکلفانہ انداز کو دیکھنے کے بعد دھیرے سے بولا۔

"خاصے عرصے سے حیدرآباد میں تھا...... آج ہی پہنچا ہوں...... تم سناؤ...... تم ادھر کہاں گھوم رہے ہو؟"

عرفان اس کے ڈھیلے ڈھالے انداز کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

"بس یار! وہی روزی کا چکر...... ادھر ایک سیاسی شخصیت کا انٹرویو کرنے آیا تھا...... وہاں سے نکلا تو تم نظر آگئے...... ویسے تم یہاں کیوں پھر رہے ہو؟"

طاہر اس کے متجسس انداز کو دیکھتے ہوئے ایک بار پھر مسکرایا پھر اسی لہجے میں گویا ہوا۔

"میں تو یہیں رہتا ہوں...... وہ سامنے میرا گھر ہے......"

اس نے اپنے گھر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا تو عرفان دانت نکالتے ہوئے بولا۔

’’لے بھئی...... یہ تو اچھا ہو گیا...... بیاسی گفتگو کر کر کے دماغ کی دہی ہو رہی ہے...... اب تیرے ہاتھ کی اچھی سی چائے بھی پیوں گا اور گپ شپ بھی لگاؤں گا...... اور اسی بہانے آج تیرا گھر بھی دیکھ لوں گا...... ویسے تو تم ہاتھ لگتے نہیں۔‘‘

اپنی بات مکمل کرتے ہوئے وہ خود ہی ہنسنے لگا تو طاہر بھی ہلکا سا مسکراتے ہوئے بولا۔

’’ہاں...... ہاں...... کیوں نہیں...... آؤ میرے ساتھ......‘‘

اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد دونوں آمنے سامنے بیٹھے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔

’’یار! گھر کی حالت تو ایسی ہو رہی ہے جیسے...... یہاں کی کبھی صفائی ہی نہیں ہوئی...... تھوڑا سا ہاتھ ہلا لیا کر بھائی...... ایسی بھی کیا بے پرواہی؟‘‘

عرفان نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے برا سا منہ بنا کر کہا۔

’’یار تمہیں بتایا تو ہے کہ آج ہی حیدر آباد سے واپس پہنچا ہوں...... اب آ گیا ہوں تو صفائی بھی ہو جائے گی۔‘‘

طاہر نے وضاحت دیتے ہوئے کہا تو وہ غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

’’تم خود بھی بڑے سست اور کھوئے کھوئے سے لگ رہے ہو خیریت تو ہے نا...... شاید تم نے حیدر آباد سے واپس آ کر اب تک آرام نہیں کیا...... تھک گئے ہو گے۔‘‘

عرفان نے خود ہی سوال کیا اور پھر خود ہی اندازہ قائم کیا۔

’’نہیں ایسی کوئی بات نہیں...... اصل میں ابھی جس جگہ سے واپس آ رہا ہوں وہاں کچھ ایسے حالات پیش آئے جو ذہن پر بری طرح اثر انداز ہوئے ہیں...... عقل حیران ہے یار......‘‘

طاہر نے معذرت خواہانہ انداز میں صفائی دی، ساتھ ہی اپنی الجھن کا تذکرہ بھی کیا تو عرفان نے متجسس انداز میں اسے گھورتے ہوئے دریافت کیا۔

’’کیسے حالات...... کہاں سے آ رہے ہو تم...... خیریت تو ہے نا؟‘‘

طاہر نے اس کے لہجے میں چھپے تجسس کو محسوس کیا تو شروع سے لے کر آخر تک ساری داستان کہہ ڈالی اور عرفان حیرت سے منہ پھاڑے سنتا چلا گیا۔ جب کہانی مکمل ہو گئی تو عرفان بے یقینی کے سے انداز میں بولا۔

’’حیرت انگیز...... یہ تو ناقابل یقین سی بات ہے...... کس علاقے میں ہے وہ گھر...... جہاں تم اس آدمی سے ملنے گئے؟‘‘

اور طاہر نے اسے گھر کا پورا ایڈریس سمجھا دیا۔ عرفان کے انداز سے جھلکتی گہری دلچسپی کو دیکھتے ہوئے طاہر نے تنبیہی لہجے میں کہا۔

’’دیکھو تم اس چکر میں نہیں پڑو...... میں خود وہاں سے بڑا خوف زدہ ہو کر نکلا ہوں...... پتا نہیں کیا معاملہ ہے؟‘‘

عرفان نے پرخیال انداز میں اس کی طرف دیکھا اور پھر چٹکی بجا کر بولا۔

’’چکر میں تو ڈال ہی دیا تم نے...... بھئی! قصہ ہی اتنا دلچسپ اور حیرت انگیز ہے کہ میں اسے نظر انداز نہیں کر سکتا...... ہو سکتا ہے کہ میرے اخبار کو کوئی زبردست سی اسٹوری مل جائے...... میں تو پہلی فرصت میں وہاں جاؤں گا اور اس آدمی کو مزید کریدوں گا...... تمہارا شکریہ! کہ تم نے مجھ سے یہ سب شیئر کیا......‘‘

عرفان نے اپنی بات مکمل کی اور پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

’’اب مجھے اجازت دو...... جلد ملاقات ہو گی......‘‘

عرفان پلٹ کر باہر نکل گیا جب کہ طاہر پر سوچ انداز میں دروازے کو تک رہا تھا جہاں سے ابھی ابھی وہ باہر نکلا تھا۔

☆......☆......☆

طاہر سے ملاقات ہوئے کافی دن گزر چکے تھے لیکن وہ اپنی مصروفیات میں ایسا الجھا کہ دوبارہ اس بارے میں کچھ سوچ ہی نہ سکا لیکن آج جب باس نے اس کی شان میں قصیدے پڑھے تو اس نے دل ہی دل میں ٹھان لیا کہ وہ بقول باس ’’مفت کی روٹیاں‘‘ نہیں توڑے گا۔ پھر جب وہ باس کے کمرے سے باہر نکلا تو تہیہ کر چکا تھا کہ کل وہ کوئی نہ کوئی دھانسو اسٹوری لے کر ہی آفس آئے گا۔ اب وہ اپنے روم میں بیٹھا انتہائی پریشانی کے عالم میں یہ ہی سوچ رہا تھا کہ وہ ’’دھانسو اسٹوری‘‘ آئے گی کہاں سے؟ یہ تو شکر ہے کہ یہ دل ہی دل میں اس نے خود سوچا تھا باس سے کہہ نہیں دیا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سگریٹ سلگائی اور اپنی کرسی کی پشت گاہ سے سر ٹکا کر دھوئیں کے مرغولے بنانے لگا۔ یہ مرغولے صرف اس کے سامنے ہی

نہیں بلکہ اس کے دماغ میں بھی چکرا رہے تھے۔ اور ہر مرغولے کی پیشانی پر کندہ ایک ہی سوالیہ نشان اس کا منہ چڑا رہا تھا ''دھانسوا سٹوری؟''

لیکن پریشان کن بات یہ تھی کہ تہیہ اپنی جگہ اور اسٹوری اپنی جگہ...... اب آئے تو آئے کہاں سے؟

''ایک تو یہ باس نام کی چیز پتا نہیں کیوں بھیج دی دنیا میں اللہ نے ...... اور اگر بھیج ہی دی تو اس کے پاس ملازمت کے لیے میرا ہی انتخاب کیوں؟

''بھلا میں نے اللہ کا کیا بگاڑا تھا؟''

وہ بڑبڑایا لیکن یوں دل کی بھڑاس نکالنے کے باوجود مسئلہ اپنی جگہ جوں کا توں برقرار تھا۔ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا! اس نے ہونٹ سکوڑتے ہوئے سوچا، پھر جیسے اندھیرے میں کوئی دیا ٹمٹماتا ہے بالکل اسی طرح اس کے ذہن میں طاہر کی سنائی ہوئی اسٹوری کا خیال آیا تو اس کا دماغ روشن ہوتا چلا گیا۔

''یہ بات......!''

وہ چٹکی بجاتے ہوئے بڑبڑایا اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد وہ اپنی بائیک پر سوار طاہر کے بتائے ہوئے ایڈریس کی جانب اڑا چلا جا رہا تھا۔ ایک دو جگہ سے معلومات حاصل کرنے کے بعد بالآخر وہ مطلوبہ جگہ تک پہنچ ہی گیا۔ اب وہ مکان نمبر B-34 کے سامنے کھڑا تھا لیکن یہاں کا منظر طاہر کی سنائی ہوئی کہانی سے یکسر مختلف تھا۔ اس نے طاہر سے ہونے والی گفتگو کو ذہن میں تازہ کیا تو اسے یاد آیا کہ طاہر نے یہاں پہنچ کر کال بیل کا بٹن پریس کیا تھا اور پھر ایک دبلے پتلے شخص نے دروازہ کھولا تھا اور اس وقت وہ اسی دبلے پتلے شخص سے ملنے کے لیے یہاں پہنچا تھا لیکن اسے اب احساس ہو رہا تھا کہ یا تو طاہر کی سنائی ہوئی کہانی غلط تھی یا جس مکان کے سامنے وہ کھڑا تھا یہ اس کا مطلوبہ مکان نہیں تھا۔ اس نے ایک بار پھر غور سے دیکھا لیکن وہاں پر لکھا ہوا نمبر B-34 واضح نظر آ رہا تھا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کے اندازے کے مطابق جس جگہ کال بیل کا بٹن ہونا چاہیے تھا وہاں پر بے ڈھنگے انداز میں دیوار سے نکل کر لٹکتے ہوئے مڑے تڑے بجلی کے تار اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ جب کہ دروازہ نام کی کوئی چیز سرے سے موجود ہی نہ تھی۔ اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں لیکن کوئی ذی روح دکھائی نہ دیا تو وہ اللہ کا نام لے کر گھر میں داخل ہو گیا۔ پھر کچھ ہی منٹوں میں وہ گھر کا چپا چپا چھان چکا تھا۔ گھر میں زندگی تو مفقود تھی ہی، سامان نام کی کوئی چیز بھی موجود نہ تھی۔ کسی دیوار پر کسی لڑکی کی کوئی تصویر آویزاں نہیں تھی۔ چاروں طرف گرد و غبار اور جھاڑ جھنکاڑ بکھرا ہوا تھا یا پھر گھر میں جا بجا اگی ہوئی خودرو جھاڑیاں۔ وہ چکرائے ہوئے دماغ کے ساتھ واپس پلٹا اور گھر سے باہر نکل آیا۔ دماغ میں صرف ایک ہی سوال چکرا رہا تھا کہ ایک ہفتہ پہلے جس بھرے پرے گھر میں طاہر کسی جیتے جاگتے شخص سے ملاقات کر کے گیا ہے اس کی یہ حالت کیوں کر ممکن ہوئی؟ لیکن کوئی بھی بات سمجھ میں نہ آسکی۔ پھر اس کی نظریں سامنے سے آتے ہوئے ایک قبول صورت نوجوان کے چہرے پر جا ٹھہریں جو تیز تیز چلتا ہوا اسی سمت آ رہا تھا۔ جوں ہی وہ قریب پہنچا عرفان نے اسے مخاطب کیا۔

''سنیے...... کیا آپ اسی محلے میں رہتے ہیں؟''

''جی! کیوں......؟ آپ کو کوئی اعتراض ہے؟''

نوجوان نے اس کی بات کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ کاٹ کھانے والے لہجے میں دریافت کیا تو وہ قدرے گڑبڑا سا گیا لیکن پھر جلد ہی سنبھل کر بولا۔

''بھائی ناراض کیوں ہوتے ہو؟ وہ دراصل...... میرا ایک دوست تقریباً چھ سات دن پہلے اس گھر میں رہنے والے صاحب سے مل کر گیا ہے لیکن اب اس گھر کی حالت ہی عجیب ہے۔''

عرفان نے وضاحت دینے کے سے انداز میں گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو جوابی ردعمل میں نوجوان کی حالت عجیب ہو گئی...... اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے عرفان کی طرف دیکھا تو عرفان کو اندازہ ہوا کہ کچھ نہ کچھ تو غیر فطری ہے۔ کیوں کہ نوجوان کی آنکھیں ناقابلِ یقین حد تک پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ گھبرا کر دوبارہ نوجوان سے مخاطب ہوا۔

''دیکھو بھائی! بات یہ ہے کہ......''

لیکن وہ نوجوان اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی یوں بھاگا جیسے کسی نے اس کے پیچھے کتے چھوڑ دیے ہوں۔ پھر اگلے ہی لمحے وہ سامنے سے آنے والے اس ادھیڑ عمر شخص سے بری طرح ٹکرایا جو اپنی ہی دھن میں مگن خراماں خراماں چلتے ہوئے اسی سمت آ رہا تھا۔ ٹکراؤ زوردار تھا جس کے نتیجے میں وہ ادھیڑ عمر شخص اچھل کر نیچے گرا اور وہ

نوجوان لڑکھڑا کر دیوار سے جا ٹکرایا لیکن کیا ہوا ہے، یہ دیکھنے کے لیے وہ بالکل نہیں رکا اور سرپٹ بھاگتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

"بدتمیز...... بے ہودہ...... پتا نہیں کہاں سے آن مرے ہیں ہمارے محلے میں...... دیدوں کا پانی ہی مر گیا ہے۔"

ادھیڑ عمر شخص کی کراہتی ہوئی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تو وہ جو حیرت کے سمندر میں ڈبکیاں کھا رہا تھا جلدی سے اپنے حواسوں میں واپس آگیا اور لپک کر اس ادھیڑ عمر آدمی کو اٹھنے میں مدد دینے لگا۔ جو بھاری بھرکم وجود کی وجہ سے خاصی مشکل میں گرفتار تھا۔

"جیتے رہو...... ایک تم ہو اور ایک یہ آفت زادہ...... اللہ کی مار ہو ان پر...... محلے کا سکون غارت کر دیا ہے، جب سے آئے ہیں جینا دوبھر کر کے رکھا ہے...... کل کرکٹ بال مار کے میری کھڑکی کا شیشہ توڑا، اور آج مجھ پر ہی چڑھ دوڑا...... چھوڑوں گا نہیں میں بھی۔"

ادھیڑ عمر شخص اٹھ کر عرفان کو دعا دینے کے بعد نان اسٹاپ شروع ہو گیا اور پھر جب خاصی حد تک اپنی بھڑاس نکال چکا تو اسے عرفان کا خیال آیا۔

"ویسے تم کون ہو بیٹا؟ پہلے تو کبھی نہیں دیکھا تمہیں یہاں۔"

"جی وہ دراصل...... بات یہ ہے کہ......"

عرفان نے مطلوبہ گھر کی جانب دیکھتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا اور پھر فوراً ہی جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ کیوں کہ چند لمحے پہلے ہی وہ اپنی گفتگو کا انجام دیکھ چکا تھا۔ اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ سوچ سمجھ کر بات کرے گا۔ پھر جب وہ بولا تو اسی فیصلے کے مطابق خاصا محتاط تھا۔

"جی میں یہاں نہیں رہتا...... بس کچھ معلومات لینے کے لیے آیا ہوں، اگر آپ کچھ ہیلپ کر سکیں...... تو نوازش ہوگی۔"

"ہاں ہاں! کیوں نہیں...... بندہ ہی بندے کے کام آتا ہے...... بتاؤ کیسی ہیلپ چاہیے؟"

ادھیڑ عمر شخص کے لہجے میں تشکر اور انکساری کے ملے جلے جذبات شامل تھے۔

"وہ مارا......!"

عرفان کے دل نے نعرہ لگایا۔ اپنے طریقہ کار پر اطمینان حاصل ہو جانے کے بعد اس نے سلسلہ کلام کو آگے بڑھایا۔

"جی دراصل...... مجھے اس گھر اور اس کے مکینوں کے بارے میں جاننا تھا...... اگر آپ بتا سکیں تو؟"

ادھیڑ عمر شخص نے چونک کر گھر کی جانب دیکھا پھر کریدتی ہوئی نظروں سے عرفان کو گھورتے ہوئے دریافت کیا۔

"تمہیں اس گھر سے کیا لینا دینا...... اور تم یہ معلومات کیوں چاہتے ہو؟"

ادھیڑ عمر شخص کا لہجہ شکوک و شبہات سے لبریز تھا۔

"جی بس ہے کوئی مسئلہ...... اگر آپ بتا سکیں تو نوازش ہوگی۔"

عرفان نے جلدی سے کہا تو ادھیڑ عمر شخص کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔

"خیر جو بھی ہے مجھے کیا...... میں کون سا جھوٹ بولوں گا۔"

ادھیڑ عمر شخص نے بے پروائی کا مظاہرہ کیا اور پھر بات کو آگے بڑھایا۔

"یہ فواد راجہ کا مکان ہے...... وہ اور اس کی بیوی اس گھر میں ہنسی خوشی زندگی گزار رہے تھے...... لیکن پھر ایک دن پتا چلا کہ فواد کی بیوی ٹرین سے گر کر جاں بحق ہو گئی ہے...... محلے میں کہرام مچ گیا! کیوں کہ یہاں کے سب لوگ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں...... پھر جب فواد کی بیوی نائلہ کی لاش یہاں پہنچی تو سب ہی کو بہت افسوس ہوا...... لیکن قدرت کے کاموں میں کسے دخل ہے؟ آہوں اور سسکیوں میں اس کی تدفین ہوئی...... سب کی طرح میں نے بھی فواد کو دلاسہ دیا اور گھر کی راہ لی...... لیکن یہ بات سب ہی جانتے تھے کہ فواد اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا...... اس کی موت کو تو شاید وہ جیسے تیسے برداشت کر ہی لیتا، لیکن اگلے ہی دن ملنے والی پوسٹ مارٹم رپورٹ نے جلتی پر تیل کا کام کیا...... جب اسے اس بات کا پتا چلا کہ مرنے سے پہلے اس کی بیوی کے ساتھ دو لوگوں نے جنسی زیادتی بھی کی ہے تو وہ اس صدمے کو سہہ نہیں پایا اور اس نے پنکھے سے لٹک کر خودکشی کر لی...... محلے کے لوگ اگر دکھ سکھ میں شریک تھے تو پھر بھلا گھر کے ساز و سامان میں شراکت داری کیوں نہ رکھتے؟ تم نے وہ بات تو

سی ہی ہوگی کہ ''گھر والے گھر نہیں اور ہمیں کسی کا ڈر نہیں'' یوں ایک کے بعد ایک اس گھر کی ہر چیز غائب ہوگئی ...... جس کے ہاتھ جو لگا اٹھالے گیا...... بس یہ کھنڈر باقی بچا ہے...... شاید کچھ عرصے کے بعد لوگ ...... یہ ملبہ بھی اٹھا لے جائیں۔''

عرفان جو حیرت سے منہ پھاڑے یہ داستان الف لیلہ سن رہا تھا، ادھیڑ عمر شخص کے خاموش ہونے پر بے اختیار بول اٹھا۔

''اور فواد راجہ نے خودکشی...... کتنے دن پہلے کی ہے؟''

ادھیڑ عمر شخص نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا اور پھر گویا ہوا۔

''جس دن اس کی بیوی کی تدفین ہوئی اس سے اگلے دن...... اور اس بات کو تقریباً پانچ سال گزر چکے ہیں۔''

عرفان نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ادھیڑ عمر شخص کی طرف دیکھا اور پھر چند ہی لمحوں کے بعد وہ موٹر سائیکل کو اندھا دھند بھگاتے ہوئے واپس جا رہا تھا۔ وہ اتنی تیز رفتاری سے پلٹا تھا کہ اس نے ادھیڑ عمر شخص کی جانب سے دی جانے والی چائے کی دعوت پر بھی کان نہیں دھرے تھے۔ لیکن پھر کافی دور آجانے کے بعد اس کے حواس قدرے بحال ہوئے تو اسے چائے کی طلب ستانے لگی۔ اس نے متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر ایک ڈھابہ نما ہوٹل پر جا رکا۔ پٹھان کو ایک دودھ پتی کا آرڈر دینے کے بعد وہ ایک گندی سی بنچ پر جا بیٹھا اور خیالات کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف ہوگیا۔

کوئی ایک بھی بات ایسی نہیں تھی جو سمجھ میں آنے والی ہو۔ ایک تو یہ پوری داستان ہی ناقابلِ یقین سی تھی اور اس ستم یہ کہ ایک ہفتہ پہلے ہونے والی ملاقات کو اس ادھیڑ عمر شخص کی باتوں نے جھٹلا کر رکھ دیا تھا۔ اگر طاہر اس گھر میں کسی سے واقعی ملا تھا تو اس شخص نے یہ کیوں کہا کہ اس گھر کے دونوں مکین پانچ سال پہلے مر چکے ہیں؟ جہاں تک اس کی اپنی فہم کام کر رہی تھی اس کے مطابق بھی ایک ہفتہ قبل ہونے والی ملاقات ممکن نہ تھی۔ کیوں کہ گھر کی جو حالت زاروہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آرہا تھا، وہ چیخ چیخ کر یہ ہی اعلان کر رہی تھی کہ وہ گھر سالوں سے ویران پڑا ہوا ہے۔ پھر وہاں صوفے، کارنس اور دیوار پر آویزاں تصویر کا ہونا کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے؟ اور پھر اس کے ذہن نے جواب دیا کہ ایسا ہونا ناممکن ہی ہے۔ تو کیا طاہر نے اس سے جھوٹ کہا؟ مگر طاہر اس سے جھوٹ کیوں بولے گا؟ اور پھر طاہر کی اس بات کی تصدیق بھی تو ہو رہی تھی کہ لڑکی کی موت ٹرین سے گر کر ہوئی...... طاہر اسے ایک ہفتے پہلے کا واقعہ بتا رہا تھا جب کہ وہاں سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق یہ سب کچھ پانچ سال پہلے وقوع پزیر ہو چکا تھا۔ آخر کیا ہے یہ سب کچھ؟ لیکن باوجود کوشش کے وہ کسی بھی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ اور پھر چائے کی آخری چسکی کے ساتھ ہی اس کے دماغ نے اسے جو راہ سجھائی وہ اسی پر عمل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اور وہ فیصلہ تھا طاہر سے دوبارہ ملاقات کا...... ایک وہ ہی شخصیت ایسی تھی جو اس راز پر سے پردہ اٹھانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اس نے کاؤنٹر پر چائے کے پیسے ادا کیے اور پھر موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے کے بعد نارمل رفتار سے سفر کرتا ہوا اپنی منزل کی جانب بڑھنے لگا۔ اب اس کا رخ طاہر کے اس گھر کی جانب تھا جسے طویل عرصے پر محیط علیک سلیک ہونے کے باوجود گزشتہ ہفتے ہی اس نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ اپنی مطلوبہ گلی تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ پھر اپنی دانست میں طاہر کا گھر سمجھتے ہوئے اس نے جس مکان کے سامنے پہنچ کر بریک لگائی وہاں لگا ہوا ایک وزنی آہنی قفل اس کے اندازوں کی نفی کر رہا تھا۔ اس نے بائیک سے اتر کر بے اختیار اپنے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر دروازے کے قریب پہنچ کر کنڈے میں لٹکتے ہوئے اس سال خوردہ اور زنگ آلود تالے کا بغور جائزہ لیا۔ تالے اور کنڈی کی حالت دیکھ کر یہ اندازہ لگانا ذرا بھی مشکل نہ تھا کہ یہ تالا امتدادِ زمانہ کا سامنا کرتے کرتے اپنی اصل وضع قطع اور مضبوطی خاصی حد تک گنوا چکا ہے۔ جب کہ گزشتہ ہفتے جب وہ طاہر کے ساتھ یہاں آیا تھا تو طاہر نے نا صرف اس کی نظروں کے سامنے بڑی آسانی سے ایک صاف ستھرا تالا کھول کر الگ کیا تھا بلکہ اندر داخل ہوتے وقت وہ اس کے ہاتھ میں ہی دبا ہوا تھا۔ بات خاصی حد تک الجھا دینے والی تھی جس کے نتیجے میں وہ واقعی الجھ کر رہ گیا تھا۔ ایک لمحے کو اس کے دماغ میں یہ خیال سرسرایا کہ کہیں وہ کسی غلط دروازے پر تو نہیں آرکا؟ پھر اپنے اس خیال کی تائید یا تصدیق کے لیے وہ چند قدم پیچھے ہٹا اور گلی میں پہلے دائیں اور پھر بائیں چلتے ہوئے اس نے

مکان کا بغور جائزہ لیا۔ لیکن نتیجہ ڈھاک کے وہی تین پات رہا۔ اس کی یادداشت اسی بات پر مصر تھی کہ وہ طاہر کے ساتھ اسی دروازے سے گزر کر، اسی مکان میں بیٹھ کر اس کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوا تھا لیکن دروازے کی خستہ حالت، کنڈی اور تالے کی ناگفتہ بہ صورت حال اس کے تمام تر اندازوں کی واٹ لگانے کے لیے کافی تھی۔ باوجود کوشش کے جب وہ کسی واضح نتیجے پر نا پہنچ سکا تو اس نے کسی کی مدد حاصل کرنے کے بارے میں سوچا۔ لیکن اپنی اس سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اسے وہاں کسی دوسرے شخص کی ضرورت تھی جو اسے چاروں طرف نظریں دوڑانے کے باوجود دکھائی نہ دے سکا۔ ناچار اس نے کسی کا دروازہ بجانے کا ارادہ کیا۔

پھر اس نے طاہر کے داہنی جانب والے گھر کے دروازے پر دستک دے ڈالی۔ چند لمحوں بعد ہی دروازے کی دوسری جانب گھسٹ گھسٹ کی سی آواز بلند ہوئی اور پھر دروازہ کھلنے پر اسے کھچڑی بالوں اور آدم بیزار سی شکل و صورت کے حامل اس نحنی وجود کا دیدار ہوا۔ دروازے کے بالکل سامنے عرفان کو ایستادہ دیکھ کر آنے والے شخص کے چہرے پر ناگواری اور بدمزگی کے ملے جلے تاثرات نمودار ہوئے۔ پھر اس نے ناک پر ٹکے بڑے سے کالے فریم والے چشمے کو ہٹاتے ہوئے اسے گھورا اور یوں گویا ہوا۔

''کہاں سے آن ٹپکے بھائی...... کسی مولوی کا گھر ڈھونڈ رہے ہو یا کسی وکیل صاحب کا؟ کسی کو پتا معلوم کرنا ہوتا ہے، کسی کو چندہ لینا ہوتا ہے تو کوئی ڈیل بیچنے آجاتا ہے...... اور جس دن خوش قسمتی سے کوئی نہیں آتا...... اس دن بیل بجا کر بھاگ جانے والے زندگی عذاب کر دیتے ہیں...... پتا نہیں سب کو میرا ہی دروازہ کیوں نظر آتا ہے۔''

بڑے میاں کا لہجہ اور انداز دیکھ کر وہ بے اختیار سر دھننے پر مجبور ہو گیا لیکن اگلے ہی لمحے اس پر بھی جھلاہٹ سوار ہو گئی۔

''آخر اس قبیل کے لوگ مجھے ہی کیوں ملتے ہیں؟''

وہ با آواز بلند بڑبڑایا تو بڑے میاں کی جلالی آواز بلند ہوئی۔

''جیسی روح ویسے فرشتے...... اس میں میرا کیا قصور ہے؟''

اور عرفان کا منہ بھاڑ کی طرح کھل گیا۔ وہ حیرت کی زیادتی کے باعث گنگ ہو کر بڑے میاں کی شکل دیکھتا رہ گیا۔ لیکن اگلے ہی لمحے بڑے میاں نے دوسرا بم پھوڑ ڈالا۔

''چلو اب منہ سے کچھ پھوٹو بھی...... سرف بیچنے آئے ہو کہ شیمپو؟''

''وہ...... دیکھیے...... آپ غلط سمجھ رہے ہیں، میں ایک شریف آدمی ہوں۔''

عرفان نے قدرے گڑبڑا کر اپنی صفائی دینے کی کمزور سی کوشش کی تو بڑے میاں پھاڑ کھانے والے لہجے میں غرائے۔

''تو...... تو میں نے کب کہا کہ تم جیل توڑ کر بھاگے ہو۔''

بڑے میاں کی بات سن کر عرفان کی آنکھیں حیرت کی زیادتی کے باعث پھیل کر کانوں تک جا لگیں۔ پھر وہ تپے ہوئے لہجے میں بولا۔

''لاحول ولا قوۃ...... یعنی کہ...... حد ہوتی ہے کوئی...... آپ سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔''

اور بڑے میاں کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار نمودار ہو گئے۔ پھر وہ ہاتھ نچا کر انگارے جیسی آواز میں بولے۔

''تو میں نے کون سا دعوت نامہ ارسال کیا تھا کہ آکر مجھ سے ضرور بات کرو...... پتا نہیں کہاں کہاں سے آجاتے ہیں منہ اٹھا کر...... چل ہٹ...... راستہ ناپ اپنا۔''

بڑے میاں نے زوردار آواز میں دروازہ یوں بند کیا جیسے اس کے منہ پر دے مارا ہو اور وہ فق چہرہ لیے دیکھتا ہی رہ گیا۔

''یہ سب اس باس کی وجہ سے ہو رہا ہے...... اس کو تو میں جان سے مار دوں گا۔''

وہ دانت پیستے ہوئے غرایا۔ اچانک کھٹاک کی آواز سنائی دی اور گیٹ میں سے کھلنے والی ایک چھوٹی سی کھڑکی سے بڑے میاں کا سر نمودار ہوا اور پھر ان کی شعلہ برساتی آواز نے اس کے کانوں کے پردے تک جلا دیے۔

''جان سے مار اپنے باپ کو...... اپنی ماں کو...... میں کیا گھر سے فالتو ہوں؟ جو مار ڈالے گا...... چل ہٹ...... بڑا آیا طرم خان!''

پھر غڑاپ سے ان کا چہرہ غائب ہوا اور کھٹاک سے

کھڑکی بھی بند ہوگئی۔ اور وہ ہونق سا کھڑا رہ گیا۔

"یا اللہ! یہ سارے کارٹون میرے ہی کھاتے میں کیوں لکھ دیے؟"

اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر دل ہی دل میں فریاد کی اور پھر گھبرا کر بڑے میاں کے دروازے کی طرف دیکھا کہ کہیں یہ بھی انہوں نے سن نہ لیا ہو۔ لیکن خیریت رہی تو وہ جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ اب وہ طاہر کے گھر کی دوسری جانب والے ہمسائیوں کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا تو ایک بھاری بھرکم سی خاتون نمودار ہوئیں جو حلیے کے اعتبار سے خاصی معقول نظر آرہی تھیں لیکن وہ گزشتہ تلخ تجربے کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی قسم کا کوئی رسک لینے کے لیے ہرگز تیار نہ تھا۔ اس لیے وہ نہایت شستہ اور مہذب لہجے میں فوراً ہی مدعا پر آ گیا۔

"جی اگر میں غلطی پر نہیں تو اس مکان میں میرے دوست طاہر صاحب رہتے ہیں...... لیکن جب یہاں آیا تو دروازے پر تالا لگا ہے۔ کیا آپ مجھے ان کے بارے میں کچھ بتا سکیں گی؟"

بھاری بھرکم خاتون نے اس کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا تو وہ گھبرا کر "جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو......" کا وظیفہ کرنے لگا لیکن خیریت رہی اور بھاری بھرکم خاتون کی انتہائی سریلی اور لوچ دار آواز بلند ہوئی جو ان کے وجود سے یکسر میل نہیں کھاتی تھی۔

"رہتے ہیں نہیں...... رہتے تھے...... کیوں کہ جب سے میں یہاں آئی ہوں اس مکان کو تالا ہی لگا دیکھا ہے...... ہاں اگر پانچ سال پہلے رہتے ہوں تو مجھے معلوم نہیں۔"

اس نے بھاری بھرکم خاتون کی بات کو پوری طرح سمجھا تو آواز کا سارا لوچ اور سریلا پن بھاپ بن کر اڑ گیا۔ اس نے تصدیق طلب لہجے میں دوبارہ دریافت کیا۔

"پانچ...... سال......؟"

"جی! پانچ سال پہلے ہی تو میں رخصت ہو کر یہاں آئی تھی۔"

بھاری بھرکم خاتون نے بری طرح شرماتے ہوئے جواب دیا تو اس کے دماغ میں بے اختیار جیسے کیچڑ میں لتھڑی بھینسوں کے ڈکرانے کی آوازیں گونجنے لگیں۔ وہ گڑبڑا کر پلٹا اور پھر گرتے پڑتے بائیک پر سوار ہونے کے بعد آفس کی جانب اڑن چھو ہو گیا۔ طاہر کے گھر سے آفس تک کا فاصلہ اس نے کیسے طے کیا اس کی وضاحت شاید کسی لغت میں بھی دستیاب نہ ہو اور اب وہ آفس میں اپنی مخصوص نشست پر بیٹھا بری طرح پکیا جانے والے اپنے دماغ کو سہلا رہا تھا۔ لیکن ذہن تھا کہ لوٹن کبوتر بنا ہوا تھا۔ طاہر کا اچانک ملنا، ٹرین میں ہونے والی واردات کا تذکرہ کرنا، باس کا ڈانٹنا، اس کی سراغ رسانی، فواد راجہ کے بارے میں پتا چلنا اور پھر طاہر کے مکان پر تالا لگا ہونا، سب کچھ غتر بود ہو کر رہ گیا تھا۔ کوئی ایک بھی بات ایسی نہ تھی جسے وہ سمجھ سکتا۔ اس نے اٹھ کر ڈسپنسر سے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس بھرا اور پھر اسے حلق میں انڈیلنے کے بعد واپس اپنی سیٹ پر آگیا۔ اب وہ خاصی حد تک خود کو سنبھال چکا تھا۔ اس نے شروع سے لے کر آخر تک ان واقعات کے تسلسل کو اپنے ذہن کے پردوں پر اجاگر کیا اور کڑی سے کڑی ملانے لگا۔ پھر دھیرے دھیرے پوری داستان اس پر واضح ہوتی چلی گئی۔

اسٹوری تو تھی، لیکن اس پر یقین کون کرے گا؟ کیا باس اس کی یہ محیر العقول کہانی چھاپنے پر تیار ہو گا؟ بہت سے سوالات تھے جن کا کوئی بھی واضح جواب کم از کم اس وقت تک سامنے نہیں آسکتا تھا جب تک وہ یہ اسٹوری لکھ کر باس کی ٹیبل تک نا پہنچا دیتا۔ اس نے کاغذ قلم اٹھایا اور لکھنے کا آغاز کیا۔ لیکن پھر ایک یا ڈیڑھ صفحہ ہی لکھ پایا تھا کہ اچانک ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح چمک جانے والے ایک خیال کے زیر اثر وہ جھٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اب اس کا رخ ریکارڈ روم کی طرف تھا وہاں پہنچ کر اس نے ریکارڈ روم کے انچارج ہاشمی صاحب سے پانچ سال پرانے اخبارات کی فائل طلب کی اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد اخبارات کے ایک ضخیم پلندے کے ساتھ وہ دوبارہ اپنے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ پھر طویل مغز ماری اور محنت کے بعد ایک اخبار اس کی نظروں کے سامنے آیا تو اس کی ریڑھ کی ہڈی میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ چھوٹی سی ایک کالم کی خبر اور اس کے ساتھ چھپی تصویر کو دیکھ کر اس کا کلیجہ جیسے اچھل کر حلق میں آگیا۔ خبر کی سرخی تھی!

"دوران سفر ٹرین میں نائلہ راجہ نامی مسافر پراسرار طور پر ہلاک۔"

اس نے جلدی جلدی تفصیل پڑھی اور پھر اس کی

نظریں تصویر میں نظر آتے نائلہ کے مردہ وجود پر جم کر رہ گئیں۔ چند لمحے وہ ساکت و جامد تصویر کو دیکھتا رہا پھر اخبار کو ٹیبل پر پٹخنے کے بعد اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ اس وقت اس کی حالت بالکل ایسی ہی تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نا ملے اور دماغ تو یوں تھا کہ جیسے فیوز اڑ گیا ہو۔

اس نے ذہن کی گل ہوتی بتی کو سنبھالا دیا تو کئی اور سوال آسیب کی طرح منہ پھاڑے آن کھڑے ہوئے۔

''یا حیرت!'' یہ ماجرا کیا ہے؟

اگر نائلہ واقعی مر چکی تھی تو وہ ٹرین میں طاہر سے کیسے ملی؟ اگر طاہر خودکشی کر چکا تھا تو وہ طاہر سے کیسے مل سکتا ہے؟ اور تو اور اگر طاہر خود پانچ سال پہلے مر چکا ہے تو ایک ہفتہ قبل وہ خود اس سے کیسے ملا؟

ہر سوال ہی عقل و فہم سے ماورا تھا۔ اور اگر یہ تمام لوگ پانچ سال پہلے ہی اس دار فانی سے رخصت ہو چکے ہیں تو آخر یہ ساری داستان اب اس کے سامنے کیوں لائی گئی؟ اور اس کے سامنے ہی کیوں؟ بھلا اس کا اس سب سے کیا واسطہ؟ کہیں وہ بھی مرنے والا تو نہیں؟ اس نے خوف زدہ سے انداز میں سوچا۔

''نہیں نہیں...... بھلا میرا اس معاملے سے کیا لینا دینا؟''

وہ جھرجھری سی لیتے ہوئے بڑبڑایا۔ کافی دیر کی ذہنی جمناسٹک کے باوجود جب کسی بھی نتیجے تک نہ پہنچ سکا تو دوبارہ کاغذ اور قلم کی جانب متوجہ ہو گیا۔

کہانی کو آخری ٹچ دینے کے بعد اس نے صفحات کو پن کیا، ناقدانہ نظروں سے اس کا آخری جائزہ لیا۔ اور پھر مرے مرے قدموں سے باس کے چیمبر کی جانب روانہ ہو گیا۔ کہانی تو اس نے مکمل کر لی تھی لیکن اسے پڑھنے کے بعد باس کے تاثرات واقعی حوصلہ افزا ہوں گے اس بارے میں وہ کچھ خاص پرامید نہیں تھا۔

ہلکی سی دستک کے بعد جب وہ باس کے کمرے میں داخل ہوا تو باس حسب عادت شدید غصے کے عالم میں فون پر مصروف تھا۔ اس نے گھور کر عرفان کی جانب دیکھا اور پھر اس کے ہاتھوں میں دبا کاغذات کا پلندہ وصول کرتے ہوئے سامنے رکھی کرسیوں کی جانب اشارہ کیا تو وہ خاموشی سے بیٹھ گیا اور یہ ہی وہ لمحہ تھا جب باس کی پھنکارتی ہوئی آواز میں وہ ''جملہ'' اس کی سماعتوں سے ٹکرایا! جس نے اس کی دماغی حالت بگاڑ کر رکھ دی۔

اس کے ذہن میں ہونے والا دھما کا اتنا ہی شدید تھا کہ سب کچھ بھک سے اڑ گیا۔ وہ بدحواس ہو کر اٹھا تو کرسی سے الجھ کر ایک زوردار آواز کے ساتھ زمین پر آ رہا لیکن یہ وقت ان سب چیزوں پر غور کرنے کا نہیں تھا اور نہ ہی یہ سوچنے کا کہ چوٹ لگی ہے یا نہیں......؟

وہ پلٹ کر دروازے کی جانب لپکا، اس کے پیروں میں گویا پہیے فٹ ہو گئے تھے، وہ جیسے اڑتا ہوا سا دفتر کی عمارت سے باہر نکلا اور پھر ایک جانب بگٹٹ بھاگ نکلا۔ اب اس کا رخ ریلوے اسٹیشن کی جانب تھا! کیوں کہ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ اس اسٹوری کو لکھنے کی پاداش میں اسے یہ نوکری اور یہ آفس ہی نہیں، یہ شہر بھی چھوڑنا ہوگا...... ورنہ شاید وہ زندہ نہ رہ سکے!

ٹرین نے پلیٹ فارم چھوڑ کر رفتہ رفتہ اسپیڈ پکڑی تو اس کے تنے ہوئے اعصاب بھی ڈھیلے پڑ گئے، اس نے ایک گہری سانس لی، سکون اور طمانیت سے بھرپور سانس...... اور پھر اس کے دماغ میں باس کا کہا ہوا وہ ''جملہ'' گونجنے لگا جسے سن کر وہ وہاں سے اندھا دھند بھاگ نکلا تھا۔

فون پر کسی شخص سے مخاطب ہو کر باس نے سرد اور پتھریلی آواز میں کہا تھا۔

''اپنے کام سے کام رکھو...... ورنہ کسی بڑے سے اخبار میں...... چھوٹی سی خبر بن کر رہ جاؤ گے!!!''

نقلی نوٹ

عمیر اسلم

آپ نے وہ مثل تو ضرور سنی ہوگی ''الٹے بانس بریلی کو'' اس مختصر سی کہانی میں آپ کو اس کی عملی تفسیر نظر آئے گی۔

ایک فنکار کا قصہ، اسے ایک روز اس جیسا فنکار ٹکرا گیا تھا

میں زمانے کی تیزی کو کوستا ہوا تھکے قدموں سے بازار میں گھوم رہا تھا جس طرف دیکھو عورتوں کا ہجوم نظر آ رہا تھا۔ بڑے بڑے شاپنگ بیگ ہاتھ میں اٹھائے وہ میری بے بسی کا مذاق اڑاتی نظر آ رہی تھی۔ مرد حضرات تو جیسے شاپنگ کرنا ہی بھول گئے تھے۔

عید کا رش تھا لیکن اس کے باوجود خال خال ہی مرد حضرات شاپنگ کرتے نظر آ رہے تھے۔ میں صبح سے قریب سولہ افراد کی جیب کاٹ چکا تھا اور ان سولہ افراد کی جیب سے زیادہ تر کریڈٹ کارڈ ہی نکلے تھے جن کا بنڈل بنا کر میں نے کچرے کے ڈرم میں پھینک دیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر دل میں رقم کا حساب لگایا' میرے پاس مجموعی طور پر بیس ہزار کی رقم جمع ہو چکی تھی۔ ابھی مجھے پانچ ہزار مزید جمع کرنے تھے کیونکہ مجھے میری بیوی سلمٰی نے عید کی خریداری کے لیے پچیس ہزار روپے کی رقم کا کہا تھا۔ میں اپنی تھکاوٹ اتارنے کے لیے قریبی کیفے میں داخل ہو گیا۔

میں کچھ دیر آرام کے بعد پھر اپنے کام پر نکلنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کیونکہ مجھے سلمٰی کے لیے پچیس ہزار روپے کی رقم درکار تھی۔ ہماری شادی کو دو سال ہو گئے تھے اور آج تک میں نے اس کی ہر فرمائش پوری کی تھی اور کیوں نہ کرتا وہ میری محبت تھی۔ مجھے وہ دن یاد آنے لگا جب میری شہرت ایک آوارہ لڑکے کے طور پر زبان زد عام تھی میں جوا بھی کھیلتا تھا لیکن اس معاملے میں قسمت مجھ پر ہمیشہ قہر برساتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی رقمیں ہار کر میں ایک بڑے قرض کے بوجھ تلے آ دب گیا تھا۔ کوئی راہ فرار باقی نہ بچا' ایک دو بار سوچا چوری چکاری یا لوٹ مار شروع کر دوں مگر اتنی ہمت بھی نہ کر پایا۔ انہی دنوں میری ملاقات استاد رشیدے سے ہوئی۔ میرے لیے وہ رحمت کا فرشتہ ثابت ہوا وہ ایک ماہر جیب کترا تھا اس نے نہ صرف میرے قرض ادا کرنے کا وعدہ کیا بلکہ اپنی شاگردی میں لے لیا۔

استاد رشیدے کی سرپرستی میں جلد ہی میں اپنے فن کا ماہر ہو گیا' اب میرے پاس اچھے لباس اور بہترین سواری تھی۔ بینک بیلنس بھی روزانہ ہزاروں کے حساب سے بڑھ رہا تھا' سلمٰی ان دنوں اسی بینک میں عارضی ملازم تھی میں دن میں بینک کے کئی کئی چکر لگاتا تھا۔ وہ مجھے بار بار سمجھاتی کہ آپ سارے دن کی آمدن کو شام کے وقت بینک کے بند ہونے سے پہلے ایک بار ہی جمع کروا دیا کریں لیکن میں اسے کیسے بتاتا کہ ایک بار اس کا دیدار ناکافی ہے میں اسے بار بار دیکھنے کا تمنائی ہوں پھر ایک روز اس نے پوچھ ہی لیا۔

''مسٹر عارف آپ روزانہ تیس سے پینتیس ہزار جمع کرواتے ہیں آخر آپ کی آمدنی کا ذریعہ کیا ہے۔'' میں ذرا سا گڑبڑا گیا۔ یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ایسا سوال بھی کر سکتی ہے۔

''میں ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور چلاتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''خوب' میں اس شہر کے تمام ڈیپارٹمنٹل اسٹور سے واقف ہوں آپ کس اسٹور کے مالک ہیں۔'' اس کے پوچھنے میں اشتیاق تھا میں گھبرا گیا۔ وہ سامنے آتی تھی تو جیسے عقل کو زنگ لگ جاتا تھا میں پھر بھول گیا کہ وہ بھی اسی شہر میں رہتی ہے اور شہر کے تمام چھوٹے بڑے اسٹورز سے واقف ہوگی۔

''وہ دراصل اسٹور اس شہر میں نہیں ہے۔'' اور پھر میں

نے اسے ایک دور دراز شہر کا نام بتایا جہاں اسٹور موجود تھا۔ میرے بتانے پر اس نے مجھے مشکوک سی نظروں سے دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو۔

وہاں کیا بینک نہیں ہے جو تم اتنی دور اس شہر میں پیسے رکھواتے ہو یا شاید اس لیے کہ وہاں سے پیسے اڑ کر میرے پاس پہنچ جاتے ہیں بھی میں دن میں کئی کئی بار انہیں جمع کروانے پہنچ جاتا ہوں خیر اس کی خاموشی میں میری عافیت تھی۔ میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے مزید کوئی سوال نہیں پوچھا تھا۔

اب میری سمجھ میں بات آ گئی تھی دل تو بہت مچلتا تھا مگر میں دن میں صرف ایک بار بینک جایا کرتا تھا وہ بھی بینک کے بند ہونے سے کچھ دیر پہلے اور اپنی تمام آمدن جمع کروا کے واپس آ جایا کرتا تھا پھر آخر ایک دن حوصلہ کر کے میں نے سلمٰی سے اپنے دل کی بات کہہ دی اس نے بھی میری پذیرائی کی اور کچھ ہی عرصہ میں ہم دونوں کی شادی ہوگئی۔ میں اپنے ماضی سے پھر حال میں لوٹ آیا۔

جوس کے چھوٹے چھوٹے سپ لیتے ہوئے میں نے وقت دیکھا مجھے یہاں بیٹھے ہوئے کافی وقت گزر گیا تھا۔ میں جوس کا بل دے کر باہر نکل آیا۔ دوپہر ڈھل چکی تھی سورج کی حدت کم ہوگئی تھی اور بازار کی گہما گہمی بڑھ گئی تھی مگر وہی نظارہ تھا۔ رنگین نسوانی آنچل اور مترنم نقرئی قہقہے میں نے تنگی سے منہ بنالیا ایک موٹا شکار ڈھونڈنے کے لیے مجھے پھر سے محنت کرنا پڑے گی۔ کاش عورتوں کی بھی کوئی جیب ہوتی پرس نہ ہوتے میں آہستگی سے بڑبڑایا۔

شام بھی ڈھلنے لگی تھی اور رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا جب مجھے ایک نوجوان نظر آیا اس کی جیب میں اس کا پرس بہت پھولا ہوا نظر آ رہا تھا پھر ایک جگہ جب اس نے کسی چیز کا بل دینے کے لیے پرس نکالا تو میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اس کے پرس میں مجھے کئی نیلے اور سبز نوٹ نظر آئے۔ میرے خیال میں اس کے پاس چالیس سے پچاس ہزار روپے نقد موجود تھے۔ اس سے پہلے کہ اس کو کوئی اور اچک لے جاتا میں نے اس کے پرس پر ہاتھ صاف کرنے کی ٹھان لی اور پھر ایک پر ہجوم جگہ سے گزرتے ہوئے اس سے ٹکرا گیا اس سے معذرت کی اس کے چہرے پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

”شکریہ۔“ اس نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ میں جلدی سے پبلک ٹوائلٹس کی طرف بڑھا۔ میرا چہرہ اس کامیابی سے جگمگا رہا تھا۔ میں نے ایک لمبی رقم اڑائی تھی میں نے دھڑکتے دل سے اس کا پرس نکالا یہ واقعی نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ جب میں نے نوٹ باہر نکالے تو میرا چہرہ دھواں دھواں ہوگیا۔ پہلے ایک نوٹ کے علاوہ سب نوٹ نقلی تھے حتیٰ کہ پرس میں موجود اے ٹی ایم کارڈ' کریڈٹ کارڈ اور شناختی کارڈ بھی نقلی تھے۔ شناختی کارڈ پر نمبر کی جگہ ایک مشہور ہوٹل کا نمبر درج تھا' میں اس صورت حال پر بھونچکا تھا۔ میں حیران تھا کہ وہ ان جعلی نوٹوں سے آخر کیا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے اور اگلے ہی لمحے مجھ پر حیرت سے قیامت گزر گئی۔ میری جیب سے میرا اپنا پرس غائب تھا' وہ مجھے دو اصلی نوٹ دے کر میرے بیس ہزار مالیت کے اصلی نوٹ لے گیا تھا۔

○

ایک سو سولہ چاند کی راتیں

عشنا کوثر سردار

یہ ناول 1947ء کے تقسیم ہندوستان کے پس منظر میں ہے، اس کے تمام کردار تقریباً 69 سال قبل کے ہیں جنہوں نے Partition سے ایک سو سولہ دن قبل جنم لیا، انڈو پاک کی تقسیم جب ہونے جا رہی تھی اس دوران اپنا سفر شروع کیا، جہاں ایک پاک سرزمین کی تاریخ رقم ہوئی ہمیں ایک آزاد مملکت کا احساس ملا وہیں محبت نے دلوں میں گھر بھی کیا، یہ سفر تب شروع ہوتا ہے جب ناول کے دو کردار پہلی بار 18 اپریل 1947ء کو ملے۔ اس سے آگے کی ایک سو سولہ راتیں ان کی ان کہی محبت کا ایک سفر ہے۔ جب تاریخ رقم ہو رہی تھی زمین ٹکڑوں میں تقسیم ہو رہی تھی تب خاموشی میں کہیں محبت دلوں کو جوڑ رہی تھی۔ زمین کی تقسیم نے دلوں کو تقسیم نہیں کیا تھا دلوں کو جوڑ دیا تھا اس تقسیم کی جو صعوبتیں ہماری ان نسلوں نے سہی تھیں ان کا اندازہ ہم نہیں کر سکتے مگر میں نے اس تکلیف کو اپنے اندر محسوس کیا ہے۔ میرے ناول کے کردار ان مصائب سے گزر رہے ہیں اور ان کے ساتھ میں نے بھی ان مصائب کی تکلیف کو محسوس کیا ہے وہ ڈر...... وہ خوف...... تمام احساسات میرے اندر کہیں مجھے محسوس ہوتے رہے ہیں۔

نیم تاریکی میں وہ دیکھ نہیں پائی تھیں کہ ان کے قریب کون کھڑا تھا ان کے شانے پر ہاتھ کسی نے رکھا تھا مگر اس گرفت میں احساس تحفظ صاف واضح تھا کوئی اسے بچانا چاہتا تھا یا مدد کرنا چاہتا تھا وہ جو کوئی بھی تھا اس کا ارادہ اسے نقصان پہنچانا نہیں تھا

"کو..... کون..... کون ہے؟" عین نے اس ہاتھ کو جھٹک کر قدرے دور ہوتے ہوئے اس اجنبی مددگار کا چہرہ دیکھنا چاہا تھا مگر تاریکی کے باعث وہ دیکھ نہیں سکی تھی مگر بھی کسی نے یقین سے کہا تھا۔

"آپ کے لیے اس تقریب میں آنا مناسب نہیں ہے نواب زادی، جتنی جلد ممکن ہو آپ کو یہاں سے نکل جانا چاہیے۔" وہ آواز وہی نغمگی لیے ہوئے تھی عین صاف پہچان سکتی تھی یہ وہی لڑکی تھی جو کچھ دیر قبل اس سے مخاطب تھی وہ اس کی مدد کرنا کیوں چاہ رہی تھی، کون تھی وہ؟ اور اس تقریب میں ایسا کیا ہوا تھا۔

"آپ خوشنما ہیں نا؟" عین نے خشک حلق سے بامشکل آواز برآمد کی تھی۔

"ہم جو کوئی بھی ہیں آپ کے خیر خواہ ہیں نواب زادی آپ برائے مہربانی جلد اس تقریب سے نکل جائیں یہاں آنا مناسب نہیں ہم آپ کو صرف یہی بتانے آئے تھے اگر آپ راستوں سے انجان ہوں تو ہم آپ کی مدد کر سکتے ہیں اس احاطے سے ایک دروازہ حویلی کے باہر جاتا ہے آیئے ہم آپ کو وہاں تک چھوڑ دیں۔" اس نغمگی والی آواز نے کہا تھا اور عین نے اس احاطے کی طرف دیکھا تھا پھر خوف کے ساتھ خوشنما کے ساتھ قدم اٹھانے لگی تھی۔ خوشنما اس کا ہاتھ تھام کر تیزی سے آگے بڑھنے لگی تھی۔

"یہ کیا راز تھا اس حویلی کا۔ تقریب میں ایسا کیا ہوا تھا عین کا دل بہت ڈر گیا تھا، خوشنما کئی راستوں سے ہوتی ہوئی اسے لے کر حویلی کے اس داخلی دروازے پر لے آئی تھی جہاں سے اس کے لیے اس حویلی سے نکلنا ممکن دکھائی دیا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے اور آپ ان راستوں کو کیسے جانتی ہیں کیا آپ اس گھر کی کوئی بچی ہیں ان راستوں سے تو ہم بھی واقف نہیں ہم تو بچپن میں کئی بار اس حویلی میں آتے جاتے رہتے ہیں والدین کے ساتھ مگر ہم نے حویلی کا یہ حصہ کبھی نہیں دیکھا۔" عین نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا تھا مگر خوشنما نے کوئی جواب نہیں دیا تھا بس رک کر خاموشی سے اپنے لبوں پر شہادت کی انگلی رکھ کر اسے مزید بولنے سے اور سوال پوچھنے سے منع کیا تھا اور عین اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

وہ یہاں سے وہاں نگاہ دوڑاتے ہوئے اس کے ڈرائیور کو ڈھونڈنے لگی تھی پھر شاید وہ اسے دکھائی دیا تھا اور اس نے اشارے سے اسے گاڑی اس داخلی دروازے کی طرف لانے کو کہا تھا۔ عین ششدر سی اسے دیکھ رہی تھی وہ اجنبی لڑکی اس کی مددگار بن رہی تھی ڈرائیور موٹر کار اس داخلی دروازے پر لے آیا تھا۔ خوشنما نے پلٹ کر عین کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا عین نے قدم آگے بڑھا دیے تھے اور تیزی سے چلتی ہوئی گاڑی میں بیٹھی تھی مگر اس نے اس مددگار کو پلٹ کر دیکھا تھا اور اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

"آپ بھی آ جائیں کیا آپ اس خطرہ سے نکلنا نہیں چاہیں گی آپ میری مدد کر رہی ہیں حویلی کا یہ کون سا راز ہے یہ کیا ماجرا ہے اور ہم اس بارے میں واقف کیوں نہیں ایسا کیا ہوا ہے آپ ہمیں اس بارے میں بتانا کیوں نہیں چاہتیں۔" عین نے دریافت کیا تھا خوشنما نے اس کی سمت دیکھا تھا اور مسکرا دی تھی۔

"نواب زادی ہم آپ سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتے ہمیں اس کی اجازت نہیں مگر ہم آپ کو اس جگہ سے فوری طور پر نکلتا دیکھنا چاہتے تھے ہم تو خطرات میں رہے ہیں ہمیں ان کا کوئی ڈر نہیں، آپ کی اور ہماری زندگی میں ایک واضح فرق ہے آپ کی عزت اور مرتبہ اہم ہے آپ خاموشی سے یہاں سے جائیے آپ کا یہاں رکنا مناسب نہیں۔" خوشنما نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نکال لیا تھا۔

کون تھی وہ؟ عین نے اسے الجھتی نظروں سے دیکھا تھا۔

"خوشنما آخری بات آپ ہمیں کچھ نہ بتائیں مگر کیا آپ سے دوبارہ ملنا ممکن ہو سکے گا ہم آپ سے ملنا چاہیں گے۔" عین نے الجھتے لہجے میں اس سے دوبارہ ملنے کا اظہار کیا تھا۔ وہ مسکرا دی تھی اور اس مسکراہٹ میں ایک یاسیت صاف محسوس کی جا سکتی تھی خوشنما کا دلکش چہرہ بجھا بجھا سا لگ

تھا ان آنکھوں کی ضیا اس لمحے ماند لگی تھی اور وہ مدھم لہجے میں بولی تھی۔

''اندھیرے کا ملن اجالا سے خال خال ہی ہوتا ہے نواب زادی ہم نہیں چاہیں گے کہ آپ ہم سے کبھی دوبارہ ملیں لیکن ایک بات آپ کو بتانا چاہیں گے جس شخص پر آپ اس لمحے اعتبار کر رہی ہیں وہ آپ کے اعتبار کے اس درجہ قابل نہیں ہے۔'' خوشنما نے کہا تھا اور عین چونکی تھیں۔

''کس کی بات کر رہی ہیں آپ؟''

''آپ جانتی ہیں ہم کن کی بات کر رہے ہیں نواب زادی، ہم سفر پر اعتبار کرنا اچھی بات ہے مگر اس درجہ اعتبار نقصان کا باعث بن سکتا ہے وہ بھی اس صورت میں جب کوئی وفادار ہی نہیں۔'' خوشنما نے جانے کیا جتانے کی کوشش کی تھی، عین سمجھ نہیں پائی تھی خوشنما نے کھڑکی میں جھک کر اسے مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔

''الوداع اے دوست ہم نہیں چاہتے آپ ہمارا یا اس ملاقات کا ذکر کسی سے کریں یا اس حویلی میں ہونے والے اس واقعہ کا ذکر باہر کسی سے کریں یہاں یہ باتیں معمولی نہیں امراء اور روساء کی تقریبات میں ایسی باتیں کثرت سے واقع ہوتی ہیں آپ ان رازوں سے دور رہیے آپ کے لیے یہی مناسب ہے مگر آنکھیں کھول کر لوگوں کا جائزہ ضرور لیجیے اور ان پر اس بنا پر اعتبار کریں۔'' اس نے نرمی سے سمجھایا تھا اور پلٹ کر وہاں سے چلتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی عین اسے دیکھتی رہ گئی تھی حتیٰ کہ ڈرائیور نے موٹر گاڑی آگے بڑھا دی تھی اور وہ منظر پیچھے چھوٹنے لگا تھا مگر عین تا دیر گردن موڑ کر اس منظر کو دیکھتی رہی تھی اور ذہن الجھتا چلا گیا تھا۔

''یہ کیا ہوا تھا۔ اس تقریب میں ایسا کیا واقعہ رونما ہوا تھا کہ خوشنما نے اسے وہاں سے واپس بھیج دیا تھا یہ کیسا راز تھا اور وہ اس سے واقف کیوں نہیں تھی خوشنما نے کیوں کہا تھا کہ وہ کسی پر اعتبار کر کے غلط کر رہی ہے۔

کیا حیدر پر اعتبار کرنا غلط تھا۔

حیدر سراج الدولہ اس کا ہونے والا ہمسفر۔

جس کے نام اور ذکر کے ساتھ اس نے ہوش سنبھالا تھا کیا تھا کہ وہ اس پر اعتبار نہ کرے ایسا کیا راز تھا جو اس رات واقع ہوا تھا وہ کیا نہیں جانتی تھی اسے غافل کیوں رکھا جا رہا تھا اور اس طرح اس تقریب سے اس کا نکلنا اس کا ذہن بری طرح الجھنے لگا تھا۔ اس سے کیا چھپایا جا رہا تھا۔

وہ حیدر سے نہیں ملی تھی جب سے اس تقریب میں آئی تھی کئی سسرالی رشتے داروں سے اسے ملوایا جاتا رہا تھا مگر اس دوران حیدر ایک بار بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔

خوشنما نے اسے حیدر سے محتاط رہنے کو کیوں کہا تھا وہ حیدر کے بارے میں اس قدر کیسے جانتی تھی اور ایسا کیا تھا جو وہ نہیں جانتی تھی اور وہ اس حویلی کی ہونے والی بہو تھی پھر ایسے رازوں سے اس درجہ انجان کیوں تھی۔

خوشنما کیوں اس کی مدد کر رہی تھی اور کون تھی یہ سارے عجیب الجھا دینے والے سوال تھے اور ان سوالوں میں کئی راز تھے اور وہ کسی ایک راز کو بھی جاننے سے قاصر تھی گھر آنے تک وہ انہی سوچوں سے الجھتی رہی تھی۔

''کیا ہوا اتنی جلد کیوں واپس آ گئیں آپ؟ تقریب میں دل نہیں لگا آپ کا نواب زادی۔'' جمن بوا نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا مگر وہ اس کا سوال کا جواب دیے بنا چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی تھیں۔

خوشنما کا چہرہ اور لہجہ ذہن میں گھومتا رہا تھا۔

وہ کون تھی وہاں اس تقریب میں موجود کیوں تھی اور سب سے بڑی بات اس کی مدد کیوں کر رہی تھی ایک بات اور جو اسے چونکا رہی تھی یہ تھی کہ وہ اس حویلی کے راستوں سے اس درجہ واقف کیسے تھی؟ اس حویلی سے اس کا کیا ربط جڑا تھا۔

''کیا ہوا آپ کب واپس آئیں۔'' اماں نے اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا غالباً وہ روم کے باہر سے گزر رہی تھیں جب نگاہ ان پر پڑی تھی اور وہ حیرت سے چلتی ہوئیں کمرے میں آ گئی تھیں عین چونکیں تھی اماں کو دیکھا تھا فوری طور پر وہ کچھ بول نہیں سکی تھی۔

''عین آپ ٹھیک ہیں۔'' اماں نے پاس آ کر فکر مندی سے اس کی پیشانی کو چھو کر دیکھا تھا تب جیسے عین نے کسی گہرے خواب سے بیدار ہوتے ہوئے سر ہلایا تھا۔

''ہم ٹھیک ہیں اماں دراصل......!'' وہ کوئی بہانہ بناتے بناتے رہ گئی تھی فوری طور پر کچھ نہیں سوجھا تھا کوئی کہانی نہیں گھڑی گئی تھی۔

"آپ کے سسرال کی اتنی بڑی تقریب تھی عین آپ کو اس طرح درمیان میں چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا آپ کی ساس کا ٹیلی فون آیا تھا ابھی کچھ دیر قبل تبھی ہمیں خبر ہوئی کہ آپ تقریب سے واپس آ گئی ہیں یہ خاصی بچکانہ حرکت ہے عین آپ سمجھدار ہوگئی ہیں آپ کو بیاہ کر کے اسی گھر میں جانا ہے اسی گھر کو سنبھالنا ہے مانا آپ پر کوئی ذمہ داری کبھی ڈالی نہیں گئی مگر اب آپ کو خود کو ذہنی طور پر ان ذمے داریوں کو قبول کرنے کے لیے آمادہ کرنا ضروری ہے اور کچھ دنوں میں شادی ہوجائے گی اس بچپنے کے ساتھ کیسے سنبھالیں گی آپ اس حویلی اور اس کے معمولات کو؟" اماں اس سے واپسی کی وجہ معلوم کیے بنا اسے ڈپٹنے لگی تھیں وہ اس کے تقریب سے لوٹ آنے کو اس کا بچپنا تصور کررہی تھیں اور عین ان کو فوری طور پر کوئی وضاحت نہیں دے سکی تھی اس کی نگاہ سے خوشنما کا چہرہ ہٹ نہیں رہا تھا اور خوشنما کے لفظ۔

وہ الجھتی چلی گئی تھی۔

"کیا ہوا طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی۔" اماں نے اسے خاموش دیکھ کر اس کی پیشانی کو چھوا تھا اور عین نے سر ہلا دیا تھا اور بامشکل خشک حلق سے آواز برآمد کرتے ہوئے بولی تھی۔

"ہم......ہم ٹھیک ہیں اماں۔ آپ ہمارے بارے میں فکر نہ کریں دراصل ہمارے سر میں اچانک درد اٹھا اور ہم اس تقریب میں ٹھہر نہیں سکے طبیعت اچانک گھبرانے لگی کہ ہم نے تقریب کو درمیان میں چھوڑ کر وہاں سے نکلنا مناسب خیال کیا، بہرحال ہم معذرت کرلیں گے۔" اس نے مدہم لہجے میں کہتے ہوئے ماں کی طرف دیکھنے سے گریز کیا تھا اماں نے اس کا چہرہ بغور دیکھا تھا پھر نرم لہجے میں بولی تھیں۔

"ہم آپ کے لیے دوا بجھوا دیتے ہیں آپ کھا کر آرام کریں باقی معاملات ہم دیکھ لیں گے۔" اماں اٹھی تھیں اور چلتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تھیں عین نے انہیں دیکھتے ہوئے سر تکیے پر رکھ کر آنکھیں موندلی تھیں۔

☆☆☆......

آنکھ ایک بھرپور خوف کے احساس سے کھلی تھی دل اتنی شدت سے دھڑکا تھا کہ اسے لگا تھا پھٹ کر سینے سے باہر آجائے گا، اتنی قتل وغارت گری کا منظر تھا اس کی نگاہ حسرت زدہ رہ گئی تھی۔

حملہ آور جانے کب ٹرین میں گھس آئے تھے لاشوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ وہ ساکت رہ گئی تھی جب تیمور نے اس کا ہاتھ تھام کر کھینچا تھا اور ٹرین سے اتر گیا تھا وہ حواس باختہ تھی۔

"تیمور.....ہم کہاں ہیں ہم کیا کریں گے یہ لوگ۔" وہ غارت گری کا منظر دیکھ کر ششدر رہ گئی تھی۔

"آپ خاموش رہیے فی الحال کوئی بات نہیں۔" تیمور اسے لے کر آگے بڑھنے لگا تھا بلوہ کرنے والے ان کا پیچھا کررہے تھے شاید وہ نگاہ موڑے بنا اور پیچھے دیکھے بنا اس کے ساتھ اپنا وجود گھسیٹتی لے جارہی تھی کراہنے کی آوازیں شور چیخ وپکار اس کا دماغ پھٹنے لگا تھا۔

"تیمور ان لوگوں کو مدد کی ضرورت ہے یہ ہمارے اپنے لوگ ہیں ہمیں رک کر ان کی مدد کرنا چاہیے کہاں لے جارہے ہیں آپ مجھے پوری ٹرین کے لوگوں کو ذبح کردیا ہے ان لوگوں نے وہ ہمیں بھی نہیں چھوڑیں گے کہاں بھاگ رہے ہیں ہم نہیں بچ سکیں گے تیمور یہ بھاگنے کی کوشش عبث ہے ہم بچ نکلنے میں ناکام رہیں گے ہم بھی مارے جائیں گے ان تمام لوگوں کی طرح اور ان تمام لوگوں کی طرح۔ یہ لاشیں دیکھیں آپ اور انہوں نے ہمیں کیسے چھوڑ دیا ٹرین میں تو ہم بھی تھے ناپوری ٹرین کو بے رحمی سے کاٹ ڈالا ان بے رحموں نے تو ہمیں کیسے چھوڑ دیا۔" وہ مسلسل بولتی جارہی تھی مگر تیمور خاموشی سے اسے لے کر آگے بڑھتا جارہا تھا راستے انجان تھے وہ کسی مقام سے واقف نہیں تھی کیسی مشکلات کا دور تھا وہ گھر سے بے گھر تھے کھلے آسمان کے نیچے بے یارومددگار سرپٹ دوڑ رہے تھے عین نے گردن موڑ کر دیکھا تھا بلوہ کرنے والے حملہ آور بہت پیچھے رہ گئے تھے ٹرین کی پٹڑیوں پر بھاگتی دوڑتی وہ ٹرین لاشوں کا ڈھیر بنی ساکت کھڑی تھی کتنی پیچھے چھوٹ گئی وہ ٹرین موت کا وہ احساس کہیں پیچھے چھوٹ گیا تھا کتنے لوگ تھے اس ٹرین میں زندگیاں جامد ہوگئی تھیں عین کو یاد آیا تھا جب وہ اس ٹرین پر سوار ہونے تھے تو بہت سے لوگ ایک خوف کے ساتھ اپنا سفر شروع کررہے تھے کئی باتیں تھیں خوف کی

کہانیاں تھیں کہ کئی ٹرینوں کو اس طرح پاکستان جانے سے روک دیا گیا تھا کئی لاشوں کے ڈھیر تھے شاید اس ٹرین میں سے بچ جانے والے وہی دو لوگ تھے جو بھاگ نکلے تھے وہ نیند سے جاگی تھی جب اس نے لاشوں کے ڈھیر کو دیکھا تھا منظر ساکت کر دینے والا تھا۔

اس کو کچھ سوچنے کا وقت ہی نہیں ملا تھا جب تیمور نے تیزی سے اس کا ہاتھ تھام کر کھینچا تھا اور ٹرین سے باہر کود گیا تھا اور اسے لے کر بھاگنے لگا تھا وہ ان خون آلود مناظر کو دیکھتی رہ گئی تھی کتنے سر دھڑ سے الگ کر دیے گئے تھے وہ قیامت کا منظر تھا اور ایسے مناظر وہ کثرت سے دیکھتی رہی تھی اس کے اپنے پیاروں کو دیکھا تھا اس نے اماں...... ابا...... ان کے سر دھڑ سے الگ پڑے تھے اور وہ پلنگ کے نیچے چھپی سانس روکے بیٹھی تھی۔ حملہ کرنے والے لوٹ مار کر کے گھر سے نکل گئے تھے کسی کی نگاہ اس پر نہیں پڑی تھی وہ خوف کے مارے شاید مر جاتی جب تیمور وہاں آ گیا تھا۔ تیمور نے اسے وہاں سے نکالا تھا اور یہ بھاگنے کا سفر تب سے جاری تھا زندگی موت سے بھاگ رہی تھی۔

فرار...... مسلسل فرار......!

وہ تھک کر رک گئی تھی اس سے مزید بھاگا نہیں جا رہا تھا۔

''ہم نہیں بھاگ سکتے اور......!'' اس نے ہانپتے ہوئے تیمور کی طرف دیکھا تھا۔ تیمور نے رک کر اسے دیکھا تھا اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا ہونٹوں پر پپڑی جمی تھی ان کے پاس پانی بھی نہیں تھا۔

''ہم کیوں بھاگ رہے ہیں تیمور اتنے لوگ مر رہے ہیں ہم بھی مر جائیں گے یہ فرار کیوں؟'' اس نے مدہم لہجے میں کہتے ہوئے نڈھال ہو کر تیمور کے شانے پر سر رکھ دیا تھا اس کا دل جیسے پھٹ رہا تھا جان جیسے وجود سے نکل رہی تھی اس میں اور ہمت نہیں تھی، ان تین چار دنوں میں اس نے زندگی کا بھیانک چہرہ دیکھا تھا۔ تیمور اسے بچانے کی کوشش کیوں کر رہا تھا وہ سمجھ نہیں پائی تھی، اسے یاد آیا تھا جب حیدر نے ہجوم میں چھوڑ دیا تھا وہ پاکستان جانے والی ایک ٹرین میں سوار ہو گیا تھا اور وہ جو اس کا ہاتھ تھامے تھی اس کا ہاتھ وہیں چھوڑ دیا تھا وہ بھیڑ میں اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی وہ ٹرین میں اس کے ساتھ سوار ہونا چاہتی تھی جب تیمور

نے اسے محل سے بحفاظت نکالا تھا تو تب اس نے تیمور سے درخواست کی تھی کہ وہ اسے حیرت سے ملا دے اور تب تیمور نے اس کا ہاتھ تھاما تھا اور اسے لے کر نکل پڑا تھا۔

"میں نہیں چاہتا آپ ایک عمر پچھتاوے میں گزار دیں کہ آپ حیدر سے مل سکتی تھیں اور آپ نہیں ملیں، سو میں آخری سانس تک لڑوں گا اور آپ کو آپ کے حیدر تک ضرور پہنچاؤں گا میں آپ کو آپ کی محبت میں سرخرو دیکھنا چاہتا ہوں عین، اس کے لیے کوئی دوسری بات میری سمجھ میں نہیں آتی آپ کی خوشی اہم ہے۔" وہ مدہم لہجے میں گویا ہوا تھا بنا اس کی سمت دیکھے اس کا ہاتھ تھاما تھا اور سفر کا آغاز کر دیا تھا اس کے انداز میں تحفظ تھا اس گرفت میں تقدس تھا وہ مددگار بنا تھا اس کا ہاتھ اس سفر کے لیے تھاما تھا جس میں اس کا ہمسفر وہ نہیں تھا مگر وہ فقط اس کی خواہشوں کا احترام کر رہا تھا اس سفر میں اسے اس شخص سے ملانے کی ٹھان چکا تھا جو بھیڑ میں عین کے ہاتھ سے ہاتھ چھڑا کر خود پاکستان جانے والی ایک ٹرین میں سوار ہو گیا تھا۔

عین کو تب بھی یقین نہیں آیا تھا کہ حیدر نے ہاتھ گویا دانستہ چھڑایا تھا یا یہ محض اتفاقاً اس بھیڑ کے باعث ہوا تھا حیدر نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا اور وہ کوئی جواز نہیں ڈھونڈ پائی تھی اس کے اندر کوئی سوال نہیں اٹھا تھا اسے بس یہ یاد تھا کہ وہ تنہا تھی۔ اماں ابا کے گزر جانے کے بعد وہ بالکل تنہا رہ گئی تھی اور اس کا منگیتر جو اس کا ہاتھ تھام کر چل رہا تھا وہ بھیڑ میں کہیں آگے نکل گیا تھا اور وہ اتفاقاً پیچھے رہ گئی تھی۔ وہ ہر بات کو مثبت ذہن کے ساتھ سوچ رہی تھی اسے لگا تھا اتفاقاً اس کا ہاتھ حیدر کے ہاتھ سے نکل گیا تھا اور حیدر کو بھیڑ نے اتنی شدت سے آگے دھکیلا تھا کہ وہ پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھ پایا تھا وہ ساکت کھڑی تھی جب تیمور نے اس کا ہاتھ تھاما تھا اس نے چونک کر اس چہرے کو دیکھا تھا۔

"مجھے حیدر کے ساتھ جانا ہے تیمور، وہ آخری سہارا ہیں میرا میں ان کے بنا زندگی کا کوئی احساس یا تصور نہیں رکھتی وہ میرے منگیتر ہیں اگر کوئی باقی ماندہ زندگی ہے یا کوئی باقی ماندہ سفر ہے تو میں اسے اپنے ہمسفر کے نام کے ساتھ جینا چاہتی ہوں پلیز مجھے پاکستان پہنچا دو حیدر پاکستان کی طرف سفر آغاز کر چکا ہے میں پاکستان پہنچ کر اس سے ملنا چاہتی ہوں مجھے اس تک پہنچنے میں مدد دو۔" اس نے مدہم لہجے میں درخواست کی تھی نظریں تیزی سے فراٹے بھرتی اس ٹرین کو دیکھ رہی تھیں جو تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی فاصلے بڑھاتی کسی اپنے کو بہت دور لے گئی تھی عین کو اپنے تنہا ہونے کا احساس شدید ترین ہوا تھا جیسے وہ بھری دنیا میں خالی ہاتھ تنہا کھڑی تھی بے یار و مددگار اکیلی۔

تیمور بہادر یار جنگ نے تب اس کا ہاتھ تھاما تھا اور اس نے پلٹ کر اس کی سمت نگاہ کی تھی۔

"آپ کو بحفاظت آپ کی منزل تک پہنچانے کی ذمہ داری ہماری ہے اور ہم یہ ذمہ داری ضرور پورا کریں گے ہم نہیں جانتے خدا کو اس سفر سے کیا مقصود ہے مگر اگر یہ سفر چند دنوں کا بھی لکھا ہے تو ہم اس میں آپ کا ساتھ دینا ضرور چاہیں گے آپ کے مددگار کے طور پر ہی سہی، ہم آپ کے ہمراہ چلیں گے اور قدم قدم آپ کو سہارا دیں گے ہماری اولین ترجیح آپ ہوں گی عین، اس کا وعدہ ہم آپ سے کرتے ہیں۔" وہ مضبوط لہجے میں کہہ رہا تھا اور وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

سفر کٹھن تھا صعوبتوں سے بھرا کٹھنائیاں زیادہ تھیں وہ نہیں جانتی تھی وہ صحیح سلامت پاکستان پہنچ پائے گی کہ نہیں مگر وہ اس لہجے کی مضبوطی پر اسے خاموشی سے دیکھتی رہی تھی لکھنؤ سے جو سفر شروع ہوا تھا اس کی کوئی سمت نہیں تھی اور آج جب ان کو تین دن اور تین راتیں مسلسل سفر کرتے ہوگئی تھیں تو تب بھی گمان نہیں تھا کہ منزل تک پہنچ پائیں گے کہ نہیں اس نے تھکن سے رک کر گہری سانس لی تھی اور سر نفی میں ہلایا تھا۔

"ہم مزید نہیں چل سکتے تیمور ہم میں ہمت نہیں ہے۔" اس نے جیسے ہار مان لی تھی اور گھٹنوں کے بل وہیں زمین پر بیٹھ گئی تھی، تیمور نے اسے کم ہمت ہوتے دیکھا تھا اور اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا تھا، اسے بغور دیکھا تھا اس کا وجود تھکن سے شل تھا نگاہوں میں ویرانی تھی اور چہرہ زرد ہو رہا تھا وہ نگاہ زندگی کا احساس کھو رہی تھی تیمور نے آہستگی سے اس کے ہاتھوں کو تھاما تھا۔

"ہم تھک کر رک نہیں سکتے عین ہمیں پاکستان جانا ہے، آپ کو آپ کے حیدر میاں سے ملنا ہے ایک نئی زندگی آپ

کی منتظر ہے اگر ہم تھک کر رک گئے تو ہم اپنی منزل سے دور ہو جائیں گے کیا آپ چاہیں گی کہ آپ کا سفر طویل ہو؟'' وہ یقیناً اس کی ہمت بڑھا رہا تھا اسے حوصلہ دینا چاہتا تھا مگر وہ سر انکار میں ہلانے لگی تھی۔

''ہم اس طرح دن رات بھی چلتے رہے تو ہم پاکستان نہیں پہنچ سکتے تیمور خدا کی یہ زمین بہت بڑی ہے اور ہمیں تو یہ بھی خبر نہیں کہ اس وقت ہم کہاں ہیں ٹرین میں تھے تو ہمیں امید تھی کہ ہم پاکستان پہنچ جائیں گے۔'' مگر اب جب حملہ آوروں نے یہ امید بھی چھین لی ہے تو ہم کیا کریں، تم نے ہمیں کیوں بچایا تیمور وہاں مر جانے کیوں نہیں دیا، جب اپنے لوگوں کو بے رحمی سے مارا جا رہا ہے تو ہم کیوں نہیں مر سکتے ہماری زندگی کا کیا مقصد باقی رہا ہے اماں ابا نہیں رہے جلال کی خبر نہیں، فتح النساء جانے کہاں ہے اپنا ہے ہمارا تو کوئی اپنا باقی نہیں رہا حیدر تھے وہ بھی بھیڑ میں کھو گئے وہ تو شاید پاکستان بھی پہنچ گئے ہوں گے نا، ان کی ٹرین تو تین دن قبل نکلی تھی خدا کرے وہ ساتھ خیریت سے لاہور پہنچ گئے ہوں ہم ان کی سلامتی کی دعا کرتے ہیں ہمیں یقین ہے وہ ضرور ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔'' عین کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر تیمور کے ہاتھوں کی پشت پر گر رہے تھے اس نے جو عین کے ہاتھ تھام رکھے تھے وہ نگاہ جھکا کر اس کے ہاتھوں کو دیکھنے لگا تھا وہاں مہندی کے کئی نقش و نگار بنے تھے اور ان نقش و نگار میں کہیں حیدر کا نام بھی درج تھا عین کی شادی ہو رہی تھی۔

ان کے ہاتھوں پر حیدر کے نام کی مہندی رچی تھی جس رات پاکستان اور انڈیا کے دو حصوں میں بٹنے کی خبر سنے بلوہ کرنے والوں کو اکسا دیا تھا اور اس حصے میں صورت حال انتہائی کشیدہ ہو گئی تھی۔

ان کا اگلے دن نکاح منعقد تھا مگر وہ سلسلہ وہیں ختم گیا تھا؟

''آپ بہت سے اچھے دن رکھتی ہیں عین آپ اپنے اچھے دنوں کو سوچیں وہ دن آپ کو امید دیں گے دیکھیے اس ہتھیلی میں آپ کے منگیتر کا نام درج ہے وہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں کیا آپ نہیں چاہتیں یہ دوریاں مختصر ہو جائیں۔'' وہ اس کو ہمت دینے کی کوشش کر رہا تھا عین نے نگاہ جھکا کر اپنی ہتھیلیوں کو دیکھا تھا جہاں حیدر کے نام کی مہندی رچی تھی وہ ڈبڈبائی نظروں سے ان نقش و نگار کو دیکھنے لگی تھی ان آنکھوں کے پیمانے چھلکنے کو تھے جب تیمور نے ہاتھ بڑھا کر ان آنسوؤں کو بے قدر ہونے سے بچایا تھا عین نے خاموشی سے تیمور کو دیکھا تھا تیمور اسے بغور دیکھنے لگا تھا۔

''اچھے دوست ہیں نا ہم، کیا آپ میری اتنی سی بات نہیں مان سکتیں۔'' وہ لہجہ جیسے درخواست کر رہا تھا۔

''ہمیں بہت پیاس لگی ہے تیمور ہم آگے مزید نہیں چل سکتے ان بے سمت راستوں پر چلتے ہم تھک گئے ہیں ہمیں ڈر ہے ہم انہی راستوں کی خاک نہ ہو جائیں کسی ذرائع کے بنا اتنی دوری کا سفر ممکن نہیں ہم اتنا طویل سفر نہیں کر پائیں گے قدموں پر اتنے طویل فاصلے عبور کرنا ناممکن ہوگا ہمیں ہار مان لینا ہوگا واپس پلٹنے کی ہمت نہیں اگر پلٹیں گے بھی تو ہم ان حملہ آوروں کا نشانہ بن جائیں گے وہ ہمیں نہیں بخشیں گے اور اس سے آگے ہم نہیں بڑھ پائیں گے سفر کہیں روک دینا لازم ہوگا آپ کو ہم سے متفق ہونا پڑے گا یہاں کوئی مدد کو نہیں آئے گا دیکھیے آفتاب غروب ہو رہا ہے اور اس ویرانے میں دور تک کسی منزل کا کوئی پتا نہیں ہے دور تک بس زمین دکھائی دے رہی ہے خالی زمین اور دور تک پھیلا بس یہ آسمان، ہم آسمان اور زمین کی تقسیم میں جکڑے بے بس کھڑے ہیں تیمور اس سے آگے کوئی منزل نہیں ہے۔'' عین کا لہجہ کم ہمت اور نقاہت سے بھرا تھا آواز اتنی مدھم تھی کہ وہ بامشکل سن رہا تھا۔

وہ ہمت ہار رہی تھی مگر تیمور اسے اتنا کم ہمت ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا تبھی بولا تھا۔

''زمین اور آسمان کی تقسیم کو بھول جائیے آپ خدا نے ہمارے سامنے جو زمین رکھی ہے دیکھیے اس پر کوئی لکیر نہیں ہے ہم اس پر آزاد چل سکتے ہیں اگرچہ ہمیں نہیں پتا کہ ہم کہاں ہیں اور کس سمت جا رہے ہیں مگر چلنا قدم روک دینے سے کہیں بہتر ہے یہ زمین کے کسی کنارے پر رک جائیں اور وہیں زندگی کے نشان ہوں گے ہمیں اس کا یقین ہے۔'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے حوصلہ دے رہا تھا عین نے نڈھال سی ہو کر اس کے شانے پر سر رکھ دیا تھا۔

اولین شام کا چاند اور غروب ہوتا کہ آفتاب انہیں

خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔

”کسی سفر کی کوئی منزل باقی نہیں ہے تیمور ہم حملہ آوروں سے تو بچ گئے مگر اس ویرانے میں کسی نہ کسی جانور کا لقمہ اجل ضرور بن جائیں گے سائے گہرے ہو رہے ہیں اور گہرے ہوتے سائے اپنے ساتھ ایک خوف بھی لا رہے ہیں ہم تھوک چکے ہیں اب اس سفر کو جاری نہیں رکھ سکتے حقیقت یہ کھلی ہے کہ زمین کی تقسیم کرنے والوں نے آسمان کو بھی حصوں میں بانٹ دیا ہے اور ہمارے لیے زمین تنگ ہوگئی ہے ہم بٹے ہوئے آسمان وزمین میں مسلسل سفر نہیں کر سکتے بٹے ہوئے حصے قدم روک دیں گے اور سر پر پھیلا یہ آسمان جلد سمٹ جائے گا یہ تقسیم زمین کی نہیں ہوئی زندگی کی ہوئی ہے دیکھو زندگی موت کے ساتھ تقسیم ہوگئی ہے سانسوں میں گھٹن بڑھ رہی ہے یہ گھٹن سانسوں کو روک دینے والی ہے سانسیں رک جائیں گی تیمور تم کیوں بے سمت، بے مقصد سفر کرنے پر انکسار رہے ہو، یہاں کوئی زمین نہیں ہے کوئی آسمان نہیں ہے ہم بے یار و مددگار مارے جائیں گے۔ بس یہی حقیقت ہے۔“ وہ نڈھال سی مدھم لہجے میں بولی تھی وہ آنکھیں موندرہی تھی غنودگی میں جانے کو تھی تیمور نے اسے پکڑ کر جھنجوڑ دیا تھا۔

”آپ اتنی جلدی ہمت کیسے ہار سکتی ہیں ہم بے سمت ضرور چل رہے ہیں مگر ہمیں یقین ہے یہاں کوئی راستہ ضرور نکلے گا آپ ہوش میں رہیے، حوصلہ رکھیے ہم آپ کے ساتھ ہیں آپ تنہا نہیں ہیں اچھے لمحوں کے بارے میں بات کرنا بہت ہمت دیتا ہے آپ حیدر میاں کا ذکر کریں ان کی باتیں کریں ہم سنیں گے آپ کی شادی ہو رہی تھی ان سے ایک نئی زندگی منتظر تھی پھر کیا ہوا یہ بھول جائیں یہ سوچیں کتنے خواب تھے آپ کے آپ کتنی خوش تھیں وہ آپ کے ہمسفر آپ سے ملنے آتے تھے نا کیا باتیں ہوئی تھیں؟ کیا آپ ہمیں نہیں بتائیں گی دوستوں سے دل کی باتیں کی جا سکتی ہیں نا اچھا بتائیے کیا حیدر میاں نے آپ کو وہ اظہار سونپ دیا تھا محبت کا وہ یقین دے دیا تھا۔“ وہ اسے بولنے پر اکسانے لگا تھا اس کے لیے اس نے اس کا من پسند ذکر چھیڑا تھا عین اسے آنکھیں کھول کر خالی خالی آنکھوں سے دیکھنے لگی تھی۔

”محبت اعلیٰ مقصد ہے تیمور تم نہیں جانتے محبت کس طور سانس لیتی ہے مگر محبت میں ہر سانس بہت گراں لگتی ہے۔“ عین کم ہمت لہجے میں مدھم آواز میں بولی تھی تیمور نے اس کی بند ہوتی بوجھل آنکھوں کو دیکھا تھا اور اس کا چہرہ تھپتھپایا تھا۔

”عین محبت جس طور پر سانس لیتی ہو محبت ایک امید ضرور دیتی ہے دیکھیے آپ نے ایک سفر کا آغاز ایک یقین کے ساتھ کیا ہے اب اس یقین کو اس طرح مرنے مت دیں میں آپ کے ساتھ ہوں اور میں حوصلہ مند ہوں آنکھیں کھولیے اور ایک نئی ہمت کے ساتھ اس سفر کا آغاز کیجیے ہم جہاں کہیں بھی ہیں اس وقت حملہ آوروں سے بہت دور ہیں کیا یہ مثبت نشانی نہیں؟ زندگی کے نشان ہم ڈھونڈ لیں گے۔ آپ اٹھیے اب آپ کو پیاس لگی ہے تو ہم آپ کے لیے پہلے پانی کی تلاش کرتے ہیں اس کے بعد ہم سفر کا ایک نئی سوچ کے ساتھ آغاز کریں گے۔“ تیمور نے اس کا چہرہ تھپتھپایا تھا اور اسے اٹھا کر مضبوطی سے کھڑا کر دیا تھا عین نے سر ہلایا تھا۔

گویا وہ اس سفر کے لیے آمادہ تھی اور تیمور کے لیے یہ کافی تھا تیمور اس کا دھیان بٹانے کو یوں ہی باتیں کرنے لگا تھا۔

”اچھا بتائیے اپنے حیدر میاں کے مقابلے میں آپ نے ہمیں کبھی گھاس کیوں نہیں ڈالی ہم کیا ایسے گئے گزرے تھے؟“ وہ مسکرایا تھا عین اسے خاموشی سے دیکھنے لگی تھی تیمور نے چلنے کے لیے قدم اٹھائے تھے اسے سہارا دے کر اپنے ساتھ ہم قدم کیا تھا عین اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی تھی۔

”آپ سے عجیب سی الجھن ہوتی تھی آپ میں ایٹی ٹیوڈ زیادہ تھا۔“ وہ بولی تھی اور وہ مسکرا دیا تھا اس کی سمت بغور دیکھنے لگا تھا۔

”ایٹی ٹیوڈ اور ہم میں۔ ہم تو خاصا ڈرتے تھے آپ سے خوف سے گھگھی بندھ جاتی تھی ہماری آپ کے سامنے تو ہم ایک لفظ بھی بول نہیں پاتے تھے کچھ نہ کہنے پر آپ اتنی کڑی سزائیں دیتی تھیں اگر کچھ کہنے کی گستاخی کر لیتے تو آپ نے جان لے لینی تھی اس میں جو بھی تھا خوف تھا بس، ایٹی ٹیوڈ کہاں تھا میڈم؟ آپ نے تو اس جنس نازک کو قدموں میں مرکر کے مرغا بنا دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی

''تھی اب اور ہم کیا کرتے۔'' وہ مسکرایا تھا عین اس کے ساتھ چلتی ہوئی نفی میں سر ہلانے لگی تھی۔

''ہاں مگر آپ ہار نہیں مانتے تھے نا، ایک بار بھی کہا کہ ہم تھک گئے ہیں اور سزاؤں کا سلسلہ بند کردیجیے بھی ایک بار بھی درخواست کی کہ ظلم کا یہ سلسلہ موقوف کردیجیے۔'' وہ ایک ہمت سے اسے دیکھنے لگی تھی وہ مسکرادیا تھا۔

''اچھا تو آپ چاہتی تھیں ہم آپ کے سامنے جھک جاتے اور درخواست کرتے، تو آپ سے ہماری وہ اکڑ برداشت نہیں ہوتی تھی۔'' وہ سفر کی تمام صعوبتوں کو بھول کر مسکرایا تھا۔

''ہاں نہیں برداشت ہوتی تھی وہ اکڑ ایٹی ٹیوڈ صرف لڑکیوں کو سوٹ کرتا ہے مردوں کو ہمیشہ جھکاؤ راس آتا ہے وہ جھکاؤ جس میں ایک خاص فکر اور خیال پوشیدہ ہوتا ہے جب کوئی جان بوجھ کر ہار مانتا ہے تو اچھا لگتا ہے۔'' عین بولی تھی۔

''اوہ اور آپ چاہتی تھیں ہم جان بوجھ کر ہار مان لیتے اچھا اگر بات مان لیتے تو کیا آپ ہمارے حق میں فیصلہ دے دیتیں؟'' تیمور نے پوچھا تھا وہ نفی میں سر ہلانے لگی تھی۔

''ایسا نہیں ہوتا ہم حیدر کے علاوہ کسی کے نہیں ہوسکتے۔'' وہ بنا کوئی لحاظ مروت رکھے صاف گوئی سے بولی تھی اور تیمور برا مانے بنا مسکرادیا تھا۔

''اچھا آپ کو پہلی بار کب احساس ہوا تھا کہ آپ کو محبت ہے۔''

''ہم نہیں جانتے ہمیں یہ احساس کب ہوا'' وہ اس کی سمت سے نگاہ پھیرتے ہوئے مدہم لہجے میں بولی تھی وہ اس سے نگاہ ملائے کیوں نہیں رکھ سکی تھی اس کی وجہ وہ نہیں جانتا تھا مگر وہ جانتا تھا اس کا لہجہ حیدر میاں کی محبت سے بوجھل تھا ان آنکھوں میں ایک روشنی کی لپک تھی۔

''آپ واقعی حیدر میاں سے اس درجہ محبت کرتی ہیں؟'' وہ جیسے یقین کرنے کو پوچھنے لگا تھا اور تب عین نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

''ہم حیدر کے خواب دیکھتے عمر کے اس حصے میں آئے ہیں ہمیں ان کو سوچ کر سانسیں لینے کی عادت ہوچکی ہے ہم ان کے خیال کے بنا کسی لمحے کا تصور نہیں رکھتے یہ محبت ہے یا کوئی اور احساس یا صرف عادت ہم نہیں جانتے مگر یہ احساس ہمیں اپنے اندر دھڑکتا محسوس ہوتا ہے۔'' عین نے برملا کہا تھا۔

''محبت عادتوں میں شمار ہونے والی شے نہیں ہے عین محبت کو صرف عادت سمجھ کر جاری رکھنا حماقت ہوسکتی ہے۔''

تیمور نے اسے بولنے پر اکسایا تھا مگر وہ اتنی بے ہمت ہورہی تھی کہ اس نے بولنا یا اس کی بات پر کوئی ردعمل دینا ضرور خیال نہیں کیا تھا وہ اتنی ناتواں لگ رہی تھی کہ تیمور کو لگا تھا وہ ابھی اس کے گرد سے اپنی گرفت ہٹائے گا اور وہ زمین پر آرہی ہوگی۔

''یہاں پانی کہاں ملے گا تیمور، یہ تو ویرانہ ہے اور اب تو شام کے سائے بھی گہرے ہوگئے ہیں سوچو اگر ہم ایسے ہی چلتے رہے تو ہمیں پانی نہیں ملا تو ہم رات یہیں ویرانے میں کیسے گزاریں گے؟'' وہ ایک خوف کے باعث بولی تھی۔

''نہیں ایسا نہیں ہوگا ہم ٹرین کی پٹڑیوں کے قریب چل رہے ہیں یہاں سے جب بھی کوئی ٹرین گزرے گی ہمیں خبر ہوجائے گی ہم راہ نہیں بھٹکے۔'' وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔

''لیکن اگر کوئی ٹرین اس پٹڑی سے نہ گزری تو؟'' عین خدشہ بیان کرنے لگی تھی اس کی آنکھوں میں خوف تھا اور وہ سر انکار میں ہلانے لگا تھا۔

''ایسا نہیں ہوسکتا عین مارنے والے سے بچانے والا کہیں بڑا ہے سبھی ٹرینیں اس حیوانیت کا شکار نہیں ہوسکتیں۔ نہ حملہ آور تمام ٹرینوں کو لاشوں کا ڈھیر بنا سکتے ہیں مجھے یقین ہے اس پٹڑی سے گزر کر کوئی ٹرین پاکستان کی سرحد عبور کرے گی اور اس ٹرین میں ہم بھی ہوں گے۔'' وہ پریقین لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''لیکن اس ویرانے میں ہمارے لیے ٹرین روکے گا کون۔'' وہ خوف سے بولی تھی۔

تیمور نے شہادت کی انگلی اٹھا کر آسمان کی طرف اشارہ کیا تھا اور عین اس کی سمت سے نگاہ ہٹا گئی تھی تبھی تیمور نے اسے متوجہ کیا تھا اور جوش سے بولا تھا۔

''ہم شاید قصور بارڈر کے قریب ہیں عین ہم زیادہ

دوری پرنہیں ہیں۔" اس کی آواز میں ایک نئی زندگی کی لہر تھی اور عین نے کوئی آواز سن کر اسے متوجہ کیا تھا۔

"تم کوئی آواز سن رہے ہو تیمور۔" عین نے اس کی سمت دیکھے بنا دور سے آتی آواز پر کان جمائے تھے جیسے وہ یقین کرنا چاہتی تھی کہ وہ جو سن رہی ہے اس کا وہم نہیں تیمور نے اس کی سمت سے دھیان ہٹاتے ہوئے توجہ اس آواز کی سمت لگائی تھی عین نے اس کی گرفت سے ہاتھ چھڑا کر بجلی کی تیزی سے ٹرین کی پٹڑی پر جھک کر اس آواز کے قریب آنے کا یقین کیا تھا اور جوش سے چلائی تھی۔

"ٹرین آرہی ہے تیمور میں نے ٹرین کی آواز سنی ہے۔" وہ جوش سے بولی تھی تب تیمور نے جھک کر ٹرین کی پٹڑی پر کان لگا کر سنا تھا۔

ٹرین کے آنے کی آواز اور فرکشن صاف محسوس کی جاسکتی تھی پٹڑی اس ٹرین کی آمد کا صاف پتا دے رہی تھی یہ عین کی سماعتوں کا دھوکا نہیں تھا۔

"اب ہم کیا کریں گے تیمور، ہم اس ٹرین کو کیسے روکیں گے یہ ناممکن ہے۔" وہ جو کچھ دیر قبل بہت پرجوش تھی یکدم ہمت ہارتے ہوئے اسے دیکھنے لگی تھی۔

"تمہیں معجزوں کے ہونے پر یقین ہے۔" تیمور نے دریافت کیا تھا مگر وہ کچھ بولے بنا اس سمت دیکھنے لگی تھی جس سمت سے ٹرین کے آنے کی آواز آرہی تھی کوئی سبب ضرور بنے گا عین اگر خدا نے ہمیں یہاں تک پہنچا دیا ہے اور زندہ رکھا ہے تو اس کے بعد بھی سب ممکن ہے۔" وہ بولا تھا جب اس نے جھاڑیوں کے قریب کچھ حرکت محسوس کی تھی اسے حملہ آوروں کا ایک بڑا گروپ دکھائی دیا تھا شاید اس گروہ نے بھی اس ٹرین کی آواز کی سمت پر کان لگائے ہوئے تھا یا کوئی کالی بھیڑ اس ٹرین میں تھی جو اس موب کے ساتھ ملی ہوئی تھی ان کا کوئی منصوبہ تھا یا محض اتفاق مگر تیمور اسے لے کر بجلی کی سی تیزی سے دوسری طرف کی جھاڑیوں کے پیچھے جا چھپا تھا عین نے یہ MOB نہیں دیکھی تھی جبھی وہ چونکتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی اور حلق کھول کر شاید آواز نکال کر کوئی ری ایکشن بھی دینا چاہا تھا جب تیمور نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا اور مدھم لہجے میں اس کے کان کے قریب منہ کر کے بولا تھا۔

"کوئی آواز مت نکالنا عین جھاڑیوں کے اس طرف ایک موب ہے وہ شاید اس ٹرین پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے مجھے یقین ہے کوئی اس ٹرین میں موجود ہے جو اس ٹرین کی زنجیر کھینچے گا تاکہ ٹرین رکے اور حملہ آور اس میں داخل ہوں ہمارے پاس بس اتنا ہی وقت ہے کہ جیسے ہی کوئی ٹرین کی چین کھینچے ہم اس ٹرین میں سوار ہو جائیں۔"

"اوہ ہم مارے جائیں گے تیمور، یہ کوئی حل نہیں ہے تمہارے خیال سے جو کوئی منصوبہ سازی کر رہا ہے وہ اس ٹرین کے مسافروں کو پاکستان زندہ سلامت جانے دے گا؟ سب مارے جائیں گے تیمور۔" عین غمزدہ ہو کر ہمت ہار گئی تھی اور آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ کر رخساروں پر ڈھلکنے لگے تھے۔

"کچھ بھی ہو عین اس ٹرین میں بیٹھنا ہے اور اس کے لیے وقت کم ہے جھاڑیوں کے اس طرف موب ہے اور اس طرف ہم ہمیں ایک کام کرنا ہے ہمیں جھاڑیوں کے اس طرف جانا ہے اس پٹڑی کو کراس کرتے ہوئے تم میرا ساتھ دینے کو تیار ہو نا؟" تیمور اس کی سمت دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا تھا عین نے اس کی سمت دیکھتے ہوئے سر انکار میں ہلایا تھا۔

"ہم اس طرح کیوں مریں، اس سے بہتر ہے ہم یہیں بھٹکتے رہیں۔"

"پاگل پن مت کرو عین میری سنو، موب کچھ فاصلے پر ہے اور ٹرین قریب آرہی ہے چلو فوراً باہر نکلتے ہیں اور جھاڑیوں کے اس طرف چلتے ہیں اس میں بہت کم وقت لگنا چاہیے۔" تیمور جانے کیا منصوبہ بندی کر رہا تھا اور اس میں کامیابی ملنا بھی تھی کہ نہیں وہ نہیں جانتی تھی مگر اس کا دل خوف سے بھر گیا تھا۔

"نہیں تیمور میں ایسا نہیں کر پاؤں گی مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔" "اور مت بھولو دوسری طرف موب ہے وہ خون کی پیاسی ہو رہی ہے ان کے پاس ہتھیار ہیں وہ کاٹ ڈالیں گے ہمیں۔" وہ خوف سے لرزنے لگی تھی۔ مگر تیمور نے اس کی سنے بنا اس کا ہاتھ تھاما تھا اور تیزی سے اسے لے کر ٹرین کی پٹڑی پھلانگ کر جھاڑیوں کے پیچھے دبک گیا تھا عین اس کی سرعت پر ششدر رہ گئی تھی پھٹی پھٹی نظروں سے اس نے تیمور کو دیکھا تھا گویا وہ یقین نہیں کر پا رہی تھی کہ تیمور نے اتنی

سرعت سے اسے لے کر جہاز یون کے اس طرف آ گیا تھا
اور ان سے کچھ فاصلے پر موب بھی یہ سوچ کر ہی اس کا دل
دہلنے لگا تھا اس نے خوف سے آنکھیں بند کر کے تیمور کے
سینے پر سر رکھا تھا۔

''ہم باقی نہیں رہیں گے تیمور، ہم مارے جائیں
گے۔'' عین نے خوف سے لرزتی آواز سے کہا تھا اور تیمور
نے اس کی سنی ان سنی کر دی تھی۔

''آپ اپنی آنکھیں بند رکھیں عین اچھے دنوں کو سوچیں
حیدر میاں کے ساتھ آپ کی کتنی یادیں باقی ہوں گی نا؟'' وہ
مدھم لہجے میں بولا تھا عین نے سختی سے آنکھیں بند کر لی تھیں
اس کا پورا وجود لرز رہا تھا، تیمور نے اسے مضبوطی سے تھاما تھا،
اس کا انداز حوصلہ دینے والا تھا مگر عین بری طرح خوف میں
مبتلا تھی۔

☆☆......

''آپ ہم سے خفا ہیں۔'' جس طرح جلال نے فتح
النساء کو نظر انداز کر دیا تھا اس پر فتح نے پوچھا تھا۔

''نہیں ہم آپ سے خفا نہیں ہیں۔'' جلال اسے دیکھے
بنا فائل پر مکمل توجہ صرف کرتے ہوئے مدھم لہجے میں گویا ہوا
تھا، فتح نے اسے بغور دیکھا تھا جانے اسے کیوں لگا تھا کہ وہ
اسے ساری حقیقت بتا دینے کے باوجود قصوروار سمجھ رہا ہے
جیسے وہ سمجھ رہا ہے کہ وہ عین سے مخلص نہیں ہے جس طرح
اس نے عین سے تمام حقیقت چھپا کر رکھی اس سے جلال
اس کی وفاداری اور مخلصی پر شک کرنے لگا تھا۔

''آپ کو لگتا ہے کہ ہم عین کے مخلص دوست نہیں
ہیں۔'' فتح النساء نے جواز جاننا چاہا تھا مگر جلال نے گویا سنی
ان سنی کر دی تھی فتح نے گہری سانس خارج کی تھی گویا جس
بات کا احتمال تھا وہی ہوا تھا وہ خوف زدہ تھی کہ وہ کہیں ایسا نہ
سوچ لے اور وہی ہوا تھا وہ اس کے مخلص ہونے پر شک کر رہا
تھا وہ سمجھتا تھا۔

''فتح النساء دانستہ اس حقیقت کو چھپانے پر تلی تھی اور کس
طرح اس نے اس سے حقیقت اگلوائی تھی تو گویا وہ اس ضمن
میں ایسے قیاس کرنے پر حق بجانب تھا کیا ایسا کر کے وہ
درست کر رہا تھا کیونکہ اس نے حقیقت بہر حال عین سے
چھپائی ضرور تھی چاہے اس کا کچھ بھی مقصد رہا ہو مگر اس نے
حقیقت عین کو واقعی نہیں بتائی تھی یہ قصور بہر حال اس کا رہا تھا
مگر یہ سب نہ بتانے کی وجہ وہ نہیں تھی جو جلال قیاس کر رہا
تھا۔

''ہم ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے ہم نے ایسا کبھی نہیں
چاہا تھا۔'' فتح النساء نے اپنی صفائی میں کہنا چاہا تھا مگر وہ تبھی
فائل لے کر اٹھا تھا اور ملازم کو آواز دے کر بلایا تھا۔

''ہم کچھ ضروری پیپر چیک کرنے اسٹڈی میں موجود ہیں
گے ہمیں ڈسٹرب نہ کیا جائے کوئی ملنے کے لیے یا پوچھے تو
صاف کہہ دیجیے ہم نہیں مل سکتے۔'' جلال کہہ کر اس کی جانب
بنا دیکھے اسٹڈی کی طرف بڑھ گئے تھے اور فتح النساء اپنا سا
منہ لے کر رہ گئی تھی، اس نے ایسا نہیں سوچا تھا وہ صاف دل
کی تھی اس کی نیت صاف تھی اس نے عین کا کبھی برا نہیں چاہا
تھا مگر وہ بھول گئی تھی جلال اپنی بہن کے لیے کس درجہ
جذبات رکھتا تھا وہ عین کے متعلق شدت پسند تھا وہ عین کو
کوئی زک پہنچتے نہیں دیکھ سکتا تھا تبھی وہ فتح النساء پر بھی شک
کر رہا تھا شاید اس نے سچائی کو عین سے چھپا کر واقعی غلطی کی
تھی وہ محبت جو اسے کسی قدر پاس آتی لگی تھی وہ اس لمحے دور
جاتی لگی تھی۔

''ہم نے کوئی سچائی نہیں چھپائی جلال خدا گواہ ہے ہم
عین سے بہت مخلص ہیں اور اس کا کبھی برا نہیں چاہ سکتے، ہم
خود نقصان سہہ سکتے ہیں مگر ہم اپنی سہیلی عین کو کوئی نقصان
پہنچتے نہیں دیکھ سکتے، جتنی عین آپ کو عزیز ہے اتنی ہی عزیز
ہمیں ہے ہم جانتے ہیں حیدر میاں کہ سچائی چھپا کر ہم نے
غلط کیا ہے مگر ہم کہتے بھی تو عین ہم پر یقین نہیں کرتی بات تو
تب بھی اس قدر بگڑتی، ہم اس صورت حال میں تھے جہاں
آگے کنواں تھا اور پیچھے کھائی نقصان دونوں طرف سے ہمارا
ہی ہوتا تھا ہم اس نقصان کو سہنے کو تیار نہیں تھے اور اسی خوف
نے ہمیں پھنسا دیا ہم نے عین کو نہیں گنوایا مگر ہم نے آپ کو
گنوا دیا ہم نہیں جانتے تھے اگر آپ کا حصول ممکن تھا مگر آپ
ہمیشہ بہت دور لگے ہیں جیسے ہم ہاتھ بڑھائیں گے بھی تو
ہاتھ خالی ہی لوٹ آئے گا آپ ہمیشہ سے ناقابل حصول
لگے ہیں مگر اس درجہ ملال شاید نہیں اس صورت میں آپ کو
کھونے پر نہیں ہوتا جس درجہ ملال اس لمحے آپ کی نگاہ سے
اترنے پر ہو رہا ہے۔'' وہ پر ملال لہجے میں بولی تھی اور جانے

کے لیے پلٹنے لگی تھی جب عین نے اسے بلالیا تھا۔

"فتح النساء، آپ کہاں جارہی ہیں؟" عین نے اسے پکارا تھا اور وہ حرکت نہیں کرپائی تھی قدم جیسے منجمد ہوگئے تھے وہ نہیں چاہتی تھی اس کی آنکھوں کی نمی عین النور دیکھے تبھی فوراً آنکھیں رگڑیں تھیں اور عین اس کے سامنے آن رکی تھی۔

"آپ کہاں جارہی تھیں فتح النساء، ہم سے ملنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، یہ کیا طریقہ ہے ہم سے خفا ہیں آپ؟" عین نے شکوہ کیا تھا مگر وہ مسکرادی تھی وہ نہیں چاہتی تھی عین کو شک ہو کہ وہ افسردہ ہے یا کوئی واقعہ رونما ہوا ہے تبھی بولی تھی۔

"نہیں ہم آپ کی طرف ہی آرہے تھے دراصل ملازم نے ہمیں آگاہ کیا تھا کہ آپ پائیں باغ میں ہیں۔" اس نے بہانہ گھڑا تھا عین چونکی تھی۔

"پائیں باغ میں ہم وہاں کیوں ہونے لگے کس نے کہا آپ سے؟" عین نے حیرت سے اسے دیکھا تھا جب اس نے فوراً مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

"یہ بات چھوڑیے عین النور آپ سسرال میں ہونے والی دعوت میں گئی تھیں نا، وہ کیسی رہی، حیدر میاں سے کوئی خاص ملاقات رہی ہوگی نا؟" وہ شرارت کرتے ہوئے مسکرائی تھی عین نے اردگرد دیکھا تھا اور شہادت کی انگلی لبوں پر رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا اور اس کا ہاتھ تھام کر اپنے کمرے میں آگئی تھی فتح النساء چونکی تھیں۔

"اف ایسی بھی کیا رازداری عین، ایسی کوئی خاص ملاقات رہی کیا؟" اس نے اپنی دانست میں چھیڑا تھا مگر عین النور نے اسے خاموشی سے دیکھا تھا تب اسے حیدر کی نیت پر شک ہوا تھا اور وہ فکرمندی سے پوچھنے لگی تھی۔

"کیا ہوا آپ ٹھیک تو ہیں عین النور، کیا ہوا کیا کہا حیدر نے آپ سے کچھ بتائیں گی آپ؟" اس کا دل دہل گیا تھا کیونکہ وہ حیدر کی اصلیت سے واقف ہوگئی تھی اور اسے شک تھا کہیں اس نے عین سے کوئی بدتمیزی نہ کی ہو، عین کو تنہا پا کر کہیں کسی موقع کا فائدہ نہ اٹھایا ہو، یہ سوچ کر اسے ایک مزید احساس جرم ہوا تھا اسے عین سے وہ سچائی نہیں چھپانا چاہیے تھی اگر حیدر نے کچھ کردیا تھا تو وہ مزید پستی میں گر رہی تھی۔

"کچھ نہیں ہوا فتح النساء حیدر میاں سے تو بات ہی نہیں ہوئی وہ دکھائی بھی نہیں دیے ہاں بہت سے سسرالی رشتے داروں سے ملاقات ہوئی۔" عین النور بولی تھی اور اس نے شکر کی ایک گہری سانس لی تھی۔

"کیا ہوا آپ کے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں۔" عین النور چونکی تھیں فتح النساء نے سر نفی میں ہلا دیا تھا۔

"نہیں، ایسی بات نہیں دراصل ہم سوچ رہے تھے کوئی بہت بھرپور ملاقات رہی ہوگی اور حیدر میاں نے بہت سے راز و نیاز بھی کیے ہوں گے مگر ایسا ہوا نہیں۔" فتح نے مسکراتے ہوئے بات بنائی تھی مگر عین النور متفکری اسے دیکھنے لگی تھی۔

"کچھ عجیب ہوا فتح۔"

"کیا ہوا عین النور کیا عجیب؟" ایک اور دھچکا اس کے دل کو لگا تھا وہ جاننا چاہتی تھی اب ایسا کیا ہوا تھا اس کا دل ڈر میں گھر گیا تھا جب عین النور بولی تھیں۔

"ہم دعوت میں تھے جب چلتے ہوئے ہم حویلی کی مخالف سمت میں نکل گئے وہ حصہ عجیب تھا وہاں ہم نے عجیب بات محسوس کی وہ حصہ حویلی کے باقی حصوں سے زیادہ ویران اور پراسرار لگا وہاں ایک بہت ہی خوب صورت لڑکی سے ملے جنہوں نے اپنا نام خوشنما بتایا جب ہم ان سے ملاقات کے لیے آگے بڑھے تو ایک تاریک حصے میں ہم نے ایک چیخ کی آواز سنی اور اس آواز کے بعد کسی نے ہمارے شانے پر ہاتھ رکھ دیا، ہم تو ڈر ہی گئے تھے مگر شکر ہوا وہ خوشنما تھیں۔ انہوں نے ہماری مدد کی ہمیں مطلع کیا کہ ہمارا اس وقت اس حویلی سے کتنی جلد ممکن ہو نکل جانا ضروری ہے وہ ہمارے کسی سوال کا جواب دینے کو تیار نہیں تھیں، انہوں نے ہمیں بتایا نہیں مگر حویلی کے ایک خفیہ راستے سے ہمیں نکلنے میں مدد دی اور نا صرف ہمارے ڈرائیور کو بلا کر ہمیں گاڑی میں بٹھایا بلکہ محتاط رہنے کو بھی کہا ہم ان کی باتوں پر بہت حیران ہوئے مگر ہماری سمجھ میں نہیں آیا ایسا کیا واقعہ رونما ہوا اور ہمارا وہاں سے چلا آنا کیوں ضروری تھا اور ہمیں حیدر میاں سے محتاط کیوں رہنے کی ضرورت ہے اور وہ

لڑکی کون تھیں، ہم اس بات پر بھی حیران تھے کہ وہ حویلی کے ان خفیہ حصوں سے کیسے واقف تھیں، انہیں ان حصوں کا اور راستوں کا علم کیسے تھا جبکہ ہم بچپن سے لے کر اب تک کئی بار حویلی جاتے رہے ہیں مگر ہم ان خفیہ حصوں کے بارے میں نہیں جانتے پھر وہ لڑکی کیسے ان داخلی راستوں سے واقف تھیں وہ اس حویلی کا حصہ تو نہیں ہیں کیونکہ اس سے قبل ہم نے انہیں اس حویلی میں نہیں دیکھا ہم سوچ رہے تھے ہم حیدر سے اس بارے میں دریافت کریں گے اور اس واقعہ کے بارے میں بھی مگر پھر سوچا کہیں یہ غیر مناسب نہ لگے ہم نے اماں کو بھی اس بارے میں کچھ نہیں بتایا، ذہن میں ایک خیال یہ بھی آیا کہ کہیں وہ لڑکی ہمیں حیدر میاں کے خلاف تو کرنا نہیں چاہتیں، کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ کوئی سازش ہو اور وہ لڑکی ہمیں حیدر میاں کے خلاف کرنے کا کوئی ارادہ رکھتی ہو؟'' عین النور سچائی کو جانے بنا کسی کے دلائل کو رد کرتے ہوئے اسی پر شک کر رہی تھی، یہی خدشہ تو فتح النساء کو بھی تھا کہ عین النور اس کا یقین نہیں کرے گی وہ یہی سمجھے گی کہ فتح النساء غلط ہے۔

''آپ کو کیا لگتا ہے فتح النسا کیا معاملہ رہا ہوگا اور وہ لڑکی کون ہوگی کہیں وہ ہمیں حیدر میاں سے بدظن تو کرنا نہیں چاہتیں کیا ہمیں حیدر سے اس بارے میں پوچھنا چاہیے۔'' عین النور نے مشورہ چاہا تھا فتح النساء خود اس صورت حال کا شکار تھی وہ خاموشی سے دیکھنے لگی تھی پھر مدہم لہجے میں بولی تھیں۔

''آپ اس لڑکی کو اس کی باتوں کو نظر انداز نہیں کرسکتیں عین النور، ہمیں لگتا ہے اگر انہوں نے آپ کہا ہے کہ آپ محتاط رہیں تو آپ کو محتاط رہنے کی ضرورت ہے ضروری نہیں کہ وہ آپ کو حیدر سے بدظن کرنا چاہتی ہو آپ اس پہلو کو مثبت پہلو سے دیکھ سکتی ہیں کہ وہ لڑکی سچ کہہ رہی ہے اور آپ کو محتاط کر رہی ہے۔''

''ایسا آپ کیسے کہہ سکتی ہیں فتح النساء اس لڑکی پر اتنا یقین کیوں ہم تو اسے جانتے بھی نہیں۔'' عین النور نے اسے شانے اچکاتے ہوئے دیکھا تھا۔ تبھی اس نے ایک اور پہلو اس کے سامنے رکھا تھا۔

''اور اگر آپ اسے جانتی ہوتیں تو کیا اس کا یقین

کرتیں، حیدر میاں سے محتاط رہتیں۔" فتح النساء نے پوچھا تھا عین النور اسے عجیب نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔

"یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ فتح النساء، ہم ایک اجنبی لڑکی کے لیے حیدر پر شک کریں؟ یہ بات کیا جواز رکھتی ہے۔" فتح النساء خاموش ہوگئی تھی پھر مدہم لہجے میں بولی تھی۔

"اگر اس کی جگہ ہم ہوتے تو کیا تب بھی آپ یقین نہیں کرتیں؟" اس کے سوال نے عین النور کو چونکا دیا تھا۔

"یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ فتح النساء، ہم ایسے قیاس کیوں کریں آپ اس لڑکی کی جگہ نہیں ہیں اور آپ حیدر کو بہت اچھے سے جانتی ہیں وہ ایسے نہیں ہیں کہ ان پر شک کیا جائے۔" عین النور ماننے کو تیار نہیں تھی فتح النساء نے ان کو کسی قدر حیرت سے دیکھا تھا۔

"عین اتنا اعتبار کرنا ٹھیک نہیں۔"

"کیوں نہیں فتح النساء، وہ ہمارے بچپن کے منگیتر ہیں ہم ان سے منسوب ہیں ایسے تھوڑا نہ شک کرنے لگیں گے ہم ان پر، کوئی اجنبی آکر کچھ بھی کہہ دے گا تو ہم انہیں زندگی سے خارج کر دیں گے۔" عین اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی تھی تب فتح النساء خاموش ہوگئی تھی اور گہری سانس لیتے ہوئے ضبط کن انداز میں اسے دیکھتی ہوئی بولی تھی۔

"سنیں عین النور پٹوڈی آپ کو حیدر سراج الدولہ پر اس درجہ اعتبار نہیں کرنا چاہیے وہ اس اعتبار کے لائق نہیں ہیں اور اس کی گواہی ہم دیتے ہیں کیونکہ ہم آپ کی سہیلی ہیں اور آپ کی زندگی خراب ہوتے نہیں دیکھ سکتے ہم نہیں دیکھ سکتے کہ آپ ایک غلط انسان کے ساتھ زندگی گزاریں اور......!" فتح النساء بولی تھیں اور عین شاکڈ سی انہیں دیکھنے لگی تھی۔

"آپ جانتی ہیں آپ کیا کہہ رہی ہیں فتح النساء کچھ اندازہ ہے آپ کو؟" عین کا لہجہ حیرتوں سے بھرا تھا اور فتح نے پرسکون انداز میں سر ہلا دیا تھا۔

"ہم بہت اچھے سے جانتے ہیں کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں کیونکہ حیدر میاں کی ایسی گری ہوئی حرکتوں کا سامنا ہم نے بھی کیا ہے وہ اچھے انسان نہیں ہیں نہ وہ اس قابل ہیں کہ ان پر اعتبار کیا جائے انہوں نے عشائیے میں ہم سے بہت زیادہ بدتمیزی کی ہمیں نازیبا باتیں کہیں اور میلی نظروں سے دیکھا، ہم نے آپ کو اس لیے نہیں بتایا کہ ہم آپ کی حیدر میاں سے محبت سے واقف تھے مگر اب ہم اس معاملے کو مزید نہیں چھپا سکتے حیدر ایک غلط انسان ہیں اور وہ آپ جیسی لڑکی کے ساتھ زندگی گزارنے کے مستحق نہیں ہیں اگر آپ ان کا ہاتھ یہ سب جان کر بھی تھامیں گی تو آپ یقیناً بہت بڑی غلطی کریں گی۔" وہ تیزی سے سچائی گوش گزار کرتی ہوئی بولی تھیں جب عین نے انہیں چپ کرا دیا تھا۔

"خاموش ہو جائیے فتح النساء برائے مہربانی آپ مزید ایک لفظ بھی مت کہیے آپ ہماری دوست ہیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ......!" وہ کچھ سخت سست کہتے کہتے رک گئی تھی۔

وہی ہوا تھا جس کا ڈر فتح النساء کو تھا عین النور محبت میں اتنی اندھی تھی کہ وہ اپنی دوست کے کہے کا بھی اعتبار نہیں کر رہی تھی یعنی اس نے اپنے قریبی دوسرے رشتے کو بھی گنوا دیا تھا ایک طرف اس سچائی کے باعث اس نے جلال کو گنوا دیا تھا اور دوسری طرف عین النور بھی اس سے خائف دکھائی دے رہی تھی لیکن اگر وہ یہ سچائی مزید عین سے چھپاتی تو وہ خود کو شاید معاف نہیں کر سکتی تھی اس نے اپنے ضمیر کے لیے ایک سچ کہہ دیا تھا اب چاہے عین اس کا یقین کرتی یا نہیں مگر وہ اپنی جگہ بہت پرسکون محسوس کر رہی تھی۔ تبھی اس نے اطمینان کی گہری سانس خارج کی تھی اور عین کی طرف دیکھا تھا اور اٹھ کھڑی ہوئی تھی وہ جانے کو پلٹی تھی مگر تبھی عین نے روک لیا تھا۔

"فتح النساء۔" فتح النساء کو یقین نہیں تھا وہ اس سے مزید بات کرنا چاہے گی تبھی اس کی سمت دیکھا تھا مگر عین اس درجہ خائف نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"آپ ہماری دوست ہیں سو ہم آپ کو اس کہے کے لیے معاف کرتے ہیں مگر آپ آئندہ حیدر کے بارے میں کچھ نہیں کہیں گی اور......!" وہ ہاتھ اٹھا کر حتمی انداز میں بولنے جا رہی تھی جب عین نے اسے ٹوک دیا تھا۔

"ہم جھوٹ نہیں کہہ رہے عین سو ہمیں کسی معافی کی ضرورت بھی نہیں ہم جانتے ہیں کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں اور ہم جو کہہ رہے ہیں اس کی سچائی کو جھٹلایا نہیں جا سکتا سو چاہے آپ اس کا یقین کریں یا نہ کریں ایسا سب واقع ہوا

ہے اور آپ کے گھر کے احاطے میں واقع ہوا ہے کئی ملازم اس کے گواہ ہیں اور اس سچائی کے متعلق جلال بھی جانتے ہیں ہم نے ان کو اس سچائی کے متعلق پہلے ہی انفارم کر دیا تھا ہمیں گمان تھا آپ ہمارا یقین نہیں کریں گی اور ایسا ہوا بھی ہے آپ ہمارا یقین کرنے کو تیار نہیں ہیں ہم آپ کو کھونا نہیں چاہتے تھے لیکن ہم اس سچائی کو مزید چھپا کر مجرم بننا نہیں چاہتے تھے ہم خود کو بھی معاف نہیں کر پاتے سو اس سچائی کا کھلنا بہت ضروری تھا ہم مطمئن ہیں ہم نے آپ کو سچ بات بتائی ہم نہیں جانتے آپ آگے کیا کرنا چاہیں مگر ہم آپ کے خیر خواہ ہیں عین النور پٹوڈی اور ہم آپ کو زک پہنچتے نہیں دیکھ سکتے کہ اب آپ کا جو بھی فیصلہ ہوگا وہ ہمیں قبول ہوگا چلتے ہیں فی امان اللہ۔'' فتح النساء کہہ کر پلٹی تھی اور چلتی ہوئی باہر نکل گئی تھی عین النور اسے جاتا دیکھتی رہ گئی تھیں۔

یہ کیا ہوا تھا وہ الجھ کر رہ گئی تھیں فتح النساء ایسا کیوں کہہ رہی تھی ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔

☆☆

''بیٹا ادھر بیٹھو میرے پاس ایک ضروری بات کرنا ہے۔'' تیمور لاؤنج سے گزر رہا تھا جب ممی نے اس کا ہاتھ تھام کر روک لیا تھا وہ تب ممی کے پاس بیٹھ گیا تھا ٹیبل سے ایک لفافہ اٹھایا تھا اور اس کی طرف بڑھایا تھا وہ چونکا تھا۔

''یہ کیا ہے ممی؟''

''کھول کر دیکھ لو مجھے تو پسند ہے سوچا کوئی بات آگے بڑھانے سے قبل تم سے پوچھ لوں تمہارے ابا کے قریبی دوست کی دختر ہیں جانی پہچانی فیملی ہے برسوں کے مراسم ہیں کوئی شک وشبے والی بات تو خیر نہیں ہے۔'' ممی نے کہا تھا تو تیمور نے انہیں دیکھا تھا۔

''ممی یہ کس بارے میں بات کر رہی ہیں آپ ارادہ کیا ہے؟'' تیمور نے لفافہ کھولے بنا کہا تھا وہ ممی کی باتوں سے کسی قدر سمجھ تو گیا تھا مگر نظر انداز کر دینا چاہتا تھا وہ فی الحال ایسا کوئی ذکر نہیں چاہتا تھا۔

''تم لفافہ تو کھول کر دیکھو اپسرا سے کم نہیں ہے اپنے بیٹے کے لیے لڑکی دیکھ رہی ہوں کوئی معمولی تو نہیں دیکھوں گی نا۔'' ممی مسکرائی تھیں تیمور نے لفافہ کھولے بنا ان کو دیکھا تھا اس کی آنکھوں میں فکر مندی آ گئی تھی اس نے لفافہ واپس ٹیبل پر رکھا تھا اور ممی کے ہاتھ تھام لیے تھے اور نرمی سے بولا تھا۔

''ممی کیا بہتر نہ ہوگا ہم یہ ذکر فی الحال نہ کریں۔'' ممی نے اسے کسی قدر حیرت سے دیکھا تھا۔

''ماجرا کیا ہے، تم ایسا کیوں چاہتے ہو کہ ہم یہ ذکر کسی بعد کے وقت کے لیے اٹھا رکھیں، دراصل تمہارے ڈیڈ ایک عشائیے میں اپنے قریبی دوستوں کو مدعو کر رہے ہیں اسی عشائیے میں بخت آور بھی مدعو ہوگی میں چاہتی تھی تم اس کی تصویر دیکھ کر کوئی عندیہ دے دو تو تم دونوں کو اس عشائیے میں باضابطہ ملوا دیا جائے دیکھو بیٹا تم تعلیم سے فارغ التحصیل ہوگئے ہو خیر سے سیاسی پارٹی کا حصہ بن گئے ہو اتنی ذمہ داریوں کو سنبھالنے لگے ہو اپنے ڈیڈ کے ساتھ بزنس کو بھی دیکھ رہے ہو مجھے لگا اب وقت آگیا ہے جب ہم تمہاری شادی کے بارے میں سوچیں اور مناسب لڑکی تلاش کریں اور مجھے بخت آور سے بہتر کوئی لڑکی نہیں لگتی، ماشاء اللہ پڑھی لکھی لڑکی ہے ہونہار اور سمجھدار ہے کئی بار گفتگو ہوئی ہے ان سے مجھے تو وہ لڑکی بہت پسند ہے میں تو مشورہ دوں گی تم ایک بار اس سے مل لو تو ہم بات آگے بڑھا دیں، دیکھو بیٹا یہ ہر بار من مانی ٹھیک نہیں ہم تو اس بڑے فیصلے میں پھر بھی تم سے تمہاری رائے چاہ رہے ہیں ورنہ بہت سے والدین تو بچوں سے ان کی مرضی معلوم کیے بنا ہی رشتے طے کر دیتے ہیں۔'' ممی نے پرسکون لہجے میں سمجھایا تھا وہ پڑھی لکھی خاتون تھیں، ان معاملات کو سمجھتی تھیں، تیمور الجھنے لگا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا ان کو کس طرح سمجھائے تبھی نرمی سے بولا تھا۔

''ہم آپ کی بات سے اتفاق کرتے ہیں ممی مگر ابھی ہم اس ذمہ داری کے لیے خود کو تیار نہیں پاتے۔''

''تم ٹال رہے ہو نا۔''

''نہیں ایسی بات نہیں ممی۔'' وہ بہت پھیکے انداز میں مسکرایا تھا۔

''کسی اور کو پسند کرتے ہو؟'' ممی نے اسے جانچتی نظروں سے دیکھا تھا۔

وہ خاموش ہو گیا تھا۔

''ایسی بات تھی تو پہلے کیوں نہیں بتایا؟'' ممی نے اسے

جانچتی نظروں سے دیکھا تھا وہ خاموش ہوگیا تھا۔

"ایسی بات تھی تو پہلے کیوں نہیں بتایا؟" ممی نے اسے بغور دیکھا تھا وہ تب بھی خاموش رہا تھا۔

"اور کون ہے وہ؟" ممی نے دریافت کیا تھا تیمور فوری طور پر کوئی جواب دیے بنا ان کی طرف سے نگاہ پھیر گیا تھا۔

"اب بتاؤ کون ہے وہ ماں سے چھپاؤ گے کیا، ہمیں پتا چلے گا کون ہے تو ہی بات آگے بڑھا ئیں گے نا ہم؟" ممی نے اسے بولنے پر مائل کیا تھا مگر وہ کچھ نہیں بولا تھا۔

"گوری فرنگی ہے کیا؟" ممی متفکر ہوئی تھیں اس نے سر نفی میں ہلا دیا تھا اور اٹھنے لگا تھا جب ممی نے ہاتھ پکڑ کر اسے دوبارہ بٹھا دیا تھا تیمور بے بسی سے ماں کو دیکھنے لگا تھا۔

"ایسی کیا بات ہے کہ تم ماں کو بتا نہیں سکتے، کون ہے وہ، بتاؤ ہمیں ہم بھی تو جانیں وہ کون سی خاص لڑکی ہے جسے ہمارے ہونہار بیٹے نے اپنے لیے چنا ہے بس وہ فرنگی نہ ہو ہماری شرط یہی ہے اور غیر مذہب سے نہ ہو کہ ہم کسی اونچی نیچی ذات والی کو اپنے گھر میں برداشت نہیں کرسکیں گے باقی سب قبول ہے۔" ممی نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

"نہیں وہ فرنگن نہیں ہے نا کسی غیر مذہب یا ذات سے ہے، مگر اس کے باوجود اس کا حصول اس قدر آسان نہیں کوئی معجزہ ہی ہوگا جو ہمیں ان سے ملا سکتا ہو، اس کے علاوہ تو ایسا کوئی سبب بننے سے رہا؟" وہ بہت بجھے لہجے میں کہتا ہوا مسکرایا تھا۔

"ہے کون وہ کچھ پتا بھی تو چلے تم ایک بار مطلع تو کرو ہم جا کر پیر پکڑ کر بھی رشتہ مانگ لیں گے ہمیں ہمارے بیٹے کی خوشی سے زیادہ کچھ اہم نہیں زندگی تمہاری ہے تم خوش تو ہم خوش، دیکھو بیٹا زندگی ایک ہی بار ملتی ہے اس میں جو کرنا ہے کرلو، کامیابی خوشی مسرتیں جو اکٹھا کرنا ہے کرو تاکہ بعد میں کوئی گلہ نہ رہے یہ بات تمہارے نانا ابا کہا کرتے تھے اللہ ان کے درجات بلند کرے ہمیشہ اپنے بچوں کو آگے بڑھنے پر اکساتے تھے۔" ممی نے کہا تھا اور تیمور کے ہاتھ تھام لیے تھے تیمور جو خاموش بیٹھا تھا چونکتے ہوئے انہیں دیکھنے لگا تھا۔

"بیٹا اس کا ذکر تو کرو ایک بار، باقی ہم سنبھال لیں گے کون ہے وہ کسی آسمان کی اپسرا ہے حور ہے؟" ممی نے مسکراتے ہوئے نرمی سے کہتے ہوئے اسے دیکھا وہ پھیکے سے انداز میں مسکرایا تھا۔

"کاش وہ اپسرا ہوتی اور ہم اس قدر الجھے نہ ہوتے ہم زمین زادے ہیں اور زمین پر رہنے والوں کے مسائل بہت پیچیدہ ہوتے ہیں۔" وہ مدھم لہجے میں گویا ہوا تھا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"ممی ہم آپ سے بعد میں بات کریں گے ایک اہم میٹنگ کا وقت ہو رہا ہے معذرت چاہتے ہیں مگر اس وقت ہمیں جانا ہوگا۔" وہ مودب انداز سے بولا تھا ممی نے سر ہلایا تھا اور وہ جھک کر ماں کے ہاتھ عقیدت سے لبوں سے چھوتے ہوئے فرما کر آگے بڑھ گیا تھا مسز بہادر یار جنگ الجھی ہوئی سی سوچنے لگی تھیں۔

"کیا ہوگیا ہے آج کل کے بچوں کو کچھ بتانے کو مائل ہی نہیں ایک ہم تھے والدین کے کہنے پر دل کھول کر سامنے رکھ دیا کرتے تھے ان کی ایک مرضی کے سامنے ادب سے سر جھکا دیا کرتے تھے رشتہ کب کہاں طے ہوا کچھ خبر ہی نہیں ہوتی تھی جب شادی طے ہوتی تھی آگاہ کردیا جاتا تھا کہ نکاح ہے فلاں تاریخ کو اور مجال تھی ہماری جو ہم کوئی چوں چراں کرتے آج کل کے بچوں کو ماں باپ کی طرف سے کسی قدر آزادی بھی حاصل ہے اور ہم تو رعایتیں بھی دیے رہے ہیں مگر ہمارے سپوت ہیں کہ ماننے کو تیار نہیں ماننا تو دور کی بات ہمارے سپوت ہمیں بتانے پر ہی مائل ہیں کہ وہ موصوفہ ہے کون خیر اس کی تو فکر نہیں پتا تو ہم چلا لیں گے مگر اگر یہ رشتہ جڑنا ممکن نہیں تو پھر کس طرح بخت آور کے لیے تیمور کو راضی تو کرنا ہوگا نا، اب یہ کیسے کریں یہ بھی ایک الگ معمہ ہے۔" وہ فکرمند ہوگئی تھیں۔

......☆☆......

عین النور بہت الجھی ہوئی سی دکھائی دی تھیں بہت بے قراری سے وہ یہاں سے وہاں چلتی چکر کاٹتی رہی تھیں پھر چلتی ہوئی باہر آ گئی تھیں۔

"سوئیں نہیں آپ؟" جلال سے ٹاکرا ہوگیا تھا تو وہ فکر مندی سے اسے دیکھنے لگا تھا، عین نے ان کی سمت سے نگاہیں پھیر لی تھیں۔

"نہیں بھیا ہمیں نیند نہیں آرہی تھی۔" اس نے آہستگی

سے کہا تھا۔

''کیا ہوا، آپ کچھ متفکر لگ رہی ہیں ماجرا کیا ہے؟'' جلال نے پوچھا تھا مگر وہ بولی نہیں تھی تب جلال نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا اور نرمی سے پوچھا تھا۔

''عین اپنے بھیا سے بھی چھپائیں گی اب آپ کہیے کیا معاملہ ہے کسی نے کہا ہے کچھ آپ سے؟'' وہ مضبوط تناور درخت بنا کھڑا اس کے سامنے تھا اس کا پیارا بھائی، اس کا مضبوط سہارا اس نے آہستگی سے جلال کے شانے پر سر رکھ دیا تھا اور غبار آہستگی سے آنکھوں کے راستے باہر کی راہ لینے لگا تھا، جلال اس کے انداز پر حیران ہوا تھا کسی بات سے عین بہت زیادہ الجھ گئی تھیں مگر کیا وہ سمجھ نہیں پایا تھا۔

''عین کیا ہوا آپ کو آپ ٹھیک تو ہیں۔'' انہوں نے اس کو اپنے سے الگ کر کے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا تھا وہ عین کے اس طرح رونے پر بہت پریشان ہو گئے تھے ذہن میں پہلا دھیان فتح النساء کا آیا تھا وہ شام میں آئی تھیں کہیں وہ عین سے تمام سچائی تو نہیں کہہ گئیں، عین نے سر انکار میں ہلایا تھا۔

''نہیں کوئی بات نہیں ہم بس کسی قدر تھک گئے تھے، اور ہمیں نیند نہیں آ رہی تھی اور ایسے میں سر بھاری ہونے لگا تبھی بے بسی سے آنکھوں سے یہ پانی بہنے لگا آپ تو جانتے ہیں نا بھیا ہم چھوٹی چھوٹی باتوں پر الجھنے لگتے ہیں۔'' عین نے غالباً اسے فکر مند ہوتے دیکھ کر بروقت بہانہ تراشا تھا مگر جلال اسے جانچتی نظروں سے دیکھتا رہا تھا۔

''عین ہم آپ کے بھائی ہیں اور آپ کو آپ سے کہیں زیادہ بہتر جانتے ہیں سو ہم سے یہ بہانے بنانا ترک کریں اصل مدعا کیا ہے ہمیں آگاہ کیجیے تب عین کو مان لینا پڑا تھا کہ وہ جھوٹ بولنے میں اچھی ثابت نہیں ہوئیں، تب اس نے اس سسرائی تقریب میں ہونے والا واقعہ بھائی کے گوش گزار کر دیا تھا۔

''کوئی ہمیں حیدر سے بدظن کرنا چاہتا ہے جلال اور ہم نہیں جانتے وہ خوشنما نام کی لڑکی کون تھی مگر اس نے ہی ہمیں اس حویلی کے اس احاطے سے نکلنے میں مدد دی تھی۔

''آپ خوشنما سے ملیں؟'' وہ چونکا تھا تب عین نے اسے دیکھا تھا۔

''کیا ہوا آپ جانتے ہیں خوشنما کون ہیں؟'' عین النور نے پوچھا تھا مگر جلال نے سر انکار میں ہلا دیا تھا۔

''نہیں ایسی بات نہیں مگر ہم جاننا چاہ رہے تھے ایسا کیوں ہوا، اگر کوئی آپ کو حیدر سے محتاط رہنے کا کہہ رہا ہے تو اس معاملے میں حق بجانب ہوگا بہر حال ہم اس معاملے کی تحقیق کریں گے آپ فکر مند نہ ہوں آپ نے اپنے جلال بھیا کو بتا دیا نا تو اب آپ کی فکر میں ختم ہوئیں ہم اس معاملے کو نبٹا لیں گے آپ اپنا ذہن ان فکروں سے اب آزاد سمجھیں کوئی اور فکر ہو تو ہمیں بتائیے۔'' جلال نے اس کے سر پر بڑے پن سے ہاتھ رکھ کر اسے نرمی سے مسکراتے ہوئے دیکھا تھا عین نے لمحہ بھر کو خاموشی سے جلال کی طرف دیکھا تھا اور آہستگی سے بولی تھی۔

''ایسی ہی بات ہم سے فتح النساء نے بھی کہی ہے اور انہوں نے تو باقاعدہ مدعا سمجھایا ہے کہ حیدر میاں نے انہیں میلی نظروں سے دیکھا ہے اور انہیں ناقابل بیان پیشکش بھی کی ہیں ہم یہ ماننے کو تیار نہیں اور.....!'' وہ بولی تھی جب جلال نے انہیں ٹوک دیا تھا۔

''یہ کب کہا فتح نے آپ سے؟'' وہ نہیں جانتا تھا کہ فتح النساء ایسا کر سکتی ہیں شاید انہوں نے عین کو یہ سب بتانے کا قصد تب اس صورت میں تھا جب جلال نے انہیں اگنور کیا تھا۔

''فتح النساء کی باتوں کا ہم یقین کریں یا انہیں الزام دیں وہ ہماری سہیلی ہیں ہم حیران ہیں انہوں نے ایسی بات کیوں کی؟ اور اگر ایسی کوئی بات رونما ہوئی بھی تھی تو تب ہی ہمیں اس سے آگاہ کیوں نہیں کر دیا، اتنے دنوں تک چھپا کر کیوں رکھا، اگر ایسا کوئی واقعہ رونما ہوا بھی تھا تو ہمیں مطلع تو کر سکتی تھیں نا؟'' عین النور نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔ جلال نے بنا کچھ کہے خاموشی سے اسے دیکھا تھا پھر نرمی سے بولے تھے۔

''اس معاملے میں اتنا الجھنا ٹھیک نہیں ہم اس کی تحقیق کر لیں گے لیکن ہم آپ سے ایک بات کرنا چاہتے ہیں آپ حیدر میاں پر اتنا اندھا اعتبار نہ کریں یہ مناسب نہیں ہوگا کوئی ایک فرد ایک بات کو اکسانے کے لیے کر سکتا ہے مگر جب ایک سے زیادہ لوگ ہی ایک رائے دینے لگیں تو پھر

اس پر شک وشبہ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے آپ اپنی آنکھیں اور عقل کھلی رکھیے۔" جلال نے اسے سہولت سے سمجھایا تھا وہ بھائی کو دیکھ کر رہ گئی تھی۔

جلال نے اسے کمرے کی دہلیز تک چھوڑا تھا اور ان کے سر پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے انہیں مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔

"اب مزید کوئی فکر نہیں آپ سکون کی نیند سوئیے اب کون کیا کہتا ہے بھول جائیے اور اپنے کمرے میں جائیے۔" جلال نے سمجھایا تھا اور تب وہ سر ہلاتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی تھی جلال کو تمام فکریں سونپ کر وہ اس کا ذہن بہت الجھ رہا تھا سونے کی کوشش میں دیر تک جاگتی رہی تھی۔

......☆☆......

فتح النساء سوچتی جا رہی تھیں مگر الجھنیں بڑھنے لگی تھیں وہ جن شکوک وشبہات کا شکار تھی وہی ہوا تھا عین نے دو دن سے ایک بار بھی اس سے رابطہ نہیں کیا تھا اسے اگرچہ اس بات کا احتمال تھا کہ کچھ ایسا ہی ہوگا مگر اس کے باوجود وہ عین کے بدلتے رویے پر حیران ہوئی تھی اور جلال اس نے جو رد عمل ظاہر کیا تھا تو پھر بھی وہ توقع کر رہی تھی کہ جلال کی بات اور تھی مگر عین وہ اس کی اتنی اچھی دوست تھی کہ اس سے ایسا رویہ متوقع نہیں تھا۔ وہ انہیں سوچوں میں الجھی ہوتی چھت پر تھی جب جلال غیر متوقع طور پر اس سے ملنے آیا تھا وہ اسے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئی تھی اور وہ اس کے مدمقابل آن رکا تھا وہ مجرم نہیں تھی مگر اس کے باوجود وہ مجرم بن رہی تھی۔

"آپ نے عین کو سب کیوں بتایا آپ کو اگر بتانا تھا تو آپ اسی وقت انہیں مطلع بھی کر سکتی تھیں اس وقت یہ سب بتانے کی ضرورت نہیں تھی آپ نے ایسا کیوں کیا فتح النساء اس کا جواز کیا بنتا تھا اب؟ صرف اس لیے کہ ہم نے آپ سے یہ رویہ رکھا آپ یہ سچ پہلے نہ اگل پائیں اور اب کہہ دینے کا جواز کیا بنا آپ نے اپنی دوستی کی پروا نہیں کی مگر پروا کی تو اپنے مطلب کی جہاں آپ کا خود کا فائدہ نکلتا تھا آپ نے وہاں زبان کھولنا ہی کیوں مناسب خیال کیا؟" وہ اسے سلگتی نظروں سے دیکھ رہا تھا فتح النساء حیران رہ گئی تھی وہ بس ساکت سی اسے دیکھتی جا رہی تھی جلال نے اسے شانے سے تھام کر جھنجوڑا تھا۔

فتح النساء وضاحت میں ایک لفظ نہیں کہہ پائی تھی وہ خاموش تھی اور جلال کی نظریں اسے خاکستر کر دینے کو تھیں۔

"ہمیں آپ کا یقین اگرچہ آ بھی جاتا اور ہم آپ کو بے قصور سمجھ بھی لیتے مگر آپ نے خود جس طور صورت حال کو الجھا دیا ہے اس سے آپ صاف مجرم محسوس ہو رہی ہیں فتح النساء آپ نے درحقیقت اپنی دوست کی پشت پر چھرا گھونپا ہے اور اس کے اعتبار کو تار تار کر دیا ہے اب تو ہمیں بھی یقین ہونے لگا ہے کہ آپ کی نیت صاف نہیں تھی آپ کہیں نہ کہیں اپنی دوست سے خائف تھیں اور آپ نے موقع دیکھ کر وار کیا ہے یہ دوستی کے نام پر کڑی دشمنی ہے اور اس پر ہی بس نہیں کیا آپ نے آپ نے اپنے جال میں ہمیں بھی پھنسانا چاہا ہے آپ نے جب دیکھا کہ آپ کی دال نہیں گل رہی تو آپ نے یہ پینترا بدلا ہے سچ مانیے تو ہمیں آپ کے اس چہرے کو دیکھنے کا احتمال نہیں تھا ہم نہیں جانتے تھے آپ ایسی چالیں چل رہی ہیں اور ایسے چہرے بدلیں گی آپ کا چہرہ دیکھنے میں تو بھولا بھالا ہے مگر اس بھولے بھالے چہرے کے پیچھے ایک مردہ چالباز کا دماغ ہے جو ایسے پلان بنا رہا ہے ہمیں آپ کے بارے میں سوچ کر ہی کراہیت آ رہی ہے فتح النساء ہم نے بھی کوئی تمیز نہیں رکھی آپ میں اور ہم میں کوئی تفریق نہیں کی مگر آپ نے اپنی اصلیت دکھانے میں دیر نہیں لگائی۔" وہ لہجہ بہت زہر خند تھا فتح النساء ساکت سی اسے دیکھتی جا رہی تھی اس کے اندر اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ ایک لفظ بھی کہہ پاتی۔

"ہمیں آپ سے یہ توقع نہیں تھی فتح النساء آپ دھوکے باز ہیں اور قابل اعتبار نہیں آپ چالباز ہیں اور سازشیں بننے میں ثانی نہیں رکھتیں ایک معصوم چہرے کے پیچھے آپ نے ایک گھناؤنا چہرہ چھپایا ہوا ہے اور...!"

"نہیں ...نہیں... ایسا نہیں ہے ایسا نہیں ہے ہم ایسے نہیں ہیں نہیں ہیں ہم ایسے۔" فتح النساء زور سے پوری شدت کے ساتھ چیخی تھی اور یکدم اس کی آنکھ کھل گئی تھی وہ اٹھ کر بیٹھ کر زور زور سے سانس لینے لگی تھی۔

اف اتنا بھیانک خواب اس نے یقین کر کے شکر کیا تھا کہ ایک خواب تھا بس جلال کے الفاظ کس قدر برچھیوں جیسے تھے لہجہ کس قدر زہر خند تھا۔

''اف کیا جلال ہم نے دانستہ عین سے کچھ نہیں چھپایا ہمیں جلال کو یہ بتانا ہوگا اور ہم کل ہی ان سے بات کریں گے اگر ہم عین کا دل صاف نہیں کر پائے تو خیر ہے مگر جلال سے محبت کرتے ہیں ہم ہم نہیں چاہتے وہ ہمارا ایسا کوئی کردار یا خاکہ ذہن میں بنا کر رکھیں ہم جلال سے اور عین سے دوبارہ بات کرنا چاہیں گے ہم اتنا بڑا الزام سر لے کر جینا نہیں چاہیے ہم وفادار دوست ہیں مخلصی میں ثانی نہیں رکھتے ہم اپنی پیشانی پر لگا داغ ضرور دھو دیں گے۔'' وہ فیصلہ کن انداز میں کہتی ہوئی خود کو یقین دلانے لگی تھی کہ وہ سب باتوں کو سلجھانے کی کوشش کرے گی۔

......☆☆......

''آپ ہماری ہمشیرہ سے ملی تھیں سراج الدولہ کی حویلی میں۔'' جلال نے خوشنما کے مقابل کھڑے ہوئے ہوئے بنا کسی تمہید کے پوچھا تھا تو وہ چونک پڑی تھیں مگر ان کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ اس کا اقرار کرتیں بھی سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

''آپ کو اس کی خبر کیسے ہوئی؟''

''آپ سراج الدولہ کی حویلی میں کس کی اجازت سے گئیں اور کیونکر گئیں۔'' وہ مکمل حق سے پوچھنے لگا تھا خوشنما خاموشی سے نگاہ پھیر گئی تھیں پھر دھیمے لہجے میں بنا ان کی طرف دیکھے گویا ہوئی تھیں۔

''ہم مانتے ہیں ہم آپ کے پابند ہیں اور آپ کی اجازت کے بنا ہمیں زیب نہیں دیتا مگر حیدر سراج الدولہ ہمیں دھمکانے لگے تھے انہیں ایک نئی لڑکی میں خاصی دلچسپی محسوس ہوئی تھی جو ہمارے اس کوٹھے کا حصہ تھی حیدر ایک خونخوار جانور سے بھی بدتر ہیں ہم ان کی عادتوں سے اچھی طرح سے واقف ہیں اپنی اس تقریب کے لیے انہیں وہ لڑکی درکار تھی تب ہمیں مجبوراً ان کی حویلی پر جانا پڑا ہم نہیں چاہتے تھے وہ اس معصوم لڑکی کو کوئی زک پہنچائیں مگر وہاں جا کر آناً فاناً منظر بدل گیا جب نشے میں مست حیدر میاں نے اس لڑکی پر حملہ کیا سب نظریں پھیرنے پر مجبور ہو گئے وہ لڑکی تو ان کے حملے پر حواس باختہ سی حویلی میں بھاگنے لگیں مگر حیدر میاں کی حیوانیت بڑھنے لگی اور تب اس لڑکی نے بالکونی سے نیچے چھلانگ لگا دی ہم نہیں چاہتے تھے کہ آپ کی ہمشیرہ کو اس معاملے کی کوئی خبر ہو سو ہم نے انہیں بحفاظت حویلی کے اس حصے سے نکال دیا۔'' خوشنما نے آگاہ کیا تھا جلال نے گہری سانس لی تھی۔

''اور آپ کو حویلی کے ان راستوں کی خبر کیونکر تھی اس معاملے میں آپ کی رہنمائی کس نے کی۔'' جلال اسے جانچتی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا تھا مگر خوشنما نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

''آپ کی خاموشی کسی بات کی کہانی سنا رہی ہے خوشنما۔'' جلال انہیں شکی نظروں سے دیکھ رہا تھا خوشنما کو بولنا ضروری لگا تھا۔

''وہ ہم...... ہم ایک ملازم کو جانتے تھے اس نے ہماری مدد کی۔'' اس نے بروقت بہانہ تراشا تھا مگر جلال کی نظروں سے صاف لگتا تھا کہ وہ اس بات سے کچھ خاص مطمئن نہیں ہوا تھا تبھی وہ پلٹ کر خاموشی سے وہاں سے چلا گیا تھا۔

''یا اللہ ہم جلال سے کیا کہیں ان سے تو جھوٹ بھی بولا نہیں جا سکتا، اتنے شاطر ہیں کہ جھوٹ بھی صاف پکڑ لیتے ہیں۔'' خوشنما اپنی جگہ پریشان دکھائی دی تھی۔

......☆☆......

''کیا آپ ہم سے نکاح کرنا چاہیں گی؟'' فتح النساء وضاحتیں دینے کے لیے محل میں آئی تھی جب جلال ان کے سامنے آن رکا تھا۔

''ان سے شادی کرنا ان کے ساتھ زندگی گزارنا ان کا ساتھ پانا ان کی اولین خواہشوں میں سے رہا تھا مگر اب جب جلال نے ان سے پوچھا تھا تو وہ چونکتے ہوئے حیرت سے انہیں دیکھنے لگی تھیں۔

''یہ کیسا مذاق ہے جلال؟''

''آپ کو یہ مذاق لگتا ہے؟'' جلال نے انہیں بغور دیکھا تھا فتح النساء چند ثانیوں تک خاموش رہی تھیں پھر شانے اچکا دیے تھے۔

''ہم نہیں جانتے اس سوال کے پوچھنے کے پیچھے کیا محرک ہیں جلال الدین یوسفزئی مگر ہم اتنا جانتے ہیں کہ یہ فیصلہ اچانک ہے اور اس کے پیچھے ضرور کوئی وجہ ہے؟'' فتح النساء ایک پراعتماد اور ذہین لڑکی تھی۔

وہ یقیناً سمجھ سکتی تھی کہ اس سوال کا پوچھا جانا ایک بڑا

فیصلہ تھا اور یہ بڑا فیصلہ یونہی رونما نہیں ہوا تھا۔

''ہم آپ سے پوچھ رہے ہیں فتح النساء باتیں پھیلانے کی اجازت نہیں دے رہے آپ کو صرف اتنی اجازت ہے کہ آپ ناں یا ہاں میں سے کوئی ایک جواب دیں۔'' جلال نے اتنا بڑا فیصلہ اچانک کس وجہ سے لیا تھا اور فتح النساء کی رائے جاننے پر اتنا بضد کیوں تھا۔

''آپ نے یہ فیصلہ کیونکر لیا؟'' فتح النساء نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پھر جواز مانگا تھا۔

''سوال نہیں فتح النساء ہمیں جواب چاہیے آپ شادی کرنے کو تیار ہیں۔'' وہ بغور اس کی سمت دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں بولا تھا فتح النساء سانس روک کر انہیں دیکھنے لگی تھیں مگر وہ اس طرح ہاں یا ناں نہیں کر سکتی تھیں۔

''اس سوال کا محرک کیا ہے جلال کیا ہم اتنا بھی جان نہیں سکتے اور دوسری بات اگر ہم ہاں کہہ بھی دیں تو اس کی کوئی وقعت نہیں رہے گی کیونکہ اس خاندان کو ہم اچھے سے جانتے ہیں اور اس خاندان کے اہم ترین فیصلے ایسے بچکانہ انداز میں نہیں لیے جاتے آپ کو نواب صاحب کی رائے لینا ہوگی بلکہ جب تک وہ اس فیصلے پر اپنی مہر ثبت نہیں کریں گے ایسا کوئی فیصلہ واقع ہو نہیں سکتا۔'' وہ مکمل خود اعتمادی سے بولی تھی جب اس کے مزید کچھ بولنے سے قبل جلال نے ان کے لبوں پر شہادت کی انگلی رکھ دی تھی اور ان کو سلگتی نظروں سے دیکھتے ہوئے درشت انداز میں گویا ہوئے تھے۔

''آپ سے جو پوچھا جا رہا ہے آپ اس کا جواب دیں فتح النساء، آپ سے کہا جا رہا ہے کہ آپ کا جواب صرف ہاں یا ناں میں ہونا چاہیے تو آپ اس سے دیکھنے بولنے کی اجازت نہیں رکھتیں، ہم نے پوچھا ہاں یا ناں، بڑے نواب صاحب کی فکر کرنا آپ ترک کر دیں وہ ہمارے والد صاحب ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ اس کو کیسے منانا یا راضی کرنا ہے آپ کو صرف دو حرفوں میں سے ایک کو چننا ہے۔'' وہ لہجہ اتنا مضبوط تھا کہ اس کے عزائم صاف جھلک رہے تھے مگر اس درجہ اچانک، وہ بھی شادی کرنے کی بات اس کے اسباب کیا تھے؛ وہ جاننے سے قاصر تھی۔

جلال کیا چاہ رہا تھا اس کے ذہن میں کیا چل رہا تھا وہ جان نہیں پائی تھی مگر جانے کیوں لگتا تھا کہ اس فیصلے کے پیچھے ضرور کوئی بڑی وجہ تھی۔

وہ جانتی تھی وہ ان کے خاندان کے ٹکڑوں پر پلتی رہی تھی جس طرح اس نے سنا تھا ابا اماں کے بعد اس کی کفالت کا ذمہ نواب صاحب نے لیا تھا اور تب سے وہ انہی کی ذمہ داری تھی اس کی ضروریات اور تعلیم کے تمام اخراجات نواب صاحب برداشت کرتے آئے تھے برابری نہیں تھی برابری والی کوئی بات بھی نہیں تھی وہ امرا کی اولاد ضرور تھا مگر جس طرح نواب صاحب نے اسے سہارا دیا تھا وہ امرا و الا وقار اور اکڑفوں جاتی رہی تھی وہ اس درجہ عزت اور ایسے رشتے کے منسلک ہونے کی امید نہیں رکھتی تھی اگرچہ ان گھر میں اسے بیٹی کا درجہ دیا جاتا رہا تھا اور اسے برابر کی عزت دی جاتی تھی مگر اس کے باوجود وہ جانتی تھی کہ نواب خاندان کے رشتے اس طور انجام نہیں پاتے تبھی وہ بہت زیادہ خواہش رکھنے اور محبت کے باوجود جلال کے متعلق اتنی انتہا پسندی پر جا کر نہیں سوچ سکی تھی۔

وہ خواب بھی اعتبار میں دیکھنے کی عادی تھی محبت اپنی جگہ مگر جلال کا حصول اسے ہمیشہ ناممکن لگا تھا جلال سے اس کا ملنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا وہ بھی حیدر میاں سے یہ سن لینے کے بعد کہ اس کی سچائی کچھ اور تھی وہ جلال کے متعلق یا اس کے ساتھ زندگی گزارنے کے متعلق نہیں سوچ سکتی تھی۔

شاید وہ اس لائق ہی نہیں تھی کہ جلال کا ہاتھ تھام کر زندگی کی شاہراہ میں اس کے ہم قدم چل سکتی پھر جلال اسے ایسے خواب کیوں دکھا رہا تھا وہ بھی تب جب وہ اس کی سمت کوئی جھکاؤ ہی نہیں رکھتا تھا فتح النساء بچپن سے اس کی محبت میں مبتلا تھی مگر جلال نے کبھی کوئی ایسا اشارہ نہیں دیا تھا اگرچہ وہ کہیں یہ حقیقت بھی جانتا تھا کہ وہ اس کی سمت ایک خاص جھکاؤ رکھتی ہے مگر جلال نے کبھی اس کی سمت کوئی توجہ نہیں دی تھی وہ اس کی ترجیحات میں نہیں تھی، اس کے لیے ایک غیر اہم اور بے وقعت شے تھی تو پھر اس سے شادی کا فیصلہ کیا سبب رکھتا تھا وہ کیوں اس کی زندگی اپنی زندگی کو ایک ناپسندیدہ فیصلے کی نذر کر رہا تھا اور اس کا جواز کیا تھا وہ نہیں جانتی تھی مگر اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کہیں کچھ غلط ہے بھی اس نے جلال کا ہاتھ اپنے لبوں سے ہٹا کر اسے فیصلہ کن انداز میں دیکھا تھا۔

"یہ فضول کے کھیل کھیلنا بند کریں جلال اس سوال کی کوئی وقعت نہیں ہے۔" اس نے اپنی دانست میں سخت لہجہ اختیار کیا تھا مگر جلال نے اسے پل میں رد کر دیا تھا۔

"آپ سے یہ نہیں پوچھا جا رہا فتح النساء کو یہ سوال کتنا مدلل یا بچکانہ ہے یا اس کی کوئی وقعت ہے بھی کہ نہیں ہم آپ سے صرف یہ جاننا چاہ رہے ہیں کہ آپ ہم سے شادی کرنا چاہتی ہیں کہ نہیں۔ سوال آسان ہے فتح النساء اور جواب بھی اس قدر آسان ہونا چاہیے سو فضول کی باتوں کو فی الحال ترک کر دیں اور جواب دیجیے۔" جلال کا انداز فیصلہ کن تھا لہجہ مضبوط تھا وہ اپنی جگہ ساکت رہ گئی تھی۔

"ہمیں اس وقت سمجھ نہیں آ رہی آپ ایسا مذاق ہم سے کیوں کر رہے ہیں؟" فتح النساء نے پوچھا تھا وہ اکتا کر اس کی سمت سے نگاہ پھیر گیا تھا اور درشت لہجے میں بولا تھا۔

"اگر ہم مذاق میں بھی پوچھ رہے ہیں تو آپ پر جواب دینا فرض ہے فتح النساء۔ آپ نواب زادہ جلال الدین پٹوڈی کی بات کو ٹال رہی ہیں اور اس کی وقعت نہیں سمجھ رہیں ہم آپ کی عزت دے رہے ہیں آپ کو اپنی بیگم بنانے کی بات کر رہے ہیں، یہ تو خواب تھا نا آپ کا محبت کرتی رہی ہیں نا آپ بچپن سے۔" جلال اسے شانوں سے تھامتا ہوا پوچھ رہا تھا اور وہ خالی خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی یہ کیسا جال بنا جا رہا تھا کوئی سازش تھی یا مذاق یا واقعی کوئی سنجیدہ فیصلہ تھا، وہ سمجھ نہیں پائی تھی مگر وہ خاموشی سے اس کے سامنے کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

جلال کی نگاہوں میں غصہ تھا ایک شعلوں کی لپک تھی جیسے وہ اسے نگاہوں سے ہی جلا کر خاکستر کر دینا چاہتا تھا اتنا غصہ کس بات پر تھا اسے؟ فتح النساء کی سمجھ نہیں پائی تھی۔

......☆☆......

عین النور کی آنکھیں بند تھیں اور سانسیں تیز چل رہی تھیں خوف کے مارے برا حال تھا اس نے اس سے زیادہ بھیانک صورت حال کبھی نہیں دیکھا تھا، موت کو اس درجہ قریب نہیں دیکھا تھا۔ موب ان کے قریب ہی کہیں جھاڑیوں میں چھپا تھا فاصلہ زیادہ نہیں تھا اگر ان کو خبر ہو جاتی کہ یہاں کوئی مسلمان جوڑا چھپا ہوا ہے اور پاکستان کی طرف روانگی کے لیے پر تول رہا ہے تو وہ دھڑ سے سر جدا کرنے میں دیر نہیں لیتے اور اس سے بھی بڑا ڈر عصمت دری کا تھا وہ اسی عزت کے ساتھ پاکستان پہنچنا چاہتی تھی اسے لگا تھا تیمور نے جھاڑیوں کے اس طرف آنے کا فیصلہ جو لیا تھا وہ سراسر غلط تھا ہندوؤں اور سکھوں کی وہ موب کسی کو صحیح سلامت پاکستان جانے دینا نہیں چاہتی تھی وہ تقسیم کی خبر کے بعد ایسے بپھر گئے تھے کہ ان کا غصہ کسی طرح ٹھنڈا نہیں ہو رہا تھا بے قصوروں کو مار کر انہیں کیا مل رہا تھا۔ یا اس قتل و غارت گری سے انہیں کیا حاصل ہو رہا تھا وہ نہیں جانتی تھی مگر یہ ایک منظم سازش تھی جو مسلمانوں کے خلاف رچی گئی تھی مسلمانوں کو پاکستان کی طرف جانے کی سزائیں دی جا رہی تھیں۔

وہ جو نرم دل اور حساس تھی اور کسی چھوٹی سی چیونٹی کو بھی مارنے کا ظرف نہیں رکھتی تھی اس درجہ غارت گری کی صورت حال دیکھ سکنے میں تھی۔

"عین حوصلہ مند بنیے آپ بہادر لڑکی ہیں آپ اس طرح ہمت نہیں ہار سکتیں، اپنی آنکھیں کھولیے ٹرین کی آواز قریب آ رہی ہے اور ہمیں چوکنا رہنے کی ضرورت ہے، ہم یہ موقع ضائع نہیں کر سکتے اور وہ بھی ان بزدلوں کے لیے جو خود کو شیر سمجھ رہے ہیں بزدل گیدڑ ہیں نہتے لوگوں پر حملہ کرنا کوئی بہادری نہیں، ہم ان کا مقابلہ کرنا جانتے ہیں آپ کو اپنے الفاظ دیتے ہیں کہ آپ کو پاکستان پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے اور ہم اس میں کہیں نہ تھک کر رکیں گے نا ڈریں گے۔" تیمور کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

مگر وہ ٹرین کی تقریب آتی آواز کے باوجود مارے خوف کے آنکھیں نہیں کھول پائی تھی۔

"ہم سے یہ نہیں ہوگا تیمور، ہم ہار مانتے ہیں آپ کو جانا ہے تو آپ ہمیں چھوڑ کر اس ٹرین میں پاکستان چلے جائیں۔"

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

چسکا

خلیل جبار

چسکا کھانے کا ہو یا فیشن کا ضرورت سے زیادہ ہو جائے تو نقصان دہ بن جاتا ہے آج کل جدید موبائل فون کا چسکا ہر دوسرے نوجوان لڑکے لڑکیوں بلکہ بڑی عمر کے لوگوں کو بھی لگ چکا ہے، جسے دیکھ کر تنہائی میں ہاتھوں میں فون دبکائے دنیا و مافیہا سے بے خبر انوکھی دنیا کی سیر کرتا نظر آتا ہے، یعنی ایک کام کی چیز کھولنا بن کر رہ گئی ہے۔

ایک فیشن ایبل نوجوان کا المیہ اس نے اپنی سیدھی سادی بیوی کو موبائل کا چسکا لگا دیا تھا

انکل دانش کی شادی کو دس سال کا عرصہ بیت چکا تھا مگر ایسا لگتا تھا کہ یہ کل کی بات ہو۔ وقت کیسے گزر جاتا ہے پتا ہی نہیں چلتا۔ جب ان کی شادی ہوئی تھی میں بامشکل بارہ سال کا تھا اب میں بائیس سال کا نوجوان ہوں۔ میں ایک دکان پر موبائل کی مرمت کا کام کرتا ہوں۔ وقت کے ساتھ ساتھ میرے تجربے میں بھی اضافہ ہوا ہے میرے ہاتھ میں موبائل آ جانے پر میں سمجھ جاتا ہوں کہ اس موبائل میں کیا خرابی ہے۔ بات انکل سے شروع ہوئی ہے تو میں آپ کو انکل کے بارے میں ہی بتاؤں گا۔ انکل دانش جوانی سے ہی رنگین مزاج قسم کے انسان ہیں ہر وقت ایسے تیار رہتے کہ جیسے ابھی ابھی کسی تقریب میں شرکت کرنے کو جانا ہے۔ تقریباً سبھی کا خیال یہ تھا کہ انکل دانش کسی فیشن زدہ اور آزاد خیال لڑکی سے شادی کریں مگر اس وقت سب کو حیرت کا جھٹکا لگا جب انہوں نے ایک ایسی لڑکی سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کر دی جو شرمیلی قسم کی اور پردہ کرنے والی لڑکی تھی وہ لڑکی ان کے قریبی رشتے داروں میں سے ہی تھی انکل دانش کی والدہ بخشش بیگم کو سب سے زیادہ جھٹکا لگا تھا۔ اس لیے وہ اپنے بیٹے سے پوچھ ہی بیٹھیں۔

"دانش بیٹا اس شرمیلی لڑکی میں تمہیں کیا نظر آ گیا کہیں ایسا نہ ہو شادی کے چند دنوں بعد تمہیں پچھتاوا ہونے لگے۔"

"نہیں امی ایسا نہیں ہوگا۔" انکل دانش نے کہا۔

"تم آزاد خیال ہو تمہارا گزارا اس شرمیلی سی لڑکی کے ساتھ کس طرح سے ہوگا۔"

"امی جان اسے گھر میں جیسا ماحول ملا ہوگا وہ اس میں ڈھل گئی ہوگی میرے ساتھ رہنے پر وہ ہمارے گھر کے ماحول میں ڈھل جائے گی۔"

"گویا وہ لڑکی نہیں کوئی دھات ہے جیسے جیسا چاہو ڈھال لو۔" امی جان نے ہنستے ہوئے کہا۔

"وہ دھات نہیں لڑکی ہی ہے اور مجھے خود پر پورا بھروسہ ہے میں اسے اپنا ہم خیال بنا لوں گا۔"

"دیکھ لو بیٹے پھر نہ کہنا مجھے سمجھایا کیوں نہیں۔" امی جان نے ان کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"امی جان بے فکر رہیں میں بالکل بھی نہیں پچھتاؤں گا۔ بس آپ لڑکی والوں کے گھر جا کر رشتے کی بات کر آئیں۔"

انکل دانش کے والد ضرغام کا مارکیٹ میں اچھا کاروبار تھا۔ انکل دانش والد صاحب کا ہاتھ بٹایا کرتے تھے لڑکی

والوں نے اس رشتے کو اپنی خوش نصیبی جان کر بات پکی کردی اور پھر چند ماہ کے اندر اندر آنٹی صفورا ان کی بیوی بن گئیں اس شادی پر انکل دانش چھولے نہیں سمار ہے تھے۔

ایسا لگتا تھا کہ جیسے ان کے ہاتھوں خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو شادی کو کئی دن گزر گئے لیکن انکل دانش دکان پر نہیں گئے تو والد صاحب نے انہیں اپنے پاس بلایا اور بولے۔

''صاحبزادے کیا کاروبار سے دل بھر گیا ہے۔''

''نہیں ابو ایسی بات نہیں ہے۔''

''پھر دکان پر کیوں نہیں آ رہے ہو۔''

''نئی نئی شادی ہوئی ہے نا اس لیے میں.....''

''دانش بیٹے شادی ہماری بھی ہوئی تھی تمہاری شادی انوکھی نہیں ہوئی ہے میں ولیمے کے دوسرے دن دکان پر پہنچ گیا تھا خیر سے تمہاری شادی کو مہینہ ہونے کو آیا ہے مگر دکان پر تمہارے دیدار نہیں ہوتے۔''

''ہاں واقعی شادی کو مہینہ ہونے کو آ رہا ہے میں کوشش کروں گا دکان کو بھی وقت دوں۔''

''کوشش نہیں کل صبح سے دکان کو جوائن کرلو کاروبار ہے تو سب کچھ ہے انسان کے پاس دولت ہونے پر وہ دس شادیاں کرسکتا ہے۔''

''دس اور شادیاں۔'' انکل دانش کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''میں نے مثال دی ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم دس شادیاں اور کرلو۔'' والد صاحب نے اپنی ہنسی دباتے ہوئے کہا۔

''ہاں میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ اسلام میں چار شادی کرنے کی اجازت ہے پھر آپ دس اور شادیوں کا کیسے کہہ رہے ہیں۔'' دانش انکل نے کہا۔

''دانش بیٹے میں نے تمہیں یہ بات سمجھانے کو کہی تھی انسان کی ساری خواہش اور ضروریات پیسے سے پوری ہوتی ہیں اور پیسہ کام کرنے سے آتا ہے ہمارے یہ ٹھاٹ باٹ کاروبار کے دم سے ہی ہیں۔''

''نہیں ابو میں آپ کی بات بالکل سمجھ گیا ہوں اب میں کوئی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔'' انکل دانش نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔''

دوسرے دن سے انکل دانش نے روزانہ دکان پر جانا شروع کردیا تھا ان کے والد صاحب بھی ان کی فرمانبرداری پر خوش ہوگئے تھے۔

ہماری انکل دانش کے خاندان سے قریبی رشتے داری تھی۔ اس لیے صفورا آنٹی کا ہمارے گھر آنا جانا رہتا تھا شادی ہونے پر جب وہ پہلی بار ہمارے گھر آئیں مجھے دیکھ کر فوراً پردہ کرلیا۔ امی جان نے ہنستے ہوئے کہا۔

''حسرت بیٹے سے پردہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے یہ ابھی بہت چھوٹا ہے۔''

''مجھے تو یہ بہت بڑا لگ رہا ہے۔'' آنٹی صفورا نے کہا۔

''حسرت کا قد نکل گیا ہے ابھی اس کی عمر اتنی نہیں کہ اس سے پردہ کیا جائے مشکل سے گیارہ بارہ سال کا ہوگا۔'' امی جان نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے چھ سال بعد یہ جوان ہوجائے گا اور اس سے پردہ کرنا ضروری ہوجائے گا اس لیے میں ابھی سے پردہ کرتی رہوں تاکہ پردہ کرنے کی عادت رہے۔''

''یہ نوجوان ہونے پر بھی تم سے چھوٹا ہی رہے گا اور تم اس کی بزرگ ہو اور بزرگوں سے کیا پردہ۔'' امی جان نے ہنستے ہوئے کہا۔

امی جان کے سمجھانے پر آنٹی صفورا نے مجھ سے پردہ کرنا نہیں چھوڑا۔ میں نے بھی ان کے پردہ کرنے پر کوئی اعتراض نہیں کیا مجھے ان سے کون سا کام پڑتا تھا جو میں ان کے پاس بار بار جاؤں۔ وہ خود ہی ہمارے گھر آتی رہتی تھیں امی جان کے پاس تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی جاتی تھیں ان کی جب بھی مجھ پر نظر پڑتی وہ فوراً سے پردہ کرلیتی وہ مجھ سے ہی نہیں محلے کے لڑکوں سے بھی پردہ کرتی تھیں کم عمر لڑکوں کو ان کو ان کے پردہ کرنے پر شروع میں حیرت ضرور ہوئی تھی پھر لڑکوں نے حیرت کرنا چھوڑ دی تھی وہ یہ بات سمجھ گئے تھے کہ پردہ کرنے کی صفورا آنٹی کو عادت ہے۔

محلے میں بزرگ اور جوان بیٹھتے تھے وہ آپس میں یہ بات ضرور کرتے تھے کہ آزاد خیال انکل دانش اور آنٹی صفورا کی کیسے نبھ رہی ہے۔ آنٹی صفورا پر انکل دانش کے ساتھ رہنے پر بھی ان پر کچھ اثر نہیں آیا تھا۔ وہ ویسے ہی مردوں اور لڑکوں سے پردہ کرتی تھیں جب وہ انکل دانش کے ساتھ

موٹر سائیکل پر جاتی تھیں ایسا لگتا کہ صفورا آنٹی نہیں بلکہ کپڑوں کی گٹھری رکھی ہے مجال ہے کہ ان کے جسم کا کوئی حصہ نظر آجائے محلے کے لوگ اس جوڑی کو موٹر سائیکل پر جاتا دیکھ کر حیرت کرتے۔ انکل کلین شیو آزاد خیال نوجوان تھے ان کے پیچھے بیٹھی کپڑوں کی گٹھری بڑی عجیب سی لگتی تھی۔

شادی کے دو تین سال گزرنے پر آنٹی صفورا پر انکل دانش کا اتنا اثر ہوا کہ وہ جب ان کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھتی تو کپڑوں کی گٹھری نہیں لگتی تھیں اب وہ چادر کا استعمال کرنے لگی تھیں چادر میں اپنے منہ کو چھپائے رکھتی تھیں کم عمر لڑکوں سے پردہ کرنا بھی چھوڑ دیا تھا کبھی انہیں گھر کے لیے کچھ سامان منگوانا ہوتا مجھے بلا لیتی تھیں میں سمجھ گیا تھا کہ آنٹی صفورا پر انکل دانش کا اثر آنا شروع ہوگیا ہے۔ پہلے وہ بہت سادگی سے رہتی تھیں مگر اب ہر وقت ان کے چہرے پر میک اپ ہوتا تھا وہ پہلے ہی حسین خاتون تھیں میک اپ کرکے وہ اور حسین لگنے لگی تھیں انہیں دیکھ کر انکل دانش کو داد دینے کو دل چاہتا تھا انہوں نے بیوی کے معاملے میں اچھا انتخاب کیا ہے۔

میں جب اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچا مجھے نا جانے کیوں انکل دانش کے گھر جاتے ہوئے شرم سی محسوس ہونے لگی تھی گھر پر آنٹی صفورا کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوتا تھا ان کی ساس کا انتقال ہو چکا تھا میں جب بھی ان کے گھر جاتا وہ بن سنور کر اس طرح سے بیٹھی ہوتی تھیں کہ جیسے وہ ابھی کسی شادی یا کسی دیگر تقریب میں جانے والی ہیں مجھے دیکھ کر نا جانے کیوں ان کی آنکھوں میں ایک کشش سی محسوس ہوتی تھی۔

ابتداء میں مجھے ایسا لگا کہ میرا یہ وہم ہے جب ہر بار ایسا ہونے پر میرا وہم یقین میں بدل گیا وہ واقعی مجھ میں دلچسپی لے رہی تھیں مجھ سے جو سامان وہ منگواتی تھیں وہ انکل دانش سے بھی منگوا سکتی تھیں یا خود بھی بازار جا کر لا سکتی تھیں میری بچپن ہی سے ایسی تربیت ہوئی تھی کہ کسی نامحرم کو آنکھ بھر کر نہیں دیکھتا تھا نامحرم کے سامنے میری کوشش یہی ہوتی تھی کہ میری نظر نیچی رہیں۔

اکثر صفورا آنٹی کے بلانے پر میں ان کے گھر نہیں جاتا تھا مجھے ایک قسم کا ان سے خوف محسوس ہوتا تھا جب وہ امی جان سے میرے گھر نا جانے پر شکایت کرتیں تو امی جان مجھے ڈانٹ دیتی تھیں کہ تم آنٹی صفورا کے بلانے پر نہیں گئے۔ میں مصروفیت کا بہانہ بنا کر اپنی جان چھڑا لیتا تھا ایک دن امی جان کو سخت غصہ آگیا۔ ہوا یہ کہ میں کرکٹ کھیلنے جارہا تھا صفورا آنٹی نے مجھے گلی سے گزرتا دیکھ کر کہا۔

''تم شام کو آنا مجھے اپنی استری ٹھیک کرانی ہے۔'' میں جب کرکٹ کھیل کر گھر لوٹ رہا تھا آنٹی صفورا کا گھر دیکھ کر مجھے یاد آگیا کہ انہوں نے مجھے کام کے لیے بلایا تھا مگر میں جان بوجھ کر ان کے پاس نہیں گیا۔ جب امی کو میری اس حرکت کا پتا چلا وہ مجھ پر برس پڑیں۔

''تم نے صفورا آنٹی کی استری ٹھیک کیوں نہیں کرائی۔''

''وہ امی میں بھول گیا تھا۔''

''اچھا تم بھول گئے تھے۔ کیا بات ہے تم ان دنوں بھول بھلکڑ کیوں بنتے جارہے ہو۔''

''امی میں کوشش کروں گا کہ آئندہ.....''

''کب تک یہ جملہ بولتے رہوگے میں تمہارے اس جملے سے عاجز آگئی ہوں ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے اس عمر میں جب تمہارا یہ حال ہے تو پھر بڑھاپے میں کیا حال ہوگا محلے کے لوگ تمہیں گھر چھوڑ کر جایا کریں گے۔'' امی جان غصے سے بولی۔

''امی ایسا نہیں ہوگا۔''

''کیا ایسا نہیں ہوگا۔''

''کہ لوگ مجھے گھر چھوڑ کر جائیں۔'' اس نے کہا۔

''پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آجاتے ہیں۔''

''امی جان!!'' نا چاہتے ہوئے بھی مجھے غصہ آگیا۔

''ایسی بات نہیں ہے میں جان بوجھ کر کرتا ہوں۔'' میں نے انہیں اصل بات بتا دینا ہی بہتر جانا۔

''کیوں کرتے ہو کیا پڑوسیوں اور رشتے داروں کے کام آنا اچھی بات نہیں ہوتی۔ کبھی تم گھر پر نہ ہو اور مجھے کسی چیز کی ضرورت پڑ جائے تو کیا میں تمہارا انتظار کرتی رہوں گی۔ کیا پڑوسیوں کا حق نہیں کہ وہ تمہاری غیر موجودگی میں وہ کام کردیں۔ آنٹی صفورا کے گھر میں کوئی چھوٹا بچہ نہیں ہے ورنہ وہ تمہیں کام کی زحمت نہ دیں۔''

''پڑوسیوں کا بالکل حق بنتا ہے میں بھی ان کے کام آنا

چاہتا ہوں آنٹی صفورا گھر میں اکیلی ہوتی ہیں۔“
”وہ گھر میں اکیلی رہتی ہیں اس لیے کہ اس کے ساس و سسر کا انتقال ہو چکا ہے اولاد ان کے ہوئی نہیں اور ان کے گھر میں اکیلے رہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔“
”آپ خود جانتی ہیں وہ کس قدر فیشن ایبل بن گئی ہیں گھر میں وہ جس طرح کا لباس زیب تن کرتی ہیں انہیں اس لباس میں دیکھ کر مجھے شرم آتی ہے۔“ میں نے کہا۔
”اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔“
”کیوں قصور نہیں ہے۔“
”تمہیں پتا ہے کہ انکل دانش کس قسم کے آدمی ہیں وہ اپنی بیگم کو جیسا دیکھنا چاہتے ہیں وہ انہیں ویسی ہی دکھائی دینا چاہتی ہیں۔ تمہیں انہیں دیکھ کر شرم آتی ہوگی تم ایسا کرو کہ جب وہ تمہیں کام کا کہیں وہ کام کر دیا کرو بیٹا گھر میں نہیں جایا کرو دروازے میں سے سامان دے آیا کرو۔“ امی جان نے مجھے سمجھایا۔
”ٹھیک ہے میں ایسا ہی کروں گا۔“ میں نے کہا۔
اس دن سے میں نے ایسا کرنا شروع کر دیا وہ مجھے گھر کے اندر بلاتی رہ جاتی تھیں میں یہ کہتے ہوئے اپنی جان چھڑا لیتا کہ ”میں جلدی میں ہوں پھر آؤں گا۔“
میں موبائل کی ایک دکان پر لگ گیا۔ وہاں میں نے موبائل بنانے کا کام سیکھنا شروع کر دیا میری موبائل پہ بھرپور توجہ تھی اس لیے اس کام میں جلدی مہارت حاصل کرلی۔ آنٹی صفورا کو جب میرے موبائل کے سیکھنے کا پتا چلا انہوں نے مجھے خوب داد دی کہ میں نے یہ اچھا کام کیا ہے اس دور میں اس کام کی بڑی مانگ ہے ایک دن صفورا آنٹی نے مجھے اپنا موبائل دیا وہ ٹھیک طریقے سے کام نہیں کر رہا تھا وہ چاہتی تھیں کہ میں گھر میں ہی بیٹھ کر ان کا موبائل ٹھیک کر دوں۔ میرے پاس موبائل ٹھیک کرنے والا سامان نہیں تھا اس لیے میں ان کا موبائل دکان پر لے گیا۔ اس میں جو خرابی تھی وہ میں نے درست کر دی تھی مگر میں انہیں موبائل نہیں دے سکا۔ دکان سے میری واپسی رات گئے بڑی تاخیر سے ہوئی تھی مجھے اچھا نہیں لگا کہ انہیں دروازہ بجا کر زحمت دوں۔ صبح دکان جاتے ہوئے موبائل دے دوں گا۔ یہ سوچ کر میں گھر چلا آیا جب میں سونے کو لیٹا نیند نہیں آئی۔ پتہ نہیں اکثر میرے ساتھ ایسا ہو جاتا ہے کہ نیند اڑ جاتی ہے اور پوری رات کروٹیں بدلتے بدلتے گزر جاتی تھی اور پھر دن میں نیند کے جھونکے آنے سے ٹھیک طریقے سے کام نہیں ہو پاتا تھا۔ آج بھی کچھ ایسا ہی میرے ساتھ ہو رہا تھا۔ بیڈ پر مسلسل کروٹیں بدل رہا تھا اچانک مجھے پیاس محسوس ہوئی اور میں اٹھ بیٹھا۔ پانی پی کر میں جیسے ہی بستر پر لیٹنے کو جانے لگا تھا کہ میری نظر ٹیبل پر رکھے صفورا آنٹی کے موبائل پر پڑی۔ موبائل دیکھنے میں بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ میں نے ایسے ہی موبائل کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ آنٹی صفورا نے بہت مہنگا موبائل اپنے استعمال میں رکھا ہوا تھا وہ چاہتی تو اس سے سستے موبائل سے بھی کام لے سکتی تھیں موبائل میں میموری کارڈ لگا ہوا تھا میں نہیں چاہتا تھا کہ میموری کارڈ میں موجود چیزیں دیکھوں مگر نا چاہتے ہوئے بھی میں نے میموری کارڈ کو آن کر دیا۔ ایک فولڈر میں آنٹی کی سنسنی خیز تصاویر تھیں میں تصاویر دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ جس قسم کی ان کی تصاویر کھینچی ہوئی تھی ایسی تصاویر کوئی غیر نہیں ان کا شوہر ہی نکال سکتا تھا۔ انکل دانش نے ایسا کیوں کیا میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس طرح کی تصاویر کھینچ کر فولڈر میں رکھنا نقصان دے ہو سکتا تھا آنٹی صفورا کا موبائل چھین یا چوری ہو سکتا تھا ایسی صورت میں موبائل چھیننے والا انہیں بلیک میل کر سکتا تھا۔
تصاویر دیکھ کر میرا دماغ گھوم گیا مجھے یہ معلوم تھا کہ انکل دانش آزاد خیال تھے لیکن وہ اپنی بیوی کے ساتھ ایسی حرکت کریں گے مجھے اندازہ نہیں تھا۔ جب ان کی بیوی کو اس طرح کی تصاویر بنوانے پر کوئی اعتراض نہیں تھا پھر دوسرا کوئی کیوں کر اعتراض کر سکتا تھا ایک فولڈر میں مختلف غیر اخلاقی فلمیں رکھی ہوئی تھیں مجھے چونکہ نیند نہیں آ رہی تھی اس لیے میں نے فلم دیکھنی شروع کیں۔ پہلی دوسری تیسری دیگر سب فلمیں دیکھ ڈالیں۔ بڑی ہیجان خیز فلمیں تھیں کسی کے بھی جذبات ابھارنے کو یہ فلمیں کافی تھیں نوجوان نسل اس طرح کی فلمیں دیکھ لیتی ہیں میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی یہ حقیقت تھی اسے کسی طرح جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔
وہ فلمیں انسانی جذبات کو زبردست طریقے سے

بھڑکانے والی تھیں۔ وہ فلمیں دیکھ کر پوری رات میری بے چینی میں گزری۔ رات بھر میں ان فلموں کے متعلق ہی سوچتا رہا۔ آنٹی صفورا نے جب موبائل دیا تھا تو میموری کارڈ اس میں سے نکالا کیوں نہیں۔ آخر ان کا کیا مقصد تھا۔ میں نے خود ہی اس خیال کو جھٹک دیا وہ کیوں ایسا کریں گی شاید ان سے غلطی سے موبائل میں کارڈ رہ گیا ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انہیں مجھ پر اعتماد ہے۔ اس لیے انہوں نے یہ سوچ کر میموری کارڈ نہ نکالا ہو کہ میں اس کارڈ میں موجود چیزیں نہیں دیکھوں گا۔ اگر ایسی بات ہے تو میں نے یہ بہت غلط حرکت کی ہے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہ احساس ہونے پر خود پر بڑی شرمندگی ہونے لگی تھی۔ انہوں نے مجھ پر اعتماد کر کے میموری کارڈ نہیں نکالا اور میں نے ان کا اعتماد کا بالکل بھی خیال نہیں کیا۔ پوری رات میری انہیں سوچوں میں گزر گئی صبح ہونے سے قبل میری آنکھ لگ گئی اور میں دیر تک سوتا رہا۔ بیدار ہونے پر ذہن بوجھل بوجھل سا محسوس ہو رہا تھا۔ ناشتہ کر کے میں سیدھا آنٹی صفورا کے گھر پہنچا۔ اس وقت بھی وہ گھر پر اکیلی تھیں ان کو موبائل دیتے ہوئے میں نے کہا۔

''آنٹی یہ آپ کا موبائل ٹھیک کر دیا ہے۔'' موبائل دیکھ کر وہ خوش ہو گئیں اور چلا کر دیکھنے لگیں۔

''واہ بھئی تم نے اسے بالکل ٹھیک کر دیا ہے۔''

''میں نے سوچا موبائل نہ ہونے پر پریشان ہو رہی ہوں گی۔ موبائل انسان کی ضرورت بن گیا ہے اس سے یہ فائدہ ہے کہ انسان کہیں بھی ہو گھر والوں اور اپنے رشتے داروں سے رابطے میں رہتا ہے۔''

''ہاں جبھی اس کی مانگ میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں تمہارے لیے ناشتہ لے کر آتی ہوں۔''

''آنٹی تکلف کی ضرورت نہیں ہے میں ناشتہ کر کے آیا ہوں۔''

''ایسے کیسے ہو سکتا ہے تم بہت دنوں میں آنٹی کے گھر آئے ہو پھر کچھ کھائے پیئے بغیر کس طرح جاؤ گے۔''

''آنٹی پیٹ میں بالکل گنجائش نہیں ہے۔''

''اچھا پھر چائے لے آتی ہوں۔''

''چائے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔''

''جب ناشتہ نہیں کر رہے ہو تو پھر چائے ضرور پینا پڑے گی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ کچن کی طرف بڑھ گئیں۔

صفورا آنٹی چائے بہت اچھی بناتی ہیں۔ مجھے ان کے ہاتھ کی چائے بہت پسند تھی۔ اس لیے میں انہیں چائے نہ بنانے سے زبردستی روک نہیں سکا۔ صفورا آنٹی چائے کے ساتھ بسکٹ بھی لے آئی تھیں۔

''ارے آنٹی بسکٹ کیوں لے آئیں۔''

''خالی چائے لانا مجھے اچھا نہیں لگا اس لیے بسکٹ بھی لے آئی جتنے بسکٹ کھا سکتے ہو کھا لو۔'' آنٹی صفورا نے جھکتے ہوئے میرے پاس رکھی میز پر چائے کی ٹرے رکھتے ہوئے کہا۔

جب وہ چائے کی ٹرے رکھتے ہوئے جھکیں مجھے ایسا لگا کہ ان کا سینہ کپڑوں سے آزاد ہو گیا ہو۔ انہوں نے کپڑے ہی ایسے پہنے ہوئے تھے وہ لباس ضرور پہنے ہوئے تھیں مگر ان کا جسم صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ایک تو رات فلمیں دیکھنے کا اثر اور پھر آنٹی صفورا کا عریاں سینہ دیکھ کر مجھے اپنے ہوش اڑتے محسوس ہو رہے تھے دل میں آئی کہ اس سے پہلے مجھ سے کوئی خطا ہو جائے فوراً اٹھ کر بھاگ جاؤں اس طرح کرنے سے آنٹی صفورا کے دل میں شک پیدا ہو جاتا کہ میرے ذہن میں کچھ گڑبڑ ہو چکی ہے لہٰذا مجھے اس طرح یہاں سے رخصت ہونا تھا کہ انہیں کسی قسم کا احساس نہ ہو۔

''ارے تم نے مجھے یہ بتایا ہی نہیں کہ موبائل پر کتنا خرچہ آیا ہے۔'' آنٹی نے پوچھا۔

''جب میں نے اس میں سامان ڈالا ہی نہیں تو خرچہ کیسے آ سکتا ہے؟''

''اس کا مطلب ہے صرف تمہاری محنت ہے اب بغیر کسی جھجک کے اپنی مزدوری بتا دو۔''

''آنٹی کیا اپنوں سے بھی مزدوری لی جاتی ہے؟'' میں نے کہا۔

''اپنوں ہی سے کھل کر مزدوری لی جاتی ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں ہنس دی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس بات کا کیا جواب دوں میں خاموشی سے ان کے چہرے کو دیکھتا رہ گیا تھا۔

''انسان کو اس کی مزدوری فوراً مل جانے پر وہ دوبارہ بھی کام کردیتا ہے اگر پہلی بار ہی مزدوری نہ ملے پھر وہ آئندہ کام بولنے پر حیلے بہانے بناتا ہے۔''

''آنٹی کیا آپ مجھے ایسا سمجھتی ہیں۔'' میں نے ناراضگی دکھائی۔

میری اس بات پر وہ کھلکھلا کر زور سے ہنس دیں اور بے اختیار مجھے اپنے سینے سے لگالیا۔

''ناراض ہوگئے ارے اپنوں سے ہی تو مذاق کیا جاتا ہے غیر سے کون کرتا ہے۔'' وہ بولیں۔

آنٹی صفورا کے مجھے گلے لگانے سے میرے جسم میں کرنٹ سا دوڑ گیا تھا۔ میں جلدی سے ان سے الگ ہوگیا۔

''میں اس میں اپنا میموری کارڈ نکالنا بھول گئی تھی کسی اور نے موبائل چیک تو نہیں کیا تھا۔'' اچانک جیسے انہیں خیال آگیا ہو وہ بولیں۔

''میری آنٹی کا موبائل تھا میں اسے کسی اور کے ہاتھوں میں کس طرح دے سکتا ہوں۔'' میں نے نظریں چرائیں۔

''مجھے تم پر اعتماد ہے اسی لیے موبائل تمہیں دیا تھا۔''

''موبائل چیز ہی ایسی ہے اسے کسی اجنبی یا غیر کے ہاتھ میں نہیں دیا جاسکتا۔''

''ہاں واقعی تم ٹھیک کہہ رہے ہو تم نے میموری کارڈ کو کھولا تھا؟'' وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولیں۔

میں ان کی بات پر گڑبڑا گیا۔ دراصل انہوں نے برجستہ یہ سوال کیا تھا اور میں اس سوال کے جواب کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھا۔ اس لیے گھبرا جانا فطری تھا۔ میری گھبراہٹ سے محظوظ ہوتے ہوئے بولیں۔

''تھوڑا بہت سرسری سا چیک کیا ہوگا۔''

''آ...... ہاں...... ایسا ہی ہے۔''

''تم تو اس طرح گھبرا رہے ہو جیسے پوری رات میرے میموری کارڈ کے فولڈر کو خوب اچھی طرح سے دیکھتے رہے ہو۔''

''نن...... نہیں......'' میں نے کہا۔

مجھ سے کچھ بن نہیں پڑ رہا تھا کہ ان کے سوالات کا کیا جواب دوں اس لیے ایسے جوابات دے رہا تھا۔

''میرے دکان پر جانے کا وقت ہوگیا ہے جن کے

اللہ پاک اپنے بندے کو کس وقت دیتا ہے

فجر...... نور

ظہر...... دولت

عصر...... صحت

مغرب...... کامیابی

عشاء...... پرسکون نیند

آئیں نماز قائم کرکے اپنی زندگی خوب صورت بنائیں۔

''بے شک نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے۔''

شجاع جعفری...... تلہ گنگ

اندھا شوہر اور بدصورت بیوی

لوگوں نے بیان کیا ہے کہ ایک آدمی کی ایک لڑکی نہایت بدصورت تھی اور وہ جوان ہوگئی تھی۔ مال سامان کے باوجود کوئی اس سے نکاح کرنے کی رغبت نہیں کرتا تھا (بدصورت دلہن کے اوپر اعلیٰ ریشمی لباس بھی برا معلوم ہوتا ہے) الحاصل ضرورت کی وجہ سے مجبور ہوکر ایک اندھے کے ساتھ اس لڑکی کا نکاح کردیا۔ کہتے ہیں کہ ایک مشہور حکیم ان ہی دنوں جزیرہ لنکا سے وہاں آیا تھا' جو اندھی آنکھوں کو اپنے علاج سے روشن کرتا تھا لوگوں نے اس آدمی سے کہا کہ تم بھی اپنے داماد کا علاج کرالو۔ اس نے جواب دیا: میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بینا (دیکھنے والا) ہوکر میری بیٹی کو طلاق دے دے۔ (گلستان ص ۱۰۲)

فائدہ: دنیوی معاملات میں بھی ہوشیار رہنا چاہیے۔

مرسلہ: شمع عندلیب...... حیدرآباد

موبائل میں نے ٹھیک کیے ہیں وہ آنے والے ہیں۔" میں نے بہانہ بنایا۔

حقیقت یہ تھی کہ میں صفورا آنٹی کا سامنا نہیں کر پا رہا تھا۔ اس لیے میں نے یہاں سے فرار ہونے میں ہی عافیت جانی تھی۔ اگر یہ بات کھل جاتی کہ میں نے ساری رات ان کے میموری کارڈ میں محفوظ فلمیں اور آنٹی کی سنسنی خیز تصاویر دیکھی تھیں ان کی نظروں میں میرا کردار مشکوک ہو جاتا۔ ممکن تھا کہ وہ امی جان سے شکایت کر دیتیں گھر میں بھی عزت خاک میں مل جاتی۔ میرے کرسی سے اٹھ جانے پر وہ بھی اٹھ گئیں اور بے اختیار مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔

"گھبراؤ نہیں میں کسی سے تمہاری شکایت نہیں کروں گی۔ میں تمہاری حالت کو سمجھ رہی ہوں تم بہت اچھے لڑکے ہو یہ بات کسی اور کو نہیں بتاؤ گے کہ تم نے میموری کارڈ میں کیا دیکھا ہے۔" وہ بولیں۔

"میں اس وقت شرم کے مارے پانی پانی ہو رہا تھا۔ میں جیسے تیسے آنٹی صفورا کے گھر سے چلا آیا۔ گلی میں آنے پر مجھے کچھ سکون ملا اور آہستہ آہستہ چلتا دکان کی طرف بڑھ گیا۔ آنٹی صفورا نے بڑے پیار سے مجھے سمجھایا تھا کہ میں اپنی زبان بند رکھوں اس میں میری عافیت ہے۔

میرے ذہن پر کئی دن یہ واقعہ غالب رہا اور میں آنٹی صفورا کے بارے میں ہی سوچتا رہا کہ آنٹی کن راہوں پر چل نکلی ہیں۔ جو خواتین ایزی لوڈ والوں سے اپنی پسند کے گانے اور اس طرح کی فلمیں میموری کارڈ میں بھروانے آتی ہیں وہ اچھے کردار کی مالک نہیں ہوتی ہیں۔ آنٹی صفورا بہت شرمیلی اور سادگی پسند خاتون تھیں۔ انکل دانش کی رفاقت میں کس راہ پر چل نکلی تھیں یہ بات میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ وہ انکل دانش کی بیوی تھیں وہ جس رنگ میں انہیں دیکھنا چاہتے انہیں اسی رنگ میں رہنا تھا۔ ان کی مجبوری تھی آنٹی صفورا نے مجھے کئی بار گھر بلایا مگر میں مصروفیت کا بہانہ بنا کر نہیں گیا جب امی نے مجھے سختی سے آنٹی کے گھر جانے کا بولا میں نے صاف کہہ دیا۔

"امی آنٹی کے موبائل میں کچھ کام ہی نہیں تھا اور نہ ہی اس میں کوئی سامان ڈالا پھر میں ان سے کیا پیسے لوں۔"

"اچھا یہ بات ہے ٹھیک ہے میں ان کو سمجھا دوں گی کہ معمولی کام کے بھی کیا اپنوں سے پیسے لیے جاتے ہیں۔ اپنے ہی ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔" امی نے کہا۔

امی جان کے سمجھانے پر آنٹی صفورا نے مجھے دوبارہ نہیں بلایا شاید وہ بھی سمجھ گئیں میں ان کا سامنا کرنے سے گھبرا رہا ہوں۔ اس لیے ملاقات کرنے سے گریز کر رہا ہوں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ حقیقت یہی تھی اس دن کے بعد سے مجھے نجانے کیوں آنٹی صفورا سے خوف آ رہا تھا۔ میں خود بھی اپنی کیفیت کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ شرمندہ آنٹی کو ہونا چاہیے تھا کہ ان کے میموری کارڈ میں ایسی واہیات چیزیں کیوں تھیں اور میں اس طرح گھبرا رہا تھا کہ جیسے میرے موبائل پر یہ چیزیں ہوں اور آنٹی صفورا نے مجھے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔ آج کل جس طرح کا ماحول چل رہا ہے اس میں اکثریت ایسے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کی ہے جو اس طرح کی غیر اخلاقی فلمیں دیکھتے رہتے ہیں اور اسے معیوب بھی نہیں سمجھتے۔ میں بھی نوجوان ہی تھا گھر کا ماحول اسی نوعیت کا ملا تھا میری طبیعت اس طرف نہیں جاتی تھی۔ میری یہ پہلی غلطی تھی کہ میں نے آنٹی کے موبائل میں اس طرح کی فلم دیکھ لی تھیں جس کا مجھے پچھتاوا ہو رہا تھا کہ میں نے کیوں اس طرح کی حرکت کی۔ آنٹی صفورا سے بھی مجھے سامنا کرتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

انکل دانش کو میں نے کئی ماہ سے دیکھا نہیں تھا۔ ایک دن مجھے مسجد میں ایک آدمی دکھائی دیا۔ جس کے چہرے پر اگر داڑھی نہ ہوتی تو وہ یقیناً انکل دانش لگتے میں حیران رہ گیا کہ کبھی کبھی انسانی صورتیں کس قدر ایسی مل جاتی ہیں کہ انہیں شناخت کرنا ممکن نہیں رہتا کہ ان میں اصل کون ہے۔ اس شخص کے چہرے پر داڑھی ہونے کے سبب انہیں پہچانا جا سکتا تھا کہ یہ انکل دانش نہیں ان کا کوئی ہم شکل ہے جب میں نماز پڑھ کر مسجد کی سیڑھیاں اترنے لگا وہ شخص بھی سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ آئی اور وہ بولے۔

"حسرت بیٹے کیسے ہو؟"

"آپ انکل دانش ہیں۔" میں ان کی آواز سن کر بولا۔

"ہاں بھئی میں تمہارا انکل دانش ہی ہوں کوئی جھوٹ نہیں۔" وہ زور سے ہنسے۔

''آپ کے چہرے پر داڑھی دیکھ کر میں سمجھا کہ......''

''میں کوئی اور شخص ہوں۔'' انکل دانش نے میرا جملہ مکمل کیا۔

''ہاں ایسی ہی بات ہے۔'' میں نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

مجھے انکل کو مسجد میں دیکھ کر حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ وہ بڑے آزاد خیال تھے۔ مسجد میں نظر ہی نہیں آتے تھے۔ ہاں عید پر وہ عیدگاہ میں ضرور نظر آ جاتے تھے۔ وہ آج مجھے مسجد میں نظر آ گئے تھے اور میرا مقصد انہیں شرمندہ کرنا نہیں تھا۔ اس لیے میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس سے وہ شرمندہ ہو جائیں۔ میرے لیے یہ اچھی خبر تھی کہ انکل دانش نے مسجد سے ناتہ جوڑ لیا ہے۔ ہم دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے گھر کو روانہ ہو گئے۔

انکل دانش مجھے نماز میں اکثر نظر آنے لگے تھے۔ کبھی ہماری ملاقات ہو جاتی کبھی وہ نماز پڑھ کر جلدی مسجد سے نکل جاتے تھے۔ انہیں مسجد میں دیکھ کر نجانے کیوں مجھے دلی مسرت ہوتی تھی کہ اس قدر آزاد خیال شخص کس طرح سے مذہب کی طرف لوٹ آیا تھا۔ ان کے ایک ہاتھ میں تسبیح ہوتی تھی میں سوچ رہا تھا کہ آنٹی صفورا بھی انکل دانش کی طرح سدھر گئی ہوں گی۔ وہ بھی فیشن ایبل زندگی کو چھوڑ کر سادگی پسند ہوں گی نماز بھی پابندی سے پڑھتی ہوں گی۔

ایک دن آنٹی صفورا کے بلانے پر میں ان کے گھر چلا گیا۔ ان کا موبائل پرابلم کر رہا تھا۔ میں جس وقت ان کے گھر پر گیا وہ اکیلی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ انکل بھی اس وقت گھر میں موجود ہوں گے آنٹی صفورا نے ایسا لباس زیب تن کر رکھا تھا کہ ان کا لباس پہننا اور نہ پہننا برابر تھا۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر میں نروس ہو گیا اور بے اختیار اپنی نظریں نیچی کر لیں۔

''آنٹی انکل کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ اس وقت گھر پہ ہی ہوتے ہیں آج ان کے دوست رفیق بھائی کے گھر پر مذہبی تقریب ہے اس میں شرکت کرنے گئے ہیں۔''

''انکل کی زندگی میں یہ انقلاب کیسے آ گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

حمد باری تعالیٰ

چاہے جیسے بھی حال میں رکھنا
مجھ کو اپنے خیال میں رکھنا
چاہتا ہوں کرم یہ ہو مجھ پر
دل پرندے کو جال میں رکھنا
جا کے رہوں کبھی مدینہ میں
مجھ کو بادِ شمال میں رکھنا
کھلی آنکھوں سے دیکھ لوں تم کو
دل میرا اعتدال میں رکھنا
نام روشن رہے میرا انصر
مجھ کو اہلِ کمال میں رکھنا

نعیم انصر ہاشمی...... جھنگ صدر

نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

میں تری آل پہ قربان رسولِ عربی
زندگی کر میری آسان رسولِ عربی
بخشوا دینا خطائیں میری ربّ سے
میں تو ہوں بس نادان رسولِ عربی
کچھ نہیں ہے زادِ راہ میرے دامن میں
صرف بخشش کا ہے ارمان رسول عربی
ہوں پُر خطا کر دے مجھ کو عطا
علم کا کچھ سر و سامان رسول عربی
ہوں مشکل میں قدموں کا دھوون دیجیے
کیجیے مجھ پر احسان رسول عربی
لکھوں نعت تیری عطا کر شیریں زباں
تیرا ہے انصر پریشان رسول عربی

نعیم انصر ہاشمی...... جھنگ صدر

''جب سے ان کی دوستی رفیق بھائی سے ہوئی ہے۔'' وہ بولیں۔

''آنٹی ایسا انقلاب آپ کی زندگی میں کب آئے گا؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''میری زندگی میں جو انقلاب آیا ہے اس سے لطف اندوز ہولوں پھر دوسرے انقلاب کے بارے میں سوچوں گی۔'' وہ ہنستے ہوئے بولیں۔

''آنٹی آپ بھی سادگی پسند ہوجائیں گی۔''

''ٹھیک ہے بھئی تمہاری بات پر غور کریں گے۔'' آنٹی صفورا معنی خیز انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولیں۔

''ہاں آنٹی وہ موبائل دکھائیں۔ دیکھوں تو ایسی اس میں کیا خرابی ہوگئی ہے۔'' میں نے کہا۔

''اتنی بھی کیا جلدی ہے پہلے آنٹی کے ہاتھوں کی چائے پی لو۔ تم موبائل ٹھیک کرنے کی مزدوری لوگے نہیں۔ کم از کم چائے ہی پی لو۔ آنٹی صفورا ہنستے ہوئے بولیں۔

''ٹھیک ہے جب تک چائے لائیں میں موبائل دیکھ لیتا ہوں۔ ممکن ہے موبائل میں ایسا فالٹ نہ ہو کہ اسے دکان لے جانے کی نوبت نہ آسکے۔''

''ہاں دیکھ لو۔'' آنٹی صفورا نے موبائل مجھے دیتے ہوئے کہا۔

آنٹی صفورا کے ہاتھ سے موبائل لے کر میں نے دیکھنا شروع کردیا وہ چائے بنانے چلی گئیں تھیں موبائل میں کام تھا اور ایسا کام تو گھر پر نہیں ہوسکتا تھا اس دوران آنٹی صفورا چائے بنا کر لے آئیں تھیں۔

''لو بھئی گرما گرم چائے اور ساتھ میں پکوڑے بھی۔'' وہ بولیں۔

''ارے آنٹی اتنی جلدی پکوڑے کیسے تیار ہوگئے۔'' میں نے حیرت سے تازہ پکوڑے دیکھتے ہوئے کہا۔

''چائے میں نے تیار کی ہی اور پکوڑے بازار سے آئے ہیں میں نے محلے کے ایک بچے کو بھیج کر منگوالیے ہیں۔''

''اچھا جبھی مزے میں چائے کے ساتھ پکوڑے نظر آرہے ہیں۔'' میں نے ایک پکوڑا اٹھاتے ہوئے کہا۔

میں کچھ دیر تک آنٹی صفورا کے پاس بیٹھ کر چلا آیا۔ ان سے دوران بات چیت میری جب بھی ان کی آنکھوں سے آنکھوں ٹکرائیں ان کی آنکھوں میں ہوس نظر آئی۔ ایسا محسوس ہورہا تھا وہ پیاسی ہیں اور سیراب ہونا چاہتی ہیں مجھے ڈر بھی لگ رہا تھا کہ انکل دانش اگر اچانک آجائیں اور آنٹی صفورا کو اس حالت میں دیکھ کر وہ ہم دونوں کے بارے میں کیا سوچیں گے۔ میں جتنی دیر آنٹی صفورا کے پاس بیٹھا رہا میرے دل میں عجیب سا خوف محسوس ہوتا رہا گھر سے نکلنے پر میری کیفیت ٹھیک ہوگئی

گھر پہنچ کر میں نے موبائل رکھ دیا۔ اب یہ کل ہی ٹھیک ہونا تھا۔ میں جب بیڈ پر سونے کو لیٹا مجھے یاد آیا کہ کچھ سامان گھر میں موجود ہے اس سے موبائل ٹھیک ہوسکتا ہے میرے پاس موبائل ٹھیک کرنے کا سامان نہیں تھا یہ سامان جنید رکھ کر گیا تھا اس کے چھوٹے بہن بھائی جنید کی غیر موجودگی میں اس کے سامان میں منع کرنے کے باوجود گھستے تھے۔ کبھی کبھار سامان خراب بھی کردیتے تھے اس لیے جنید کو جب دوسرے شہر جانا ہوتا تھا میرے پاس سامان رکھ جاتا تھا اور جب لوٹتا مجھ سے اپنا سامان لے جاتا تھا۔

میں نے جنید کا سامان نکالا اور موبائل کے فالٹ کو ٹھیک کرنے میں مصروف ہوگیا۔ آدھے گھنٹے کی محنت سے موبائل کا فالٹ دور ہوچکا تھا اس دفعہ بھی آنٹی صفورا موبائل سے میموری کارڈ نکالنا بھول گئیں تھیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ایسا جان بوجھ کر کررہی ہیں یا ان سے انجانے میں ایسا ہوتا ہے۔ بہرحال جو بھی ہورہا تھا وہ اچھا نہیں ہورہا تھا میری عمر ہی ایسی تھی مجھے خود پر کنٹرول کرنا بہت مشکل تھا۔ اس وقت بھی ایسا ہوا کہ نا چاہتے ہوئے بھی میں نے میموری کارڈ کو کھول لیا۔ ایک فولڈر میں آنٹی کی تصاویر دیکھ کر مجھے اپنا دماغ گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ ان کی تصاویر انسان کے جذبات کو بڑھکا دینے والی تھیں ان تصاویر میں اگر وہ انکل دانش کے ساتھ ہوتیں تو ٹھیک ہوتا لیکن وہ تصاویر انکل دانش کے بجائے غیر مردوں کے ساتھ تھیں میرا دماغ مجھے بھک سے اڑتا محسوس ہوا۔ میری بڑی عجیب کیفیت ہوگئی۔ جسے بیان کرنے کی بجائے سمجھنے کی ضرورت تھی۔ آنٹی صفورا اخلاقی طور پر اتنا گر جائیں گی میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ ان میں آنٹی صفورا سے زیادہ قصوروار انکل دانش ہی تھے۔

وہ باپردہ شرم وحیا کی مالک خاتون تھیں انہیں آزاد خیال فیشن ایبل بنانے میں انکل کا ہی ہاتھ تھا۔ جس قسم کی وہ فلمیں دیکھنے لگی تھیں ظاہر ہے یہ فلمیں بھی انکل دانش نے ہی انہیں دکھائی ہوں گی اور اب انہیں یہ فلمیں دیکھنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ ایسی فلمیں دیکھنے سے انسانی سوچ گندی ہوجاتی ہے اور فلم دیکھنے والا حلال وحرام کام کی تمیز کیے بغیر اپنی زندگی کو بھرپور طریقے سے انجوائے کرنا چاہتا ہے۔ آنٹی صفورا کی غیر مردوں کے ساتھ آزادانہ اسٹائل میں تصاویر دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ وہ بھی زندگی کو بھرپور طریقے سے انجوائے کرنے کو ترجیح دے رہی ہیں۔

آنٹی صفورا کا موبائل اور میموری کارڈ میرے ہاتھوں میں تھا بے اختیار میری انگلیاں موبائل پر چل رہی تھیں مووی کا فولڈر کھولنے پر میرے سامنے وہ فلمیں آگئیں جو میموری کارڈ میں موجود تھیں۔ ایک ایک کرکے میں نے وہ تمام فلمیں دیکھ ڈالیں۔ بڑی ہاٹ قسم کی مووی تھیں۔ ان فلموں کو دیکھ کر انسانی جذبات کنٹرول میں نہیں رہ سکتے تھے ان فلموں کا اثر میرے ذہن پر اس وقت تک رہا جب تک نیند نہیں آگئی صبح بیدار ہونے پر میرا ذہن بوجھل بوجھل ہورہا تھا۔

بیدار ہونے پر بھی بیڈ کو چھوڑنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا یہ رات دیر تک فلمیں دیکھنے کا اثر تھا میں وہ فلمیں دیکھنا نہیں چاہتا تھا لیکن وہ فلمیں ہی ایسی تھیں کہ نہ چاہتے ہوئے بھی دیکھتا ہی چلا گیا تھا۔

میرا ارادہ یہی تھا کہ دکان جاتے ہوئے آنٹی صفورا کو موبائل دیتا ہوا نکل جاؤں مگر میں جیسے ہی ان کے دروازے پر پہنچا۔ مجھ میں اتنی ہمت پیدا نہ ہوسکی دستک دے دوں۔ نہ جانے کون سی قوت تھی جو مجھے دروازے پر دستک دینے سے روک رہی تھی بے اختیار میرے قدم آگے بڑھ گئے۔ چند قدم چلنے پر میں دوبارہ لوٹ کر دروازے پر آیا لیکن پھر دستک دیئے بغیر آگے بڑھ گیا۔ میری یہ کیفیت خاصی دیر رہی میں دروازے پر آتا اور بغیر دستک دیئے لوٹ آتا۔ آنٹی صفورا اچانک سے دروازہ نہ کھول دیتیں تو نجانے میری کتنی دیر اور یہ کیفیت رہتی ان کے دروازے پر مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا۔

''حسرت باہر کھڑے کیا کررہے ہو آؤ اندر آجاؤ۔'' وہ پیار سے بولیں۔

''جج۔۔۔۔جی۔'' یہ کہتے ہوئے میں گھر میں داخل ہوگیا۔

''کیا بات ہے تم دروازے پر دستک دیتے ہوئے کیوں ہچکچا رہے تھے؟''

''آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں.....'' میں نے کہنا چاہا۔

''میں چھت پر کپڑے سکھا رہی تھی میری دو تین بار گلی میں نظر پڑی تھی میں نے یہ ہی دیکھا کہ تم دروازے پر آتے ہو اور پھر دستک دیئے بغیر پلٹ پڑتے ہو۔ اس لیے میں نیچے اتر آئی کہ پوچھوں کہ تم آج ایسا کیوں کررہے ہو آخر تمہارے یہ ہاتھ دستک دینے سے کیوں ہچکچا رہے ہیں۔'' آنٹی صفورا نے میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

''ارے تم تو گرم ہورہے ہو تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں میری طبیعت ٹھیک ہے۔'' میں نے ان کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ چھڑانا چاہے مگر آنٹی نے میرے ہاتھ اتنی مضبوطی سے پکڑ لیے تھے کہ چھڑانا مشکل ہورہا تھا۔

''آؤ اندر چلو۔'' وہ میرے ہاتھ پکڑے پکڑے صحن سے اندر لے گئیں۔ آج نجانے کیوں میرے ہاتھ چھوڑنے کو تیار نہیں ہورہی تھیں وہ مخمور نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھیں مجھے اس لمحے بڑی شرم سی محسوس ہورہی تھی صفورا آنٹی کی شرم نہ جانے کہاں گم ہوگئی تھی وہ بس مجھے دیکھے جارہی تھیں۔

''آنٹی کیا آج چائے پلانے کا موڈ نہیں ہے۔'' میں نے اپنی جان چھڑانے کو کہا۔

''اوہ! ہاں مجھے یاد نہیں رہا۔'' وہ بولیں۔ وہ میرے ہاتھ چھوڑ کر کچن کی طرف بڑھ گئیں۔ میں انجانے خوف سے گھبرا رہا تھا رات میں نے جو فلمیں دیکھیں تھیں ان کا اثر ابھی ذہن پر باقی تھا۔ ایسی فلمیں انسانی اخلاق کو بگاڑنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں آنٹی صفورا نے جب میرے ہاتھوں کو تھاما تھا مجھے کچھ کچھ ہورہا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی غلط حرکت کا مرتکب ہوجاؤں بظاہر وہ مجھ سے عمر میں بڑی تھی مگر جب انسان اخلاق سے گر جائے پھر وہ عمر اور رشتوں کی

قدر کھو دیتا ہے۔ آنٹی صفورا چائے اور بسکٹ لے آئیں۔
''اب یہ مت بولنا کہ بسکٹ کیوں لے آئی ہو؟'' وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔
''نہیں بولوں گا۔'' میں بھی جواباً مسکرا دیا۔
''تم کچھ بھی طلب کر سکتے ہو۔''
''کیا؟'' میں چونکا۔
''بسکٹ کی بات کر رہی ہوں جب طلب ہو کھا لینا۔''
''میں پولیس والا نہیں ہوں جب پولیس کی طلب ہو گی آنٹی کی گھر آ جاؤں گا۔'' میں نے کہا۔
''ہاں بھئی یہ تمہارا ہی گھر ہے جب دل کرے آ جاؤ تمہیں کوئی نہیں روکے گا۔'' آنٹی صفورا نے زوردار قہقہہ لگایا۔ مجبوراً مجھے بھی قہقہہ لگانا پڑا۔
وہ مجھے بڑی پیار بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ چائے گرم تھی ورنہ ایک ہی گھونٹ میں پی جاتا۔ وہ مجھے جن نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں ان سے میرے بدن میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ میں خود کو کنٹرول میں رکھنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا وہ میرے حواس پر چھا رہی تھیں۔ میں نے گرم گرم چائے اپنے جسم میں انڈیلنا چاہا تو آنٹی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔
''گرم چائے مت جسم میں انڈیلو ورنہ چائے نقصان کر جائے گی۔''
''جی جی۔'' میں نے اپنے بے ترتیب سانسوں کو سمیٹتے ہوئے کہا۔
''میں چائے ٹھنڈی کر کے پی لوں گا۔''
ان کے میرے ہاتھ پکڑے رہنے سے میرے جسم میں ایک کرنٹ کی لہر دوڑ رہی تھی وہ مجھ پر جھکتی جا رہی تھیں اور میں پیچھے ہو رہا تھا اس عمل میں، میں خود پھنس گیا میں مکمل طور پر ان کی گرفت میں آ چکا تھا۔
''میرے موبائل کا کیا بنا ٹھیک بھی ہوا یا نہیں۔'' وہ مجھ پر جھکتے جھکتے بولیں۔
آنٹی صفورا کی ہوس بھری آنکھیں میرے چہرے کا بھرپور طواف کر رہی تھیں ان کی گرم گرم سانسیں میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں۔
''میں وہی دینے آیا ہوں۔''
''میں موبائل لے لوں گی تم پریشان مت ہو۔'' کہتے ہوئے وہ اپنا چہرہ میرے چہرے کے بالکل قریب لے آئیں۔ خوف سے میرا چہرہ فق ہو گیا تھا۔
''مجھ سے ڈر رہے ہو۔'' وہ بولیں۔
''نہیں وہ دکان پر کام ہے اس کی فکر ہے۔'' میں نے کہا۔
آنٹی صفورا کی سانسیں میرے چہرے سے مسلسل ٹکرا رہی تھیں اس سے قبل وہ کوئی حرکت کرتیں میرا موبائل بج اٹھا۔ میں نے آنٹی کی گرفت نرم پڑتے دیکھ کر اپنے ہاتھ ان سے چھڑا کر موبائل نکال لیا۔ دکان مالک کی کال تھی۔
''کہاں ہو ابھی تک تم دکان پر نہیں آئے؟''
''میں، میں پہنچ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔
''جلدی آؤ مجھے کام سے جانا ہے۔''
''میں آ رہا ہوں۔'' میں نے یہ کہتے ہوئے موبائل بند کر دیا۔
میرے جانے کا سن کر آنٹی صفورا کے چہرے پر جو دل نشین مسکراہٹ آئی تھی وہ غائب ہو گئی میں نے موقع غنیمت جانا اور موبائل ان کے حوالے کیا اور جلدی جلدی چائے کی پیالی ختم کر کے چلا آیا۔
گھر سے باہر آنے پر مجھے سکون محسوس ہوا تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ جب انسان گناہوں سے بچنا چاہے بچ جاتا ہے۔ رات کو جو فلمیں دیکھی تھیں ان کے سبب مجھ پر شیطان غالب آ رہا تھا اور اگر میں ایک لمحے میں جذبات کی رو میں بہہ جاتا تو شیطان اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا۔ گھر سے نکلتے ہی میں نے دل میں پکا عہد کر لیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے مجھے اب آنٹی صفورا کے گھر نہیں آنا ہے۔ میں موبائل ٹھیک ضرور کر دوں گا لیکن اپنے چھوٹے بھائی کے ہاتھوں بھجوا دوں گا۔ میں آئے دن اخبارات میں اس نوعیت کے واقعات پڑھتا رہتا ہوں کہ بیوی نے کسی دوسرے مرد سے جنسی تعلقات استوار کر لیے اور شوہر کو علم ہو جانے پر کسی کا شوہر اپنی بیوی کو اور کسی کا شوہر اس کے آشنا کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ بعض شوہر ایسے ہوتے ہیں کہ وہ بیوی اور اس کے آشنا کو ہی قتل کر دیتے ہیں کبھی بیوی اپنا راز افشا ہونے پر آشنا سے قتل کرا کے شوہر کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ آنٹی صفورا بھی [illegible] جس کا انجام

سوائے تباہی اور بربادی کے کچھ نہیں ہے۔ آنٹی صفورا مجھے بھی اپنے لیے استعمال کرنا چاہ رہی تھی انسان کو ایک بار اس کا چسکا لگ جانے پر اس سے چھوٹتا نہیں ہے جھلاتی اسی میں تھی کہ میں صفورا آنٹی سے اس طرح دور ہو جاؤں کہ اسے برا بھی نہ لگے اور میں ان کے لیے استعمال بھی نہ ہوسکوں۔

مجھے آنٹی صفورا کا موبائل ٹھیک کیے ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ پتا چلا کہ انہیں کسی نے اغوا کرلیا ہے انکل دانش انہیں تلاش کرتے پھر رہے تھے تھانے میں ان کی گمشدگی کی رپورٹ کروادی تھی جو بھی یہ خبر سنتا حیرت کرتا۔ انکل دانش نے آنٹی صفورا کا بھرپور خیال رکھا تھا ان کے منہ سے فرمائش نکلی اور انکل دانش نے فوراً پوری کردی۔ اتنا خیال رکھے ہونے وہ خود کہیں نہیں جاسکتی تھیں۔ ضرور انہیں کسی نے تاوان حاصل کرنے کے لیے اغوا کیا تھا۔ انکل دانش کی مالی حیثیت بہت اچھی تھی یہ تقریباً سب ہی رشتے داروں کی رائے تھی۔ ان کے برعکس میری رائے مختلف تھی آنٹی صفورا کو کسی نے اغوا نہیں کیا تھا بلکہ وہ خود اپنے کسی آشنا کے ساتھ فرار ہوگئی ہیں۔ جن مردوں کے ساتھ صفورا آنٹی کی بے باکانہ انداز میں تصاویر میموری کارڈ میں کھنچی ہوئی تھیں وہ کسی شریف خاتون کی نہیں ہوسکتی تھیں۔ ضرور گڑبڑ تھی جس کا انکل دانش کو پتہ نہیں تھا اس راہ پر چلانے والے بھی انکل دانش ہی تھے میں اگر اپنی اسی رائے کا اظہار کرتا بھی تو کوئی یقین نہ کرتا جن مردوں سے آنٹی صفورا کی دوستی تھی انہیں کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ محلے میں آنٹی صفورا کا کردار خراب نہیں تھا بس محلے اور رشتے داروں کو یہی پتا تھا کہ انکل انہیں جیسا دیکھنا چاہتے ہیں وہ ویسی ہی بن کر گھر میں رہتی ہیں۔

صفورا آنٹی کو گم یا اغوا ہوئے دس دن ہوگئے تھے پولیس انہیں بازیاب کرنے میں ناکام رہی تھی گیارہویں دن پولیس کو ایک لاش ملی۔ پولیس نے لاش کی شناخت کے لیے انکل دانش کو بلایا۔ انکل دانش نے لاش دیکھتے ہی شناخت کرلیا کہ وہ ان کی بیوی صفورا ہی ہے۔ پولیس نے لاش کا پوسٹ مارٹم کرکے لاش کو انکل دانش کے حوالے کردی۔ آنٹی صفورا کے جسم پر تشدد کے نشانات موجود تھے قاتل نے بڑی بے دردی سے ان پر پہلے تشدد کیا اور پھر ان کا گلا گھونٹ

کر ہلاک کر دیا تھا۔ محلے کے لوگ اور میت کی تدفین میں آئے ہوئے رشتے دار سب ہی قاتل کو برا بھلا کر رہے تھے کہ اسے آنٹی صفورا پر ظلم کرتے ہوئے ذرا بھی رحم نہیں آیا۔ کس قدر تشدد کر کے انہیں ہلاک کیا ہے۔ انکل دانش کی کسی سے دشمنی بھی نہیں تھی جو سمجھتے کہ کسی نے دشمنی نکالی ہے غرض ہر شخص اپنی اپنی رائے پیش کر رہا تھا مجھے بھی آنٹی صفورا کے قتل کا بہت افسوس تھا وہ بہت خوش اخلاق عورت تھیں گھر آئے مہمانوں اور رشتے داروں کی خاطر مدارت اور بھرپور خیال رکھتی تھیں ان کے قتل کا سبھی کو افسوس اور رنج تھا۔

آج استاد پیارے خاموشی سے سگریٹ پر سگریٹ پیئے جا رہے تھے۔

''کیا آج چپ رہنے کا روزہ رکھا ہوا ہے؟'' نعیم قریشی ان سے مخاطب ہوئے۔

''بس یار میرا دل ٹوٹ گیا ہے۔''

''کیوں؟''

''میں نے خلیل جبار سے ایک چائے کے کپ کی فرمائش کی مگر اس نے انکار کر دیا۔ یہ استاد پیارے کی توہین ہے کہ نہیں۔'' استاد پیارے نے کہا۔

''میں نے آپ کی توہین نہیں عزت افزائی کی ہے۔'' میں نے کہا۔

''کیا خاک عزت افزائی کر رہے ہو۔ استاد پیارے کو ایک کپ چائے تک نہیں پلا سکتے؟'' استاد پیارے نے کہا۔

''استاد پیارے میں جب کورٹ رپورٹنگ میں آیا تھا جہاں آپ نے مجھے ڈھیری نصیحتیں کی تھیں ان ہی نصیحتوں میں ایک نصیحت یہ بھی تھی کہ وہ صحافی کیا جو چائے اپنے پیسوں کی پیے۔ ہمیشہ دوسروں کے پیسوں کی چائے پیو ورنہ صحافت چھوڑ دو۔ بس اس دن سے ہم آپ کی بات پر سختی سے عمل کر رہے ہیں میں نے کہا۔''

''یہ بات استاد پیارے پر بھی آزماؤ گے؟'' استاد پیارے نے جھینپتے ہوئے کہا۔

''استاد پیارے کی بات کو ہم کس طرح بھول سکتے ہیں آخر کو ہمیں بھی صحافت میں رہنا ہے بلکہ صحافت میں ترقی کرنا ہے۔'' میں نے کہا۔

''استاد پیارے دیکھو یہ ہوتی ہے سعادت مندی کس طرح آپ کا حکم مانتا ہے۔'' نعیم قریشی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نعیم بھائی میں دیکھ رہا ہوں آپ بھی میرا ساتھ دینے کے بجائے خلیل جبار سے مل گئے ہو خیر ہم بھی استاد پیارے ہیں ہم چائے پیئں گے بھی پلائیں گے بھی آؤ میرے ساتھ۔'' استاد پیارے نے کہا۔

''کہیں جانے کی کیا ضرورت ہے ہم کینٹین میں ہی بیٹھے ہوئے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ارے ہاں واقعی ہم کینٹین میں ہی بیٹھے ہیں۔'' استاد پیارے خوش ہوتے ہوئے بولے۔

کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے نوجوان پر ایک بھرپور نظر ڈالتے ہوئے استاد پیارے اس سے مخاطب ہوئے۔

''میاں تمہاری کینٹین میں صحت وصفائی کا فقدان ہے لوگ تمہاری چائے اور پانی پی پی کر ہیپاٹائٹس بی اور سی کے مریض بن رہے ہیں۔''

''کیا چچی نے صبح ہی صبح کچھ کہہ دیا ہے جو اس طرح کی باتیں کر رہے ہو۔'' کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔

''میں بہت سنجیدہ ہوں مجھے تمہاری کینٹین کے بارے میں لکھنا پڑے گا کہ یہاں کیا کیا ہو رہا ہے؟'' استاد پیارے نے اپنا چشمہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

''لکھ دیں کچھ فرق نہیں پڑے گا۔''

''یہ تم آج کس طرح کی باتیں کر رہے ہو۔'' استاد پیارے نے مصنوعی غصے کا اظہار کیا۔

''چائے پینی ہے تو بتا دو میں چائے بھجوا دیتا ہوں۔''

''ہاں بھئی تین کپ چائے دے دو۔'' استاد پیارے نے گردن نیچے کرتے ہوئے کہا۔

''کیا بات ہے استاد پیارے آج یہ تمہیں لفٹ نہیں کروا رہا ہے؟'' میں نے انہیں چھیڑا۔

''میرا خیال ہے یہ بیگم سے لڑ کر آیا ہے۔'' استاد پیارے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ابھی ہم چائے پی رہے تھے کہ اے ایس آئی جاوید ایک بزرگ کو ہتھکڑیاں لگاتے ہوئے لائے تھے۔ ایک نوجوان بھی بزرگ کے ساتھ تھا۔ اس نوجوان کو دیکھ کر میں چونکا۔

اسے میں نے موبائل ٹھیک کرنے کی دکان پر کام کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

''استاد پیارے لگتا ہے کوئی خاص خبر ہے۔''

''ہاں مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔'' استاد پیارے نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

ہم چائے ختم کرکے ان کے پاس پہنچ گئے۔ وہ لوگ چائے پی رہے تھے ہمیں دیکھ کر اے ایس آئی جاوید مسکرایا۔ اور مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔

''آپ لوگ یقیناً اس خبر کے سلسلے میں آئے ہو۔''

''ہاں کیا خبر ہے؟'' نعیم قریشی نے پوچھا۔

''آپ لوگ اس سے ہی پوچھ لو؟'' اے ایس آئی نے بزرگ کی طرف اشارہ کیا۔

''میں نے اپنی بیوی کا قتل کیا ہے۔'' بزرگ نے بتایا۔

''کیا یہ لڑکا بھی اس جرم میں شریک ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''نہیں یہ میرا بھتیجا حسرت ہے میری گرفتاری کا سن کر کورٹ میں آ گیا ہے۔''

''قتل کی کوئی خاص وجہ؟'' استاد پیارے نے پوچھا۔

''میری بیوی کے غیر مردوں سے ناجائز تعلقات تھے مجھ پر یہ انکشاف ہونے پر میں نے اسے بہت سمجھایا کہ مگر وہ باز نہیں آئی۔ اس کے نزدیک زندگی نام اسی کا ہے کہ انجوائے کرو۔ مجھے کہتی تھی کہ تم بھی انجوائے کرو کیا یہ بزرگی کا ڈھونگ رچا کر گھوم رہے ہو۔ یعنی اس کے نزدیک میں ڈھونگی بابا تھا۔ ایک دن جب میری برداشت سے باہر ہو گیا تو میں نے ایک دوست کے گھر جانے کا بہانہ بنا کر باہر لے گیا اور ایک ویران علاقے میں لے گیا۔ اور وہاں میں جتنا غصہ اس پر اتار سکتا تھا تشدد کرکے پورا کیا اور جب وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں گئی تو میں نے اس کا گلا گھونٹ کر اپنا انتقام پورا کرلیا۔

''اپنے کیے پر کوئی پشیمانی یا دکھ ہے؟'' استاد پیارے نے پوچھا۔

''قتل ہمیشہ جذبات میں آ کر ہی کیا جاتا ہے میں اگر جذبات میں نہ آتا تو کبھی قتل نہ کرتا میں نے جو قدم اٹھایا ہے اس کی سزا بھی بھگتنی پڑے گی۔'' بزرگ دانش نے نظریں نیچی کیے کہا۔

''کتنے دن کا ریمانڈ لیا ہے۔'' نعیم قریشی نے اے ایس آئی سے پوچھا۔

''تین دن کا ریمانڈ لیا۔ یہ مکمل ہونے پر مزید ریمانڈ لیں گے۔''

ہمارے مزید نہ پوچھنے پر پولیس چائے پی کر بزرگ دانش کو لے گئی۔ جب کہ ان کا بھتیجا حسرت وہیں رک گیا تھا ان کے جانے پر وہ ہم سے مخاطب ہوا۔

''انکل دانش نے آنٹی صفورا کو جس راہ پر چلایا تھا اس کا یہی انجام ہونا تھا۔

''اس کا مطلب ہے تمہارے پاس بہت سی معلومات ہے۔'' نعیم قریشی نے کہا۔

''ہاں مجھے سب پتا ہے لیکن جب شوہر خود اپنی بیوی کو بگاڑے پھر اسے کون سدھار سکتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے حسرت نے پوری تفصیل ہمیں بتادی۔

''حسرت بیٹے تم نے اخبار کے لیے بہت اچھی خبر دے دی ہے کل تم دیکھنا اخبارات اس خبر کو کیسے لگاتے ہیں۔'' استاد پیارے نے کہا۔

''خبر میں یہ ضرور لکھ دینا کہ اگر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی بیویاں نیک بن کر زندگی گزاریں تو انہیں ایسا موبائل فون دیں جو صرف رابطے کے ہی کام میں آئے۔'' حسرت نے کہا۔

''بے فکر رہو خبر میں ہم اس جملے کا اضافہ کردیں گے۔'' میں نے کہا۔

استاد پیارے کے چہرے پر رونق آ گئی تھی یہ رونق ان کے چہرے پر جبھی آتی ہے جب انہیں اسی طرح کی خبریں ملتی ہیں۔

آب زد

امجد جاوید

اس کہانی کے لیے صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ اسے محترم امجد جاوید نے تحریر کیا ہے ان کا ایک خاص وصف ہے کہ وہ جو کچھ تحریر کرتے ہیں اس میں ڈوب کر لکھتے ہیں ان کے ہاتھ قارئین کی نبض پر ہوتے ہیں۔

آیئے ان کی تحریر سے لطف اٹھایئے

سیلی جب ملتان ایئر پورٹ سے باہر نکلی تو کئی نگاہوں میں اس کے لیے ستائش بھر گئی۔ اس کا فطری حسن تو قدرت کا عطیہ تھا ہی، لیکن بدن کے خال و خد میں بھی وہ سراپا شہکار تھی۔ قدرت کے عطیے پر اگر انسانی محنت ہو جائے تو بھی شہکار وجود میں آجاتے ہیں۔ سیلی اپنے فطری حسن کی کشش سے آشنا تھی۔ سو وہ ستائشی نگاہوں سے بے نیاز متلاشی نگاہوں سے ایئر پورٹ کے داخلی راستوں کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ مجسمہ حسن ایک لمحہ کو ٹھہر گئی تو گویا نگاہیں بھی تھم گئیں۔ تبھی اس کے پیچھے گرانڈیل مرد نما خاتون "نجو" بھی رک گئی۔ خواجہ سراؤں جیسی نجو اس کی ملازمہ کم اور سیکورٹی گارڈ زیادہ دکھائی دے رہی تھی۔ انہی لمحات میں اس کی نگاہ مسکراتی ہوئی فائقہ پر پڑی جو چند مرد و خواتین کے ساتھ تیزی سے اس کی جانب بڑھی تھی۔

"ویل کم سیلینہ۔۔۔ ویل کم۔۔ آپ کی آمد ہمارے لیے خوشی کا باعث ہے۔"

"حماد خان نہیں آئے۔" اس نے آہستگی سے پوچھا

"وہ تھوڑا مصروف تھے۔۔ ہمیشہ کی طرح۔۔ خیر، میں جو آ گئی ہوں۔ اور وہ بھی اتنے لوگوں کے ساتھ" یہ کہتے ہوئے وہ دھیرے سے ہنس دی۔

"چلیں پھر۔!" یہ کہتے ہوئے اس نے قدم بڑھا دیئے۔ مزید تبصرہ کرنا اس نے مناسب ہی نہ سمجھا تھا۔ وہ سب اس کے پیچھے پیچھے آنے لگے۔ ایئر پورٹ کی عمارت کے باہر گاڑیاں قطار میں کھڑی تھیں۔ وہ بیٹھی تو گاڑیوں کا یہ قافلہ چل دیا۔

سیلی، لاہور سے ملتان کے اس مضافاتی علاقے مظفر گڑھ میں حماد خان کی خصوصی دعوت پر آئی تھی۔ اُس نے ایک اعلیٰ سطحی سیمینار کا اہتمام کیا تھا۔ یہ وہ علاقہ تھا، جہاں گزشتہ برس دریائے سندھ کے سیلاب نے تباہی مچا دی تھی۔ نجانے کتنے لوگ لقمہ اجل تھے۔ کتنے بے گھر ہو گئے اور ان میں ایسے بھی تھے، جنہیں سیلاب بہا کر لے گیا تو پھر ان کا نام و نشان تک نہ ملا کہ لواحقین صبر ہی کر لیں۔ یہ سیمینار انہی سیلاب زدگان کی بحالی کے بارے میں صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے تھا۔ جسے اس علاقے کے سیاسی زعماء نے اپنی طاقت کے اظہار کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ جن ممالک نے ان لوگوں کی امداد کی تھی، ان کے سفیر یا نمائندے، حکومتی وزراء، این جی اوز کے لوگوں کے علاوہ وہ بھی شامل تھے جنہوں نے اپنے طور پر ان سیلاب زدگان کی مدد کی تھی۔

سیلاب کے دنوں میں سیلی بھی یہاں موجود تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے وہ سارے منظر دیکھے تھے، جن سے انسان دہل کر رہ جائے۔ ان مناظر کو اس نے اپنے دل پر محسوس کیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس سیمینار میں اس کی حیثیت محض نمائشی ہے، ورنہ اس کا یہاں نہ کوئی کام تھا اور نہ کوئی مقصد۔ وہ صرف اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو

کر اس صحرائی علاقے میں آئی تھی۔ جس لمحے اسے دعوت ملی تھی۔ اسی لمحے ایک خواہش، ہمک کر ہوک بن گئی تھی۔ وہ اس شخص سے دوبارہ ملنا چاہتی تھی، جو سیلاب کے دنوں میں اس سے ملا تھا۔ ایک آوارہ جھونکے کی طرح، جو اپنی خوشبو، تازگی اور فرحت سے سرشار کر جائے۔ تب وہ پورے دل سے مچل گئی تھی۔ وہ جو کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی اور نہ ہی کسی سے مرعوب ہوئی تھی۔ اس شخص سے ملنے کی خواہش، خوشی بن کر اس کے پورے وجود میں پھیل گئی تھی۔ اس نے فوراً ہی وعدہ کر لیا تھا۔ پھر یہ چند دن کیسے گزرے۔ یہ وہی جانتی تھی۔ اضطراب و انتظار کے یہ دن بڑے صبر آزما تھے۔ اسے اُمید نہیں تھی کہ وہ دوبارہ اس شخص سے مل پائے گی۔ اس کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اسے تلاش ضرور کرے گی۔ اپنے دل میں اس شخص سے ملنے کا ارمان چھپائے، وہ حماد خاں کی حویلی کی جانب گامزن تھی۔ سیلاب کے دنوں میں وہ وہیں ٹھہری تھی۔ وہ یہاں کا سب سے مضبوط سیاسی گھرانہ تھا۔ اس شخص کے بارے میں سکی نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔ یہاں تک کہ حماد خاں کو بھی نہیں۔ اور شاید اسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ اسے اتنا یاد آئے گا۔

گاڑیوں کا قافلہ حویلی کی جانب رواں تھا۔ اس کی گاڑی میں خاموشی تھی۔ اور ان علاقوں کو دیکھ رہی تھی جو پچھلے برس زیر آب تھے۔ اس نے آنکھیں موند لیں اور ماضی کے ان لمحات میں جا پہنچی، جب اس کے من میں جوت جاگی تھی۔ یہی وہ دن تھے، جب اس نے زندگی کو بڑے قریب سے دیکھا تھا۔ انہی دنوں اس نے انسان کے اندر تک جھانکنے کا تجربہ حاصل کیا تھا۔ کیونکہ جس طرح علم کا دارومدار سوچ پر ہوتا ہے، اس طرح عمل سے بھی سوچ کا کھوج مل جاتا ہے۔

❋ ❋ ❋

جولائی کے اس گرم موسم میں تازہ دم ہونے کے لیے وہ شاور لے چکی تو سیدھی ٹی وی لاؤنج میں آ گئی۔ کہیں کہیں سے بھیگا ہوا ڈھیلا ڈھالا سفید ریشمی لباس اس کے بدن سے چپک کر رہ گیا تھا۔ اس کی لمبی سیاہ زلفوں سے پانی قطرہ قطرہ موتیوں کی طرح گر رہا تھا۔ جس سے لباس اس کی پشت پر سے اس کا گلابی بدن آشکار کر رہا تھا۔ کھلے گیسوؤں سے ایک آوارہ لٹ گال سے ہوتی ہوئی نچلے لب تک آ گئی تھی۔ بڑی بڑی متلاشی آنکھیں مخمور تھیں۔ شہد ملا گورا رنگ، گول چہرہ، پتلے لب اور ستواں ناک میں سونے کی ہلکی سی تار، اس کے نقوش کو ابھار رہی تھی۔ اس نے اپنے گلابی پیروں میں سے سیاہ سلیپر اتارے، تولیے سے زلفوں کو باندھا اور صوفے پر پھیل کر بیٹھ گئی۔

کچھ ہی دیر بعد ٹی وی پر اس کا وہ پروگرام آنے والا تھا، جس میں سکی کے رقص کو بے انتہا سراہا گیا تھا۔ اس کے ذہن میں وہ سیکڑوں لوگ تھے جو اس کی ایک ایک ادا پر بے تحاشا داد دے رہے تھے۔ اس نے بھی اسٹیج پر خود کو شعلہ جوالہ بنا کر اپنا من داؤ پر لگا دیا تھا۔ وہ رقص کرتی رہی اور اپنے عشاق کا دل اپنی مٹھی میں جکڑتی رہی۔ بہت عرصے بعد اس نے یوں کھلے عام پرفارمنس دی تھی۔ ورنہ تو چند مخصوص لوگ تھے جو ان کے بنگلے پر آتے اور اس کے مجرے سے حظ اٹھاتے تھے۔ کچھ دیر پہلے ہی وہ ایسا ہی مجرا کر کے آئی تھی۔ جس کا معاوضہ اس کی ماں کہیں بیٹھی گن رہی تھی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ذرا دیر بعد ٹی وی پر وہ پروگرام آنے والا ہے، جس میں اس کا رقص تھا۔ ایک تماشائی کی حیثیت سے وہ اپنا مجرا خود آپ دیکھنا چاہتی تھی۔ اس لیے وہ ٹی وی لاؤنج میں تھی۔

وہ پشتینی طوائف زادی تھی۔ بہت عرصہ قبل اس کی ماں کوٹھے سے اتر کر کوٹھی میں آن بسی تھی۔ یہیں سے اس نے بنگلے میں جانے کی خواہش کر لی تھی۔ ڈھلتی عمر کی طوائف اپنے مستقبل کو محفوظ بنانے ہی کا سوچتی ہے۔ اس کا دور تو ختم ہو گیا تھا لیکن اس کا مستقبل سلیمہ عرف سکی کی صورت میں اس کے پاس تھا۔ وہ ایک نایاب مگر ناتراشیدہ ہیرے کی مانند اس کی صندوقچی میں پڑی ہوئی تھی۔ اب وہی اس کی کل متاع تھی۔ اس نے سکی پر بھرپور توجہ سے سرمایہ کاری کی تھی۔ بہترین تعلیمی اداروں میں اسے پڑھایا۔ اسے ایک امیر زادی کے طور پر پیش کیا جو کسی بھی امیر زادی سے کم نہیں ہوتی۔ جدید ماڈل کی گاڑی سے لے کر جدید ترین فیشن کی ہر شے اسے میسر تھی۔ وہ سمجھدار تھی۔ اس لیے آرٹ اینڈ کلچر کے نام پر ایک اکیڈمی بنائی تھی۔ جہاں موسیقی اور رقص کی باقاعدہ تربیت دی جاتی تھی۔ امیر گھرانوں کی بہت ساری لڑکیاں کلچر، آرٹ اور فیشن کے نام پر یہ سب سیکھ رہی تھیں۔ کام وہی پرانا تھا

لیکن نام اور ڈھب کی تبدیلی سے وہ سوسائٹی میں اپنا اچھا تاثر بنانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ سکی اسی ماحول میں پروان چڑھی تھی۔ وہ اپنی ماں کی توجہ پا کر ایسا تراشیدہ ہیرا بن گئی جس کی جگمگاہٹ سے ہزاروں فدا ہو گئے۔ جس طرح گاڑیوں کے شیدائی ہر نئے ماڈل کے منتظر رہتے ہیں۔ اسی طرح عشاق بھی ہر نئی ماڈل یا طوائف کی خبر رکھتے ہیں۔ سکی کی شہرت ان امیر زادوں میں پھیلنے لگی جو محض اپنی ذات ہی کو اہمیت دیتے ہیں۔ جس کا مقصد محض اپنی ذاتی خواہشوں کی تکمیل ہوتا ہے۔ محدود محفلوں میں وہ اتنا کمانے لگی، جتنا اس کی ماں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس پر کی گئی سرمایہ کاری رنگ لانے لگی تھی۔ زیادہ دولت کمانے کے لیے اس نے محدود محفلوں سے نکل کر اپنی آرٹ اینڈ کلچر اکیڈمی کے تحت بڑے بڑے پروگرام کرانا شروع کر دیے۔ جس میں بہت سارے لوگوں کا کمانے کا موقع ملا تو سکی ایک انڈسٹری کی صورت اختیار کر گئی۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ اگر پرانے زمانے کی کوئی طوائف اسے کماتا ہوا دیکھ لے تو حیرت سے مر جائے۔ انہوں نے ساری زندگی میں اتنا نہیں کمایا ہوگا، جتنا وہ چند دنوں میں کما لیتی تھی۔

سکی کی نگاہ وال کلاک پر پڑی۔ ابھی پروگرام شروع ہونے میں تھوڑا وقت تھا۔ اس نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کر دیا۔ وہ مختلف چینل بدلتے ہوئے، وہ چینل تلاش کرنے لگی، جہاں اس کا پروگرام آنے والا تھا۔ سکی نے دیکھا، ہر چینل پر سیلاب اور اس کی تباہ کاریاں دکھائی جا رہی تھیں۔ اس نے ملک میں سیلاب کی آمد کے بارے میں سنا تو تھا مگر اتنی تباہی ہو رہی تھی۔ اس بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ تبھی ایک جگہ وہ ٹھٹک گئی۔ تباہ حال علاقے کے پس منظر میں ایک معصوم سی بچی شدت سے رو رہی تھی۔ وہ اٹکتے ہوئے مقامی زبان میں بتا رہی تھی کہ اس کے سارے گھر والے سیلاب کی نذر ہو گئے ہیں اور وہی زندہ بچی ہے۔ ہچکیاں لے کر روتے ہوئے وہ چھ سات برس کی بچی کے ہونٹ خشک اور آنکھوں سے بے تحاشا پانی بہہ رہا تھا۔ سکی وہیں ساکت ہو گئی۔ اب اس بچی کی پرورش کون کرے گا؟ وہ کہاں رہے گی؟ کیسے وہ زمانے کے بے رحم ہاتھوں سے محفوظ رہے گی؟ کیا اس قدر لوگ موت کا شکار ہو گئے ہیں؟ کتنے لوگ ہوں گے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے پیاروں سے بچھڑ گئے ہوں گے؟ کتنے بے گھر ہو گئے ہیں؟ اب وہ کیسے زندگی گذار رہے ہوں گے۔۔۔؟ ایسے بے یار و مددگار نجانے کتنے بچے ہوں گے۔ اس ناگہانی آفت میں نجانے کتنے زخمی ہوں گے۔۔۔ کتنے بیمار۔۔۔ اس وقت وہ بری طرح چونک گئی، جب گود میں رکھے ہاتھوں پر گرم گرم آنسو آن گرے۔ سیلاب زدگان کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ انتہائی غم زدہ ہو گئی تھی۔ دکھ کی شدت سے اس کا پورا وجود بھر گیا۔ اس نے اپنے آنسوؤں کو صاف کیا اور ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی بھی اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے ریموٹ ایک طرف رکھا اور صوفے کی پشت گاہ سے ٹیک لگا لی۔ اس کا دل بھر آیا تھا اور آنسو پھر سے رواں ہو گئے۔

''کیا تمہارے پاس ان سیلاب زدگان کے لیے انہی چند آنسوؤں کا خراج ہے۔۔۔'' اس کے اندر سے آواز ابھری۔ تو وہ چونک گئی۔ قدرت نے اسے کیسی کیسی نعمتوں سے نوازا ہوا تھا۔ جہاں وہ بیٹھی ہے، وہ عالیشان بنگلے کا سب سے بہترین کمرہ ہے۔ قیمتی اور پر آسائش چیزوں سے بھرا ہوا۔ اگر میرا بھی بنگلہ آفت کی زد میں آ جائے، میرے بدن میں کوئی کمی پیدا ہو جائے تو پھر میں کیا ہوں؟ ایک لمحے کے بعد میں مر جاؤں تو یہ سب کس کام کا؟ اسی بدن سے جو دولت کمائی تھی، اس کا کیا مصرف۔۔۔ ہیرے موتی جڑے زیور اسے کیا فائدہ دے سکتے ہیں۔۔۔ وہ لوگ جو اس وقت آفت سے گذر رہے ہیں، ان کی مدد کون کرے گا۔۔۔

''مجھے ان کی مدد کرنی چاہئے۔۔۔'' اس کے اندر سے زوردار آواز گونجی جو بازگشت کی طرح اس کے اندر پھیل گئی۔ ہر گذرتے لمحے کے ساتھ اس کے اندر یہ سوچ مضبوط ہوتی چلی گئی۔ روتی ہوئی بچی کا چہرہ اس کی نگاہوں سے ہٹ ہی نہیں رہا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے کوئی اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہتا ہو کہ اٹھو اور ان سیلاب زدگان کی امداد کو پہنچو۔ پھر وہ ایک دم سے اٹھ گئی۔ اس نے یاد کیا کہ وہ کس علاقے کی ٹی وی رپورٹ دیکھ رہی تھی۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل سے اپنا سیل فون اٹھایا اور حماد خاں کے نمبر پش کر دیے۔ وہ اس کا قدردان تھا اور کئی بار اس کا مجرا سننے اس

کے بنگلے پر آیا تھا۔ دونوں میں اچھی خاصی جان پہچان تھی۔ فوراً ہی فون ریسیو کرلیا گیا۔

''سیلی، بھئی بڑی لمبی عمر ہے تمہاری۔ یہ سامنے ٹی وی پر تمہارا پروگرام دیکھ رہا ہوں۔ کیا غضب ڈھا رہی ہو تم۔۔۔ بھئی بہت خوبصورت۔۔۔۔ کیا ادائیں ہیں۔۔ کیا نزاکت ہے۔۔'' حماد خان پرجوش انداز میں کہتا چلا گیا۔

''ہم ابھی آپ کے پاس آنا چاہ رہے ہیں۔'' اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''سیلی۔! خیریت تو ہے نا۔۔ یہ تمہاری آواز۔۔'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

''کچھ نہیں ہوا ہماری آواز کو۔۔ ہم پہلی ملنے والی فلائیٹ سے آرہے ہیں۔ ملتان ائرپورٹ سے ہمیں لے لیجیے گا۔'' وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولی تو اس نے انتہائی تجسس سے پوچھا۔

''جم جم آؤ۔۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی۔۔ ائرپورٹ سے بھی لے لوں گا۔۔ لیکن یہ اچانک آمد۔۔ کس لیے؟''

''وہیں آکر بتائیں گے نا۔۔ ہم دوبارہ فون کرکے فلائٹ کے بارے میں بتاتے ہیں۔ انتظار کیجیے گا۔۔'' اس نے کہا۔

''میں انتظار کررہا ہوں۔'' وہ بولا تو اس نے فون بند کردیا۔

سیلی تیار ہونے لگی۔ اسے یقین تھا کہ اس کی ماں اسے جانے کی قطعاً اجازت نہیں دے گی۔ سو اس نے خاموشی سے بیگ تیار کیا، جو سمجھ میں آیا وہ رکھا اور لباس تبدیل کرکے تیار ہوگئی۔ اس دوران وہ ٹریول ایجنٹ سے ٹکٹ کے بارے میں کنفرم کرچکی تھی۔ پھر وقت پر گاڑی نکال کر رات کے دوسرے پہر وہ ائرپورٹ جا پہنچی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ماں نشے میں وحشت کہیں پڑی ہوگی۔ اس نے اپنی گاڑی پارکنگ میں چھوڑی اور ملتان کے لیے پرواز کرگئی۔ جہاں حماد خان اسے لینے کے لیے آیا ہوا تھا۔ اس وقت پو پھٹ رہی تھی۔ جب وہ مظفر گڑھ کے قریب اپنی آبائی حویلی کی جانب چل پڑا۔ حال احوال کے بعد جب حماد نے اس سے یہاں آنے کا مقصد پوچھا تو سیلی نے بتا دیا۔

''او سیلی۔! کیا تم نہیں جانتی ہو۔ ان علاقوں میں کیسی کیسی وبائیں پھیلی ہوئی ہیں۔ جہاں لوگ مر رہے ہیں۔ وہاں تم جارہی ہو۔ تم دوسرے دن ہی بیمار پڑ جاؤ گی۔ یہاں تم کیا مدد کروگی ان کی۔۔ وہیں کسی بنک میں چند لاکھ جمع کروا دیتیں۔۔ پہنچ جاتے ان کے پاس۔۔ تیری طرف سے فرض ادا ہوجاتا۔۔۔''

''ہم آپ پر بوجھ نہیں بنیں گے۔۔ آپ بس ہمیں اس علاقے تک پہنچا دیں۔ ہم بیمار پڑ جائیں یا ہمیں کوئی وبا نگل جائے وہ آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔'' سیلی نے سکون سے کہا۔

''تم ناراض ہوگئی ہو۔ کیونکہ تم حقیقت نہیں جانتی ہو۔ سارا علاقہ پانی میں گھرا ہوا ہے۔ امدادی کام کرنے والے کررہے ہیں۔ مجھے یہ سمجھ نہیں آرہا ہے تم وہاں کروگی کیا؟''

''یہی بات تو یہی ہے حماد۔۔ میرے ذہن میں کچھ بھی نہیں ہے کہ ہم وہاں ان کی کیسے مدد کر پائیں گے۔۔ مگر ہم نے جانا ہے۔۔'' اس نے کسی ضدی بچے کی طرح کہا۔

''تم آنٹی کو بتا کر نہیں آئی ہو۔ ظاہر ہے وہ لوگ تمہیں تلاش کرلیں گے۔۔ اس دوران اگر تمہیں کچھ ہوگیا تو'' حماد نے ایک دوسرے پہلو سے اسے سمجھانا چاہا۔
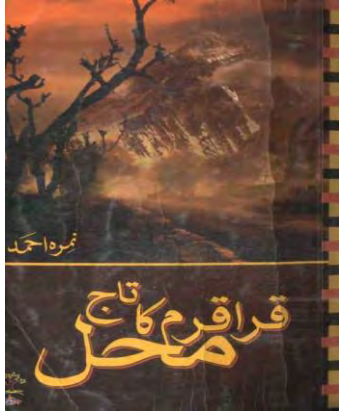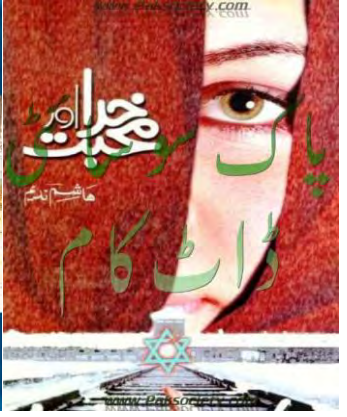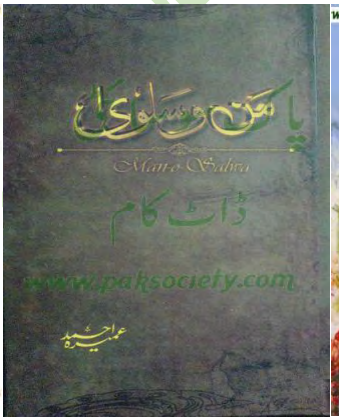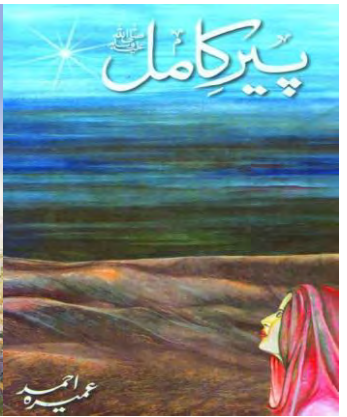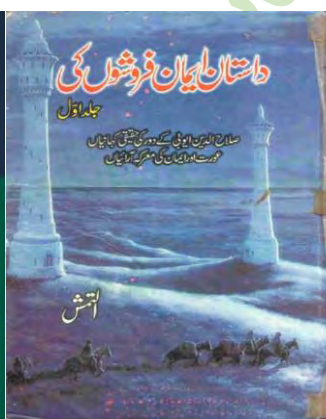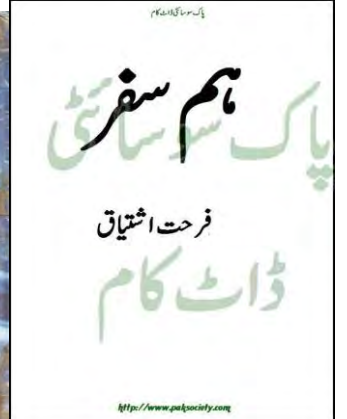
''وہ ہمارا مسئلہ ہے۔۔ آپ کو ہماری وجہ سے کوفت نہیں ہوگی۔'' اس نے کہا تو حماد خاموش ہوگیا۔ پھر حویلی آجانے تک ان میں گفتگو نہ ہوئی۔ اسے خصوصی مہمان خانے میں ٹھہرا دیا گیا۔

''ابھی تم آرام کرو۔۔ ناشتے کے بعد میں تمہیں خود اس علاقے میں لے جاؤں گا۔'' حماد خان نے کہا تو اس نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ وہ واپس گیا تو سیلی بیڈ پر پھیل گئی۔ اس کی آنکھوں سے نیند نجانے کہاں غائب ہوگئی تھی۔ اس نے اپنا سیل فون بند کیا اور سوچنے لگی کہ وہ ان سیلاب زدگان کی امداد کیسے کرسکتی ہے؟

❁......❁......❁

دریائے سندھ کے بیٹ والے اس پورے علاقے میں سیلاب نے تباہی مچادی تھی۔ پانی کی ناگہانی آفت نے موت کے سائے پھیلا دیئے تھے۔ لوگ زیر آب علاقوں میں محصور ہوکر رہ گئے تھے۔ جبکہ پانی تھا کہ بڑھتا ہی چلا جارہا تھا۔ حماد خان اسے زیر آب علاقے میں تو نہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

لے جا سکا۔ لیکن ایک ایسے کنارے تک لے گیا، جہاں سے محصور لوگ باہر آرہے تھے اور کسی نہ کسی محفوظ ٹھکانے کی طرف جا رہے تھے۔ وہ ان لٹے پٹے لوگوں کو دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے۔ حماد خاں اسے وہاں سے واپس لے آیا، پھر چوک گودر سے نکلے تو ڈیرہ غازی خاں روڈ کے مغرب کی جانب ایک اونچے ٹیلے پر بہت سے لوگ دکھائی دیئے۔ تبھی اس نے پوچھا۔

''حماد وہ لوگ۔۔۔''

''سیلاب زدگان ہی ہیں۔ لگتا ہے یہاں محفوظ جگہ پر آ گئے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''ادھر چلیں۔'' اس نے تیزی سے کہا تو حماد نے گاڑی اس جانب موڑ دی۔ طاقتور فور ڈبل جیپ اس ٹیلے کے قریب رکی تو وہ باہر آ گئی۔ گرم ہوا کے تھپڑے سے اس کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ وہ سیاہ گاگلز میں سے وہاں موجود چہروں کو دیکھنے لگی۔ جہاں صرف حزن وملال تھا۔ اسے لگا جیسے وہاں پر ہر ذی روح غم زدہ ہے۔ چھت، چھن جانے کے دکھ سے لے کر، اپنوں سے بچھڑ جانے کا غم ان کے چہروں پر کندہ تھا۔ بے گھر لوگوں کی زندگی کیا ہوتی ہے، اس کا احساس اسے وہاں جا کر ہوا۔ سڑک سے ذرا فاصلے پر وہ ریتلی مٹی کا بڑا سا ٹیلہ تھا۔ اس کے اردگرد زمین بے آب و گیا تھی۔ تقریباً ہر عمر کے مرد اور عورتیں وہاں موجود تھیں۔ جو مختلف ٹولیوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سر پر سورج اور پاؤں کے نیچے ریتلی زمین۔ میلے کپڑوں اور اٹے ہوئے سروں کے ساتھ وہ بے گھر لوگ ایسے منظر میں تھے جس میں فقط بے یقینی ہوتی ہے۔ چند لوگ حماد خاں کی طرف بڑھ گئے تھے۔ سیاسی گھرانے کی وجہ سے وہ اپنی پہچان رکھتا تھا۔ وہ ان سے باتیں کرنے لگا۔ وہ لوگ مختلف بستیوں سے یہاں رات ہی پہنچے تھے۔ کئی دنوں سے پانی میں گھرے ہوئے لوگ محفوظ مقام کی تلاش میں یہاں تک آ گئے تھے۔ حماد ان سے وعدے وعید کرنے لگا تو سیکی نے آسمان کی جانب دیکھا۔ دوپہر کا سورج سر پر آرہا تھا۔ نیلے آسمان پر سفید بادل تھے جو کبھی کبھی سایہ دے جاتے۔ بارش برس گئی تو کیا ہوگا۔؟ اس نے دکھ سے سوچا۔ تبھی سڑک پر سے ایک ٹرالی کو کھینچتا ہوا ایک ٹریکٹر مڑا۔ وہ اس ٹیلے کی طرف آرہا تھا۔ ٹرالی میں دیگیں رکھی ہوئی تھیں اور چند لوگ سوار تھے۔ وہ ان لوگوں کے لیئے کھانا لے کر آئے تھے جبکہ المیہ یہ تھا کہ ان کے پاس کوئی برتن بھی نہیں تھا۔ جس میں وہ کھانے کے لیئے کچھ لے سکتے۔ سب بے سروسامان تھے۔ لوگ کھانے کی طرف دوڑ پڑے، نہ جانے وہ کب سے بھوکے تھے۔ سیکی کو لگا جیسے وہ کھانا ان لوگوں کے لیئے کم پڑ جائے گا۔ وہ انہیں بڑے دکھ سے دیکھ رہی تھی۔ کھانے پر یوں ٹوٹ پڑنے کا منظر اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اچانک سیکی کی نگاہ ایک لڑکی پر پڑی۔ وہ سب کی طرف پشت کیئے ٹیلے کی دوسری جانب ڈھلوان پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اس سارے ہنگامے سے الگ تھلگ تنہا تھی۔ اسے بڑا عجیب سا لگا تو اس جانب بڑھ گئی۔ اس کی آمد کا احساس کر کے وہ بھرے بھرے بدن والی لڑکی نے خوف زدہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا اور پھر فوراً ہی نگاہیں جھکا لیں۔ سیکی کو وہ ساری دنیا سے روٹھی ہوئی لگی۔ میلے چیکٹ مٹی گارے سے بھرے کپڑوں والی اس لڑکی کے پاس بیٹھ کر سیکی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔

''کیا بات ہے، یہاں کیوں بیٹھی ہیں۔ بھوک نہیں لگی آپ کو؟''

یوں پوچھنے پر لڑکی نے چند لمحے شاکی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا، پھر دکھ سے بھیگے ہوئے لہجے میں اپنی مقامی زبان میں بولی

''بھوک کسے نہیں لگتی باجی، یہ پیٹ کا دوزخ ہی تو ہے جو بندے کو مار دیتا ہے۔ میری ماں گئی ہے کھانا لینے۔۔۔ لے آئے گی تو کھالوں گی۔''

''آپ لوگوں کو سیلاب نے اتنی مہلت بھی نہیں دی کہ کوئی برتن اٹھا سکیں یا۔۔۔'' اس نے پوچھنا چاہا تو لڑکی نے بات قطع کرتے ہوئے کہا۔

''باجی، آپ ایسی باتیں کیوں پوچھ رہی ہیں۔ کون اپنے گھر کو چھوڑتا ہے اور وہ بھی اس بے سروسامانی کی حالت میں۔ پتہ نہیں کیا ہوگا ہمارے ساتھ۔۔۔ کب تک ہمارا تماشہ لگا رہے گا۔۔'' وہ یوں بولی جیسے ابھی رو دے گی۔

''دیکھو۔! ہم یہاں آپ سب کی مدد کرنے کے لیے آئے ہیں۔ ہمیں بتائیں، ہم آپ کے لیے کیا کر سکتے

ہیں۔" اس نے ایک خیال کے تحت پوچھا تو لڑکی جیسے پھٹ پڑی۔

"اگر آپ کچھ کرنا ہی چاہتی ہیں نا باجی، تو خدا کے لیے سب سے پہلے ہمیں کوئی ایسی آڑ دے دو جہاں ہم، ان لوگوں کی نظروں سے محفوظ ہو جائیں۔ لوگ یہاں آ کر ہمارا تماشہ کرتے ہیں۔ ترس کھاتے ہیں ہمیں دیکھ کر، جیسے ہم کوئی ایسی مخلوق ہو گئے ہیں، جن پر صرف ترس ہی کھایا جا سکتا ہے۔ ہم چھ دن سے اپنے گھروں کی چھتوں پر تھے۔ رات میں سو رہی تھی جب ہم وہاں سے نکلے ہیں۔ ہم نے وہاں سے کوئی چیز کیا لینی تھی۔ جانیں بچا کر یوں نکلے ہیں کہ میں اپنے سر کا دوپٹہ بھی نہیں لے سکی۔ یہ چادر جو آپ میرے سر پر دیکھ رہی ہیں میری ماں کی ہے اور اس وقت میری ماں ننگے سر ہے۔ ہمیں چاہے کوئی کھانا نہ دے۔ برتن نہ دے۔۔۔ کچھ نہ دے۔۔۔ چاہے چھت بھی نہ ہو۔ مگر کوئی ایسی آڑ ہو۔ جہاں میں اپنے پھٹے ہوئے کپڑوں کے ساتھ سمٹ کر بیٹھی رہوں۔ یہاں جو میں سب کی نگاہوں کے سامنے شرم سے گڑی جا رہی ہوں، کم از کم اس سے تو چھٹکارا ملے۔۔۔ اس سے اچھا تھا کہ ہم پانی میں گھرے رہتے۔۔" یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم سے رونے لگی۔ اس کی رندھی ہوئی آواز میں پنہاں دکھ کو سیکی نے اپنے دل پر محسوس کیا۔ اس نے لڑکی کے پھٹے ہوئے کپڑوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"آپ فکر نہیں کرو۔۔۔ ہم کچھ کرتے ہیں۔" سیکی نے پیار سے اس کا کاندھا تھپتھپایا اور اٹھ گئی۔ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اب اس نے کیا کرنا ہے۔ وہ پلٹ کر حماد خاں کے پاس آ گئی۔ وہ ایک خوبرو سے دیہاتی نوجوان سے بات کر رہا تھا۔

"اچھا۔ تو تمہارا نام ندیم ہے۔۔۔" حماد خاں نے اسے سرتاپا دیکھتے ہوئے کہا تو قریب کھڑے ایک ادھیڑ عمر شخص نے کہا

"سائیں۔! یہی تو ہے ہمارا آسرا۔ ہمیں چھ دن ہو گئے تھے اپنی چھتوں پر پڑے ہوئے اس نے نہ صرف ہمیں وہاں کھانا پانی پہنچایا۔ بلکہ محفوظ جگہ لا کر بھی کھانا لے آیا ہے۔ اللہ اس کی زندگی دراز کرے۔"

"کس تنظیم سے تعلق ہے تمہارا ندیم۔۔" حماد نے انتہائی تجسس سے پوچھا

"کسی سے بھی نہیں۔۔ اپنی مدد آپ۔۔۔ میرے ساتھ میرے چند دوست ہیں۔" وہ سکون سے بولا

"اوہ۔! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے جیب میں سے چند بڑے نوٹ نکالے اور اس کی طرف بڑھا کر بولا "یہ لو۔!"

ندیم کو شاید حماد کا انداز پسند نہیں آیا تھا، اس لیے پہلے اس نے نوٹوں کو اور پھر حماد کی طرف دیکھ کر کہا۔

"سائیں۔! آپ رکھیں۔ میں ان کی خدمت کر رہا ہوں۔۔ یہ نوٹ کہیں اور کام آئیں گے۔"

"رکھ لو۔۔۔ اس سے کچھ نہ کچھ تو ہو جائے گا۔"

"میرے پاس اللہ کا دیا اتنا ہے کہ میں ان کی خدمت کر سکتا ہوں۔۔۔ آپ تو بہت بڑے آدمی ہیں۔ میرے خیال میں آپ کو مجھ سے بہت زیادہ کرنا چاہیے۔ ان نوٹوں سے تو ایک وقت کا کھانا بھی نہیں بن سکے گا ان لوگوں کے لیے۔"

"بہت جذباتی ہو تم۔" حماد خاں نے بظاہر سکون سے کہا تھا لیکن اسے ندیم کی بات بہت بری لگی تھی۔ بے عزت کر کے رکھ دیا تھا۔

"شاید یہ جذبے ہی ہیں جو کام آتے ہیں۔ یہ کاغذ کے نوٹ نہیں۔۔ خیر۔ آپ اپنا کام کریں میں اپنا کر رہا ہوں۔ مجھے کافی مصروفیت ہے۔۔۔ اگر آپ نے کوئی بات کہنی ہو تو کہیں۔۔۔ ورنہ اجازت دیں۔۔۔"

"ٹھیک ہے۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ جاؤ۔۔" حماد خاں نے کہا اور سیکی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "چلو سیکی۔۔ واپس چلیں۔۔" یہ کہہ کر اس نے نوٹ واپس جیب میں ڈال لیے۔ اس کا چہرہ غصے میں سرخ ہو گیا تھا۔ وہ واپس چل دیئے۔ ٹیلے سے حویلی تک کے راستے میں سیکی نے حماد سے کہا

"ہمیں ابھی ملتان جانا ہے۔ وہاں سے۔۔"

"دیکھو سیکی۔! صاف بات ہے۔ تم شاید انسانی ہمدردی یا انسانیت وغیرہ کے چکر میں یہاں پر ہو، مگر ہم سیاسی لوگ ایسا پس منظر رکھتے ہیں کہ لوگوں کی ہم سے وہ امیدیں بھی ہیں جو ہم پوری نہیں کر سکتے۔ جس کا تماشا تم نے ابھی دیکھا ہے۔ اسی سیلاب کے حوالے سے مجھے اور
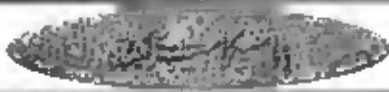
بہت سارے کام ہیں۔سوری میں تمہیں اتنا وقت نہیں دے سکتا۔'' حماد خاں نے دبے دبے غصے میں کہا۔

''کوئی بات نہیں۔آپ کسی اور کو بھجوا دیں'' وہ اس کی کیفیات کو سمجھتے ہوئے اطمینان سے بولی۔

''ہاں۔!میں فائقہ سے کہہ دیتا ہوں۔وہ اپنے ساتھ کچھ لوگوں کو لے جائے گی۔'' اس نے آہستگی سے کہا تو پھر ان میں خاموشی چھا گئی۔ٹیلے سے حویلی تک کا فاصلہ کوئی اتنا زیادہ نہیں تھا۔

حویلی میں جاتے ہی سکی نے اپنا بیگ کھولا اور اس میں دھرا کیش اٹھا لیا۔پھر ایک میرون رنگ کی تھیلی نکالی اور ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے حماد خاں کے پاس لے گئی۔وہ تھیلی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

''اس میں تین ہیرے ہیں۔جو میں نے فروخت کرنے ہیں۔مجھے بس کیش چاہئے۔''

''ہیرے۔!فروخت کرنے ہیں۔کیا تم ان کی مدد کے لیے اس حد تک جا پہنچی ہو۔'' وہ حیرت سے بولا

''ہاں۔!اس سے پہلے کہ میرا یہ جذبہ ماند پڑ جائے۔۔آپ انہیں فروخت کر دو۔۔'' سکی نے یوں کہا جیسے اکتائی ہوئی ہو۔

''ٹھیک ہے۔جیسا تم چاہو۔کل تک تمہیں کیش مل جائے گا۔'' حماد خاں نے کہا اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔سکی کچھ دیر تک حویلی میں رہی پھر فائقہ اور چند لوگوں کے ساتھ ملتان کے لیے روانہ ہو گئی۔جہاں اس نے خریداری کرنا تھی۔پھر رات گئے وہ حویلی واپس آ گئی۔

❋ ❋ ❋

پو پھوٹ رہی تھی جب وہ ٹیلے پر جا پہنچی۔اس کے ساتھ صرف ڈرائیور تھا اور دو ٹرک تھے۔ایک میں خیمے اور دوسرے میں ساز وسامان تھا۔اس نے دیکھا،ویسا ہی سماں تھا جیسا وہ کل چھوڑ گئی تھی۔سیلاب کی تباہ کاری کا پھیلاؤ ہی اتنا تھا کہ امدادی ٹیمیں پانی میں پھنسے ہوئے لوگوں کو نکال رہی تھیں۔پاک فوج کے جوان ہمہ وقت مصروف کار تھے۔یہ لوگ شاید اسی لیے ابھی تک نظر انداز تھے کہ محفوظ جگہ پر تھے۔سول ڈیفنس اور کچھ فلاحی تنظیموں کے لوگ وہاں موجود تھے۔وہ لوگ حیران تھے کہ اتنی صبح صبح وہاں پر کون آ گیا ہے۔

سیلی کی نگاہیں اس لڑکی کو تلاش کر رہی تھیں۔ جلد وہ اسے کل والی جگہ پر بیٹھی دکھائی دے گئی۔ جیسے وہ وہیں پر ساکت ہوگئی ہو۔ کسی مجسمے کی طرح، وہ اس طرف بڑھ گئی۔ لڑکی کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک ابھری تو سیلی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''گھبرانا نہیں۔ وہ سامنے خیموں سے بھرا ہوا ٹرک آ گیا ہے۔ میں بہت سارے کپڑے بھی لائی ہوں۔''

''سچی۔'' وہ یوں بولی جیسے اعتبار نہ آ رہا ہو۔

''ہاں۔۔! بس ابھی کچھ دیر میں تم محفوظ ہو جاؤ گی۔۔ اچھا۔ مجھے بتاؤ۔ وہ ندیم کیسے مل سکے گا۔'' سیلی نے اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر پوچھا۔

''کچھ دیر پہلے میں نے اسے یہاں دیکھا تھا۔۔'' یہ کہتے ہوئے اچانک اس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ دیکھیں۔۔ وہ لوگوں کے درمیان۔۔''

کچھ ہی دیر بعد ندیم اس کے سامنے تھا۔ سیلی نے اسے بھرپور نگاہوں سے دیکھا۔ پھر بولی۔

''ندیم۔! کیا آپ ہماری کچھ مدد کرو گے۔؟''

''جی فرمائیں، میں کیا کر سکتا ہوں آپ کے لیے۔'' وہ انتہائی سنجیدگی سے بولا

''وہ سامنے دو ٹرک کھڑے ہیں۔ ان میں خیمے اور بہت سارا سامان ہے۔۔ جو ہماری سمجھ میں آیا۔ ہم لے آئے ہیں۔۔۔ آپ بس انہیں بانٹ دیں۔''

''اوہ۔! یہ خیموں والا تو آپ نے بہت بڑا احسان کیا ہے۔ آپ تھوڑا انتظار کریں۔ میں سب کر لیتا ہوں۔'' اس نے کہا تو وہ حیران ہوگئی۔ حماد خاں کو بے دھڑک جواب دینے والا اس کی بات آرام سے مان گیا تھا۔ وہ مزید کچھ کہے بنا پلٹ گیا۔ سیلی چند لمحوں تک اس ان تھک جوان کو دیکھتی رہی۔ پھر اس لڑکی سے باتیں کرنے لگی۔ اس دوران اس کی نگاہ ایک عورت پر پڑی جو زمین پر ساکت پڑی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو اسے یوں لگا جیسے اس عورت کی روح پرواز کر چکی ہے۔ وہیں زمین پر اس کے پاس چار بچے یوں لگ کر بیٹھے ہوئے تھے جیسے کسی مہیب خوف سے سہمے ہوئے ہوں۔ وہ سب کچھ بھول کر اس کے پاس جا پہنچی۔ اس نے عورت کو ڈرتے ڈرتے ہلایا۔ اس نے یوں آنکھیں کھولیں جیسے کوئی بے ہوشی میں نہ سمجھتے ہوئے کسی کو دیکھ رہا ہو اور اسے کچھ سمجھ میں نہ آ رہا ہو۔

''بی بی جی۔ آپ ایسے کیوں پڑی ہوئی ہیں۔ کیا بات ہے۔؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا تو وہ ہونقوں کی طرح دیکھتے ہوئے بولی۔

''میری دھی نمانی۔۔! کل رات میرے ہاتھوں ہی سے پانی میں بہہ گئی، اب تک تو نمانی پانی میں سر کھپ گئی ہو گی۔۔ میرا دودھ پیتی تھی وہ۔۔ کیسے چیختی تھی۔۔ اس کا چہرہ نگاہوں سے ہٹ ہی نہیں رہا۔۔ لگتا ہے وہ مجھے بلا رہی ہے۔۔ مجھے اس کے پاس جانا ہے۔۔'' یہ کہتے ہوئے وہ یوں رونے لگی کہ اس کا پورا بدن لرزنے لگا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ رہا تھا۔ سیلی کو پتہ ہی نہیں چلا کہ کب اس کی اپنی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

''یہ چار بچے آپ کے ہیں؟''

''ہاں۔! یہ چاروں میرے ہیں۔ اور وہ پانچویں۔۔۔ اسے پانی نگل گیا'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیے۔ جیسے اسے وہاں بہت تکلیف ہو رہی ہو۔ سیلی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس عورت کی ڈھارس کیسے بندھائے۔ اسے لگا جیسے وہاں پر موجود ہر فرد اپنے ساتھ کئی کہانیاں رکھتا ہے۔ بے گھر ہو جانا کتنی بڑی اذیت ہے۔ اسے خود اپنا سانس بند ہوتا ہوا محسوس ہوا تو وہ بولی۔

''آپ گھبراؤ نہیں۔۔ ہم آپ کی بیٹی تو نہیں لوٹا سکتے مگر آپ کی تکلیف دور کرنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گئی۔ یہی وہ لمحات تھے جب اس نے اپنا سیل فون آن کر دیا۔ فون میں اس کے دوستوں سے لے کر عشاق تک کے نمبر موجود تھے۔ اس نے بہت سارے لوگوں سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سب سے پہلے اس نے ایک ایسے سرکاری آفیسر کو فون کیا جو صوبائی سطح پر بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ وہ حیران تھا کہ وہ کہاں جا پہنچی ہے۔

''ہمیں یہاں ڈاکٹرز اور دوائیوں کی اشد ضرورت ہے۔ ہمیں شام تک چاہیے بس۔۔'' اس نے اپنی مخصوص ادا سے کہا تو اس نے وعدہ کر لیا۔ سیلی نے مزید کئی لوگوں سے رابطہ کیا۔ ہر ایک نے وعدہ کیا۔ سہ پہر تک یہی سلسلہ

چلتا رہا۔

خیمے لگتے رہے یہاں تک کہ اس ٹیلے پر خیموں کی ایک بستی گویا اگ آئی۔ اس دوران لوگوں میں کھانا بھی تقسیم کیا گیا۔ وہیں ٹیلے پر اس نے دیکھا، ایک بزرگ سا بندہ اپنے خاندان کے ساتھ خیمے سے باہر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کھانا بھی کھا رہا تھا لیکن ساتھ میں رو بھی رہا تھا۔ کاندھے پر دھرے کپڑے سے وہ آنسو صاف کرتا اور پھر کھانا شروع کر دیتا۔ سکی اسے دیکھتی رہی۔ وہ کھانا کھا چکا تو سکی ان کے قریب چلی گئی۔ وہاں ٹیلے کے لوگ جان گئے تھے کہ یہ لڑکی ان کے لیے بہت کچھ کر رہی ہے۔ وہ بزرگ تو اس کی طرف دیکھتا رہا تاہم اس کی بیٹیوں اور بیوی نے اس کی آمد پر اچھا محسوس کیا۔ کچھ دیر باتوں کے بعد اس نے پوچھا۔

''کیا بات ہے یہ بزرگ اتنا رو کیوں رہے ہیں۔''

یہ پوچھنے پر اس بزرگ نے سکی کی طرف دیکھا تو اس کی بیوی جلدی سے بولی۔

''کیا بتائیں۔! ہم اپنے علاقے کے زمیندار ہیں۔ یوں سمجھیں اپنے وقت کے بادشاہ تھے۔ اب ہمارا حال فقیروں سے بھی بدتر ہو گیا ہے۔ دو کنال کے گھر میں ہم رہتے تھے اور دو کنال ہی کا ہمارا ڈیرہ تھا۔ جہاں تین وقت کا کھانا ہمارے ہاں سے ہی جاتا تھا۔ علاقے میں آنے والا ہر آفیسر، ملازم یا مسافر ہمارے پاس ہی آتا تھا۔ جانور پانی میں بہہ گئے۔ فصلیں تباہ ہو گئیں اور یہاں فقیروں کی طرح پڑے ہیں۔ پتہ نہیں اللہ سائیں ہم سے کیا امتحان لے رہا ہے۔''

سکی اس پر کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ کچھ دیر خاموش رہی، پھر اٹھ کر چل دی۔ اس کا دل بوجھل ہو رہا تھا۔ یہاں آ کر پتہ چلا تھا کہ دنیا کی بے ثباتی کیا ہوتی ہے۔ وہ کھڑی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی کہ کدھر جائے۔ وہ تھک چکی تھی۔ آرام کرنا چاہتی تھی۔ وہ حویلی جا سکتی تھی مگر جانا نہیں چاہ رہی تھی۔ جن لوگوں سے اس نے امدادی سامان کا وعدہ لیا تھا۔ وہ مسلسل رابطے میں تھے۔ سامان لے کر ٹرک اس ٹیلے کی جانب چل پڑے تھے۔ وہ ان کے آنے تک وہاں رہنا چاہتی تھی۔ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ ندیم اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ تب اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''آپ تھک گئیں ہو گی نا؟''

"آپ کو کیسے پتہ چلا۔۔"
"آپ کا چہرہ بتا رہا ہے۔آئیں تھوڑا آرام کر لیں۔" یہ کہہ کر وہ چل دیا۔تو وہ بھی اس کے ساتھ چل دی۔وہ ٹیلے کے کنارے خیمہ نصب تھا۔"یہ آپ کے لیے مخصوص ہے ،آپ یہاں آرام کر لیں۔میں ابھی آتا ہوں۔"

اسے خیمے کے اندر بیٹھے چند منٹ ہوئے تھے کہ ندیم آ گیا۔اس کے ہاتھ میں چائے کے دو مگ تھے۔پہلی بار سکی کو احساس ہوا کہ اس ویرانے میں چائے کا ایک مگ کتنا قیمتی بھی ہو سکتا ہے۔اس نے سپ لیا اور قدرے خوشگوار لہجے میں بولی۔

"خیمے سب کو پورے آ گئے تھے۔"

"کچھ بچ گئے ہیں۔میرا خیال ہے کہ جو مزید لوگ آئیں گے۔ان کے کام آ جائیں گے۔"

"ندیم یہاں کچھ ڈاکٹر، اسٹاف اور ادویات آ رہی ہیں۔انہیں کیسے۔۔۔" سکی نے کہنا چاہا تو اس کی آنکھیں ایک دم سے روشن ہو گئیں۔اسے یوں لگا جیسے خزانہ مل گیا ہو ۔وہ خوشی سے بولا۔

"یہ تو سمجھیں کمال ہو گیا۔بہت سارے لوگ بیمار ہیں۔اللہ نے ان کے لیے بندوبست کر دیا۔" یہی وہ لمحہ تھا جب سکی نے سوچا کہ آخر اس کے دل میں اتنا درد کیوں ہے ان لوگوں کے لیے۔آج کی منافقت بھری، مفاد پرست دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو انسانیت کے لیے اتنا کچھ کرتے ہیں کہ اپنی ذات کو بھی بھول جائیں۔فطری طور پر حماد خان اور ندیم کا موازنہ کرنے لگی۔وہ شخص سارے وسائل ہونے کے باوجود کچھ نہ کر سکا۔حتٰی اس کے دیئے ہوئے ہیروں کے بدلے کیش نہ لا سکا اور یہ۔۔۔تبھی اس نے پوچھ لیا۔

ندیم ہم ایک بات پوچھیں۔۔۔آپ ان کے لیے اتنا سب کچھ کیوں کر رہے ہیں؟"

"آپ کیوں یہاں پہنچی ہیں۔" اس نے کہا پھر لمحہ بھر توقف کے بعد بولا۔"یہ سوال آتا ہے ذہن میں، خیر میرا کسی تنظیم یا پارٹی سے کوئی تعلق نہیں۔دراصل میں خود اس مصیبت کو جھیل چکا ہوں۔1992ء میں ہم دریائے چناب کے کنارے رہتے تھے۔میں بہت چھوٹا تھا اس وقت۔۔ہماری بستی ڈوب گئی تھی۔ہم دریا کے بند پر پڑے تھے بے یارو مددگار۔کوئی آسرا نہیں تھا۔ہمارے بزرگ اس وقت کے بڑے ضلعی آفیسر کے پاس گئے تو اس نے کہا تھا،اب آئے ہو جب ہمارے پاس سب کچھ ختم ہو گیا ہے، جاؤ پھر سیلاب آئے گا تو دیکھیں گے کہ کیا مدد کرنی ہے تم لوگوں کی۔۔۔

"مطلب۔اوہ آفیسر پھر سے سیلاب جیسی ناگہانی آفت کا منتظر تھا؟" وہ حیران ہو گئی۔

"جب کچھ کرنا ہی نہیں ہے تو ایسی سوچ ہی ہوتی ہے ،خیر۔!ہمارا وہ علاقہ دریا کے کٹاؤ میں آ گیا۔ہم وہاں سے ادھر دریائے سندھ کے کنارے آ گئے۔تب سے میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ اگر ایسی کوئی آفت آئی تو میں اپنے دوستوں کے ساتھ چل کر مدد کروں گا۔"

"آپ کو آٹھ دن ہو گئے۔آپ کے گھر والے ۔۔۔" اس نے پوچھا

"ہماری بستی ابھی محفوظ ہے۔یہ کھانا پانی ،وہیں سے آ رہا ہے۔مجھے نہیں پتہ اللہ کہاں سے دے رہا ہے۔میں نے تو اپنے گھر سے ابتداء کی تھی اور آج آپ کی صورت میں غیبی مدد مل گئی۔یقین کریں آپ ان لوگوں کو نئی زندگی دے دی ہے۔" اس نے جذب سے کہا تو سکی نجانے کن کیفیات سے گذر گئی۔ایک ایسا سکون اس کے دل میں اترا تھا،جس کا احساس اس نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔

"اتنی تباہی ہوئی کیوں۔کیا 92ء میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔"

"نہیں۔!اتنی تباہی نہیں تھی۔یہاں بارہ لاکھ سے پچیس لاکھ کیوسک پانی گذرا ہے،جو دریا کے بند برداشت نہیں کر سکے۔۔کہا جا رہا ہے کہ یہ اعمال کا نتیجہ ہے کہ یہاں اتنی آفت آئی لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ یہ آفت ہماری غلطیوں کی وجہ سے آئی ہے۔ایسی غلطیاں جو کرپشن کا نتیجہ ہیں اور ناقابل برداشت ہیں۔" وہ ایک دم سے جذباتی ہو گیا تھا۔"ظاہر ہے کرپٹ لوگوں کی غلطیاں اور غفلت اتنی انسانی جانوں کو نگل گئیں۔حالانکہ ایسے جدید آلات اب میسر ہیں ،جن سے موسمیاتی تبدیلیوں کے بارے میں پیشن گوئی ہو سکتی ہے۔خیر۔!آپ آرام کریں۔۔" اس نے کہا اور مگ اٹھا کر باہر چلا گیا۔سکی چند لمحے تک چٹائی پر

بیٹھی رہی۔ پھر لیٹ گئی۔ وہ زندگی کے انہی پہلوؤں کو بھی سوچنے لگی جہاں آہیں، سسکیاں اور غم ہی تھے۔ اس کا فون بجتا رہا اور یونہی سوچتی رہی، زندگی کتنی ارزاں ہو گئی تھی۔ یہی سوچتے ہوئے نجانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

فون کی بیل ہی سے وہ بیدار ہوئی تھی۔ چند لمحوں تک وہ سمجھ ہی نہ سکی کہ وہ کہاں ہے۔ پھر جب سمجھ میں آیا تو خود پر مسکرا دی۔ یوں چٹائی پر سوجانے کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ جہاں اسے نیند آ گئی تھی۔ اسے گھبراہٹ سی محسوس ہونے لگی تھی۔ سر اور پلکیں بھاری ہونے لگیں۔ اس نے یہی سمجھا کہ شدید تھکن اور آرام کی کمی کے باعث بدن دکھ رہا ہے۔ اس نے فون سنا، ڈاکٹرز آ گئے ہوئے تھے۔ وہ جلدی سے اٹھی تو اسے چکر آ گیا۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالتی ہوئی خیمے سے باہر چلی گئی۔ اسے یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ سڑک کنارے خیمے نصب تھے اور ان کے پاس کئی ٹرک اور دوسری گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وہ ندیم کو دیکھنے کے لیے وہاں کھڑی رہی۔ وہ اس کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی کہ ایک بچہ اس کے قریب آ گیا۔ اس کے ساتھ دو تین اور بچے بچیاں تھیں جو دوڑتے ہوئے کچھ فاصلے پر ہی رک گئے تھے۔ وہ معصوم بچہ اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر بولا۔

”آپی۔۔۔ آپی۔۔۔ آپ نے اتنی ساری چیزیں دی ہیں۔۔۔ کیا ہماری کتابیں بھی ہمیں مل جائیں گی۔“

”کتابیں، مطلب۔۔۔“ ایک لمحے کو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

”آپی، حکومت نے ہمیں کتابیں مفت دی تھیں۔ وہ تو پانی میں بہہ گئیں۔ اب وہ دوبارہ تو نہیں ملیں گی۔۔۔ یا پھر ملیں گی۔۔۔ کیا ہم پھر اسکول جاسکیں گے۔“

”او۔۔! اچھا، آئیں گی بیٹا۔ کتابیں آئیں گی۔۔۔ باقی تو آپ سب لوگ خوش ہو نا۔“

”بہت خوش، اب تو اماں بابا۔۔۔ ہنس کر بات کرتے ہیں۔۔۔“ اس نے معصومیت سے کہا اور پھر ایک طرف بھاگ گیا۔ اس کے اپنے چہرے پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔ اسے وہیں سے معلوم ہوا کہ ندیم سڑک کنارے خیموں کے پاس ہے۔ وہ اس جانب بڑھ گئی۔ ٹیلے سے سڑک تک کا کوئی اتنا فاصلہ نہیں تھا لیکن یہ سفر اسے بہت زیادہ لگا۔ اس کا پورا بدن دکھنے لگا تھا۔

سیلی کی آمد کا احساس کر کے وہ سب اس کے گرد جمع ہو گئے۔ جو لوگ کچھ نہ کچھ لے کر آئے تھے۔ وہ تفصیلات بتاتے رہے۔ ندیم نے وہاں خیمے لگا کر اسپتال کی صورت دے دی گئی تھی۔ جہاں ڈاکٹرز نے آتے ہی کام شروع کر دیا تھا۔ کچھ پڑے تھے۔ جو انہی خیموں میں لگا دیئے گئے۔

”آپ لوگ جو کچھ بھی لائے ہیں، ندیم کے حوالے کر دیں۔ ہماری طرف سے شکریہ کہہ دیں۔ ہم بعد میں فون کر لیں گے۔“ اس نے کافی حد تک بے پروائی سے کہا اور ڈاکٹرز سے ملنے کے لیے چل دی۔

”میڈم لگتا ہے آپ خود بھی ٹھیک نہیں ہیں اس وقت۔۔۔“ ایک بزرگ سے ڈاکٹر نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہمیں بھی احساس ہو رہا ہے۔ بدن دکھ رہا ہے۔ شاید تھکن کی وجہ سے۔“ اس نے ایک سٹول پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”میں دیکھتا ہوں۔۔۔“ ڈاکٹر نے کہا اور مختلف آلات سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔ ”وہی ہوا نا، آپ کو بخار ہے۔۔۔ کس وجہ سے ہے، یہ دیکھنا ہوگا، آپ بہرحال اب آرام کریں۔ میں آپ کو میڈیسن دیتا ہوں۔“ ڈاکٹر نے کہا تو قریب کھڑا ندیم تیزی سے بولا۔

”مجھے یہی ڈر تھا۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو حویلی چھوڑ دوں۔۔۔“

”نہیں، ہم یہیں رہیں گے۔۔۔ آپ میڈیسن دیں۔“ سیلی نے کہا اور ندیم کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔

اسپتال تمام خیموں میں روشنی تھی۔ اسے ایک خیمے میں لٹا دیا گیا تھا۔ ندیم کا کہیں پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ رات گئے وہ لوٹا تو اس کا بخار بہت حد تک کم ہو گیا تھا۔

”آپ کہاں تھے؟“

”میں مظفر گڑھ گیا تھا۔ آپ کے لئے کچھ دوائیں لینے اور ٹیسٹ کروانے، خدا کا شکر ہے کوئی خطرے والی بات نہیں ہے، جیسا ڈاکٹر سمجھ رہے تھے۔“

”آپ میرے لیئے اتنی دور گئے؟“ سیلی نے حیرت سے پوچھا۔

”کیوں، کیا میں آپ کے لیے نہیں جاسکتا۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے رکا پھر سوچتے ہوئے بولا، ”میڈم آپ کے لیے

میری کوئی بھی کوشش اس لیے نہیں ہے کہ آپ لڑکی ہیں اور وہ بھی بے حد حسین لڑکی، میرے دل میں آپ کے لیے احترام ہے۔ بے حد احترام۔۔۔ کیونکہ آپ ہماری محسن ہو۔ ایک غیبی مددگار۔۔۔" ندیم یوں کہہ رہا تھا جیسے وہ کوئی ماورائی مخلوق ہو۔ ایک لمحے کے لیے سِلی کانپ گئی۔ وہ اسے کس حد تک عزت اور مان دے رہا تھا۔ "اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ ہم ایک طوائف زادی ہیں تو کیا پھر بھی وہ ایسے ہی ہمارا احترام کرے گا؟ نہیں ہمیں یہ تاثر نہیں دینا چاہیے۔"

"ہم نے ایسا کیا کر دیا۔ جو آپ اتنا احترام دے رہے ہیں۔" سِلی نے یونہی کہہ دیا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ آپ کون ہیں۔ کہاں سے آئی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے جو کچھ بھی کیا۔ پورے دل سے کیا۔ میرا نہیں خیال کہ کوئی ریاکاری تھی۔" وہ بڑے سکون سے بولا

"وہ ہی تو پوچھ رہے ہیں نا۔ آپ نے ایسا خیال کیسے کر لیا۔" وہ دلچسپی سے پوچھنے لگی۔

"بعض اوقات لفظ اتنی اہمیت نہیں رکھتے، جتنے عمل سے نیت کا اظہار ہو جاتا ہے۔ آپ دوسرے لوگوں کی طرف روپے پھینک کر جا سکتی تھیں، ساز و سامان کے ڈھیر لگا کر اپنے محل میں سکون کرتیں۔ یوں ان بے یار و مددگار لوگوں کے درمیان رہ کر وقت نہ گذارتیں۔ ایک ایک کا خیال نہ کرتیں۔ ان کے پاس جا کر ان کے دکھ درد میں شریک نہ ہوتیں۔" وہ جذب میں کہتا چلا گیا تو سِلی کو یاد آ گیا۔ اس لیے جلدی سے بولی۔

"ہاں ندیم۔! یہاں بچوں کے پڑھنے کا بھی کوئی بندوبست کر دیں۔۔ بتائیں ان کے لیے کیا کیا چاہیے ہو گا۔"

"وہ بھی ہو جائے گا، آپ فی الحال خود کو سنبھالیں۔۔" ندیم نے کہا اور اٹھ گیا۔ اس نے نہ صرف خود اسے دوائیں دیں بلکہ کھانے پینے کا بھی خیال رکھا۔ پتہ نہیں کیا وقت تھا۔ جب اسے نیند آ گئی۔ دوبارہ جب اس کی آنکھ کھلی تو اسے سخت پیاس لگی ہوئی تھی۔ ہر طرف اندھیرا تھا، وہ ایک دم خوف زدہ ہو گئی۔ شاید اس کے منہ سے کوئی آوازیں ایسی نکلی تھیں یا کسی کو پکارتے ہوئے۔ ٹھیک طرح سے کہہ نہیں پائی تھی۔ چند لمحوں بعد ہی ندیم اس کے خیمے میں آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں لائٹ تھی۔

"کیا ہوا طبیعت ٹھیک ہے نا۔" اس نے تیزی سے پوچھا

"پیاس۔ ہمیں پیاس لگ رہی ہے۔" اس نے بڑی مشکل سے کہا، حالانکہ خوف سے اس کا بدن پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ اس نے قریب پڑے اسٹول سے پانی کی بوتل اٹھائی اور سِلی کی جانب بڑھا دی۔ وہ غٹا غٹ ساری پی گئی۔ پھر خالی بوتل اسے تھماتے ہوئے بولی۔ "ندیم۔! آپ کچھ دیر ہمارے پاس بیٹھو۔"

"میں یہیں ہوں۔ آپ کے پاس۔ میں کہیں بھی نہیں گیا تھا۔ یہاں باہر بیٹھا تھا۔ لگتا ہے آپ ڈر گئی ہیں۔"

"ہاں۔! ہم خوف زدہ ہو گئے تھے۔" اس نے اعتراف کر لیا۔ پھر سِلی کو نیند نہیں آئی۔ وہ اس سے باتیں کرتی چلی گئی۔ زندگی اور اس کی بے ثباتی کی باتیں، پانی میں گھرے ہوئے لوگوں کی بے بسی کی باتیں، ایک دوسرے سے بچھڑ جانے کی باتیں۔ بے حس لوگوں کی بے اعتنائی کی باتیں۔ یہاں تک کہ پو پھٹ گئی اور اندھیرا چھٹنے لگا۔ سِلی کو لگا کہ وہ اتنا دیہاتی نہیں ہے، جتنا وہ سمجھی تھی۔ وہ خاصا پڑھا لکھا اور باشعور انسان دکھائی دیا تھا۔ وہ باتیں کرتے کرتے سو گئی تھی۔ اس کی آنکھ کھلی تو سامنے اس کی ماں کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ حماد خاں تھا۔

"ہائے ہائے میری بچی۔! یہاں کہاں پڑی ہے۔؟ حماد آپ نے بھی اسے نہیں سمجھایا۔"

"پوچھ لیں اس سے میں نے بہت سمجھایا تھا لیکن یہ مانی ہی نہیں، تو پھر میں نے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔" اس نے بے پروائی سے کہا اور اپنا دامن صاف کر لیا۔ "آخر آپ نے اسے آنے ہی کیوں دیا۔"

"ہم اپنی مرضی سے آئے ہیں۔" سِلی نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"چلو اٹھو۔ چلیں۔ ہائے ہائے کیا حالت بن گئی میری شہزادی کی۔۔" اس کی ماں کا بس نہیں چل رہا تھا، ورنہ وہ اسے لمحوں میں غائب کر کے لے جائے۔

"اماں چلیں جائیں گے۔ اتنی جلدی کاہے کی ہے۔۔" سِلی نے کہا تو اس کی ماں نے شور مچا دیا کہ یہ کوئی

جگہ ہے رہنے کی۔ اگر تمہیں کچھ ہوگیا تو پھر کیا ہوگا۔ تمہیں جلد از جلد کسی ماہر ڈاکٹر کو دکھانا ہوگا۔ خدانخواستہ کوئی وبائی مرض چمٹ گیا ہو تو وغیرہ وغیرہ جیسی دلیلیں دیتے چلی جا رہی تھی۔ کون اپنی ڈوبتی ہوئی انڈسٹری کو دیکھ سکتا ہے۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی پھر حماد سے بولی۔

''آپ نے کیش لیا۔۔۔ وہ۔۔۔''

''نہیں۔ وہ ہیرے میں نے تمہاری اماں کو دے دیے ہیں۔'' حماد خان نے کہا اور نگاہیں چرالیں۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے یوں دولت برباد کرنے کی حکومت کر رہی ہے نا ان کے لیے اور تم نے جو کر دیا اب تک وہ بہت ہے، بس چلو تم۔۔۔'' اس کی ماں تنک کر بولی۔

سیلی نے کچھ نہ کہا اور خاموشی سے اٹھ کر خیموں والے اسپتال سے باہر آگئی۔ اس کی نگاہیں ندیم کو تلاش کر رہی تھیں۔ اس کے جانے کی اطلاع لمحوں میں ٹیلے پر پھیل گئی۔ ندیم کو معلوم نہ ہوتا یہ ممکن نہ تھا۔ وہ وہاں پہنچا تو سیلی گاڑی کے قریب پہنچ چکی تھی۔

''اچھا ہوا ندیم آپ آگئے۔ ہم جا رہے ہیں، آپ۔۔۔'' وہ بات پوری بھی نہیں کر پائی تھی کہ اس کی ماں نے جلدی سے کہا۔

''تو یہ ہے ندیم۔!''

''ہاں۔! جو چند ہزار میں ان سیلاب زدگان کی مدد قبول نہیں کرتا بلکہ لاکھوں روپے وصول کر لیتا ہے۔۔'' حماد خان نے اپنی بھڑاس نکالی تو ندیم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''ظاہر ہے یہ بے چارے لوگ محنت کریں گے تو کئی برسوں کی روٹی بنا پائیں گے۔ بہت دے دیا انہیں چلو اب۔۔ تم تو چلو۔۔'' اس کی ماں نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا تو سیلی کی نگاہیں جھک گئیں۔ وہ ندیم کا سامنا ہی نہ کر پائی۔ بس ایک لمحے کے لیے اس کی طرف دیکھا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ بہت کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اس کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔ شاید اس نے سیلی کی نگاہوں میں بے بسی دیکھ لی تھی وہ ایک لفظ بھی نہیں بولا۔ کئی لمحے گزر گئے۔ پھر لمحہ بہ لمحہ وہ ٹیلا دور ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ تب سیلی نے کہا۔

''اماں۔! آپ نے ندیم کو یوں بے عزت کر کے اچھا نہیں کیا۔ آپ کو نہیں معلوم وہ کیا کچھ کر رہیں ہیں وہاں پر۔'' وہ ایک دم برس پڑی تھی۔

''بس اب چھوڑو۔! جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ اب لاہور پہنچنے کی فکر کرو۔۔ سب سے پہلے میں نے تمہیں ڈاکٹرز کو دکھانا ہے۔'' اس کی ماں نے کمالِ مہارت سے اس کی بات کو نظر انداز کر دیا اور وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ پھر وہ لاہور پہنچ جانے تک یونہی کھولتی اور شرمندہ ہوتی رہی۔

وقت گزرتا چلا گیا اور ندیم اسے نہیں بھولا، وہ اس کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔ وہ دن جب اسے یاد آتے تو پھر بے تحاشا یاد آتے۔ وہ موازنہ کرنے بیٹھ جاتی، انسانی جذبوں کو تولنے کی کوشش کرتی، جس میں ناکام ہو جاتی۔ تاہم اسے اندازہ ضرور ہو جایا کرتا تھا۔ کسی بھی شے کی اچھائی یا برائی، اعلیٰ یا گھٹیا ہونا، اسی وقت ثابت ہوتا ہے جب کوئی معیار سامنے ہو۔ ٹیلے پر جانے سے پہلے اس نے جس طرح کے انسانی رویے دیکھے تھے۔ اس میں منافقت ہی منافقت تھی۔ اسے یہ اندازہ ہی نہیں تھا کہ دوسروں کے جذبات سے کھیلنے والے مفاد پرست لوگ کتنے گھٹیا ہوتے ہیں۔ ایک اعلیٰ رویہ اس کے سامنے آیا تو پتہ چلا زندگی اپنا ایسا پہلو بھی رکھتی ہے۔ معیار لے کر تجزیہ کیا جائے تو سب کچھ عیاں ہو جاتا ہے اور اس کے لیے کبھی کبھی وقت کی بڑی شدت سے ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ندیم کے ایک ایک رویے پر غور کرتی رہی۔ وہ جب بھی اس کے بارے میں سوچتی، وہ اسے مزید اچھا لگنے لگتا، یہاں تک کہ ایک برس گزر گیا اور وہ اس سے ملنے کی تڑپ لیے پھر سے ان فضاؤں میں آگئی تھی۔

❁ ......❁...... ❁

''سلیمہ جی، اتریں۔ حویلی آگئی ہے، کہاں کھوئی ہوئی ہیں آپ۔۔۔'' فائقہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ اپنے آپ میں آگئی۔ وہ گاڑی سے اتری اور حویلی کے مہمان خانے کی جانب بڑھ گئی۔ تب فائقہ نے بتایا۔ ''یہاں آپ تیار ہوں گی۔ پھر کچھ ہی دیر بعد سیمینار میں جائیں گے۔'' اس نے خاموشی سے سنا اور اپنے لیے مخصوص کمرے میں چلی گئی۔ اس کا بولنے کو دل ہی نہیں کر رہا تھا پرانی یادوں نے اسے اپنے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ ندیم کا

چہرہ اس کی نگاہوں سے ہٹ ہی نہیں رہا تھا۔ کتنی بے بسی سے دیکھا تھا اس نے۔ سلمٰی کا دل بھر آیا۔ پتہ نہیں وہ اب ملے گا بھی یا نہیں۔۔۔؟

وہ سیمینار میں پہنچی تو مقررین زور شور سے خطاب کر رہے تھے۔ ہر ایک کی تقریر کا لب لباب خوشامدانہ تھا۔ سیلاب زدگان کی بحالی کا سارا کریڈٹ سیاست دان لے جا رہے تھے۔ وہ دکھی دل سے سوچے چلی جا رہی تھی کہ وہ لوگ تو بالکل نظر انداز ہو گئے ہیں جنہوں نے حقیقت میں ان مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کی تھی۔ پاک فوج کے اس سپاہی کا کہیں ذکر نہیں تھا جو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر پانی میں گھرے ہوئے لوگوں تک پہنچا تھا۔ اس رضا کار کی ہمت نظر انداز ہو گئی جو بھوکوں اور پیاسوں تک کھانا پانی لے کر جاتا رہا۔ اسے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ بعد میں وہاں مختلف حکومتوں نے بہت کچھ کیا۔ مثلاً سعودیہ کی طرف سے اسپتال لایا گیا اور جولائی کے آخر میں جب عید آئی تو وہ لوگ واپس اپنے گھروں کو پلٹ گئے تھے۔ وہ مختلف کیفیات سے گذرتی ہوئی تقریریں سنتی رہی۔ سیمینار ختم ہو گیا تو وہ حماد خاں کے ساتھ شوپیس کی طرح خصوصی مہمانوں کے درمیان پھرتی رہی۔ اس نے خود محسوس کیا کہ وہ وہاں اوپری دل سے ہنستی مسکراتی رہی تھی۔ سہ پہر کے وقت ہر طرح سے فراغت ہو گئی تو اس کا دل حویلی جانے کو نہ چاہا، وہ گاڑی میں بیٹھی تو ساتھ میں نجو بھی تھی، تب اس نے ڈرائیور سے ٹیلے پر جانے کو کہا۔ وہ حکم کی تعمیل میں ادھر چل پڑا۔

سڑک کنارے ٹیلا ویران تھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ ایک برس پہلے کے آثار بھی نہیں تھے وہاں۔ گذرتے وقت کی نشانیاں اگر زمین پر تھیں تو شاید اب تک یہ زمین ایسی نشانیوں سے اَٹ چکی ہو گی۔ یہ تو انسان کا دل ہی ہے جو پرانی یادوں کا مسکن بنا رہتا ہے۔ وہ ویران ٹیلے پر کھڑی تھی۔ اس سے ذرا فاصلے پر نجو تھی اور ٹیلے کے نیچے گاڑی کے قریب ڈرائیور منتظر تھا۔

سلمٰی وہاں ٹیلے کی بے آب و گیاہ زمین کو تکتی رہی۔ اسے وہاں کا ایک ایک منظر یاد آتا چلا گیا تھا۔ جس کے ساتھ نجانے کتنے سوال امڈتے چلے آئے تھے۔ ایک لمحے کو اسے ایسا لگا جیسے سارے منظر پھر سے جاگ گئے ہیں۔ اسے لگا ندیم یہیں کہیں آس پاس ہی ہو گا۔ تبھی سڑک پر سے فور وہیل سرکاری جیپ اتری اور سیدھی ٹیلے تک آ گئی۔ وہ اسے دیکھتی رہی۔ جیپ گاڑی کے قریب رکی اور اس میں سے تین لوگ باہر آئے۔ سب سے آگے والا اسمارٹ سا نوجوان ویل ڈریسڈ تھا، اس نے سیاہ چشمہ لگایا ہوا تھا۔ وہ بڑے نپے تلے قدموں سے چلتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔

”کہیے میڈم کیا حال ہیں۔“ نوجوان نے سیاہ چشمہ اتارا تو سلمٰی پر حیرت ٹوٹ پڑی۔ اس نے ایک دم سے ندیم کو پہچانا تھا۔

”ندیم آپ۔۔! کیسے پتہ چلا کہ میں یہاں ہوں؟“

”مجھے معلوم تھا کہ آپ سیمینار میں مدعو ہیں۔۔۔ اور یہ یقین تھا کہ آپ اس ٹیلے پر ضرور آئیں گی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ میں یہاں پہلے آتا اور آپ کا استقبال کرتا، بس ذرا سی تاخیر ہو گئی۔“

”ہمیں یقین نہیں آ رہا ندیم کہ یہ آپ ہی ہیں وہ جو ایک برس پہلے یہاں ملے تھے۔ وہ دیہاتی نوجوان اور یہ سرکاری گاڑی۔۔۔“

”میں سی ایس پی آفیسر ہوں۔۔۔ خیر چھوڑیں۔۔۔ آپ کے لیے تو میں وہی ندیم ہوں۔ گارے مٹی سے بھرے ہوئے کپڑوں والا، جو آٹھ دن تک نہیں نہایا تھا۔۔۔“ وہ خوشگوار انداز میں بولا۔

”ہم کیسے یقین کر لیں۔۔۔ خواب کیا ہے اور حقیقت کیا ہے۔۔۔“ سلمٰی حیرت کے بھنور سے نکل ہی نہیں پا رہی تھی۔

”خواب اور حقیقت کو چھوڑیں، اگر آپ کے پاس وقت ہو تو چلیں میرے ساتھ، بہت سارے لوگ آپ سے ملنے کو بے تاب ہیں۔“

”ضرور۔ ! چلو۔۔۔ ہم تو خود آپ سے ملنے کو بے تاب تھے۔ آئیں۔“ اس نے قدم بڑھائے تو نجو بھی اس کے ساتھ چل دی۔ دونوں گاڑیاں سڑک پر حویلی کی طرف جانے والے مخالف راستے پر چل دیں۔

وہ ایک بہت ہی خوبصورت ماڈل ویلج تھا۔ جہاں صفائی ستھرائی کے ساتھ ترتیب بھی تھی۔ وہ ایک بڑے سے گھر کے سامنے جا رکے۔ گاڑیوں سے اترنے کے بعد وہ

بجو اور سیمی گھر کے اندر چلے گئے۔ سامنے بڑے سارے صحن سے آگے دالان میں ایک بزرگ بیٹھا ہوا تھا۔ اس سمیت گھر کے ہر فرد نے قیمتی لباس پہنا ہوا تھا۔ اس کی آمد پر وہ بزرگ کھڑا ہو گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر سیمی کے سر پر پیار دیتے ہوئے کہا
"خوش آمدید بیٹی۔!"
وہ ایک لمحے کو لرز گئی۔ وہ پہچان چکی تھی کہ وہ بزرگ کون ہے۔ اس کی زبان سے اپنے لیے بیٹی کا لفظ سن کر تھرا گئی تھی۔ ایسا تو کسی نے بھی اسے کہنے کی جرات نہیں کی تھی۔ چاہے اس نے آرٹ اینڈ کلچر کے نام پر جتنی بھی نیک نامی کمائی تھی۔ سیمی نے گھر کو دیکھا اور لرزتے ہوئے لہجے میں بولی۔
"وقت نے آپ کو پھر بادشاہ بنا دیا ہے۔"
"ہاں پتر۔ لیکن یقین بھی آ گیا ہے کہ وہ مالک جس کو جو چاہے دے دے اور جب چاہے لے لے۔۔ لے کر بھی سب کچھ دے دیتا ہے۔۔ اپنا یہاں کیا ہے، اسی کا ہے۔۔ آؤ۔۔ بیٹھو۔۔"
وہ اس کی بہو اور بیٹیوں میں جا بیٹھی۔ وہ سب اس کی آؤ بھگت میں لگ گئیں۔
"آپ ٹیلے پر بڑے مایوس تھے۔"
"نہیں، صرف یہ سوچتا رہا تھا کہ مجھ سے کیا گناہ سرزد ہو گیا جس کی سزا ملی۔۔۔ لیکن نہیں وہ بس امتحان تھا، گزر گیا۔ اب بھی سب ویسا ہی چل رہا ہے۔" اس بزرگ نے کہا۔
سیمی وہاں کافی دیر تک بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ جب چلنے لگی تو اس بزرگ کی بیوی نے ایک مقامی طرز کا بڑا سا آنچل جسے "پھوچھن" کہا جاتا تھا، اس کے سر پر دے دیا۔
"بیٹی۔! یہ ہماری طرف سے۔۔۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب یہ تمہارا گھر ہے، جب چاہو آ سکتی ہو۔ یہاں تمہارا مان ایک بیٹی کی طرح رکھا جائے گا۔" اس خاتون نے رسان سے کہا تو سیمی پھر پورے وجود سے لرز گئی۔ اگر انہیں پتہ چل جائے میں کون ہوں تو کیا یہ پھر بھی میری اتنی ہی عزت کریں گے؟
"آئیں میڈم، ابھی کچھ اور لوگوں سے بھی ملنا ہے۔" ندیم نے کہا تو وہ زیر بار سا وجود لے کر پھاٹک تک آ گئی۔ پھر بڑی حسرت سے اس صحن کو دیکھا جو دالان میں کھڑے گھر والوں پر نگاہ ڈالی، پھر جیسے سب دھندلا ہو گیا۔ اسے پتہ ہی نہیں چلا کب اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ وہ جلدی سے گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ اس بار ندیم نے اسے اپنے ساتھ بٹھا لیا تھا۔ راستے میں ایک جگہ رکا اور اشارہ کرتے ہوئے بولا۔
"یہ اسکول ہے۔۔ عام سرکاری اسکول نہیں۔۔ ایک مثالی اسکول، جس بچے نے آپ سے کتابیں مانگی تھیں۔ وہ اب اس اسکول میں پڑھتا ہے۔ ابھی ملواتا ہوں اس سے۔"
"اور وہ خاتون۔۔ جن کی بیٹی سیلاب میں بہہ گئی تھی۔" اس نے تجسس سے پوچھا۔
"وہ اللہ کو پیاری ہو گئی ہے۔" ندیم نے آزردہ لہجے میں بتایا۔
"اور اس کے بچے۔۔" وہ تڑپ کر بولی۔
"میرے پاس ہیں۔۔ میں ان کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔۔" اس نے سکون سے کہا اور ایک بڑے سے گھر کے سامنے گاڑی روک دی۔ "یہ میرا گھر ہے۔۔"
"آپ کا۔۔" اس نے خوشگوار حیرت سے پوچھا۔
"ہاں میرا۔ آئیں۔۔" وہ بولا اور اسے لے کر اندر چلا گیا۔ کئی سارے کمروں پر مشتمل سادہ سا لیکن صاف ستھرا گھر بڑا پرسکون تھا۔ وہ جیسے ہی صحن میں آئے۔ تو سامنے سے ایک نوجوان مگر اپنے سراپا سے خاتون دکھائی دینے والی لڑکی آ گئی۔ وہ پروین تھی وہ لڑکی جو ٹیلے پر آٹا مانگ رہی تھی۔ وہ آتے ہی سیمی سے گلے لگ گئی۔ یہ پروین اور اس کا شوہر یہاں ان بچوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔
"مجھے نہیں یقین تھا کہ ہم کبھی دوبارہ مل پائیں گے۔" پروین نے شدت جذبات میں کہا۔
"لیکن دیکھیں قسمت لے آئی ہے۔"
"آئیں۔!" وہ انہیں لے کر ڈرائنگ روم میں آ گئی۔
"آپ کے والدین اور۔۔۔" سیمی نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
"وہ یہاں نہیں رہتے بلکہ وہ اسی بستی میں ہیں جہاں سیلاب آنے سے پہلے رہتے تھے۔ میڈم میں دراصل آپ کو بتاؤں کہ ٹیلے پر وہ خاتون فوت ہو گئی تو اس کے بے یار و مددگار بچے بے آسرا ہو گئے۔ یہ ذمہ داری پروین نے اپنے سر لی کہ وہ انہیں پالے گی۔ پھر کئی بچے بڑھتے گئے تب

پھر پوری طرح یہ ذمہ داری میں نے لے لی۔اب یہاں بہت سے بچے پرورش پا رہے ہیں۔'' ندیم نے بتایا تو سیلی ان کیفیات میں جا پہنچی، جہاں احساس فقط روح محسوس کرتی ہے۔جسم سے اس کا کوئی رابطہ نہیں ہوتا۔بچے وہیں آتے رہے تو وہ ان سے باتیں کرتی رہی۔اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ کتنا وقت گذر گیا ہے۔تبھی تجو نے قریب آ کر بتایا۔

''حماد خاں کا بار بار فون آ رہا ہے۔وہ آپ کے بارے میں پوچھ رہے ہیں، کیا بتاؤں۔''

''یہی کہ ہم ائیر پورٹ چلے جائیں گے۔۔حویلی نہیں آئیں گے۔۔'' سیلی نے بے خیالی میں کہہ دیا۔

''اپنا سامان تو ادھر پڑا ہے۔۔'' تجو نے اسے یاد دلایا۔

''چلیں پھر چلتے ہیں۔'' سیلی نے ندیم اور پروین کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ہم آپ کو ائیر پورٹ پر وداع کریں گے۔آپ حویلی جائیں اور حماد خاں کو لے کر ائیر پورٹ آئیں۔'' ندیم نے کہا تو سیلی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔اور پھر اٹھ کر چل دی۔اس نے محسوس کیا کہ وہاں سے جاتے ہوئے اس کے قدم بوجھل ہو رہے تھے۔

ائیر پورٹ پر ندیم تھا۔جب وہ وہاں پہنچی،اس کے ساتھ حماد خاں بھی تھا، فائقہ اور دوسرے لوگوں کے ساتھ تجو بھی تھی۔حماد خاں حسب سابق انتہائی بے رخی سے ملا۔تب ندیم بولا۔

''میڈم۔! کیا حماد خاں نے وہ رقم آپ کو پہنچا دی تھی جو آپ نے یہاں ٹیلے پر موجود لوگوں پر خرچ کی تھی۔؟''

''مطلب۔ہم نے جو رقم خرچ کی۔۔۔آپ نے وہ حماد خاں کو دی۔۔'' سیلی نے انتہائی حیرت سے کہا۔

''ہاں۔! یہ اس کی رسید ہے جو رقم دے کر ان سے لی گئی تھی۔'' ندیم نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر اسے تھماتے ہوئے کہا تو حماد خان نے پوری ڈھٹائی سے کہا

''وہ رقم اب بھی میرے پاس امانت پڑی ہے، میں دے دوں گا۔''

''یہ رقم دے کر میں یہ باور نہیں کروانا چاہتا کہ میں بہت امیر آدمی ہوں۔۔۔میں نے تو بس اتنا کیا کہ ٹیلے پر موجود لوگوں کو یہ سوچ دے دی کہ رازق اللہ کی ذات ہے۔آج رقم لوٹانے کی نیت کرو، کل رب اور زیادہ دے گا۔یہ سب ان لوگوں نے جمع کر کے انہیں دے دیئے تھے۔میں یہ بھی باور کرانا چاہتا ہوں کہ رزق دینے والی اللہ کی ذات ہے۔مگر افسوس ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو سیلاب زدگان کی امدادی اشیاء کو اب تک بلیک مارکیٹ میں فروخت کر رہے ہیں۔''

''ہم آپ سے بہت شرمندہ ہیں ندیم۔'' وہ انتہائی شرمندگی سے بولی

''جو کچھ آپ دیکھ کر آئی ہیں یہ اپنی مدد آپ کے تحت ہوا ہے۔اگر ان جیسے لوگوں کے وعدے پر رہتے تو آج بھی ان لوگوں کی طرح ہوتے جو اب تک بحالی کے منتظر ہیں۔'' اس نے انتہائی دکھ سے کہا تو سیلی کتنی دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی، پھر جو بولی تو اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا اور اس کا ازالہ فقط ایک صورت میں کر سکتے ہیں''

''وہ کیسے؟'' ندیم نے پوچھا

''اس سیلاب کے باعث ہم جہاں کیچڑ میں پڑے ہوئے کنول کی خوشبو سے متعارف ہوئے، وہاں کئی ایسے بکروہ چہرے بھی دیکھے جو خوبصورت نقاب اوڑھے ہوئے ہیں۔اصل زندگی کیا ہے، یہ اب ہم نے جانا ہم نے سوچ لیا ہے کہ ہم یہیں رہ جائیں۔کیا آپ ہمیں قبول کریں گے۔لیکن ہم پہلے یہ بتا دیں، ہم ایک طوائف۔۔۔''

''میں جانتا ہوں سیلینہ ،میں آپ کو اس وقت پہچان گیا تھا۔جب آپ ٹیلے پر آئی تھیں۔آپ اپنی ذات میں کیا ہیں؟ غرض اس سے نہیں ،اس دردمند دل کا احترام ہے، جو اس وجود میں دوسروں کے لیے تڑپا اور آپ کو لے کر اس ویرانے میں آ گیا۔اگر آپ کی خواہش ہے تو میں پورے دل سے آپ کو قبول کرتا ہوں۔''

''چلیں، واپس چلیں۔اور ان بچوں کی ذمے داری مجھے دے دیں۔'' سیلی نے تڑپ سے کہا۔'' جاؤ تجو چلی جاؤ، اب ہم لوٹ کر نہیں جائیں گے۔'' اس نے کہا اور ندیم کی طرف دیکھا۔پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر ائیر پورٹ سے باہر چل دی۔

تفتیش

عارف رمضان جتوئی

اسلام دین فطرت ہے اس میں ازل سے ابد تک پیش آنے والے مسائل کا حل موجود ہے۔ اس لیے اسے سائنٹیفک اور آسان دین کہا جاتا ہے لیکن ہم نے خود اسے مشکل بنا رکھا ہے اپنے سیاسی مفاد کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے ایک دوسرے کو کافر قرار دینا، جہاد کو صرف ہتھیار اٹھانے کا نام دینا بھی اسی کا حصہ ہے آج جس طرح نوجوانوں کی برین واشنگ اسلام کے نام پر کی جارہی ہے وہ سب کے سامنے ہے۔

ایک نوجوان کا قصہ عجیب و غریب، وہ خودکش بمبار بننے جا رہا تھا

"بتاؤ... پیسے کہاں گئے؟ تمہیں سب معلوم ہے مگر تم بتا نہیں رہے ہو" ۔ ڈنڈا بردار تفتیشی افسر نے گرجتے ہوئے دوبارہ مجھ سے پوچھا۔ میں نے رحم بھری نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ مگر سختی اس کے چہرے پر ہی نہیں دل میں بھی تھی،

"آپ کون سے پیسوں کی بات کر رہے ہیں... مجھے... نہیں معلوم ہے... یقین مانیں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا" میری مریل سی آواز اور اتری ہوئی صورت نے بھی اس پر کچھ اثر نہیں کیا۔ اتنے میں پاس بیٹھے امیر کے سیکرٹری نے لپک کر ایک زنانے دار تھپڑ میرے منہ پر رسید کیا، میں لڑکھڑاتا ہوا قالین پر گر گیا۔

"جھوٹ بولتا ہے... پیسے تو نے ہی اٹھائے ہیں اور اب مکر رہا ہے" ۔ وہ غصہ سے بے قابو ہو کر بولا۔ دونوں کے چہرے غصہ کے مارے سرخ ہو رہے تھے۔ دونوں مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں بہت پریشان تھا کہ آخر انہیں کیسے یقین دلاؤں کہ جس چوری کے متعلق وہ مجھ سے سختی برت رہے ہیں مجھے اس کے بارے میں تمیں رائی کے دانے کے برابر بھی کچھ معلوم نہیں۔ مگر وہ بضد تھے کہ پیسے میں نے ہی اٹھائے ہیں۔ دفتر کی گیلری میں لگے کیمرے بھی یہی بتا رہے تھے کہ جس کمرے سے پیسے چوری ہوئے ہیں وہاں صرف میں ہی آیا تھا۔ تبھی کوئی بھی میری بات کا اعتبار کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

.....☆☆☆.....

جب میرے بار بار کہنے کے باوجود بھی وہ نہیں مانے تو میں تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ میرا تفتیشی سلسلہ اب مزید آگے بڑھے گا... یہ لوگ اتنی آسانی سے جان نہیں چھوڑنے والے ہیں۔

بند کمرہ میں مجھ سے پر تشدد پوچھ گچھ کی گئی... یہاں پر چلانا یا شور کرنا بھی عبث تھا۔ کمرہ کی اندرونی حالت بتا رہی تھی کہ وہاں پر من پسند بیان حاصل کرنا چنداں دشوار نہیں۔

میں ابھی انہیں خیالوں میں گم تھا کہ مذہبی جماعت کے ادارے کے سیکورٹی انچارج ابو عاصم نے مجھے زوردار لات ماری۔ میں زمین پر اوندھا گر گیا۔ امیر کا سیکرٹری معین بھی تفتیش کے سلسلے میں مسلسل ابو عاصم کی معاونت کر رہا تھا۔

تیسری بار [illegible] جب انہیں اندازہ ہو گیا کہ میں

اب بھی ہامی نہیں بھروں گا تو انہوں نے لگا تار مجھ پر ڈنڈوں کی بارش کردی۔ ڈنڈے لگتے ہی میرے منہ سے ایک دردناک آواز ابھری اور پھر برداشت کی حد کیا ختم ہوئی۔۔آہیں۔۔سسکیوں میں بدل گئیں۔

مجھے اس وقت اپنی بے بسی کا احساس مارے جارہا تھا۔ یہ مار صرف جسم کو نہیں میری روح کو بھی تڑپا رہی تھی۔ یہ احساس کتنا جان لیوا تھا کہ جس ادارے میں میں نے گزشتہ 10 برسوں سے محنت اور ایمانداری کو اپنا شعار بنا کر کام کیا۔۔آج وہاں چند ٹکوں کے عوض میرا یقین مان سب ٹوٹ گیا۔ڈنڈوں کے لگتے ہی میرا جسم کچھ ہی دیر میں سن ہوگیا اور مجھے یہ احساس آہستہ آہستہ کم ہونے لگا کہ کہاں کہاں ڈنڈے مارے جارہے ہیں۔ تفتیش کا دائرہ کار کبھی نرمی تو کبھی انتہائی گرمی کے انداز میں وقفے وقفے سے جاری تھا۔ تفتیشی افسر ابو عاصم کے انداز سے یہ پتا لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس سے قبل بھی وہ کتنے ہی بے گناہوں سے اقرار جرم کروا چکا ہوگا۔ وہ ایسے معاملات میں کافی تجربہ کار لگا مگر وہ جانتا نہیں تھا کہ آج جن تلوں سے تیل نکالنے کی کوشش کررہا تھا وہاں کچھ نہیں تھا۔ جب اتنے ڈنڈے لگ چکے کہ مجھ سے بیٹھنا محال ہورہا تھا تو ابو عاصم نے مجھے بیٹھنے پر مجبور کیا تاکہ تکلیف کا یہ احساس مزید دگنا کیا جاسکے۔

......☆☆☆......

رات کے ایک یا دو بجے کے دوران ابو عاصم نے آکر مجھ ایک مرتبہ پھر پوچھ گچھ شروع کردی تاہم میرے پاس سے کوئی جواب نہ پا کر گویا اس نے ہار مان لی تھی اور وہ وہاں سے کمرا کھلا چھوڑ کر چلا گیا۔ کمرے کے کھلا چھوڑنے کا مطلب بھی یہی تھا کہ اب وہ مزید کچھ نہیں پوچھنا چاہ رہا تھا۔ ادھر امیر کی جانب سے پیسوں کی چوری کا معاملہ الجھتا

جا رہا تھا شاید انہیں یقین کی حد تک امید تھی کہ چوری ہونے والی دو لاکھ روپے کی رقم میں نے اٹھائی ہوگی تاہم جب ان کو مجھ سے انکار میں جواب ملا تو وہ کافی پریشان ہو گئے۔ امیر ہر صورت معاملے کو سلجھانا چاہتا تھا تبھی ان کی کوشش تھی کہ بات اندر ہی دبی رہے اور باہر نہ نکلے تو اچھا ہوگا، ورنہ ایک مذہبی جماعت کے صوبائی مرکز میں اتنی بڑی چوری کا مطلب سیکورٹی کے ناقص انتظامات پر سوالیہ نشان تھا۔ امیر کی پریشانی اپنی جگہ اہم تھی تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں بنتا تھا اپنی ناقص حکمت عملی کے پیش نظر کسی بھی بے قصور شخص پر فرد جرم عائد کر کے اسے تفتیش کے کٹہرے میں لاکھڑا کیا جائے۔ یہ بات جس قدر کہنا آسان تھا کہ اس قدر تکلیف دہ بھی تھی۔ اگلے روز میں نے اپنے چچا سلطان کو بلوایا تاکہ پیسوں کے معاملے پر امیر سے بات کی جائے کہ کیوں بے قصور پر زبردستی الزام عائد کر کے مارا گیا تاہم امیر نے صاف لفظوں میں ملنے سے انکار کر دیا اور ساتھ میں کہہ بھی دیا کہ وہ صرف پیسے دینے کی بات سننے کے لئے دوبارہ بات کریں گے۔ جب صورت حال گمبھیر ہوگئی تو میں نے وہاں پر مزید رک کر اپنی ہڈیاں تڑوانے کے وہاں سے چلے جانے کو ترجیح دی دوسرے ہی روز میں نے بلا کسی سے پوچھے وہاں سے چلا آیا۔ تشدد کی وجہ سے میرے جسم پر نیل پڑ چکے تھے۔ خوف و ہراس کی وجہ سے میری حالت اس قدر ابتر ہو چکی تھی میری ماں سے لیکر گھر کا ہر فرد سراپا احتجاج بنا ہوا تھا۔ دادی کی تو آنکھوں سے آنسو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ ان کے لحاظ سے میں اپنے خاندان میں انتہائی شریف النفس اور بے ضرر سا لڑکا تھا۔ بعد میں کئی روز تک میں نے ان کے منہ سے متعلقہ افراد کے بارے میں صرف بد دعائیں ہی سنتا رہا تھا۔

☆☆☆

ایک ایسی جماعت کہ جس کے لئے میں اپنی جان تک کی قربانی دینے کے لئے تیار رہتا تھا اب بے پناہ نفرت نے لے لی تھی۔ ایک ایسی نفرت کہ جو شاید زندگی بھر ختم نہ کی جا سکے۔ ان حالات نے میری زندگی پر بہت گہرے اثرات چھوڑے تھے۔ میں بہت ہی زیادہ گھبرا چکا تھا۔ رشتوں سے اعتبار تک اٹھ چکا تھا۔ کچھ رشتے وہ ہوتے ہیں جو ہمیں خاندان سے ملتے ہیں مگر کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں جو ہم خود بناتے ہیں۔ یہ رشتے بھی وہیں تھے جنہیں میں اپنے خاندانی رشتوں پر بھی ترجیح دیتا تھا تاہم انہیں رشتوں نے آج میری قدر نہیں کی تھی۔ کتنی ہی بار دل میں خیال آیا کہ اپنے پر بیتے ان لمحات کا بدلہ چکایا جائے تاہم پھر کچھ لوگوں کی اچھائیاں سامنے آ جاتیں جن کی وجہ سے میں اپنے ارادے ترک کر دیتا۔ ایک روز میں موٹر سائیکل پر اسپتال دوا لینے کے لئے نکلا تو میری ملاقات ایک لڑکے سے ہوئی جس نے مجھے بتایا کہ وہ اسلام اور دین کی اشاعت کے لئے اپنی جانوں کو بیچ چکے ہیں۔ مجھے اس کی باتیں کچھ سمجھ میں نہیں آئیں تو وہ مجھے اپنے قریبی دفتر لے گیا۔ دفتر میں مجھے ہر طرف مختلف ہتھیاروں کی تصاویر نظر آئیں۔ میری نظر ان پر پڑی تو مجھے اپنے ٹریننگ کے دن یاد آ گئے۔ میں ایک مدرسے میں دینی تعلیم حاصل کرنے گیا ہوا تھا تو انہوں نے مجھے اپنی ٹریننگ سینٹر میں کچھ اسلحہ چلانے کی تربیت دی تھی۔ یہ تربیت شاید اس لئے بھی ضروری تھی کہ تاکہ ہمیں معلوم ہو سکے ہمیں اپنا دفاع اور خود کو کیسے محفوظ رکھنا ہے۔ ہمیں ان کے بارے میں اگر علم نہیں ہوگا تو شاید ہم فلموں کو دیکھ کر اس اسلحہ کا غلط استعمال کر بیٹھیں گے۔

☆☆☆

دفتر میں ایک خوبصورت باریش نوجوان نے ہمارا استقبال کیا۔ نوجوان نے اپنا نام عبدالرحمن بتایا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد عبدالرحمن نے مجھے اپنے دفتر میں آنے کی دعوت دی۔ میں نے فارغ رہنے سے بہتر سمجھا کہ وہیں چلا جایا کروں۔ ہماری ملاقاتیں روز بہ روز بڑھنے لگیں اور پھر ایک دن عبدالرحمن نے بتایا کہ بھارت سے کوئی عالم دین جو کہ ان کے امیر کے طور پر بھی کام کرتے ہیں وہ کل یہاں آ رہے ہیں۔ ان سے میری ملاقات بھی کروانی ہے۔ اگلے ہی روز میری ان سے ملاقات کرائی گئی جس پر انہوں نے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ آنے والے بزرگ کا نام حفیظ الرحمن بتایا گیا، جسے سب حفیظ بابا کے نام سے مخاطب کرتے تھے۔ حفیظ بابا کچھ ہی روز یہاں ٹھہرے تھے۔

”بیٹے اب یہاں کا چارج آپ کو دے رہا ہوں لہٰذا

اب آپ ہمارے یہاں کے انچارج ہوگئے۔ آپ کی تنخواہ بھی اب ہمارے ہاں سے آپ کو مل جایا کرے گی۔'' انہوں نے مجھے بلا کر کہا۔

میں نے کام کا پوچھا تو بتانے لگے کہ کام جب آئے گا آپ کو وہ بھی ہم سکھا دیں گے۔ میں نے فوری طور پر کچھ نہ کہا اور وہ وہاں سے چلے گئے۔ اب میں باقاعدہ دفتر آنے لگا تھا اور عبدالرحمٰن نے مجھے دفتر سے متعلق تمام امور سکھانے بھی شروع کردیے تھے۔ ایک کمرے کے علاوہ باقی تمام چیزیں مجھے بتادی گئی تھیں۔ جس کمرے کے بارے میں مجھے نہیں بتایا گیا تھا مجھے وہ دیکھ کر تجسس سا ہونے لگا کہ آخر اس میں ایسا کیا ہے۔ میرے پوچھنے پر عبدالرحمٰن نے کہا ابھی امیر صاحب کی جانب سے اجازت نہیں ملی ورنہ وہ کمرہ بھی ہم آپ کو دکھادیتے۔

......☆☆☆......

کچھ دن گزرنے کے بعد ایک دن امیر صاحب تشریف لائے، حفیظ بابا بھی ان کے ساتھ تھے۔ انہوں نے اپنی تنظیم کے تمام افراد کو بلایا ہوا تھا۔ مجھے خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ ان کا مجھے ملنے کا انداز مانوس سا لگا جیسے وہ مجھے پہلے سے جانتے ہوں۔ جیسے میرے متعلق انہیں تمام معلومات بتادی گئی تھیں جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ تنظیم کا نیٹ ورک کافی حد تک مضبوط تھا۔ تنظیم کی جانب سے کسی خاص مشن کا بار بار ذکر کیا جارہا تھا اور اس مشن میں میرا تذکرہ بھی بار بار آرہا تھا۔ یہ بات میری تشویش میں اضافہ کرتی جارہی تھی کہ آخر ایسا کیا ہے جس کے لئے امیر صاحب خود تشریف لائے ہیں۔ میرے ذہن میں کئی طرح کے خیالات جنم لے رہے تھے تاہم میں نے انہیں اپنے اندر دبائے رکھا۔ امیر نے کچھ خاص پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور پھر وہاں سے چل دیے۔ میں بھی اپنے گھر آگیا تاہم پوری رات میرے دماغ میں امیر کی باتیں گونجتی رہیں۔ بدلہ، انتقام اور اشاعت دین فی الجہاد۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ ہم پاکستان میں دین کی اشاعت کا تو سوچ سکتے ہیں تاہم یہ کیسے ممکن ہے اسے ہم جہاد کے ذریعے کریں گے۔ جہاد کا مقصد جو امیر صاحب نے بتایا تھا اس میں جانیں ہی جانی تھیں اموات تھیں اپنی بھی اور سامنے والوں کی بھی۔ سامنے والے وہ تھے جنہیں مرتد کہا جارہا تھا۔ جنہوں نے کلمہ تو پڑھا تھا تاہم اب وہ کلمہ چھوڑ کر غیر اللہ کی پوجا کررہے تھے۔ کوئی جمہوریت کی پوجا کررہا تھا تو کوئی قبروں کی۔ تابوت کی پوجا کی جارہی تھی اور سب حکم فی اللہ میں شرک کے مرتکب ہورہے تھے۔

......☆☆☆......

امیر صاحب کے مطابق یہ سب لوگ واجب القتل ہیں۔ امریکا کے ساتھ ان کا اتحاد ہے اور ان سے یہ فنڈز لیتے ہیں اس لئے انہیں قتل کرنا ہمارے اوپر ضروری ہے۔ اگلے روز جب میں دوبارہ دفتر گیا تو امیر صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا اور مجھے کچھ دیر تک مسلسل اسلام کی اشاعت اور جہاد پر درس دیا۔ اس کے بعد مجھے شہادت کی نوید سنائی اور اس کے فضائل سے آگاہ کیا۔ انہوں نے مجھے ایک خاص مشن کے لئے چنا تھا۔ میں ان کی باتوں کو صحیح سمجھنے لگا تھا۔ ویسے بھی زندگی کا مقصد ختم ہی ہوچکا تھا۔ اب مزید زندہ رہ کر اپنی جان کو تکلیف دینا بے کار تھا۔ مشن کی ہامی بھرتے ہی میری تیاری پر خصوصی توجہ دی جانی لگے۔ میں نے اپنے گھر والوں کو کچھ کہے بنا ہی اپنا سامان اٹھایا اور ہمیشہ کے لئے دفتر آگیا۔ دفتر میں روزانہ مختلف پہلوؤں پر مجھے ٹریننگ دی جاتی۔ اسلحہ کی ٹریننگ تو میں نے کشمیر میں برسرپیکار ایک جہادی تنظیم کے ساتھ کرچکا تھا۔ انہوں نے اب فدائی کارروائی کی ٹریننگ مجھے دینی شروع کردی۔ فدائی کارروائی جسے عام لفظوں میں میڈیا والے خودکش حملہ آور ہمارے دیگر مذہبی جماعت والے اسے خودکشی کہتے ہیں۔ فدائی کارروائی کہاں کرنی تھی اور کب کرنی تھی یہ مجھے بعد میں سمجھایا جانا تھا۔ اس کے لئے باقاعدہ طور پر نقشوں اور گوگل سرچ کے ذریعے مجھے حملے کی جگہ کے بارے میں بتایا جانا تھا۔

......☆☆☆......

امیر صاحب کی جانب سے حتمی فیصلہ آنے کے بعد میری تربیت کا دوسرا اور آخری مرحلہ شروع ہوگیا۔ مجھے نقشوں اور جدید سائنسی ٹیکنالوجی سے لیس ہتھیاروں کے متعلق بتایا گیا۔ یہ ساری تربیت خود امیر صاحب کی زیر

نگرانی مجھے ایک ماہر استاد دے رہے تھے۔ استاد کے بارے میں مجھے صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ وہ باہر ملک سے ٹریننگ کے لئے یہاں پر آتے ہیں۔ ان کی اردو اس قدر عمدہ تھی کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ باہر کے کسی ملک سے آئے ہیں۔ ان کی باتوں کی مٹھاس اور گفتگو کا انداز ایسا تھا کہ جو زبان سے نکلتے ہی سیدھا دل میں اتر جاتا تھا۔ ایک ایک لفظ موتی کی مانند ہوتا تھا۔ ان کی باتیں سننے والا ایک لمحے کے لئے اپنے ہوش بھول بیٹھتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ مجھے ان کی باتیں بھی متاثر کن لگیں۔ انہوں نے مجھے اپنے خاص کمرے میں بلایا۔ وہاں پر انہوں نے مجھے میرے مشن سے متعلق کچھ خاص آگاہی کی اور پھر میری تیاری کے حوالے سے گہرے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے امیر صاحب کے حوالے کردیا۔ مجھے کمپیوٹر سے لے کر جدید ترین اسلحہ جس میں دستی بم، راکٹ لانچر کچھ دیگر چیزیں شامل تھیں سب پڑھائی گئیں تھیں۔ ٹریننگ کا یہ مرحلہ انتہائی محتاط انداز میں طے پایا تھا۔ استاد کے ساتھ ساتھ امیر صاحب بھی میری کارکردگی سے کافی مطمئن تھے۔ انہیں پورا یقین تھا کہ مجھے جس مشن پر بھیجا جارہا ہے میں اس میں ضرور کامیاب ہوکر آؤں گا۔

......☆☆☆......

سردیوں کے دن تھے اور موسم انتہائی خشک اور ٹھنڈا ہورہا تھا۔ سردی کے مارے ہمارے دانت تک بجنے لگے تھے۔ میرے ساتھ تین اور لڑکے بھی تھے ہمیں گاڑی سے اتار کر ایک ہوٹل میں پہنچادیا گیا۔ وہاں پر ہمارے ناشتے کھانے کا اہتمام کردیا گیا تھا۔ سردی کی وجہ سے وہاں پر گرم ہیٹر بھی لگایا گیا تھا جس کی وجہ سے کمرے کا موسم بہت اچھا تھا۔ وہاں سے میں نے ان تینوں لڑکوں کو مختلف مقامات پر پہنچانا اور انہیں کام سمجھانا تھا۔ وہ تینوں مجھے کمانڈر کے نام سے پکار رہے تھے تاہم مجھے یہ لفظ اپنے لیے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ تین لڑکوں کا مطلب تھا تین جان لیوا حملہ آور۔ جس کا واضح معنی تھا کہ تین جگہوں پر ایک خطرناک حملہ ہونا تھا۔ جس حملے کے نتیجے میں سرکاری ادارے کو اچھا خاصا نقصان پہنچانا تھا۔ میرے اوپر کی جانے والی ایک عرصے کی انتھک محنت کا مطلب آج مجھے معلوم ہورہا تھا۔ مجھے یہ اندازہ بھی آج ہورہا تھا کہ میں اپنی تنظیم کے لئے کس قدر اہم ہوگیا ہوں۔ ہمیں جن مقامات پر حملے کا مشن دیا گیا تھا ان میں ایک مذہبی جماعت کے جلسے کا اسٹیج تھا، بیرونی گیٹ اور قریبی اسپتال شامل تھے۔ امیر کا کہنا تھا کہ یہ جماعت شرک و بدعت کو ترویج دے رہی ہے لہٰذا ان کو ختم کرنا ہمارے اوپر فرض ہے۔ تاہم ان کو سیکورٹی مہیا کرنے والے بھی ہم میں سے نہیں ہیں۔ ان مقامات پر حملہ میرا کام تھا ان تین لڑکوں کو ٹارگٹ کی جگہ پر بٹھانا ان کو حملے کے لئے دھماکا خیز مواد مہیا کرنا اور دیگر ضروری ہدایات دے کر وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک الگ روپ میں ان کی نگرانی کرنا۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ مجھ پر بھی مسلسل تنظیم کی جانب سے سخت نگرانی کی جارہی تھی۔

......☆☆☆......

تنظیم کے کارندے میری ہر نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ یہ اندازہ بھی مجھے حملے سے چند منٹ قبل ہی ہوگیا تھا اور میری حیرت میں تو اس وقت اور بھی اضافہ ہوگیا جب میں نے ایک اہلکار کو خود اس مشن کا حصہ پایا۔ اس حملے کے وقت مجھے ایک لمحے کے لئے تو یوں لگا جیسے میں بہت غلط کام کررہا ہوں۔ اپنے ملک کے ساتھ غداری کررہا ہوں تاہم اس لمحے مجھے امیر کی نصیحتیں یاد آگئیں جو انہوں نے کی تھیں کہ اس قسم کی باتیں شیطان کی جانب سے وسوسے ہوتے ہیں جو یہ چاہ رہا ہوتا ہے کہ کوئی اللہ کی راہ میں جہاد کرکے شہادت کے اعلیٰ مرتبے کو نہ پاسکے۔ وہ وقت ایسا تھا کہ جب میں دل میں پیدا ہونے والے اس خیال کے درمیان یہ فرق نہیں کرپایا کہ آیا یہ شیطانی وسوسہ ہے یا ضمیر کی آواز۔ بے گناہوں کا لہو بہانا جہاد ہے یا پھر گناہ کبیرہ۔ تاہم اس وقت صرف مشن پر مکمل توجہ تھی۔ میں اپنے ماتحت لڑکوں کو ہوٹل بیٹھے ہی تمام تفصیلات بتائیں۔ حملے کے مقام کو ہم ہوٹل کی گیلری سے ہی باخوبی دیکھ سکتے تھے۔ ہم نے ان جگہوں کا مکمل تعین کیا اور پھر دھماکا خیز مواد کی تیاری میں لگ گئے۔

......☆☆☆......

تینوں لڑکوں کو وہ پیک دے کر روانہ کرتے ہوئے دل

سے دعا نکلی یا اللہ اگر ہم حق پر ہیں تو ہمیں کامیابی عطا کرنا اور اگر ہم ناحق ہیں تو ہمیں راہ حق دکھا دے۔ لڑکوں کو روانہ کر کے ایک عجیب سی بے چینی دل میں انگڑائیاں لینے لگی تھی۔ ہزار قسم کے عجیب و غریب وسوسوں نے اس سارے مشن کو غلط قرار دینا شروع کر دیا۔ اضطرار تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ بالآخر میں نے تہیہ کیا اور وضو کر کے مصلہ بچھایا اور دو رکعت نماز ادا کی۔ اس کے بعد اللہ کے حضور سچے دل سے دعا کی اور استخارہ کیا۔ استخارہ کے یہ الفاظ جب میرے ہونٹوں پر آئے، جن کا ترجمہ ہے ”اے اللہ! تو تو جانتا ہے کہ اگر میرا یہ کام میرے دین، میری معیشت اور میری آخرت کے انجام کے لئے بہتر ہے تو تو اسے میرے مقدر میں لکھ دے اور اسے آسان کر دے اور اس میں برکت عطا کر دے۔ اے اللہ تو جانتا ہے کہ اگر میرا یہ کام میرے دین، میری معیشت اور میرے آخرت کے انجام کے لئے بہتر نہیں ہے تو (اے اللہ) تو اسے مجھ سے ہٹا دے اور مجھے اس سے ہٹا دے۔“ دعا کے بعد مجھے ایسے لگا جیسے میں کچھ بہت غلط کرنے جا رہا ہوں۔ میرا اندر ہی اندر بہت کانپ رہا تھا اور بے چینی سی تھی جو مجھے ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھی۔

......☆☆☆......

میں نے خیالوں ہی خیالوں میں سب سے نظریں چرا کر ایک نمبر ڈائل کیا اور مذکورہ بم دھماکوں کے سلسلے میں پولیس کو آگاہ کر دیا۔ انہیں یہ بھی بتا دیا کہ وہ بم کہاں کہاں رکھے جائیں گے تاہم وہ خبر میں نے بہت ہی محتاط انداز میں دی تھی تاکہ پولیس مجھ تک نہ پہنچ پائے۔ پولیس نے فوری طور پر ایکشن لیتے ہوئے تین میں سے دو بموں کو ڈیفیوز کر دیا تاہم جلسہ گاہ کے اندر والے بم تک پولیس پہنچنے میں ناکام ہو گئی اور وہ بم پھٹ گیا۔ ایک زوردار دھماکا ہوا اور فضا دھوئیں کے علاوہ خون اور انسانی جسم کے لوتھڑوں سے اٹ گئی۔ دھماکے کے بعد ایک، بلا دینے والی چیخ و پکار شروع ہو گئی جسے دیکھ کر کلیجہ منہ کو آنے لگتا تھا۔ مجھے اس دھماکے کا بہت شدت سے احساس ہو رہا تھا اور اس کا ذمہ دار بھی میں خود کو سمجھ رہا تھا۔ مجھے اس کے پھٹنے کے بعد اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کام نہ صرف غلط ہے بلکہ شاید اس سے

یادیں

+ یہی بس مشکل ہے بھول جانا انسان کے بس میں نہیں جو حادثہ ایک دفعہ گزر جائے وہ یاد بن کے بار بار گزرتا ہے۔ بھولنے کی کوشش ہی اسے زندہ رکھتی ہے انسان ظالم کو معاف کر سکتا ہے لیکن اس کے ظلم کو نہیں بھول سکتا' بھول جانا انسان کے اختیار میں نہیں۔

+ موسم گزر جاتا ہے مگر یاد نہیں گزرتی' مرحوم زمانوں کی یاد مرحوم نہیں ہوتی۔ پرانے چہرے نئے چہروں میں نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ پرانے غم نئے غم میں شامل نظر آتے ہیں۔

+ پرانی یادیں زندگی کے ساتھ چلتی ہے تہہ در تہہ یاد انسان کے اندر ہمیشہ محفوظ رہتی ہے یادوں سے نجات کی کوشش دلدل سے نجات کی کوشش کی طرح رائیگاں جاتی ہے۔

(واصف علی واصف کی کتاب ”دل دریا سمندر“ سے اقتباس)

صدف مختار...... بوسال منصورہ

غروب ہونا ہے تمہیں بھی

+ کبھی کبھی انسان کسی اپنے کو دکھ دے کر سکون محسوس کرتا ہے ایسا وہ بدلے کی آگ میں کرتا ہے لیکن اس کا یہ عمل بعض اوقات دکھ سہنے والے کو اپنے پروردگار سے قریب تر کر دیتا ہے اور اسے جہنم سے قریب کرنے میں اس کے بدلے کا ہاتھ شامل ہوتا ہے۔ آنکھیں بند کر لینے سے جس طرح دنیا کی رنگینیاں نہیں اوجھل ہو جاتی ہیں' بالکل اسی طرح مرنے کے بعد حساب اس دنیاوی اندھیرے سے بھی بدتر دکھائی دے گا۔ نکل کی چاہ ہم انسانوں کے آج کو تو تاریکی کی طرف دھکیل ہی رہی ہے اس کے ساتھ ساتھ سفر آخرت کے دیئے بھی بجھائی جا رہی ہے۔ دنیا کی رنگینیاں فریب ہیں' آخرت اور قبر کو روشن کرنے والے عمل کریں جن کا اجر مرنے کے بعد ملے گا۔

+ سورج اپنے مقررہ وقت پر طلوع و غروب ہوتا ہے' انسان بھی اسی طرح ایک دن غروب کی جانب سفر کرتا ہے' فرق صرف اتنا ہے سورج پھر سے اگلی صبح طلوع ہوتا ہے جب کہ انسان قیامت کے روز حاضر کیا جائے گا' سورج جو نظام کائنات میں اہم فریضہ سرانجام دیتا ہے غروب ہوتے وقت اس کا پیغام یہی ہوتا ہے ”غروب ہونا ہے تمہیں بھی ایک دن۔“

شازیہ فاروق احمد...... خان بیلہ

ہمیں جنت کبھی نہیں ملے گی۔ عام معصوم انسانوں کو قتل کرنے سے جنت نہیں ملتی بلکہ جنت تو انسانیت کو بچانے میں ہے۔ نہ جانے ہماری نوجوان نسل کو جہاد کے نام پر اپنے ہی ملک میں اپنے ہی مسلمانوں کو قتل کر کے جنت و جہنم کے فیصلے کیسے کر دیے جاتے ہیں۔

......☆☆☆......

اس دھماکے کے بعد میرے دماغ نے کام کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ مجھے ہر وقت ان معصوموں کی اموات کا احساس ہی نہیں جینے دے رہا تھا۔ پولیس نے اس دھماکے بعد مجھے اور میرے تین ساتھیوں کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی تاہم پولیس کو بم کے چند ٹکڑوں کے علاوہ کچھ بھی نہ مل سکا اور اگر کسی کے ہاتھ کوئی اہم سراغ لگا بھی تو تنظیم کے اندر کے لوگوں نے وہ بہت ہی ہوشیاری سے مٹا دیا تھا۔ اس دھماکے کے علاوہ دیگر دو دھماکوں کے پولیس کو اطلاع پر تنظیم کافی برہم تھی۔ اندر ہی اندر تنظیم میں بھی چہ مگوئیاں شروع ہوگئی تھیں اور تاہم کسی کو میرے اوپر ذرہ برابر بھی شک نہیں گیا تھا۔ کیوں کہ ان کے مطابق میں ہر وقت ان کی کڑی نگرانی میں تھا اور میں نے کوئی ایسی مشکوک حرکت نہیں کی تھی۔ اب میں ان کے اس اعتماد کا فائدہ اٹھا رہا تھا اور ان کے نیٹ ورک کے خلاف عملی اقدام کا سوچ رہا تھا۔ مگر مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ پولیس میں کچھ اہم سینئرز بھی ان کے اپنے بندے ہیں جو ان دھماکوں میں مکمل طور پر ملوث ہیں۔ ان کی شہہ پر بھی یہ خون ریزی اور قتل عام کیا جارہا تھا۔ کچھ دن تنظیم ان دھماکوں پر بحث و مباحثہ کرتی رہی اور پھر رفتہ رفتہ حالات روٹین پر آنے لگے۔ مگر ابھی تک یہ بات کہی جارہی تھی کہ امیر صاحب نے آکر اس مشن کے حوالے سے رپورٹ لینی ہے اور اس میں ان دھماکوں کے نہ ہونے کے حوالے سے باز پرس ہوسکتی ہے۔

......☆☆☆......

امیر صاحب نے آتے ہیں سب کو بلا لیا اور مشن کے حوالے سے سوالات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس دوران امیر صاحب نے اپنی باتوں کے دوران بائی کمان کا تذکرہ بھی کیا انہیں کیا جواب دیا جانے اب کہ ہم کیسے پولیس کے ہاتھ لگے۔ بائی کمان کو میں نہیں جانتا تھا کہ امیر کا بائی کمان سے کیا مطلب تھا۔ تاہم وہ بائی کمان کی بات کرتے وقت کافی پریشان سے دکھائی دینے لگتے تھے۔ خیر انہوں نے بات کو ختم کرتے ہوئے ایک اور مشن کے حوالے سے بھی بات کی۔ مجھے الگ سے بلا کر کارروائی کی شاباش بھی دی۔ اس دوران میں نے ان سے بائی کمان سے متعلق سوال کیا تو وہ کہنے لگے ہمارے کچھ مہربان جو ہمیں فنڈز جاری کرتے ہیں انہیں ہم بائی کمان کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جبکہ انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ وہ مہربان کہاں کے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ کچھ روز رہنے کے بعد امیر صاحب نے مجھے اور دو اور لڑکوں کو دوسرے افراد سے باخبر رہنے کا کہا اور چل دیے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ کافی فکرمند تھے اور ان کی یہ فکر ہونی بھی چاہیے کیوں کہ ایک چھوٹی سی غلطی سے پوری کی پوری تنظیم کا تختہ الٹ جانا تھا اور بھاری تعداد میں نقصان اٹھانا پڑ سکتا تھا۔

......☆☆☆......

میں اب ہر وقت یہ سوچ رہا تھا کہ اس تنظیم کو سیکورٹی اداروں کے حوالے کیسے کیا جائے اور اس میں مجھے خود کو مکھن سے بال کی طرح نکالنا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ مجھے کسی بھی کیس کا سامنا کرنا پڑے یا پھر میں کسی کی جانب سے پولیس کے لئے اہم گواہ بن کر پوری زندگی کورٹ کچہریوں کے چکر کاٹتا رہوں۔ ایک روز میری ایک پولیس اہلکار سے بس میں ملاقات ہوئی۔ باتوں ہی باتوں میں ہم نے ایک دوسرے سے اچھا تعلق بنا لیا۔ میرا تعلق بنانے کا مقصد یہ تھا کہ میں جان سکوں کہ ادارے میں کوئی ایسا اہم افسر ہے جس تک تنظیم کے متعلق رپورٹ پہنچائی جاسکے۔ پولیس اہلکار سے مجھے معلوم ہوا کہ شہر کے نئے ایس ایچ او ایک عظیم انسان ہیں اور وہ اس وقت جلسہ میں دھماکے کی مکمل تحقیقات کر رہے ہیں۔ میں نے ایک خفیہ مراسلہ ان کے نام لکھا اور ان کے گھر پہنچا دیا۔ اس مراسلے کے دوران میں نے ان سے اپنے حوالے کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ تاہم میں نے اپنے دوست پولیس اہلکار سے اس موضوع پر کچھ تذکرہ کیا تھا اور وہ بھی انہیں اعتماد میں لینے کے لئے۔ اس مراسلے کے بعد [illegible] تنظیم کے دفتر جانے سے پرہیز کرنا شروع کر دیا اور

بیماری کا بہانہ بنا کر ہمیشہ گھر میں رہنے لگا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد پولیس کی بھاری نفری نے تنظیم کے دفتر پر چھاپہ مار کارروائی کرتے ہوئے وہاں پر کام کرنے والے تمام افراد کو حراست میں لے لیا، جبکہ اس چھاپے کے دوران امیر صاحب بھی وہاں پر موجود تھے انہیں بھی پولیس نے گرفتار کرلیا۔ ایس ایچ او کی جانب سے اگلے روز اخبارات میں نامعلوم اطلاع دینے والے کے نام شکریہ کا پیغام جاری کیا گیا تھا۔ اس کارروائی کے بعد تنظیم کے دفتر کو سیل کر دیا گیا اور اس پر پولیس کی جانب سے کڑی نظر رکھی جانی لگی۔

......☆☆☆......

کچھ ہی روز بعد تفتیشی افسر نے بتایا کہ امیر صاحب کی تنظیم پاکستان میں تخریب کاری کی سنگین کارروائیوں میں ملوث ہے اور وہ مسلمان بھی نہیں بلکہ بیرونی آقاؤں کے فنڈ پر ایک ایجنٹ تھے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ انہیں فنڈز پاکستان اور اسلام مخالف ممالک کی جانب سے ملتے تھے اور اب ان کی گرفتاری کے بعد باقاعدہ طور پر اعلیٰ سطح پر رابطے بھی شروع ہوگئے ہیں۔ یہ باتیں مجھے میرے پولیس ملازم دوست سے معلوم ہوئی تھیں۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور اس سے پوچھا کہ پھر وہ جہاد کی باتیں اور جنت جہنم اور کافر مشرک وہ سب کیا تھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ تو سب ایک ڈھونگ ہے ایک ہتھیار ہے ہماری نوجوان نسل کو ورغلانے کا۔ اس کی ایک ایک بات میری حیرت میں اضافہ کرتی جاری تھی۔ نا جانے اب تک کتنے ایسے نوجوان تھے جو ان کی ان باتوں میں آ کر خود کو فدائی سمجھتے ہوئے خودکش دھماکے کر چکے تھے۔ میں تو سوچ سوچ کر گھبرا رہا تھا کہ میں بھی انہیں کا آلہ کار بن چکا تھا اور نا جانے اگر مجھے اللہ نے ہدایت نہ دی ہوتی تو میں بھی کسی بم دھماکے میں خود کو پھاڑ چکا ہوتا اور پھر اپنے اللہ کو کیا منہ دکھاتا۔ آیا میں ایک شہید ہوتا یا پھر ایک مجرم۔ میری حیرت ابھی باقی تھی میں نے ان سے مزید پوچھا تو اس کا مقصد کیا تھا، کیوں یہ بے گناہوں کو قتل کر دار ہے تھے انہیں اس سے کیا مفاد مل رہا تھا تو وہ بتانے لگے کہ یہ دراصل ایک سوچی سمجھی سازش کا حصہ ہے۔ ہمارے ملک میں ان لوگوں کو بھیجا جاتا ہے اور پھر ہمارے ان نوجوانوں کو یہ ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں جنہیں ہماری جہادی تنظیم کسی وجہ سے چھوڑ چکی ہوتی ہیں۔ یا وہ لڑکے جو جہاد کی مکمل ٹریننگ کر چکے ہوتے ہیں اور اسلحہ وغیرہ چلا لیتے ہیں اور وہ اب اپنی جماعت یا تنظیم سے متنفر ہو چکے ہوتے ہیں تو ایسے نوجوان ان کا بہترین شکار ہوتے ہیں۔ ان پر انہیں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی اور وہ سونے کے انڈے دینے والی مرغی ثابت ہوتے ہیں۔ کیوں کہ وہ جہاد کی آیات اور احادیث کو اچھے سے جانتے ہوتے ہیں اور پھر نئے لڑکوں کو تیار کرنے میں وہ بہترین معاون ثابت ہوتے ہیں۔ جب یہ ان لڑکوں کا برین واش کر لیتے ہیں تو ان میں موجود انتقام اور جہاد کے جذبے کا غلط استعمال کرتے ہوئے مذہبی جماعتوں، سیاسی پارٹیوں اور سرکاری اداروں کے خلاف کارروائیاں کرواتے ہیں۔ اس سے ملک میں خانہ جنگی کی فضا پیدا ہوتی اور فرقہ واریت کو ہوا ملتی ہے۔ انہوں نے مزید بتایا کہ اس سے ہم اپنے مسئلوں میں الجھ کر رہ جاتے ہیں اور عالم کفر کی جانب کوئی انگلی نہیں اٹھا پاتا اور وہ جو چاہیے، جیسے چاہیے اسلام کے خلاف اپنے پروپیگنڈے کرتے پھریں۔

......☆☆☆......

میں نے یہ سب سننے کے بعد اللہ کا لاکھ شکر ادا کیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بچالیا تھا۔ میرے ہاتھوں نادانستہ طور پر جو غلطی ہوئی تھی اس کا ازالہ کیسے ممکن تھا یہ تو مجھے معلوم نہیں تاہم اللہ تعالیٰ کی ذات غفور رحیم ہے وہ ضرور مجھے معاف کردے گی۔ جبکہ میں نے اس دہشت گرد تنظیم کو گرفتار کروانے کے بعد اپنے آپ میں اطمینان محسوس کیا۔ امیر صاحب کی تفتیش کے بعد پولیس میں موجود کالی بھیڑوں کو بھی دھرلیا گیا اور انہیں بھی حوالات میں بند کر کے دہشت گردی ایکٹ کے تحت مقدمہ درج کر دیا گیا تھا۔ اس سب کے بعد میرے دل میں انتقام کی آگ آج بھی موجود ہے، وہ انتقام جو تفتیش سے شروع ہوئی تھی جس کی وجہ سے میں نہ جانے کتنے سنگین جرائم کی دلدل میں دھنستے جارہا تھا۔ بلکہ اب وہ نفرت اور بھی بڑھ چکی ہے۔

قہقہہ

مہتاب خان

کچھ لوگوں کی فطرت ہوتی ہے کہ وہ حقائق سے آنکھیں چرا کر فیصلے کرتے ہیں اور پھر جب ہوش آتا ہے تو چڑیاں کھیت چگ چکی ہوتی ہیں۔

ایک بڑے میاں کا قصہ اس نے آخری عمر میں اک انوکھا فیصلہ کیا تھا

لکی اسٹار نامی یہ ریسٹوران اسلام آباد کے ایک گنجان آباد علاقے میں واقع تھا۔ بے حد صاف ستھرا رنگین شیشوں سے مزین یہاں کا عملہ بھی بڑا صاف ستھرا تھا۔ جب صبح سویرے حمد و تلاوت کے بعد ریسٹوران میں مدھم موسیقی کے ریکارڈ بجتے تو نوجوانوں کے گروہ بھی دوسرے ریسٹوران چھوڑ کر یہاں کرسیاں توڑتے رہتے۔ دن بھر چائے چلتی رہتی تھی خاص طور پر شام کے بعد تو اس ریسٹوران میں تل دھرنے کو جگہ نہیں بچتی تھی۔

ہوٹل کا مالک قیس اپنے نام کی طرح رنگین اور عاشق مزاج تھا اور اپنی زندگی کی پچاس بہاریں دیکھ چکا تھا۔ اس کا تعلق وزیرستان سے تھا جن دنوں وطن عزیز کے بہادر فوجی دہشت گردوں کے خلاف وزیرستان میں کارروائیاں کر رہے تھے ان ہی دنوں ایک ڈرون حملے میں وہ اپنے بیوی اور بچوں کو گنوا چکا تھا۔ کہتے ہیں کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتے ہیں اسی طرح قیس کی فیملی بھی ختم ہوگئی تھی پھر قیس کا وہاں دل نہیں لگا وہ اپنی تمام آبائی زمین فروخت کرکے اور تمام جمع پونجی لے کر اسلام آباد آ گیا اور یہاں ریسٹوران کھول لیا۔ اللہ نے برکت دی اور اس کا ریسٹوران خوب چلنے لگا کچھ عرصے بعد اس نے ریسٹوران کے ساتھ بیکری بھی کھول لی بیکری کا مشورہ اسے برابر میں واقع میڈیکل اسٹور والے حاجی صاحب نے دیا تھا۔ حاجی صاحب یہاں اس کے واحد دوست تھے کیونکہ آس پاس کوئی بیکری نہیں تھی اس لیے اس کی بیکری بھی چل رہی تھی۔

قیس بھی سویرے ہوٹل کھولنے پہنچ جاتا تھا جہاں ولی اس سے پہلے وہاں موجود ہوتا تھا کیونکہ وہ ہوٹل میں ہی رہتا تھا۔ یہ خصوصی اجازت قیس نے اسے دی تھی ولی کا تعلق پشاور سے تھا اور وہ اسلام آباد روزگار کی غرض سے آیا تھا۔ یہاں اس کی رہائش کے لیے کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس کی درخواست پر قیس نے اسے ہوٹل میں رہنے کی اجازت دے دی تھی۔

صبح ہوٹل کا دروازہ کھلتے ہی ولی سب سے پہلے ہوٹل کے فرش کو دھوتا اور دوسرے بیروں کی مدد سے تمام شیشوں کو رگڑ رگڑ کر صاف کرواتا تھا۔ اتنی دیر میں قیس تلاوت کلام پاک اور دعا سے فارغ ہو کر کاؤنٹر سنبھال چکا ہوتا تھا پھر ولی قیس کی اجازت سے صبح ناشتے کی تیاری کے دوران اپنی پسند کے گانے لگاتا رہتا تھا کچھ ہی دیر میں دودھ والا دودھ دے جاتا اور بیکری کا سامان لانے والی گاڑی بھی پہنچ جاتی اور اس سے انڈے ڈبل روٹی مکھن کی ٹکیاں شیرمال اور بن وغیرہ اتارے جاتے تھے کچھ ہی دیر میں ہوٹل کی فضا چائے کی سوندھی سوندھی خوشبو سے مہکنے لگتی تھی اور آس پاس رہنے والے مکین ناشتے کی مزیداری اور ایک پرلطف ناشتے

کا مزہ لینے کے لیے ہوٹل کے دروازے سے اندر داخل ہونے لگتے تھے۔

قیس اپنے چہرے پر خوش اخلاق مسکراہٹ سجانے ان سب کا استقبال کرتا تھا اور یوں ایک خوشگوار دن کا آغاز ہو جاتا تھا۔ آس پاس کے رہائشی علاقے کے کچھ بوڑھے ہوٹل میں آکر بیٹھ جاتے اور کئی کئی کپ چائے انڈیل جاتے ساتھ پرانے گانے بھی چل رہے ہوتے تھے اسی ہنگامے میں صبح ڈھل جاتی اور دوپہر کے کھانے کا وقت ہو جاتا تھا۔ نرم گرم نان اور انواع واقسام کے کھانوں کبابوں اور چاولوں کی پلیٹیں میزوں پر سجنے لگتی تھیں۔

اس ہوٹل میں علاقے کے باقی ہوٹلوں کے مقابلے میں بڑا رش ہوتا تھا وجہ تھی یہاں کا لذیذ کھانا اور صفائی۔ قیس ان چیزوں کا بڑا خیال رکھا کرتا تھا کچھ دیر بعد شام کی چائے کا وقت ہونے لگتا اور شام تک ہوٹل کی خالی کرسیاں آس پاس کے من چلے نوجوانوں کی ٹولیوں سے بھر جاتی تھیں اس میں کچھ ہاتھ لکی اسٹار کی مزیدار چائے اور ماحول کا تھا تو کافی زیادہ ہاتھ اس حسین ومہ جبین کا بھی تھا جو تقریباً روز شام کو ناشتے کا سامان لینے آتی تھی وہ چند دنوں سے وہاں آنے لگی تھی اس لڑکی کا خاندان چند دن پہلے ہی ہوٹل کی پچھلی گلی میں قیام پذیر ہوا تھا۔

وہ لڑکی انتہائی خوبصورت تھی بڑی سی کالی چادر میں لپٹا ہوا اس کا وجود جہاں جہاں جھلک دکھاتا تھا دمکتا تھا اس کی روشن چمکدار آنکھوں میں بے پناہ کشش تھی۔ شروع شروع میں وہ اپنی پکی عمر کی ماں اور ایک چھوٹے سے بچے کا ہاتھ تھامے یہاں آتی تھی قیس کے دل کی دھڑکنیں تو اسی روز اتھل پتھل ہوگئی تھیں جس دن پہلی بار اس نے سیاہ چادر میں سے دمکتے اس کے چہرے کو دیکھا تھا۔ اس کی ماں نے قیس سے اپنی ٹوٹی پھوٹی آواز میں ناشتے کی فرمائش کی تو قیس نے پوچھا۔

''آپ یہاں کی مقامی تو نہیں لگتیں کہاں سے تعلق ہے آپ کا؟'' اور جب لڑکی کی ماں نے یہ بتایا کہ اس کا تعلق وزیرستان کے قریب واقع کسی گاؤں سے ہے تو قیس خوشی سے اچھل پڑا۔

اس نے اپنی آبائی زبان میں انہیں اطلاع دی کہ اس کا تعلق بھی اسی کے علاقے سے ہے۔ وہ اس سے اپنی زبان میں بات کر سکتی ہے۔ لڑکی کی ماں نے بہت دنوں بعد اپنی مادری زبان سنی تو وہ بھی اپنے آنسو نہ روک سکی۔ بس پھر کیا تھا ذرا سی ہی دیر میں تکلف کے سارے پردے اٹھ گئے اور قیس نے تو مہمان نوازی کی انتہا کر دی۔ اس نے ماں بیٹی سے سامان کی قیمت وصول کرنے سے صاف انکار کر دیا ماں نہ نہ ہی کرتی رہ گئی لیکن قیس نہ مانا بلکہ بہت سی کھانے پینے کی اشیاء شاپر میں رکھوا دیں۔

لڑکی کی آنکھوں میں شکریے اور احسان مندی کی ایک جھلک نے ہی قیس کو نہال کر دیا۔ پھر یوں ہوا کہ وہ روز شام

کو آنے لگی وہ یہاں بے ناشتہ لینے آتی تھی۔ جب وہ ہوٹل کے ہال میں داخل ہوتی تو بہت سوں کی دھڑکنیں تہہ و بالا ہوجاتی تھیں۔ بوڑھے کھنکار کر خاموش ہوجاتے تھے نوجوانوں کی سانسیں تیز ہوجاتیں اور سارے ماحول پر ایک رنگینی سی چھا جاتی تھی روز شام کو سب سراپا انتظار ہوتے تھے اور جب تک وہ وہاں سے ہوکر واپس نہ چلی جاتی تب تک ہوٹل کی فضا پر ایک عجیب سی بے چینی طاری رہتی تھی جب وہ آ کر چلی جاتی تو سب ہی کو اپنے بھولے ہوئے کام یاد آنے لگتے تھے۔

پچاس پچپن سالہ قیس کو بھی اسے دیکھ کر جوانی کے سہانے دن یاد آنے لگے تھے جس لمحے وہ وہاں اپنا پہلا قدم دھرتی تھی ٹھیک اسی گھڑی اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوجاتی تھیں کچھ ایسا ہی حال اس خوبرو نوجوان ولی کا بھی تھا مگر قیس اب ایسے موقع پر اسے کاؤنٹر کے گرد پھٹکنے بھی نہیں دیتا تھا۔ شاید اسے بھی ولی کی آنکھوں میں چمکتی وہ چمک نظر آ گئی تھی جو آگے چل کر اسے رقیب ثابت کرسکتی تھی۔

قیس نے سوچ لیا تھا کہ موقع ملتے ہی اپنے دل کی بات وہ اس سے کہہ دے گا۔ اس کی صحت اس عمر میں بھی قابل رشک تھی اس کے علاوہ ایک بہترین چلتا ہوا کاروبار اور ایک بڑے بینک بیلنس کا تن تنہا اور بلا شرکت غیرے مالک تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی درخواست رد نہیں کی جائے گی۔

پھر ایک روز اس نے موقع پا کر تنہائی میں اس لڑکی سے اس کی ماں کا حال احوال پوچھنے کے بہانے اس کا نام بھی پوچھ لیا لڑکی شرما گئی پھر کچھ دیر ٹھہر کر بولی۔

''پری زاد۔''

''بہت پیارا نام ہے۔'' ہاں اس پری وش کا کچھ ایسا ہی نام ہونا چاہیے تھا اس نے سوچا۔

اب قیس گاہے بگاہے پری زاد سے اس کی ماں گل بی بی کا حال احوال پوچھنے کے بہانے سے بات چیت کا سلسلہ بڑھانے لگا تھا۔ پری زاد جب بھی سر جھکائے قیس کے سوالوں کے جواب دیتی تو دور کھڑے کسی کام میں مصروفیت کا دکھاوا کرتے ولی کے سینے پر سانپ لوٹ جاتے تھے وہ دل ہی دل میں اپنی غربت کو کوستا تھا اور راتوں رات مجرا امیر ہونے کے منصوبے بناتا رہتا تھا وہ ابھی نوجوان تھا۔ خوبرو تھا کیا ہوا اگر غریب تھا۔

خود اسے کئی بار شبہ ہوا تھا کہ پری زاد اس کی جانب دیکھ کر مسکرائی تھی مگر قیس کی سخت گیر نگاہیں کبھی ولی کو جی بھر کے پری زاد کو دیکھنے نہیں دیتی تھیں۔ قیس زیادہ تر شام کو جب پری زاد کے آنے کا ٹائم ہوتا تھا ولی کو کسی نہ کسی کام سے باہر بھیج دیتا تھا۔ اس کا یہ عمل ولی کے لیے کسی تازیانے سے کم نہیں تھا۔ اسے احساس ہو چکا تھا کہ قیس اسے کسی بھی طور پر پری زاد سے دور رکھنا چاہتا تھا۔

اس روز اتفاق سے قیس کو کسی ضروری کام سے جانا پڑ گیا تھا۔ ولی دوپہر ہونے کے بعد گڑگڑا کر خدا سے دعا کرنے لگا کہ کسی بہانے قیس کی واپسی میں اتنی تاخیر ہوجائے کہ وہ پری زاد سے بات کر سکے۔ پری زاد اپنے وقت پر سیاہ چادر میں لپٹی اندر داخل ہوئی تو ولی کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں اور نظریں اس کے حسین سراپا پر جم کر رہ گئیں۔ اس نے اپنی گھنیری پلکیں اٹھائیں ولی اس کی جھیل جیسی آنکھوں میں ڈوب سا گیا۔

''کیا آج قیس صاحب نہیں ہیں؟'' ولی کے کانوں میں گھنٹیاں سی بجیں۔

''نہیں وہ کسی ضروری کام سے باہر گئے ہیں۔'' پری زاد نے پلکیں جھپکیں۔

''اوہ اچھا دودھ ڈبل روٹی اور مکھن بھی دے دیں۔''

ولی نے کسی خواب سے چونک کر جلدی جلدی ناشتے کا سامان شاپر میں ڈال کر اسے دیا۔ پری زاد نے پیسے ولی کے سامنے کاؤنٹر پر رکھے اور جانے کے لیے پلٹی۔ ولی نے ایک لمحہ سوچے بغیر فیصلہ کن لہجہ میں اسے آواز دی۔

''سنیں۔'' پری زاد نے پلٹ کر ولی کو دیکھا۔

ہنر سیکھنے کی ترغیب

ایک دانش مند اپنے بیٹوں کو نصیحت کر رہا تھا کہ اے پیارے بچو! ہنر سیکھو اپنے اندر کوئی کمال پیدا کرو اس لیے کہ دنیا کا ہر ملک اور دولت اعتماد کے قابل نہیں اور مال و دولت ہر وقت خطرہ میں ہیں یا چور ایک ہی دفعہ میں چرا لے جائے گا یا مال والا اپنا مال تھوڑا تھوڑا کر کے کھا جائے گا لیکن ہنر ایک جاری اُبلنے والا چشمہ ہے اور ہمیشہ کی دولت ہے اگر ہنر والا غریب ہو جائے تو کوئی غم کی بات نہیں اس لیے کہ ہنر اس کی ذات میں ایک دولت ہے وہ جہاں جائے گا روزی اور عزت پائے گا۔

(گلستان ص ۱۸۳)

(مرسلہ: جاوید اختر......بھکر)

سب سے بڑی طاقت

اخلاق ایک طاقت ہے بلکہ اخلاق سب سے بڑی طاقت ہے ایک اچھا سلوک دشمن کو دوست بنا سکتا ہے۔ ایک میٹھا بول ایک سرکش آدمی سے اس کی سرکشی چھین سکتا ہے۔ ایک ہمدردانہ برتاؤ ایک ایسے جھگڑے کو ختم کر سکتا ہے جس کو ختم کرنے کے لیے لاٹھی اور گولی کی طاقت ناکام ہو یہی وہ بات ہے جو قرآن میں ان لفظوں میں بتائی گئی ہے۔

''اور نیکی اور بدی برابر نہیں ہو سکتی تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی وہ ایسا ہو گیا ہے جیسے کوئی دوست قرابت والا۔''

اسلام میں تالیف قلب کا اصول بھی اخلاق سے تعلق رکھتا ہے۔ قرآن میں زکواۃ کی رقم کی کئی مدیں بتائی گئی ہیں ان میں سے ایک خاص مد تالیف قلب کی ہے اس مد کے تحت ان لوگوں کی مالی اعانت کی جاتی ہے۔ جن کے دل اسلام کے لیے نرم کرنا مطلوب ہوں اس اصول کے تحت رسول نے عرب کے متعدد سرکش سرداروں کو رقمیں دیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد وہ لوگ بالکل ٹھنڈے پڑ گئے اسلام کی یہ تعلیم اس بات کی ایک کھلی تصدیق ہے کہ اللہ نے اخلاق کے اندر زبردست تسخیری طاقت رکھی ہے۔

مرسلہ: عبید یوسف......کراچی

ایمان کے ساتھ عمل

ایک دفعہ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایمان کے ساتھ کوئی عمل بتائیے فرمایا۔ ''جو اللہ تعالیٰ نے دی ہے اس میں سے دوسروں کو دے۔'' عرض کیا اگر وہ ضعیف ہو کر مدد کی قوت نہ رکھتا ہو فرمایا۔ ''جس کو کوئی کام کرنا نہ آتا ہو اس کا کام کر دے۔'' عرض کیا اگر وہ خود بھی ایسا ہی ناکارہ ہو فرمایا۔ ''اپنی ایذا رسانی سے لوگوں کو بچائے رکھے۔

(مستدرک حاکم۔ سیرۃ النبیؐ)

انتخاب: اسد علی......گجرات

"اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔"
"جی بولیں۔" وہ الجھن آمیز نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
"دراصل روز آپ کا یہاں آنا ٹھیک نہیں ہے یہاں کا ماحول اچھا نہیں ہے اور قیس صاحب۔" وہ اس کم عمر حسین لڑکی کو اپنے بوڑھے مالک سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ اسے بتانا چاہتا تھا کہ قیس کی نیت اس کے لیے ٹھیک نہیں ہے مگر وہ کھل کر کہہ نہیں سکا۔ اس کی بات عجیب بے ربط سی ہوگئی پھر کچھ دیر ٹھہر کر اس نے بات جوڑی۔
"اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں روزانہ شام کو کام سے فارغ ہونے کے بعد آپ کے ناشتے کا سامان خود آپ کے گھر پر پہنچا دیا کروں گا۔" پری زاد کے چہرے پر مسکراہٹ ابھر آئی۔
"بہت مہربانی آپ کی۔ ٹھیک ہے میں امی سے بات کرکے آپ کو بتا دوں گی۔ آپ کا بہت شکریہ۔" پری زاد نے مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھا تو وہ نہال ہوگیا۔ پری زاد کے جانے کے بعد وہ دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ آج اس کے چہرے پر عجیب سی چمک تھی۔ شام ڈھلے قیس بھی واپس آگیا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی اس روز ایک روشنی سی بکھری ہوئی تھی۔
اسی رات برابر میڈیکل اسٹور والے حاجی صاحب نے ولی کو بتایا تھا کہ قیس آج پری زاد کے گھر گیا تھا اور قیس کی واپسی میں تاخیر کی وجہ بھی یہی تھی۔ حاجی صاحب نے مزید بتایا کہ قیس نے پری زاد کی ماں کو دبے لفظوں میں پری زاد کے رشتے کا عندیہ بھی دیا ہے۔
ولی کی آنکھوں میں خون اتر آیا آج ہی تو اس نے پری زاد سے بات کی تھی۔ اسے یقین تھا کہ پری زاد کی ماں چاہے پری زاد کے رشتے کے لیے ہاں کردے لیکن وہ کبھی دل سے قیس کی نہیں ہو پائے گی۔ حاجی صاحب نے بتایا تھا کہ وہ بہت جلد پری زاد کے گھر باقاعدہ رشتہ لے کر جانے والا ہے۔
قیس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ پری زاد کے لیے قریب ہی کوئی مکان خرید لے گا اور جیسے ہی اس کی ماں رشتے کے لیے ہاں کرے گی وہ مکان کی چابیاں اس کے حوالے کردے گا اس سلسلے میں اس نے پراپرٹی ڈیلر سے بھی بات کرلی تھی۔ وہ اس کام میں مزید تاخیر کرنا نہیں چاہتا تھا۔
قیس اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ پری زاد ہال میں داخل ہوتی نظر آئی۔ آج وہ حد سے زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی پری زاد قیس کے سامنے آکر کھڑی ہوئی تو اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور لب کانپ رہے تھے۔
"قیس صاحب آپ کے ہمارے گھر پر پہلے ہی بہت احسان ہیں میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں۔" قیس کی سماعتوں میں رس گھل گیا۔
"نہیں نہیں اس میں بھلا شکریے کی کیا بات ہے میں نے جو بھی کیا اپنا فرض سمجھ کر کیا اور میں اب آپ کے خاندان کو اپنا ہی خاندان سمجھتا ہوں۔ اسی لیے تو کل......"
"جی جی۔" پری زاد نے اس کی بات کاٹی مجھے امی نے سب بتا دیا ہے کہ آپ نے کل دبے لفظوں میں ہمارے خاندان سے رشتہ جوڑنے کی بات کی ہے۔ میں اسی سلسلے میں یہاں آئی ہوں امی نے کہا ہے انہیں منظور ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ہم رات بھر آپس میں یہ ذکر کرتے رہے ہیں کہ آج کل کے اس دور میں آپ جیسا نیک اور شریف انسان بھلا کہاں ملتا ہے۔" وہ نظریں جھکائے اپنی دھن میں نہ جانے کیا کچھ کہتی رہی۔ قیس کا دل تو قلابازیاں کھا رہا تھا لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ یہ باتیں پری زاد کی ماں کو کرنی چاہیے تھیں بہرحال کچھ بھی تھا اس کے خواب حقیقت میں ڈھلنے والے تھے۔ خوشی اس کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔
"قیس صاحب! بس امی کی ایک ہی شرط ہے۔" اس نے لمحہ بھر کے لیے قیس کی طرف دیکھا دونوں کی نظریں ملی تھیں پہلے ہی وارفتہ نظروں سے دیکھ رہا تھا پری زاد نے پلکیں جھکائیں۔

''جی فرمایئے مجھے ان کی ہر شرط منظور ہے۔''
''امی نے کہا ہے کہ نکاح سادگی سے ہوگا آپ جمعہ کو نماز کے بعد گواہوں اور مولوی صاحب کو لے کر آ جائیے گا۔'' وہ گردن جھکائے کہہ رہی تھی۔
''ٹھیک ہے میں سارے انتظامات کرلوں گا۔'' قیس کا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا۔ پری زاد کے جانے کے بعد وہ فوراً ہی حاجی صاحب کی طرف دوڑا وقت بہت کم تھا جمعہ آنے میں دو ہی دن تو باقی تھے۔

وقت جیسے پر لگا کر اڑ رہا تھا۔ اس موقع پر حاجی صاحب قیس کے بڑے کام آئے۔ گواہوں اور نکاح پڑھانے کے لیے مولوی صاحب کا بندوبست بھی انہوں نے ہی کیا تھا۔ ولی یہ ساری تیاریاں دیکھ دیکھ کر کڑھ رہا تھا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کسی طرح اس نکاح کو رکوا دے۔ اسے پری زاد کی ماں پر بھی رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا جو لالچ میں آ کر اپنی پھول جیسی بچی قیس جیسے بوڑھے کے حوالے کررہی تھی۔ اس نے ٹھان لی تھی کہ وہ آخری وقت تک اس شادی کو رکوا کر رہے گا۔ وہ پری زاد پر یہ ظلم نہیں ہونے دے گا۔

آخر شادی کا دن آ پہنچا اور جمعہ کی نماز کے بعد قیس سادہ لیکن قیمتی لباس میں دولہا بنا بمعہ حاجی صاحب ولی اور گواہوں وغیرہ کے پری زاد کے گھر پہنچا۔

دروازے پر اس مختصر بارات کا استقبال ایک اجنبی نوجوان نے کیا تھا اور انہیں ساتھ لے کر ایک ہال نما کمرے میں بیٹھا دیا گیا تھا۔

کچھ دیر بعد پری زاد اور وہ نوجوان جس نے اس چھوٹے بچے کو گود میں اٹھایا ہوا تھا جو اکثر پری زاد کے ساتھ آیا کرتا تھا کسی بات پر ہنستے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے پری زاد کے موتیوں جیسے دانت چمک رہے تھے وہ دونوں آ کر مہمانوں کے ساتھ بیٹھ گئے۔

حاجی صاحب نے قیس کی طرف اور قیس نے حاجی صاحب حیران نظروں سے دیکھا۔

''بسم اللہ کریں مولوی صاحب۔'' نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا قیس بہت تذبذب میں تھا۔
''ایک منٹ۔'' آخر حاجی صاحب بولے۔
''آپ کی والدہ کہاں ہیں؟''
''وہ دوسرے کمرے میں ہیں۔'' پری زاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''یہ صاحب کون ہیں؟'' انہوں نے پری زاد سے اس اجنبی نوجوان کے بارے میں دریافت کیا۔
''یہ میرے شوہر ہیں اور یہ میرا بیٹا ہے۔'' جسے آج تک وہ لوگ پری زاد کا بھائی سمجھتے رہے وہ بچہ پری زاد کا بیٹا تھا۔
''یہ ملک سے باہر ہوتے ہیں کل ہی آئے ہیں۔ ہمارے گھر تو برسوں بعد ایک ساتھ بہت سی خوشیاں آ گئی ہیں۔ امی جان نے میرے لیے قربانیاں دی ہیں۔ ابو کے مرنے کے بعد انہوں نے میری خاطر دوسری شادی نہیں کی۔ تن تنہا میری پرورش کی پڑھایا لکھایا میری شادی کروائی۔ امی کے اس ایثار کا انعام رب العزت نے انہیں قیس صاحب جیسے نیک انسان کی صورت میں عطا کیا ہے۔ اب مجھے اپنے شوہر کے ساتھ ملک سے باہر جانا ہے۔ امی کا نکاح قیس صاحب سے ہو جائے گا تو مجھے بھی سکون ملے گا ورنہ وہاں میں امی کی طرف سے ہمیشہ فکر مند ہی رہتی۔ میرے شوہر بھی ہمارے اس فیصلے پر بڑے خوش ہیں۔'' اس نے مسکراتی نظروں سے اپنے شوہر کی سمت دیکھا۔

یہ سب سن کر قیس کے اندر بیک وقت کئی چھناکے ہوئے اسے ایک زوردار چکر آیا اور وہ وہیں فرش پر ڈھے گیا۔ ولی کا زوردار قہقہہ دیر تک ہال میں گونجتا رہا۔

جمہوری انقلاب

عارف شیخ

جنگل میں جمہوریت کا تماشہ، ایک خوب صورت علامتی کہانی۔ اس کہانی کا ہماری جمہوریت اور سیاستدانوں سے کوئی تعلق نہیں۔

یہ کہانی ایک ایسے جنگل کی تھی کہاں ہر طرح کے جانوروں کا بسیرا تھا لیکن اس جنگل کی انفرادیت یہ تھی کہ وہاں رہنے والے جانور قدرت کے اصول کے بجائے جو قدرت نے بنائے تھے بلکہ وہ انسانوں کی دنیا کے خود ساختہ رہنما اصول اپنے جنگل میں نافذ کرنا چاہتے تھے۔

یہ جانور شکار کی شکل میں ہونے والے انسانی ظلم سے اتنے خوف زدہ تھے کہ انہوں نے انسانوں کی طرح خود کو منتظم کرنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ جس طرح انسانوں نے طاقت اور ہوشیاری سے انسان کو طبقوں میں بانٹا ہے انہیں بھی اسی طرح کرنا چاہیے۔

آج سے کچھ عرصہ قبل اسی جنگل میں تمام جانوروں کے درمیان یہ فیصلہ ہوا تھا کہ وہ سب جانوروں کو ان کی طاقت اور ہوشیاری چالاکی کے حساب سے انسانی پیشوں میں تقسیم کریں گے۔ اور اس کے بعد پورے جنگل میں انسانی دنیا ہی کی طرح پورے جنگل میں جمہوریت نافذ کریں گے۔ ایک جانور ایک ووٹ کا اصول پہ سب جانور کاربند ہوں گے۔

چنانچہ فیصلہ ہوگیا۔ سب سے پہلے جانوروں کے درمیان یہ طے پایا کہ انسانی پیشوں پر جانوروں کو ان کی قدرتی صلاحیتوں کے اعتبار سے پکارا جائے۔

لومڑی نے ٹانگ اٹھائی۔

''انسانوں کے درمیان سب سے چالاک سیاست دان ہوتا ہے۔'' وہ بولی۔ ''اور میں کیونکہ جنگل میں چالاک لومڑی پہچانی جاتی ہوں لہذا مجھے سیاست دان پکارا جائے۔''

تمام جانوروں نے لومڑی کی اس تجویز کی حمایت کردی۔ چنانچہ چالاک لومڑی اب جنگل کی سیاست دان تھی۔

''میں بہادر ہوں سب مجھ سے ڈرتے ہیں۔ لہذا میں اس جنگل کا جنرل کہلاؤں گا۔'' شیر نے دہاڑ لگائی۔ پورے جنگل کی کیا مجال تھی کہ شیر کی مخالفت کرتا۔ فوراً شیر کو جنگل کا آرمی چیف تسلیم کرلیا گیا۔

جنگلی بھینسے نے آواز لگائی۔ ''میں کیا بنوں؟''

لومڑی کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔ ''تو بے چارہ غریب ہے چل تو کسان ہاری بن جا۔''

بھینسے کو معلوم تھا کہ اس سے زیادہ اس کی چلے گی نہیں لہذا وہ اپنے اس نام پر ہی خوش ہو کر بیٹھ گیا اور جگالی کرنے لگا۔

چیتا اپنی مخصوص غراہٹ سے سامنے آیا۔

''یاروں مجھے بھی کوئی نام دے دو۔ میں بھی رعب دار بن جاؤں۔'' وہ بولا۔

لومڑی نے فوراً شیر جنرل سے مشاورت کی پھر بولی۔

''تجھے پولیس کا عہدہ دیا جاتا ہے۔''

''یہ اچھا ہے۔'' چیتا خوش ہو کر بولا۔

''جنگل میں سب مجھ سے ڈریں گے۔''

''میں کیا بنوں؟'' یہ آواز جس طرف سے آئی تھی سب نے اس طرف دیکھا تو گدھا گھبرا گیا۔

''ابے تو گدھا ہے تجھے صرف بوجھ ہی اٹھانا ہے۔'' چیتا ہنس کر بولا۔

''تو پھر ٹھیک ہے گدھا مزدور ٹھہرا۔'' لومڑی نے کہا۔

گدھا بھی اپنے اس نام اور عہدے سے مطمئن ہو کر ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔

اس کے بعد زیبرا۔ زرافہ اور دوسرے جانوروں کو بھی چھوٹے چھوٹے انسانی عہدے اور نام دے دیئے گئے۔ ہاتھی اور گینڈے ذرا تگڑے تھے اس لیے انہیں سول سروس میں شامل کیا گیا۔

چالاک لومڑی جانتی تھی کہ وہ چالاک اور ہوشیار تو ہے لیکن اس کے پاس طاقت نہیں ہے۔ لہذا اس نے ایک علیحدہ اجلاس بلایا۔ جس میں اس کے علاوہ آرمی چیف شیر پولیس چیف چیتا ہاتھی اور گینڈے نے شرکت کی۔ لومڑی نے ان پانچوں کے درمیان بات کا آغاز کیا۔

''انسان اپنے لوگوں پر حکومت کرتے ہیں چالاکی ہوشیاری دماغ اور طاقت سے۔'' وہ دھیرے دھیرے سمجھانے کے انداز میں بات کر رہی تھی۔

''طاقت تم چاروں کے پاس ہے لیکن دماغ اور چالاکی صرف میرے پاس ہے۔''

''تم سمجھانا کیا چاہ رہی ہو؟'' شیر دہاڑا۔

''شیر کی دہاڑ سے لومڑی کا دل حلق میں آ جاتا تھا لیکن دہاڑنا شیر کی عادت تھی جسے وہ بدل نہیں سکتا تھا۔ لومڑی سنبھل کر بولی۔

''انسانوں میں جمہوریت بھی ہوتی ہے جس کی مدد سے وہ سب پر حاکم ہو جاتے ہیں۔''

لیعنی ہم میں سے ایک کو حاکم بنا ہے۔'' چیتا بولا۔

''بالکل ٹھیک سمجھے ہو۔'' لومڑی خوش ہوئی۔

''پھر تو میں طاقت ور ہوں مجھے حق حاصل ہے حکومت کرنے کا۔'' شیر نے سینہ تانا۔

ہاتھی نے سونڈ لہرائی تو شیر گھبرا کر پیچھے ہو گیا۔ گینڈا بھی شیر کی تجویز پر خوش نہیں تھا۔ لومڑی جو تمام صورت حال دیکھ رہی تھی۔

''حکمرانی میرے حصے میں آئے گی۔ کیونکہ سیاست دان حکمران ہوتا ہے جمہوریت میں۔'' وہ گویا ہوئی۔

''یہ کیا بات ہوئی......؟'' گینڈا بولا۔

''شاید سیاست دان ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' ہاتھی بولا۔

''کیسے ٹھیک کہہ رہی ہے؟'' شیر بولا۔

''ہم چاروں طاقت ور ہیں اور ایک دوسرے سے لڑ سکتے ہیں۔'' ہاتھی نے کہا۔

''پھر ہمارے پاس چالاکی ہوشیاری بھی نہیں ہے وہ تو سیاست دان ہی کے پاس ہوتی ہے۔''

''میں تو سیاست دان کے ساتھ ہوں۔'' چیتا نے جلدی سے حمایت کر دی۔

''میں بھی لومڑی کو حکمران مانتا ہوں۔'' ہاتھی نے کہا۔ شیر اور گینڈے نے بھی مجبوری میں یہ فیصلہ تسلیم کر لیا تھا۔ لومڑی بڑی چالاکی کے ساتھ اپنی بات منواتی جا رہی تھی ابھی اسے آخری بات اور تسلیم کروانی تھی۔ لہذا وہ بولی۔

''اب کیونکہ متفقہ طور پر جمہوریت ہمارے جنگل میں آ گئی ہے اور میں سیاست دان کے طور پر حکمران بنی ہوں لہذا مجھے آج سے وزیر اعظم کہا جائے گا۔''

''انسانوں کی دنیا میں ایک صدر بھی تو ہوتا ہے۔'' ہاتھی

نے کہا۔

"مگرمچھ کو صدر بنا دیتے ہیں۔" لومڑی بولی۔

"صدر کا کام ہے بس آرام سے پڑا سوتا رہے۔" لومڑی نے بڑی ہوشیاری سے مگرمچھ کو بھی عہدہ دیا تھا تاکہ جب وہ پانی پینے جائے تو مگرمچھ سے محفوظ رہ سکے۔

"کیا جمہوریت مکمل ہوگئی؟" شیر نے پوچھا۔

"بالکل۔" لومڑی نے کہا۔ اب سارا جنگل اور اس کے جانوروں کو ہم عوام کا نام دیتے ہیں۔ پورا جنگل ہم چند جانوروں کا خیال رکھے یہی جمہوریت ہے۔"

"میں اب قانونی طور پر کسی بھی جانور کا شکار کرکے کھا سکتا ہوں؟" چیتا نے پوچھا۔

"یقیناً اب تم کو قانونی حق حاصل ہوگیا ہے کہ تم عوام کا شکار کرسکتے ہو۔" لومڑی نے جواب دیا اور میٹنگ برخاست ہوگئی۔

چالاک لومڑی جو پہلے سیاست دان کہلائی اور پھر خود کو وزیراعظم منوالیا۔ وہ بڑے غرور کے ساتھ جنگل میں گشت کرتی تھی اب اسے شیر چیتے سے کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ اس نے طاقت ور لوگوں کو اپنی ہوشیاری سے ماتحت کرلیا تھا۔ تالاب پر پانی پینے جاتی تو مگرمچھ جسے اس نے صدر کا عہدہ دلوایا تھا اس کے احترام میں سامنے سے ہٹ جاتا تھا۔

روزانہ کی طرح آج بھی وہ صبح سویرے سیر گشت کر رہی تھی۔ راستے میں ملنے والے جانور اسے سلام اور راستہ دیتے تھے وہ بڑے غرور سے جواب دیتی اور کسی کو وہ جواب دینا ہی پسند نہیں کرتی تھی۔ بلکہ انہیں دیکھ کر منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی تو بے چارے عوام جمہوریت کے چکر میں پھنس گئے ہیں۔

دفعتاً چالاک لومڑی کو کوئی رنگ برنگی سی چیز دکھائی دی اس نے منہ نزدیک لے کر سونگھا لیکن وہ کوئی انجانی سی چیز تھی۔ اس نے اسے منہ میں پکڑا تو وہ بڑی ملائم سی لگی۔ وہ ایک کیک کا ٹکڑا تھا جو اس طرف سے گزرتے ہوئے کوئی شکاری گرا گیا تھا۔

"کیا مجھے یہ کھانا چاہیے؟" چالاک لومڑی نے خود سے سوال کیا۔ پھر خود ہی جواب دیا۔

"میں سیاست دان ہوں اور سیاست دان کچھ نہیں چھوڑتے ہیں سب کھا جاتے ہیں۔ لہٰذا مجھے اسے بھی نہیں چھوڑنا۔ کوئی اور کھائے یہ ہو ہی نہیں سکتا اسے تو مجھے ہی کھانا ہے۔"

چالاک لومڑی کیک منہ میں دبائے ابھی دو قدم ہی چلی تھی کہ سامنے سے ایک ہرنی اپنے بچے کے ساتھ آ گئی لومڑی اس کے معصوم بچے کو دیکھ کر رال ٹپکانے لگی لیکن پھر اسے یاد آیا کہ ابھی اس نے پیٹ بھر کھانا کھایا ہے اور منہ میں کیک کا ٹکڑا بھی تو ہے۔

"سیاست دان یہ کیا ہے؟" ہرن نے لومڑی سے کیک کی طرف اشارہ کرکے سوال کیا۔

"یہ وزیراعظم کے کھانے کی چیز ہے جو تم نہیں سمجھو گی۔" اس نے ہرن پر رعب ڈالا۔

"کیا سیاست دان یہ بھی کھاتے ہیں؟" ہرن نے حیرانی سے پوچھا۔

"میں سیاست دان ہوں اور سیاست دان سب کھاتے ہیں۔ وہ خوشی سے سرشار تھی کہ اس نے کس طرح سارے جانوروں کو بے وقوف بنایا ہے۔ اچانک اس کا وجود لڑکھڑایا اور اپنے کیک کے ٹکڑے سمیت ایک گڑھے میں جا گری۔ وہ گڑھا خاصا گہرا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ چھلانگ لگائی تاکہ باہر آسکے لیکن اسے ہر بار ناکامی ہوئی۔ پہلے تو وہ پریشان ہوگئی کہ اب کیا کرے لیکن پھر خود کو تسلی دی کہ وہ ایک سیاست دان ہے اور سیاست دانوں پر مشکلات آتی رہتی ہیں اور وہ ان مشکلوں سے نکلنا جانتے ہیں۔

فوراً ہی اس کے دماغ نے کام کیا اور اس نے اس ہرنی کو آواز لگانی شروع کردی جو اسے ابھی ملی تھی اس کا اندازہ تھا کہ وہ اپنے بچے کی وجہ سے زیادہ دور نہیں گئی ہوگی۔ اس کا اندازہ بالکل ٹھیک نکلا فوراً ہی اسے گڑھے کے اوپر ہرنی کا سر دکھائی دیا۔

"وزیراعظم تم گڑھے میں کیا کر رہی ہو؟" ہرنی اپنے بچے کے ساتھ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"خود کو محفوظ کرنے کے لیے میں گڑھے کے اندر آئی ہوں۔" اس نے کہانی سنائی۔

"محفوظ رکھنے کے لیے کیوں کیا باہر کوئی انسانی شکاری آنے والے ہیں؟" ہرنی خوف زدہ ہوکر بولی۔ اس نے

جلدی سے اپنے بچے کو بھی پاس کر لیا تھا۔

''اس سے بھی خطرناک چیز باہر انقلاب آنے والا ہے۔''

ہرنی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ ''وہ کیا ہوتا ہے؟''

''تم عوام ہو نا، عقل نام کو نہیں ہے۔'' چالاک لومڑی بولی۔

''انقلاب میں سب کچھ ختم ہو جاتا ہے بہت تباہی ہوتی ہے ہر طرف موت اور لاشیں ہوتی ہیں۔''

''شاید جنگل کی آگ جیسی؟'' ہرنی لرز کر بولی۔

''اس سے بھی خطرناک۔''

''سیاست دان پھر مجھے بھی بچاؤ اس انقلاب سے دیکھو میرا تو چھوٹا سا بچہ بھی ہے۔''

چالاک لومڑی مسکرائی۔

''میں تیرے بچے کی وجہ سے بچانا چاہتی ہوں اور پھر سیاست دانوں کا کام ہوتا ہے اپنے عوام کو محفوظ رکھنا۔''

''تو کیا اس گڑھے میں وہ انقلاب نہیں آئے گا؟'' ہرنی نے پوچھا۔

''ارے بے وقوف اسی لیے تو میں اس میں چھپی ہوں۔''

''تو پھر میں اندر گڑھے میں آجاتی ہوں۔'' وہ بولی۔

''ہاں ضرور آجاؤ لیکن اندر آنے سے پہلے شرط جان لو۔''

''کیسی شرط؟'' ہرنی چونکی۔

''گڑھے کے اندر چھینکنا بالکل نہیں اس لیے کہ انقلاب کو پتہ چل جائے اور انقلاب پھر اس گڑھے کے اندر آجائے گا اور ہم سب مارے جائیں گے۔''

''میں شرط سمجھ گئی میں بالکل نہیں چھینکوں گی۔'' ہرنی نے ہامی بھرلی اور پھر وہ اپنے بچے کے ساتھ گڑھے کے اندر آگئی۔

......

دوپہر کے نزدیک تک گدھا' بھینسا' چیتا ہاتھی بھی گڑھے کے اندر آچکے تھے چالاک لومڑی نے سب کو انقلاب کی کہانی سنائی تھی اور اندر آنے کی شرط بھی بتادی تھی یہ اس گڑھے میں رش بڑھتا جا رہا تھا۔

شیر جواب تک اس گڑھے سے باہر تھا وہ گڑھے کے منہ پر آیا اور اندر جھانک کر حیرانی سے پوچھنے لگا۔

''یہ سب اندر کیا کر رہے ہیں۔؟''

چالاک لومڑی نے شیر یعنی جنگل کے آرمی چیف کو بھی اپنی کہانی سنا ڈالی۔

''باہر انقلاب آنے والا ہے۔ انقلاب میں سب کچھ الٹ پلٹ ہو جاتا ہے۔ خون بہتا ہے سب مر جاتے ہیں۔ بھوک آجاتی ہے جو بچ جاتے ہیں وہ دوبارہ سے سب کچھ ٹھیک کرتے ہیں۔''

''یعنی گڑھے والے بچ جائیں گے اور وہ دوبارہ جنگل کو آباد کریں گے۔'' شیر نے کہا اور شرط سنے بغیر ہی اندر کود گیا تھا۔

چالاک لومڑی نے دیکھا کہ گڑھا پوری طرح سے بھر گیا ہے۔ لہٰذا اس نے اب آخری بات کا آغاز کیا۔

''اب میرا فیصلہ بھی سن لو۔ جمہوریت میں سب برابر ہوتے ہیں لہٰذا ہم میں جو بھی گڑھے کے اندر چھینکے گا باقی لوگ اسے باہر پھینک دیں گے۔'' چالاک لومڑی نے ابھی اپنی بات مکمل ہی کی تھی کہ اس نے ایک کے بعد ایک تین بار چھینک ماری۔ پہلے تو سارے جانور حیران رہ گئے۔

''اسے اٹھا کر باہر پھینکو۔'' آرمی چیف شیر نے حکم دیا۔

ہاتھی نے فوراً ہی عمل کیا۔ اور سونڈ میں جکڑ کر لومڑی کو گڑھے سے باہر اچھال دیا۔

چالاک لومڑی نے پہلے تو خود کو جھاڑا اور گڑھے کے اندر جھانک کر بولی۔

''انقلاب وہ نہیں بے وقوفو جو میں نے تمہیں بتایا۔ انقلاب تو وہ ہے جو تم میری باتوں یا بہکاوے میں نہ آؤ۔''

''تو نے دھوکا دیا۔'' شیر دہاڑا۔

''تم عوام ہو تمہارا کام دھوکا کھانا ہے میں سیاست دان ہوں میرا کام ہے دھوکا دینا۔'' لومڑی بولی۔

''ہم دونوں اپنا کام ایمان داری سے کر رہے ہیں اب بولو انقلاب زندہ باد۔'' وہ ہنستی وہاں سے بھاگ گئی۔

بے سائبان لوگ

ناظم بخاری

دنیا اک جنگل سے کم نہیں، جہاں صرف درندے چرند پرند ہی نہیں بلکہ انسان نما جانور بھی بستے ہیں، اللہ تعالیٰ نے بے زبان جانوروں کو صرف بولنے اور سوچنے کی صلاحیت نہیں دی ہے البتہ انسانوں کو یہ دونوں صفات عطا کر رکھی ہیں ان صلاحیتوں نے انسان کو ضرورت سے زیادہ خطرناک بنا دیا ہے کہ وہ اپنے جیسے انسانوں کا گوشت کھانے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

ایسے ہی شیطان صفت لوگوں کا قضیہ، جن سے شیطان بھی شرماتا ہے

اگلے دن اس نے بتایا کہ اس کی ماں اور بھائی کہتے ہیں کہ گھر چھوڑ کر وہ خود گئی تھی۔ وہ اسے لینے نہیں جائیں گے۔ البتہ یہ اس کا اپنا گھر ہے۔ وہ اگر واپس آنا چاہے تو آ جائے، اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔ بالی اسی دن گئی اور سعدیہ کو اپنے ساتھ لا کر اس کے سسرال چھوڑ آئی۔ اس نے سعدیہ سے کہا کہ خدا نے چاہا تو اب اس کے ساتھ پہلے والا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔۔۔۔ سعدیہ کی ساس اور شوہر نے اسے دیکھا تو انہوں نے بھی اسے کچھ کہنے کی بجائے خاموش رہنا بہتر سمجھا۔

گھر میں بلا معاوضہ ایک نوکرانی کی اہمیت سے وہ بخوبی واقف ہو گئے تھے۔ سعدیہ کے سسرال آنے کے بعد جب ایک دو دن تک کوئی مسئلہ نہیں ہوا تو بالی نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس نے سعدیہ سے جو وعدہ کیا تھا، وہ اسے صحیح طرح نبھانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

......☆☆......

جیدے کو اپنی پہلی تنخواہ ملی تو اس نے وہ وعدے کے مطابق لا کر بالی کے ہاتھ پر رکھ دی تھی۔ بالی کو بہت حیرت ہوئی۔ اسے یقین نہیں تھا کہ جیدا اپنا کیا ہوا وعدہ وفا بھی کر سکتا ہے۔ اسے ویسے بھی ان دنوں پیسوں کی بہت ضرورت تھی۔ اس دوران وہ جتنا عرصہ اپنا جسم سونپتی آئی تھی، اس سب کی کسر نکل گئی تھی۔ حالانکہ اس نے اس نیت سے جیدے سے مراسم قائم نہیں کیے تھے کہ وہ اس سے پیسے حاصل کرتی۔ بلکہ اس کا مقصد جیدے کا دھیان سعدیہ سے ہٹا کر اپنی طرف مبذول کرانا تھا اور وہ اس میں کامیاب ہو گئی تھی۔

جیدا سعدیہ کو بھول کر دن رات اسی کے گن گانے لگا تھا۔ بالی جب سے سعدیہ کو اس کے ماں باپ کے گھر سے لائی تھی، اس دن سے اگلے پندرہ دنوں تک وہ بالی سے ملنے اس کے گھر نہیں آئی۔ حالانکہ اس سے پہلے سعدیہ ہر دوسرے تیسرے دن اس سے ملنے ضرور آتی تھی۔ بالی شروع میں تو یہی سمجھتی رہی کہ سعدیہ گھر کے کاموں میں الجھ گئی ہو گی۔ اسے جب وہاں سے فرصت ملے گی تو وہ ضرور اس سے ملنے آئے گی مگر جب پندرہ دنوں تک بھی وہ بالی سے ملنے اس کے گھر نہیں آئی تو بالی نے ایک دن چپکے سے اس کے گھر کا رستہ ناپا۔

اس نے جیدے کے گھر میں داخل ہونا چاہا تو اسے دروازہ اندر سے بند ملا۔ اسے حیرت ہوئی۔ اب سے پہلے ایسا نہیں ہوا تھا کہ اسے وہ دروازہ کبھی بند ملا ہو۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے سعدیہ کی ساس کی آواز آئی۔

''کون ہے؟''

''میں ہوں خالہ، اقبال، دروازہ کھولو''

''کیوں، کیا کام ہے؟''

''سعدیہ سے ملنا ہے''

''وہ گھر میں نہیں ہے'' سعدیہ کی ساس نے کہا۔

''اور ہاں، خبردار جو آج کے بعد اس طرف کا رخ کیا تو۔۔۔ تم خود بھی گندی عورت ہو اور ہماری بہو کو بھی اپنے جیسا بناؤ گی۔''

بالی ایک کڑوا گھونٹ بھر کر رہ گئی۔ سعدیہ کی ساس کی طرح وہ بھی پہلے دن سے ہی اسے پسند نہیں کرتی تھی، مگر بالی سعدیہ کی دوستی کی وجہ سے اسے نظر انداز کرتی آئی تھی۔ وہ چپ چاپ اپنے گھر کی طرف چل دی۔ ویسے اس کی چھٹی حس نے اسے آگاہ کیا تھا کہ ہو نہ ہو اندر کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ جس کے بارے میں اسے جاننا ہے۔ اس نے سوچا کہ اگلے دو دنوں تک سعدیہ اس سے ملنے آ گئی تو ٹھیک، ورنہ وہ خود کسی اور طرح سے اس کا پتہ کرائے گی۔

......☆☆......

مگر جب اگلے دو دنوں تک ملنے نہیں آئی تو اس کا دل ایک بار پھر بے چین ہونے لگا۔ سعدیہ کی ساس کی کہی ہوئی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ ایک بار پھر سعدیہ سے ملنے اس کے گھر کی طرف چل دی۔

اس بار بھی اسے اسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا، جس سے پہلے پڑا تھا۔

سعدیہ کی ساس، اس بار پہلے سے بھی زیادہ سختی سے اس سے پیش آئی تھی۔ بالی کے شکوک و شبہات میں اور اضافہ ہوگیا کہ ہو نا ہو سعدیہ کے ساتھ کچھ گڑ بڑ ضرور ہے۔

اگلی بار جیدا اس سے ملنے آیا تو بالی نے اس سے پوچھا۔

"یہ سعدیہ کہاں ہوتی ہے آج کل، نظر ہی نہیں آتی؟" بالی کے سوال پر جیدا تھوڑا گھبرا گیا۔

"وہ... وہ گھر میں ہی ہے۔ اس نے کہاں جانا ہے؟"

"کتنے دن ہوگئے ہیں، وہ مجھ سے ملنے ہی نہیں آئی..."

"وہ سارا دن گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی ہے، فرصت ملے گی تو آئے گی نا..."

"ایسا بھی کیا کام کاج کرتی ہے وہ۔ پہلے بھی تو آتی تھی۔ اچھا، گھر جانا تو اسے میرے نام سے کہنا کہ میں نے بلایا ہے۔"

"اچھا کہہ دوں گا۔" مگر جیدے کے کہنے کے باوجود بھی سعدیہ اگلے تین دن تک نہیں آئی تو اس کے شکوک میں اور اضافہ ہوگیا۔ اس کا خود سعدیہ کے گھر جانا ممکن نہیں تھا اور جیدا اسے درست بات بتا نہیں رہا تھا۔ ایک دن وہ اپنے گھر سے کچھ فاصلے پر رہنے والی خالہ میدو کے پاس جا پہنچی۔ اس نے اس کے ہاتھ پر دس روپے بھی رکھ دیے اور اپنے مطلب کی بات بھی اس کے گوش گزار کر دی۔ خالہ نے ذرا سے تامل کے بعد پیسے رکھ لیے اور کہا کہ وہ اس بارے میں پتہ کرتی ہے۔ شام کو اس نے اسے سعدیہ کی رپورٹ دی۔

"ہائے ہائے... اس بچی کی تو حالت ہی بہت خراب ہے۔ پہلے تو مجھ سے فضہ نے یہ بات چھپائی کہ سعدیہ گھر میں نہیں ہے مگر جب میں نے [illegible] تو اس نے وہیں مجھ کچھ کہنے کی بجائے سعدیہ کو اپنا

کمرے میں جا کر دیکھا تو وہ بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔ فضہ نے بتایا کہ اس کی ٹانگ پر چوٹ آئی ہے۔ کہیں چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہے وہ۔ اس لیے وہ اتنے دن سے تیرے پاس نہیں آسکی..."

بالی کا دل سینے میں بیٹھنے لگا۔ "خالہ تو کسی نہ کسی طرح مجھے اس سے ملوا دے۔"

"ارے نہیں بھئی، یہ ممکن نہیں ہے۔ فضہ نے تو مجھے بھی بمشکل گھر میں داخل ہونے دیا کہ میری اس سے پرانی جان پہچان ہے۔ ورنہ وہ کسی کو بھی اپنے گھر میں نہیں آنے دے رہی۔ مجھے تو شک ہے کہ انہوں نے خود ہی سعدیہ کے ساتھ کچھ اچھا برا کیا ہے اور اسی لیے وہ کسی کو بھی اپنے گھر میں نہیں آنے دے رہے..." بالی نے دس روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھا۔

"خالہ، آپ بس خالہ فضہ کو کسی طرح دس، پندرہ منٹ کے لیے اپنے گھر بلا لو، میں اس دوران سعدیہ سے مل لوں گی۔"

"اچھا... میں کوشش کروں گی۔" اگلے دن خالہ میدو نے اس سے کہا کہ نماز ظہر کے بعد فضہ اس کے پاس، اس کے گھر میں ہوگی۔ وہ سعدیہ سے چاہے تو ملاقات کرسکتی ہے۔

بالی جب سعدیہ کے گھر پہنچی اور اس کی سعدیہ پر نظر پڑی تو وہ اپنا دل تھام کر رہ گئی۔ سعدیہ بالکل کمزور ہوکر رہ گئی تھی۔ اس کا چہرہ بے رونق تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ اس کی ایک پنڈلی پر کپڑا لپیٹ کر باندھا گیا تھا اور وہ اپنے آپ سے بے سدھ ہوکر چارپائی پر پڑی ہوئی تھی۔ اس وقت گھر میں اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ بالی نے اسے ہولے سے پکارا۔

"سعدیہ!" سادی نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور دوسرے ہی پل اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ ایسی ہی کچھ کیفیت بالی کی بھی تھی۔

سہارا دے کر اٹھایا اور بولی۔

''فی الحال میرے گھر چلو، باقی ساری باتیں وہیں ہوں گی۔'' وہ بالی کا سہارا پا کر، ایک ٹانگ پر ہولے ہولے چلتی بالی کے گھر آ گئی۔

......☆☆......

دیلے نے میدے سے کہا۔''سالی آسانی سے نہیں مان رہی۔

میں اسے کئی دن سے سمجھا رہا ہوں۔ محبت سے بھی اور غصے سے بھی۔ پر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔

تو ایسا کر، آج سے اپنا کام شروع کر دے۔ جب وقت آئے گا تو خود ہی سیدھی ہو جائے گی۔''

''میں نے تو اپنا کام کب سے کر رکھا ہے۔ ایک نہیں دو دو لوگ تیار ہیں۔

بس مجھے تیرا ہی انتظار تھا۔''

''تو ٹھیک ہے۔ تو رات کو ایک بندہ لے آنا۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔''

''میں رات نو بجے تک آ جاؤں گا۔''

وہ جنوری کا مہینہ تھا۔ شام پانچ بجے تک سورج غروب ہو جاتا تھا اور رات نو دس بجے تک دیہات میں آدھی رات کا سماں ہوتا تھا۔ رات نو بجے میدے نے دیلے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس کے ساتھ ایک شخص اور بھی تھا۔ دیلے نے دروازہ کھولا اور ان دونوں کو اندر بلا لیا۔

''یہی شخص ہے نا؟'' دیلے نے تصدیق چاہی۔

''ہاں یہی ہے۔''

''اسے بتا دیا ہے نا کہ لڑکی ذرا نئی ہے، وہ تھوڑی گڑبڑ کر سکتی ہے، یہ سنبھال لے گا نا؟''

''ہاں بتا دیا ہے۔ کہتا ہے، سنبھال لوں گا۔''

''تو ٹھیک ہے جا، وہ اندر ہے، سنبھال لینا۔''

وہ شخص اندر گیا اور تھوڑی دیر بعد ہی وہاں سے ایسی آوازیں آنے لگیں، جیسے دو افراد آپس میں گتھم گتھا ہوں۔ پھر اچانک ہی کسی کی دلدوز چیخ سنائی۔ دوسرے ہی پل وہ شخص بڑی تیزی سے کمرے سے باہر نکلا۔

''ہائے میں مر گیا۔''

اس نے اپنا ایک بازو دوسرے ہاتھ سے دبا رکھا تھا۔

وہاں سے بڑی تیزی سے خون کے قطرے گر رہے تھے۔ اس کے ساتھ سکینہ بھی دوسرے ہی پل کمرے سے باہر تھی۔

اس نے اپنے ایک ہاتھ میں چھری پکڑی ہوئی تھی۔

''اگر آج کے بعد ادھر کا رخ بھی کیا تو ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گی۔''

اس نے دھیمے مگر تند لہجے میں کہا۔

دوسرے ہی پل وہ شخص گھر کی دہلیز پار کر چکا تھا۔ میدا بھی اس کے ساتھ تھا۔

دیلے کو ساری بات سمجھنے میں کچھ سیکنڈ ہی لگے۔ اسے خدشہ تو تھا کہ سکینہ کچھ گڑبڑ کرے گی، مگر اسے یہ امید نہیں تھی کہ سکینہ اس طرح سے بھی پیش آ سکتی ہے۔ سکینہ پھنکارتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔

''میں نے منع کیا تھا نا کہ اپنی اس کمینی حرکت پر عمل کرنے سے باز رہنا نہیں تو ۔۔۔۔ آخر دکھا دی نا اپنی اوقات ۔۔ تم آخر اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟

تم کیا سمجھتے ہو کہ تم میں ایسی کوئی خوبی ہے کہ میں تم سے نباہ کرنے پر مجبور ہوں؟ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں صرف مری ہوئی بوا کا وعدہ نبھا رہی تھی۔ میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ میں ان کے بعد تمہارا ہر طرح سے خیال رکھوں گی۔ کبھی پریشان نہیں ہونے دوں گی۔ تمہیں اچھا انسان بنانے کی کوشش کروں گی مگر ۔۔۔ تم وہ انسان ہی نہیں ہو کہ تمہارے لیے ایسا کچھ کیا جائے۔ حالانکہ میں نے تمہارے لیے یہ سب کچھ کیا ۔۔۔۔ اور اس کا تم نے آج مجھے یہ اجر دیا ہے کہ ۔۔۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اس حد تک

بھی کر سکتے ہو۔"

سکینہ کی آواز ایک پل کو بھرا سی گئی مگر دوسرے ہی پل اس نے خود پر قابو پالیا اور تند لہجے میں بولی۔

"اب تمھاری بہتری اسی میں ہے کہ تم بھی گھر سے دفع ہو جاؤ ورنہ میں تمھیں بھی مار ڈالوں گی اور خود کو بھی۔" وہ چھری تھامے دیلے کی طرف بڑھی تو دوسرے ہی پل وہ گھر سے باہر جا چکا تھا۔

سکینہ اگلے ہی پل دروازہ بند کر کے کنڈی لگا چکی تھی۔ اچانک ہی اس کی آنکھوں میں رکے ہوئے آنسو بہہ نکلے۔ باہر نکل کر دیلے نے سکینہ سے کچھ کہنا چاہا پر اچانک ہی اس نے اپنے لب سی لیے۔ وہ اس وقت غصے میں تھی اور اس سے کچھ کہنا یا بات کرنا، اس کے غصے کو ہوا دینے کے مترادف تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے ادھر ادھر گلیوں میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ اب سکینہ کا غصہ کسی حد تک ٹھنڈا ہو گیا ہوگا تو اس نے اپنے قدم گھر کی طرف بڑھا دیے۔

اس نے دروازے پر دستک دی تو اسے سکینہ کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"دیکھ دیلے! بہتری اسی میں ہے کہ آج رات تو گھر سے باہر رہ، ورنہ یا تو تو نہیں رہے گا یا میں نہیں رہوں گی۔ کل میں اپنے میکے چلی جاؤں گی، پھر شوق سے اپنا گھر سنبھال کے بیٹھے رہنا۔"

دیلے کو اندازہ ہو گیا کہ اس بار بھی بات نہیں بنے گی۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنے قدم چوک کی طرف بڑھا دیے۔

وہ وہاں دو سے تین گھنٹے تک بیٹھا وقت گزارتا رہا اور سردی سے تھر تھر کانپتا رہا۔ جب اسے اندازہ ہو گیا کہ اب سکینہ سو گئی ہوگی تو اس نے اپنے قدم دوبارہ گھر کی طرف بڑھا دیے۔ اس بار اس نے دروازہ کھٹکھٹانے کی بجائے دیوار پھاندی اور صحن میں اتر گیا۔

دیلا کا اندازہ غلط ہو گیا۔ سکینہ سوئی نہیں تھی وہ اپنا سر تھامے برآمدے میں چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ سکینہ نے دیلے پر ایک نظر ڈالی پر اس بار اسے کچھ نہیں کہا۔

دیلے نے بھی کچھ نہ کہنا بہتر سمجھا اور اپنے قدم اندر کمرے کی طرف بڑھا دیے۔ نیند سے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو سکینہ وہاں نہیں تھی۔ اس نے کمرے میں جا کر اس کے سامان کا جائزہ لیا۔ وہاں سکینہ کے کپڑے بھی نہیں تھے۔ وہ صبح سویرے ہی اپنے کپڑے باندھ کر میکے چلی گئی تھی۔ دیلے نے زیر لب اسے ایک گالی دی۔

"سالی حرامزادی نہ ہو تو۔۔۔۔"

اور پھر اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ وہ اس کے تمام منصوبوں پر پانی پھیر کر اپنے ماں باپ کے گھر جا چکی تھی۔

☆☆

تاش کھیلتے شاہ جی نے قہوے کا کپ اٹھا کر لبوں سے لگایا تو اسے زور کا ٹھسکا لگا۔

"اونہہ۔۔۔۔"

"ارے آرام سے یار، کیا جلدی ہے، سکون سے پیو۔"

"ارے، یہ قہوہ ہے یا زہریلا شربت؟"

"کیا ہوا؟"

"پی کر دیکھو" شمے نے قہوہ لے کر پیا تو اسے سچ میں قہوہ کڑوا لگا۔

"لگتا ہے سالی چینی ڈالنا بھول گئی ہے۔

اری کمو! ادھر دفع ہو۔" مگر کوثر وہاں ہوتی تو اسے جواب ملتا۔

"اری کہاں مری پڑی ہے، ادھر دفع ہو نا۔۔۔"

"لگتا ہے وہ گھر میں نہیں ہے، کہیں گئی ہوئی ہے۔" دیلے نے کہا۔

"نہیں۔"
شمے کا دل اس کے سینے میں بیٹھنے لگا۔
وہ اچانک ہی بے چین ہو اٹھا۔ وہ کوثر کو کبھی بھی بغیر گالی دیے مخاطب نہیں کرتا تھا اور معذوری کے بعد تو اس کی یہ عادت اور پختہ ہوگئی تھی۔ حالانکہ کوثر نے کئی بار اسے منع کیا تھا کہ وہ گالیاں نکالنا چھوڑ دے، یہ اچھی عادت نہیں ہے مگر جب وہ منع کرنے کے باوجود بھی باز نہیں آیا تھا تو اس نے اسے دھمکی دی تھی کہ اگر اس کی یہ بد زبانی برقرار رہی تو وہ ایک دن اسے اسی طرح معذور چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے کہیں چلی جائے گی۔ شروع میں وہ اس کی دھمکی سے کچھ ڈر گیا تھا۔ کیا پتہ وہ سچ کہہ رہی ہو۔ اگر وہ اسی طرح اسے گھر میں پڑا ہوا چھوڑ کر کہیں چلی گئی تو؟ اسکا تو کوئی بھائی بہن، ماں باپ یا کوئی رشتے دار بھی نہیں تھا، جو اسکا پتہ کرتا۔
کوثر کی اس دھمکی سے اس کی زبان کچھ دنوں کے لیے سیدھی ہوگئی تھی۔
وہ کوشش کرنے لگا تھا کہ وہ اپنی زبان کو قابو میں رکھے مگر یہ اس کے بس سے باہر تھا۔
وہ مرد تھا۔ کب تک اپنی زبان کو روک کر رکھتا؟
کوثر صبح کی گئی دوپہر کو حویلی سے لوٹتی تو شیطان کئی کہانیاں اس کے ذہن میں بھر چکا ہوتا، جسے وہ کوثر کے آنے کے بعد سنانا شروع کر دیتا۔ شروع شروع میں کوثر، اس کی ان باتوں کی سختی سے تردید کرتی تھی، مگر جلد ہی اسے محسوس ہوگیا کہ یہ سب بے سود ہے۔
شمے کو نہ ہی اس پر اعتبار ہے اور نہ ہی وہ کرسکتا ہے۔ چاہے لاکھ وہ اپنی پاکیزگی کی قسمیں کھائے۔ اس نے سوچ لیا کہ بار بار اپنی صفائی دینے سے بہتر ہے کہ خاموشی پر ہی اکتفا کیا جائے۔ اس سے بہتر اور کوئی حل نہیں۔ سو اس دن کے بعد اس نے شمے کی باتوں پر آہستہ آہستہ خاموشی اختیار کرنا شروع کر دی تھی اور شما اس کی خاموشی کے جواب میں مزید تیر ہوگیا۔ وہ جب بھی کام سے لوٹتی وہ کچھ اس طرح کی باتوں سے اس کا استقبال کرتا تھا۔
"گشتی۔۔۔ حرامزادی۔۔۔ ذرا جلدی گھر مر لیا کر۔
یہ بھی سوچ لیا کر کہ گھر میں کوئی تیری ماں کا یار صبح بھوکا پیاسا پڑا ہے۔۔۔۔
کچھ اس کے بارے میں بھی سوچ لیا کر۔"
وہ اس کی گالیوں اور باتوں کو نظر انداز کرتی، اسے کھانا پانی دیتی اور اپنے کام میں مصروف ہوجاتی۔ شما کھانا بھی کھاتا جاتا اور ساتھ ساتھ بکواس بھی کیے جاتا۔
"آئندہ ماں کو تا۔۔۔ ذرا جلدی آیا کر۔ ورنہ۔۔۔۔۔"
وہ اسے نظر انداز کرتے ہوئے بانو کو سنبھالتی رہتی۔
شما اچانک غور سے کوثر کے چہرے کو دیکھنے لگتا۔
کبھی یہ چہرہ بہت خوبصورت ہوا کرتا تھا اور اب۔۔۔؟
وہ مزید غور سے دیکھنے لگتا۔ یہ تو اب بھی پہلے کی طرح خوبصورت ہے۔
اس کا ذہن پھر شیطانی کہانیاں تراشنا شروع کر دیتا۔ ایک دن کوثر صبح کی گئی شام کو گھر لوٹی تھی۔ اس دن حویلی میں بڑے چوہدری کا ختم تھا۔ صبح سے ہی مہمانوں کی آمد تھی اور اس دوران کام اتنا بڑھ گیا تھا، جو شام سے پہلے کسی طور ختم ہونے میں نہیں آیا تھا۔
وہ کوشش کر کے بھی گھر نہیں آسکی تھی۔
حالانکہ اس نے بڑی بیگم سے کہا بھی تھا کہ اس کا معذور شوہر گھر میں بھوکا پیاسا اسکا منتظر ہے، اسے کچھ دیر کے لیے گھر جانے دیا جائے۔ وہ دوبارہ واپس آجائے گی، مگر بڑی بیگم نے اسے ٹال دیا تھا۔ "ارے نہیں بھئی، اتنا ٹائم نہیں ہے۔
تمہیں پتہ ہے آج فضہ بھی طبیعت کی خرابی کی بنا پر نہیں آئی۔ اب تم بھی تھوڑی دیر کے لیے چلی گئی تو

سارا کم اُدھورا رہ جائے گا اور چوہدری صاحب ناراض ہوں گے۔ ان کے غصے کا تو پتہ ہی ہے تمہیں۔ بس یہ تھوڑے سے کام نمٹ جائیں، پھر گھر چلی جانا۔ میں کچھ کھانا بھی ساتھ کر دوں گی، وہ بھی لے جانا اس کے لیے۔۔۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گئی تھی۔ ان دنوں بانو پیٹ میں تھی۔ شام کو وہ گوشت اور چاول لے کر گھر میں داخل ہوئی اور اس نے وہ کھانا شمے کے سامنے رکھا تو شمے نے ایک ہاتھ مار کر وہ کھانا دیوار پر دے مارا۔

''سالی۔۔۔ حرامزادی۔۔۔ اب وقت ملا ہے گھر آنے کا؟

کس یار کے ساتھ اتنا وقت گزارتی رہی ہے کہ تجھے گھر کا خیال ہی نہیں آیا؟''

''چوہدریوں کے گھر مہمان آئے ہوئے تھے۔

بڑے چوہدری کا ختم تھا، اس لیے دیر ہوگئی۔''

''ایک تو دیر کرتی ہے اوپر سے زبان لڑاتی ہے۔ مجھے پتہ کہ اپنے کس کس یار کا پاسا گرم کرتی رہتی ہے تو۔ سب جانتا ہوں میں۔۔۔۔۔''

''میں نے کتنی بار کہا ہے کہ ایسی بکواس مت کیا کر نہیں تو۔۔۔''

''نہیں تو کیا؟ میں بکواس کرتا ہوں، حرامزادی! میں بکواس کرتا ہوں اور تو حاجن بی بی ہے۔ کمینی عورت، کسے بے وقوف بنا رہی ہے تو، مجھے یا خود کو؟ ساری دنیا جانتی ہے کہ چھوٹا چودھری ایک نمبر کا حرامزادہ ہے اور وہ حرامزادہ تیرا یار ہے۔ یہ جو تیرا پیٹ پھولا ہوا ہے ناں۔۔۔ یہ تیرا اسی یار کے ساتھ سونے کا نتیجہ ہے۔ حرام کا بیج پیٹ میں لیے گھوم رہی ہے تو۔۔۔۔'' کچھ دور کھڑی، چادر لپیٹتی ہوئی کوثر نے خود پر قابو پانے کی پوری کوشش کی، مگر آج ضبط کے تمام بندھن اچانک ہی ٹوٹ گئے۔

وہ ایک عرصے سے شمے کی یہ باتیں سنتی آئی تھی۔ کبھی اشاروں میں، کبھی براہِ راست۔ مگر آج۔۔۔ آج تو اس نے کھل کر کہہ دیا تھا کہ وہ بے حیا اور فاحشہ ہے۔۔۔ وہ، جس نے اب تک خود کو اس آلودگی سے بچا کر رکھا تھا اور خود کو گمراہ نہیں ہونے دیا تھا۔ حالانکہ اسے بہکانے والے کتنے ہاتھ اس کی طرف بڑھے تھے، کیسی بیہودہ نگاہوں نے اسے گناہ کی دعوت دی تھی، مگر اس نے کبھی بھی اپنے دل میں ایسا ویسا کوئی خیال نہیں لایا تھا۔ اس نے اب تک اپنی عزت کی حفاظت کی تھی۔ نا صرف اپنی عزت کی حفاظت کی تھی بلکہ عزت سے اس کا اور اس کے بچوں کا پیٹ بھی پال رہی تھی۔ مگر وہ اس کا احسان ماننے کی بجائے اُلٹا اس پر بے حیائی کا الزام لگا رہا تھا۔

اس کی اس طرح کی باتیں، وہ پچھلے کئی ماہ سے سنتی اور نظر انداز کرتی آئی تھی، مگر آج تو شمے نے جیسے ان باتوں کی انتہا کر دی تھی۔

اس نے کوثر کی ضبط کی دیوار کو پوری قوت سے دھکا دے کر گرا دیا تھا۔ اپنے آپ پر جبر کرتی ہوئی کوثر کا اچانک ہی خود پر سے اختیار ختم ہوگیا۔

وہ کسی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح پلٹی اور اس کے دونوں ہاتھ فوراً ہی شمے کے گریبان تک پہنچ گئے۔ ''میں تمہاری ہر بات کے جواب میں چپ ہو جاتی ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں گنہگار ہوں یا برائی کے راستے پر چل رہی ہوں۔۔۔ تم میرے بچوں کے باپ ہو، بس اس بات کی شرم کر جاتی ہوں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ تم صرف نام کی حد تک بچوں کے باپ رہ گئے ہو۔ کمانے کھلانے کے قابل تو ہو نہیں، مجھے اور بچوں کو کیا کھلاؤ گے؟ تم تو اس قابل بھی نہیں ہو کہ اس گھر سے باہر ہی نکل سکو۔ تمہیں تو میرا احسان مند ہونا چاہیے کہ تمہاری معذوری کے بعد میں عزت سے تمہارا اور بچوں کا پیٹ پال رہی ہوں اور اُلٹا تم ہو کہ اگر میری جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو کب کا تمہیں چھوڑ کر جا چکی ہوتی اور ایک بات اور بھی کان کھول کر سن لو، آج یہ ہاتھ تمہارے گریبان تک آئے ہیں۔

اگر آج کے بعد تم نے ایسی کوئی بات کی تو یہ ہاتھ اور بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔۔“ اس نے ایک جھٹکے سے شمے کا گریبان چھوڑ دیا۔ شما، کوثر کے اس رویے سے ایک پل کو سکتے میں آ گیا تھا۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ کوثر کبھی اس کے ساتھ اس طرح بھی پیش آ سکتی ہے۔ کوثر اب بھی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح دور کھڑی اسے گھور رہی تھی۔ ”آج کے بعد تم نے میرے یا بچوں کے بارے میں ایسی کوئی بات کی تو یاد رکھنا، میں ایک دن کیا، ایک پل کو بھی اس گھر میں نہیں رہوں گی۔ ویسے بھی میں اپنے بچوں کا خود پیٹ پال رہی ہوں۔ تمہارے گھر کی چھت تلے نا سہی نہیں اور رہ کر بھی وہ پل جائیں گے، البتہ تمہیں کھلانے والا کوئی نہیں ملے گا۔ تم اکیلے یا تو بھوکے مرو گے یا بھیک مانگو گے۔۔۔۔ لہذا بہتری اسی میں ہے کہ جو جیسا چل رہا ہے، ویسا چلنے دو ورنہ۔۔۔۔۔ اور ہاں، اگر تمہیں میرے کردار پر اتنا ہی شک ہے تو تم آج ہی مجھے آزاد کر کے اپنے گھر سے نکال سکتے ہو۔ مجھے ویسے بھی بچوں کا بوجھ خود اٹھانا ہے۔ اس کے بعد کم سے کم تمہارے وجود سے تو رہائی ملے گی۔ میں ہر بات برداشت کر سکتی ہوں مگر اپنی ذات پر اچھالی گئی کیچڑ برداشت نہیں کروں گی۔“

شمے کے سر پر جیسے کسی نے پہاڑ گرا دیا تھا۔

اس نے کوثر کا آج وہ روپ دیکھا تھا، جو آج سے پہلے اسے کبھی نظر نہیں آیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوثر یوں بھی اس کے روبرو ہو سکتی ہے، یوں بھی اس کے سامنے آ کر اتنا کچھ کہہ اور کر سکتی ہے۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ کوثر سچ کہہ رہی ہے۔ اس سے واقعی زیادتی ہوئی ہے۔ اگر وہ سچ مچ اسے چھوڑ کر چلی گئی تو۔۔۔؟ یہ تصور ہی اس کا دل دہلا دینے کے لیے کافی تھا۔ وہ جو دو قدم چل کر باتھ روم تک نہیں جا سکتا تھا، اکیلے کیسے زندگی گزارے گا؟ کہاں سے کھائے اور پیے گا؟

اس نے اسی وقت ہی دل میں ارادہ باندھ لیا تھا کہ وہ آج کے بعد کوثر کو کبھی کچھ نہیں کہے گا۔ کبھی اس پر اپنے دل کی بھڑاس نہیں نکالے گا۔ کوثر نے سچ مچ جو دھمکی دی ہے، اگر وہ اس پر عمل پیرا ہو گئی تو وہ کہیں کا نہیں رہے گا۔

اگلے کچھ دنوں تک اس نے اپنی زبان پر قابو پانے کی پوری کوشش کی تھی، مگر وہ ایک مرد کی زبان تھی، ایک حاکم شوہر کی زبان تھی، وہ بھلا کیسے کچھ کہے بغیر خاموش رہتی؟

کوثر بھی خطا کی پتلی تھی۔ ادھر اس سے ایک دو بار شمے کو کھانا دینے میں دیر ہوئی ادھر شمے کی زبان کو گالیوں کی آزادی نصیب ہو گئی۔ پر اس بار کوثر نے سچ میں صبر کا کڑوا گھونٹ بھر لیا تھا۔ پچھلی بار اس نے شمے کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا تھا، اس پر بعد میں وہ بہت پچھتائی تھی۔ اس نے اپنی اس غلطی کی خدا سے بھی معافی مانگی تھی اور دل میں عہد کیا تھا کہ شما اب اسے جو بھی کہتا رہے، وہ کبھی اس سے اس طرح پیش نہیں آئے گی۔ وہ آخر کو اس کا شوہر تھا، اس کا مجازی خدا تھا اور کچھ نہ سہی، اس کی حیثیت گھر کی چھت کی طرح تھی۔ بعد میں، جب دو چار بار شمے نے کوثر کو اپنی گالیوں سے نوازا اور جواب میں کوثر خاموش رہی تو شمے کا حوصلہ دھیرے دھیرے بڑھتا گیا اور وہ ایک بار پھر اس مقام تک آ کھڑا تھا جہاں سے چلا تھا۔ کوثر کو اس وقت وہاں نہ پا کر، شمے کا دل بیٹھنے لگا تھا۔

اسے بے اختیار خیال آیا کہ کہیں کوثر نے سچ مچ اپنی دھمکی کو عملی شکل نہ دے دی ہو۔ وہ ہمیشہ کے لیے گھر چھوڑ کر نہ چلی گئی ہو۔ دوسرے ہی پل اس کا ذہن اس بات کی تردید کرنے لگا۔ اگر کوثر نے گھر چھوڑ کر ہی جانا ہوتا تو کب کا چھوڑ کر جا چکی ہوتی۔ اسے اتنا انتظار کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور دوسرا وہ اب اس کی گالیوں کی بھی عادی ہو گئی تھی۔ ان کے جواب میں اس نے کبھی اسے کچھ نہیں کہا تھا

''تو پھر وہ کہاں چلی گئی؟'' اس نے ایک بار پھر اسے پکارا۔

''او کمو! کہاں مر گئی ہے تو، جواب کیوں نہیں دے رہی؟''

جواب میں اس بار بھی خاموشی رہی۔

دیلا اٹھتے ہوئے بولا ''لگتا ہے، بھابی کہیں باہر چلی گئی ہے، میں دیکھتا ہوں۔''

شاہ جی بولا۔ ''ساتھ ہی میری دوکان پر بھی چلے جانا، وہاں سے دودھ اور چینی بھی لیتے آنا، چائے بنا کر پئیں گے۔ قہوہ نے تو سارا منہ کا ذائقہ ہی خراب کر دیا ہے۔''

شما اپنی سوچوں میں مصروف تھا۔

''حرامزادی۔۔۔ پہلے تو بتائے بغیر کبھی گھر سے غائب نہیں ہوئی، آج پتہ نہیں کس یار کے پاس چلی گئی ہے۔ آج آجائے، اس کی اچھی طرح طبیعت صاف کرتا ہوں۔ اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے یہ ماں کی......''

اس نے زیر لب اسے ایک گالی دی۔

......☆☆......

دیلا شمے کے گھر سے باہر نکل کر گلی کے کونے پر پہنچا ہی تھا کہ اس کی نظر ناصر پر پڑی۔

اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پنجرا تھا، جس میں دو اعلیٰ نسل کے بہت خوبصورت کبوتر بند تھے۔ وہ اپنی مستی میں جھومتا گاتا ہوا آرہا تھا۔

اس کی دیلے پر نظر پڑی تو وہ اسے گھور کر رہ گیا۔ دیلے نے اس کے پچاس روپے دینے تھے۔ دیلے نے وہ رقم ایک ماہ پہلے دینے کا وعدہ کیا تھا مگر وہ ابھی تک یہ وعدہ وفا نہیں کر پایا تھا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ وفا کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

یہ اس کی سرشت میں ہی نہیں تھا۔ اس نے اس بستی کے پتہ نہیں کتنے لوگوں کے اسی طرح کے ''قرضے'' دینے تھے۔

اس کے حالات اچھے ہوں یا برے، اس نے یہ قرضے لوگوں سے قرضہ لینا مجھے اچھے ہے پتہ ہے، جو تو نے لوگوں سے قرضہ لینا

قرضے کبھی لوٹانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اگر کوئی زیادہ اصرار کرتا تو وہ ایک آنکھ دبا کر کہتا۔

''یار پیسے تو نہیں ہیں فی الحال میرے پاس، البتہ رات کو گھر آ جانا۔ میں تمہارا یہ قرض کسی اور طرح اتارنے کی کوشش کروں گا۔'' اور اگر سامنے والا اسی کے مزاج کا بندہ ہوتا تو رات کو وہ دیلے کے پاس جا کر اپنا قرضہ وصول کر لیا کرتا تھا اور اگر کوئی اس کے مزاج کا بندہ نہ ہوتا تو وہ ایک کڑوا گھونٹ بھر کر رہ جاتا اور دل ہی دل میں توبہ کر لیتا کہ وہ آج کے بعد دیلے کو ادھار دینے کی غلطی کبھی نہیں کرے گا۔

ناصر سے بھی اس نے ایک دن باتوں باتوں میں پچاس روپے لیے تھے اور اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ یہ رقم دو دن میں لوٹا دے گا مگر یہ دو دن کبھی نہیں آنے تھے۔ ناصر نے ایک دو بار اس سے پیسے مانگنے کی کوشش کی تو اس نے اسے بھی وہی جواب دیا، جو دوسروں کو دیتا تھا۔ جواب میں ناصر نے اس سے کہا تھا۔

''اپنی یہ رات والی مہربانی کسی اور پر کرنا۔ میری شادی ہونے والی ہے، مجھے معاف ہی رکھو۔ بس مہربانی کر کے میرے پیسے لوٹا دو'' اور دیلے نے ایک بار پھر اس سے جھوٹا وعدہ کر لیا کہ وہ جلد ہی اسے پیسے دے دے گا۔ ناصر کی اس پر نظر پڑی تو اس نے کہا۔

''او ئے دیلے! تو نے پیسے دینے ہیں کہ نہیں؟ تیرے دو دن پورے نہیں ہوئے ابھی تک؟'' دیلا پھیکی سی ہنسی ہنسا۔

''یار کہیں بھاگا تھوڑی جا رہا ہوں، دے دوں گا۔ اصل میں پیسے کہیں سے ہاتھ نہیں لگ رہے۔ بہت سے لوگوں سے پیسے لینے ہیں، پر کوئی سالا دینے کو تیار ہی نہیں۔ ان میں سے کوئی پیسے دے تو تمہیں دوں۔''

''بس رہنے دے۔ یہ ڈرامے کسی اور سے کرنا۔

ہے۔تیری بہتری اسی میں ہے کہ تو شرافت سے چپ چاپ میرے پیسے لوٹا دے، نہیں تو میں اپنی شرافت کو ایک طرف رکھ کر تم سے پیسے لے لوں گا، اور تو خود پاؤں پکڑ کر روتا پھرے گا۔''

''یار بہت کوشش کر رہا ہوں، قسم سے۔ پر کہیں سے کچھ ہاتھ ہی نہیں لگ رہا۔ کام بھی آج کل بہت مندہ جا رہا ہے۔ جونہی کہیں سے کچھ ہاتھ لگتا ہے سب سے پہلے تمہیں دیتا ہوں۔''

اچانک اس نے اپنے ہاتھ پنجرے کی طرف بڑھائے۔

''لکے ہیں نا؟ ذرا دکھانا، اتنے سوہنے دانے کہاں سے ہاتھ لگ گئے؟ اپنے علاقے کے تو نہیں لگتے، کہیں باہر سے آئے ہیں؟''

''ہاں باہر سے ہی آئے ہیں۔'' ناصر نے پنجرا واپس لیتے ہوئے کہا۔

''کتنے میں لیے؟''

''کیوں، لینے ہیں کیا؟'' ناصر کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

''جب لینے کی اوقات ہو جائے تو پھر بات کرنا۔''

اس نے پنجرا لیا اور اپنے قدم گھر کی طرف بڑھا دیے۔

دیلا ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

اس نے اپنے قدم شاہ جی کی دکان کی طرف بڑھا دیے۔

خلاف معمول شاہ جی کی دکان پر رش نہیں تھا۔

اس نے خیر دین سے شاہ جی کا نام لے کر دودھ چینی لی اور اپنے قدم دوبارہ شیدے کے گھر کی طرف بڑھا دیے۔

اسے یہ یاد بھی نہ رہا کہ وہ کوتر کا پتہ کرنے کے لیے بھی گھر سے باہر آیا تھا۔

سکینہ جب دیلے کو چھوڑ کر واپس اپنے ماں باپ کے گھر آ رہی تھی تو تمام راستے اس کا دل خون روتا رہا تھا۔ جب وہ اپنے گھر میں اکیلے داخل ہوئی اور خیر دین نے اسے دیکھا تو وہ پریشان ہو گیا تھا۔ اس کی شادی کو تین ماہ ہو گئے تھے اور ان گزرے ہوئے تین ماہ میں، وہ صرف تین بار وہاں آئی تھی اور وہ بھی دیلے کے ساتھ۔ اس بار وہ اکیلی آئی تو خیر دین نے پوچھا۔

''پتر! خیریت تو ہے، دیلا نہیں آیا ساتھ؟'' سکینہ کا اپنے آنسوؤں پر اختیار ختم ہو گیا۔ اس نے بمشکل اصل بات چھپائی۔

''وہ۔۔۔وہ۔۔۔دیلا۔۔۔۔'' وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔

خیر دین بے چین ہو گیا۔ پتہ نہیں کیوں، جب اس نے سکینہ کی شادی کی تھی، اسے اسی دن سے ہی گمان سا تھا کہ ایک نا ایک دن ایسا وقت ضرور آئے گا اور اب وہ وقت آ گیا تھا۔ اس نے سکینہ کو اپنی بانہوں میں بھر کر اس کے سر پر پیار کیا۔

''کیا ہوا عدیل نے کچھ کہا ہے؟''

سکینہ نے نفی میں سر ہلایا۔

اس نے اپنے باپ کو دیلے کی اصل حرکت کے بارے میں نہیں بتایا۔ پتہ نہیں اس نے ایسا کیوں نہیں کیا تھا۔ شاید اسے گمان تھا کہ اس کا باپ جتنا اچھا انسان ہے، اتنا جذباتی اور غصے کا بھی تیز ہے۔ اگر اس نے اسے اصل بات بتا دی تو کچھ بڑی بات نہیں کہ اس کا باپ غصے میں آ کر کچھ ایسا کر گزرے، جس پر بعد میں اسے اور سکینہ کو پچھتاوا ہو اور وہ ایسا کچھ کرنا نہیں چاہتی تھی۔

اسے اندازہ تھا کہ ایک نا ایک دن یہ بات ضرور سامنے آئے گی مگر وہ اس بات کو سامنے لانے میں خود پہل کرنا نہیں چاہتی تھی۔

خیر دین کو سکینہ کی بات کا اعتبار نہیں آیا تھا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ دیلے نے ضرور اسے کچھ نہ

کچھ کہا ہوگا۔ ورنہ اس کی سکینہ ایسی نہیں کہ وہ کسی چھوٹی سی بات پر یوں گھر چھوڑ کر چلی آئے۔ وہ اپنی سکینہ سے بخوبی واقف تھا۔ وہ اس کی سمجھدار بیٹی تھی۔ اسے پتا تھا کہ سکینہ کو ہر حال میں اپنا گھر عزیز تھا۔ وہ کسی ناگزیر وجوہات کے بغیر اپنا گھر چھوڑ کر آنے والوں میں سے نہیں تھی۔ خیر دین نے سکینہ سے کہا۔

''پتر! میں کل ہی عدیل سے جا کر اس سلسلے میں بات کرتا ہوں، تو فکر نہ کر سب ٹھیک ہو جائیگا۔''

سکینہ نے خیر دین کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

''ابا! آپ وہاں نہیں جائیں گے، آپ کو میری قسم۔ کیا میں آپ لوگوں پر بوجھ ہوں، جو آپ مجھے آتے ہی وہاں بھیجنا چاہتے ہیں؟''

خیر دین نے نرمی سے اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ ''جھلی کہیں کی، بیٹیاں بھی بھلا باپ پر بوجھ ہوتی ہیں؟ اچھا، جب میرا پتر کہے گا، تب دیلے کا پاس جاؤں گا، اب تو خوش؟ تیرا جب تک دل کرے تو یہاں رہ۔''

سکینہ محبت سے خیر دین کے سینے میں سما گئی تھی۔ کہنے کو تو خیر دین نے سکینہ سے کہہ دیا تھا کہ وہ دیلے کے پاس نہیں جائیگا، مگر سکینہ کے اس طرح منع کرنے پر اس کے شک کو مزید تقویت ملی تھی۔ ضرور ان کے درمیان کوئی بڑی بات ہوئی تھی، جسے سکینہ چھپانا چاہ رہی تھی۔ ایک پل کو اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ اسی وقت ہی دیلے کے پاس جائے اور ساری بات معلوم کرے، پر سکینہ سے وعدہ کرنے کے بعد اسے اس بات پر عمل کرنا گوارہ نہ ہو سکا۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر سب کچھ آنے والے وقت پر چھوڑ دیا۔ دیلے کا خیال آتے ہی سکینہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ وہ اس کا شوہر تھا، اس کا مجازی خدا تھا، اس کے جسم و جان کا ملک تھا مگر۔۔۔۔ اس نے اسے سدھارنے کے جیسے خواب دیکھے تھے، وہ دیلا بالکل نہیں بن سکا

تھا۔

۔۔ حالانکہ اس نے خلوص دل اس کے کام آنے اور اسے اچھا انسان بنانے کی اپنی سی پوری کوشش کی تھی۔ مگر۔۔۔۔۔ وہ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا شخص تھا، جسے اس نے اپنے جسم و جاں میں بسایا تھا۔ اس کی کوتاہیوں اور خامیوں سے صرف نظر کر کے اسے وہ مقام دیا تھا، جس کا ایک اچھا شوہر مستحق ہوتا ہے۔

جب سے اس کی شادی ہوئی تھی، اس نے دیلے کی کسی بات سے بھی انکار نہیں کیا تھا۔ یہاں تک کہ جب اس نے شادی کے فوراً بعد ہی اس کے جہیز کی قیمتی چیزیں فروخت کرنا شروع کر دی تھیں، تو بھی اس نے اسے کچھ نہیں کہا تھا۔

البتہ رات کو جب وہ دونوں ساتھ ہوتے تو وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہتی۔

''آپ نے کل وعدہ کیا تھا کہ آپ رات کو جلدی گھر آ جایا کریں گے۔ آپ نہ چرس وغیرہ پئیں گے اور نہ ہی اپنے آوارہ دوستوں کے ساتھ وقت گزاریں گے۔ مگر آپ نے ابھی تک ایک بھی وعدہ پورا نہیں کیا۔''

دیلا اس کی طرف سے منہ پھیر کر دوسری طرف کر لیتا۔ اس وقت وہ دونوں چارپائی پر لیٹے ہوتے۔

''اچھا، چھوڑ دوں گا سب کچھ کل سے۔ اب سونے دو مجھے۔''

اس کے لہجے میں بیزاریت ہوتی۔ سکینہ ایک گہری سانس لے کر رہ جاتی۔

اچانک اسے خیال آتا کہ وہ یہ سب آسانی سے چھوڑنے والا نہیں ہے، اگر اسے یہ سب چھڑانا ہے تو اسے دیلے کو تھوڑا لالچ دے کر دھیرے دھیرے اس راہ پر لانا ہوگا۔

وہ اس کا رخ اپنی طرف کرتی اور اس کے چہرے پر اپنے لب رکھ دیتی۔ پتہ نہیں کیوں، اسے یقین سا تھا کہ پیار ایک ایسا ہتھیار ہے جس سے بازوؤں تک

کو سدھایا جاسکتا ہے۔ دیلا تو پھر ایک انسان تھا۔
''اچھا آپ صرف میری ایک بات مان لیں تو آپ کی کل کی ''دوائی'' کے پیسے میں خود دوں گی۔''
دیلے کے وجود میں کرنٹ سا دوڑ جاتا اور وہ ایک ہی جست میں اٹھ کر بیٹھ جاتا۔
''سچ!'' اس کے لہجے میں بے یقینی ہوتی۔
''مجھے منظور ہے، تم جو بات کہو گی، مجھے منظور ہے۔ کہو، کیا کرنا ہے مجھے؟''
''آپ اپنے کسی بھی دوست سے ملنے باہر نہیں جائیں گے۔ خاص کر اپنے دوست میدے سے۔ آپ کو جس چیز کی ضرورت ہوگی، وہ آپ کو یہیں مل جایا کرے گی۔''
سکینہ کو یقین تھا کہ اس کے نہ سدھرنے کی وجہ صرف اس کے دوست ہیں۔ خاص کر اس کا دوست میدا ہے، جس کا ذکر وہ کئی بار اپنی باتوں میں کر چکا تھا۔
سکینہ کا خیال تھا کہ اگر کسی طرح دیلے کو اس کے دوستوں سے دور کر دیا جاتا تو اس کے سدھرنے کے کچھ امکانات ہو سکتے تھے۔ اس لیے اس نے دیلے کو لالچ دے کر یہ بات کہی تھی۔ اگر دیلا اس کی بات مان لیتا تو وہ اسے ڈھیرے ڈھیرے تمام برے کاموں سے بھی دور کر دیتی۔ دیلا اس کی بات سنتا تو اس کے چہرے پر مایوسی چھا جاتی۔ وہ مرے ہوئے لہجے میں کہتا۔
''اچھا ٹھیک ہے، نہیں جاؤں گا کل سے گھر سے باہر۔ لاؤ، اب دو کل کی دوائی کے پیسے۔''
سکینہ دل پر پتھر رکھ کر چند روپے اسے پکڑا دیتی۔ دیلا صبح اٹھ کر کہتا۔
''میں ابھی گیا اور دوائی لے کر واپس آیا۔'' مگر وہ واپس ہمیشہ اپنے وقت پر ہی آتا تھا۔ اس کے باوجود سکینہ اپنی کوشش جاری رکھتی۔ اسے جب بھی موقع ملتا، وہ وقتاً فوقتاً دیلے کو برے کاموں سے روکتی۔ اسے اور وہ جانتے ہوئے کہ باز نہیں آئے گا، وہ کچھ نہیں پائی

جب تک سکینہ نے اور اس کے جہیز کے قیمتی سامان نے ساتھ دیا، دیلا اس کی بات سنتا اور اس سے سدھرنے کا وعدہ کرتا رہا تھا، مگر جب سب کچھ ختم ہو گیا تو اس کا بھی سکینہ سے رخ بدل گیا۔ اس دن کے بعد وہ اکثر سکینہ کی اس بات پر چڑ جایا کرتا اور کہتا۔
''الو کی پٹھی! یہ کیا ہر وقت ٹر ٹر کرتی رہتی ہے؟ تو نے اگر میرے ساتھ رہنا ہے تو جیسا میں ہوں، اسی طرح میرے ساتھ رہ۔ نہیں کوئی دوسرا یار کر کے اس کے ساتھ گھر بسا لے۔۔۔''
سکینہ کے دل پر ایک پتھر سا آ لگتا۔
پچھلے کچھ عرصے سے اس نے دیلے کی ماں سے کیا ہوا وعدہ نبھانے اور دیلے کو سدھارنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی، مگر دیلا وہ انسان ہی نہیں تھا۔ جس کا نام سدھرنے والوں کی فہرست میں لکھا ہوتا۔ سکینہ جب اپنی سی کوشش کر کے تھک گئی اور دیلا کسی طور اس کے راستے پر نہ آیا تو بلا خر اس نے دیلے کو دوائی کے پیسے دینے بند کر دیے اور دوسرا اس کے پاس بھی کون سا قارون کا خزانہ تھا؟ صرف ماں باپ کے دیے ہوئے چند سو روپے تھے، جو وہ دیلے کو دیتی رہی تھی۔
جب گھر میں بھی سب کچھ ختم ہو گیا اور سکینہ نے بھی پیسے دینے بند کر دیے تو ایک دن دیلے کا سکینہ پر ہاتھ اٹھ گیا۔ اس نے سکینہ کو پیٹا بھی اور اس کے کانوں سے سونے کی چھوٹی چھوٹی بالیاں بھی اتار کر لے گیا۔
سکینہ کے دل پر جیسے کسی نے کسی تیز دھار آلے سے زخم ڈال دیا تھا۔ وہ دل پر پتھر رکھ کر اس کی اس حرکت کو برداشت کر گئی تھی۔ ہر شوہر اپنی بیوی پر ہاتھ اٹھاتا ہے اگر اس نے بھی اس پر ہاتھ اٹھا دیا تھا تو کون سی بڑی بات ہو گئی تھی۔ مگر سکینہ کو اپنے پٹنے سے زیادہ اس بات کا دکھ تھا کہ دیلا اس کی ماں کی محبت سے پہنائی ہوئی بالیاں اتار کر لے گیا تھا۔ وہ بالیاں سکینہ کی نانی نے اس کی ماں کو دی تھیں اور اس کی ماں نے

تھی۔ وہ بالیاں اسے جان سے بھی زیادہ عزیز تھیں۔
اس کے بعد گھر میں دو چار دن تک امن رہا تھا اور دیلے کی زبان کو بھی کچھ سکون نصیب ہوگیا تھا۔ شاید یہ سکینہ کی بالیوں کا ”کرشمہ“ تھا اور جب اس کرشمے کا اثر ختم ہوا تو وہ دوبارہ اپنی جون میں لوٹ آیا۔ وہ سکینہ کو ایک بار پھر اسی طرح بار بار گالیاں دیتا اور برا بھلا کہتا۔ پھر اچانک ہی ایک دن اس کے اس رویے میں بہت بڑی تبدیلی آگئی۔ اس نے نہ صرف سکینہ کو گالیاں دینا بند کردیں بلکہ وہ اس کی عزت بھی کرنے لگا۔ پہلے ایک دو دن تو سکینہ کا دل دہلا دہلا سا رہا کہ پتہ نہیں کب دیلے کا دماغ پلٹی کھا جائے۔ مگر جب دیلا کا یہ رویہ دو چار دن تک مسلسل برقرار رہا تو سکینہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ گو اس کے سدھرنے کی اسے امید نہیں تھی، مگر پھر بھی سکینہ نے اس کے سدھرنے کی بہت سی منتیں مان لی تھیں۔ اب جو دیلے کے رویے میں اچانک ہی تبدیلی آئی تو سکینہ کو گمان ہونے لگا کہ شاید اس کی منتیں پوری کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ اپنی کوئی مانی ہوئی منت پوری کرتی، اچانک ہی اسے دیلے کی اس تبدیلی کی وجہ بھی معلوم ہوگئی۔ اس رات وہ دونوں ساتھ ہی سوئے ہوئے تھے۔ دیلے نے اسے اپنی بانہوں میں بھر رکھا تھا اور اس کے بالوں کو سہلا رہا تھا۔ ایسا بہت کم ہی ہوتا تھا کہ وہ اتنے پیار سے سکینہ سے پیش آتا ہو۔ یا اسے اس طرح پیار کرتا ہو۔ اس نے سکینہ سے کہا۔

”سکینہ، کیا تم مجھ سے پیار کرتی ہو؟“

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔“

”اچھا، کتنا پیار کرتی ہو مجھ سے؟“

”بہت زیادہ“

”کیا میری ایک بات مانو گی؟“

”آپ کہہ کر تو دیکھیں۔“

”کیا تم میرے کہنے پر، کسی دوسرے مرد کے ساتھ سوسکتی ہو، صرف ایک بار؟“

سکینہ کو اس کی بات سمجھنے میں تھوڑی دیر لگی اور جب بات اس کی سمجھ میں آئی تو وہ تڑپ کر رہ گئی۔

”آپ مذاق کر رہے ہیں نا“ اس کی آواز میں لرزش تھی۔

”نہیں، میں سنجیدہ ہوں“

سکینہ کو یوں لگا، جیسے کسی نے اس کے دل پر پتھر دے مارا ہو، پوری قوت سے۔ دیلے میں ہزاروں عیب تھے اور وہ اسے اس کے تمام عیبوں کے ساتھ قبول بھی کرچکی تھی مگر اب جو دیلے نے یہ بات کہی تھی، اس نے اسے اندر سے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اب اسے دیلے کے دو چار دن محبت سے پیش آنے کی وجہ سمجھ آ رہی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اپنی خواہشوں اور ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اس حد تک بھی گر سکتا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو بمشکل چیخنے اور چلانے سے باز رکھا۔

”اگر آج کے بعد مذاق میں بھی ایسی بات کی تو اس کا انجام بہت برا ہوگا۔“

وہ اس دن پہلی بار اس سے تند لہجے میں مخاطب ہوئی تھی۔ دیلا اس کی بات سن کر جھنجلاتے ہوئے باہر نکل گیا تھا۔ اس کی پچھلے ایک ہفتے کی محنت برباد چلی گئی تھی۔

اگلے دو چار دنوں میں سکینہ کے روکنے کے باوجود وہ اسے غلط کام کے لیے کہتا رہا تھا اور مجبور کرتا رہا تھا۔ جواباً وہ صبر کا کڑوا گھونٹ بھر کر اس کی بات سنتی اور اسے جواب دیتی آئی تھی۔ یہاں تک کہ ایک دن اس نے اس کے انکار کے باوجود بھی ایک نامحرم کو اس کے کمرے میں بھیج دیا تھا۔ وہ تو خدا کا شکر کے اس وقت اس کے ہاتھ میں وہاں پڑی ہوئی ایک چھری لگ گئی تھی، ورنہ عین ممکن تھا کہ وہ اپنی عزت سے ہاتھ دھو بیٹھتی۔

اسے اسی دن ہی معلوم ہوگیا کہ اب اس کا اس گھر میں رہنا ناممکن ہوگیا ہے اور اس کی عزت وہاں محفوظ

نہیں ہے۔ اسے دیلے سے اتنی وقت بے اتنی شدید نفرت محسوس ہوئی، جتنی شادی سے پہلے اس وقت محسوس ہوئی تھی، جب تنہائی میں ایک بار موقع ملنے پر اس نے اس سے بدتمیزی کی تھی۔ جواب میں سکینہ نے اس کی ایسی عزت کی تھی کہ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا تھا۔

اس نے اسی رات ہی دل میں ارادہ کرلیا تھا کہ وہ آج کے بعد ہرگز ہرگز وہاں نہیں رہے گی۔ اس نے جتنے دن وہاں گزارنے تھے، گزار لیے۔ اب وہ زندگی کے جتنے دن گزارے گی، اپنے ماں باپ کا گھر گزارے گی۔ وہاں سب کچھ تھا۔ اگر وہاں اور کچھ نہ بھی ہوتا، کم سے کم وہاں اس کی عزت تو محفوظ تھی۔

اور پھر صبح، فجر کی اذان کے وقت اس نے اپنے کپڑے باندھے اور اپنے ماں باپ کے گھر چل دی تھی اور اب رہ رہ کر اس کا دل ان گزری ہوئی باتوں کو یاد کرتا تھا اور خون روتا تھا۔ اسے خیال آتا کہ کاش وہ اسی وقت ہی دیلے سے شادی سے انکار کر دیتی، جب اس کی بو اس کے لیے دیلے کا رشتہ مانگنے کے لیے آئی تھی۔

پر وہ چاہنے کے باوجود ایسا نہیں کر سکی تھی۔ اس کی تربیت ہی ایسی نہیں کی گئی تھی کہ وہ بزرگوں کے سامنے اس طرح منہ پھاڑ کر انکار کر دیتی۔ اس نے تقدیر کے لکھے کو چپ چاپ مان لیا تھا اور اس کے بعد اس نے اپنی اور دیلے کی تقدیر کو بدلنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی، مگر اپنی اور دیلے کی لکھی ہوئی تقدیر بدلنا اس کے بس سے باہر تھا۔

......☆☆......

کوثر گھبرائی ہوئی سی عابی کے ساتھ چوہدریوں کے پلاٹ میں پہنچی تو وہاں شانی موجود نہیں تھا۔ البتہ زمین پر بکھرے خون کے چند قطرے اس بات کے گواہ تھے کہ شانی کچھ دیر پہلے تک وہاں ضرور موجود رہا ہے۔ آس پاس سے معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ شانی کو زخمی حالت میں دیکھ کر، امام بارگاہ کا خادم، شبیر حسین اسے ڈاکٹر منظور کے کلینک پر پٹی کرانے لے گیا ہے۔

کوثر کا دل چاہا کہ وہ اسی وقت ڈاکٹر منظور کے کلینک پر جائے اور اسے اپنے ساتھ لے کر آئے۔ مگر دوسرے ہی پل اس نے یہ خیال اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ ڈاکٹر منظور کا کلینک بستی کے آخری سرے پر تھا اور وہاں پیدل آنے جانے میں کافی دیر لگ سکتی تھی۔ وہ گھر میں شمے کو بتا کر بھی نہیں آئی تھی کہ وہ شانی کو لینے جا رہی ہے۔ دوسرا جب وہ گھر سے آئی تھی بانو بھی رو رو کر بے حال ہو رہی تھی، جسے مریم سنبھالنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ پہلے وہ گھر جا کر شمے کو شانی کے بارے میں بتائے، بانو کا پتہ کرے اور پھر وہ شانی کا پتہ کرنے کے لیے ڈاکٹر منظور کے کلینک پر جائے۔ اس نے اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو پونچھا اور اپنے قدم گھر کی طرف بڑھا دیے۔ اس کا دل شانی کا تصور کر کے بار بار ہول رہا تھا۔ پتہ نہیں وہ کیسا تھا، کس حال میں تھا۔ اس کے دل سے رہ رہ کر دعا نکل رہی تھی کہ کاش شانی کو زیادہ چوٹ نہ آئی ہو۔

......☆☆......

اس پوری بستی میں صرف ایک ہی ہوٹل تھا اور وہ چوک میں تھا۔ اس چھوٹے سے ہوٹل کے مالک کا اصل نام تو صغیر حسین تھا مگر بستی کے لوگوں اسے حاجی چاچا کے نام سے پکارتے تھے۔ حاجی اس کا الٹا نام تھا اور چاچا اسے بزرگی کی وجہ سے کہا جاتا تھا۔ وہ پچاس کے لگ بھگ تھا اور اسی بستی کا مکین تھا۔ کچھ سال پہلے تک وہ گدھا گاڑی چلاتا تھا، پر جب ایک حادثے میں گدھا ہلاک ہو گیا، گاڑی ٹوٹ پھوٹ گئی تو اس نے بستی میں چھوٹا سا ہوٹل کھول لیا، جو کچھ ہی عرصے میں چل نکلا تھا۔ شروع میں وہ چھوٹا سا ایک چائے کا ہوٹل تھا، جہاں لوگ وقت گزارنے اور چائے پینے کے لیے آتے تھے۔ پھر صغیر حسین نے ایک

کاریگر رکھ کر روٹی اور سالن کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔ چائے کا کام تو ٹھیک چل رہا تھا، اس کے ساتھ کھانے پکانے کا کام بھی چل نکلا۔ اس نے اپنے ہوٹل کو مزید پُرکشش بنانے کے لیے ایک بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی بھی لا کر رکھ دیا تھا، جس کے آنے کے بعد ہوٹل کا کام اور لوگوں کی آمد و رفت اور بڑھ گئی تھی۔ اس بستی میں صرف دو ہی ٹی وی تھے۔ ایک چوہدریوں کے گھر میں، دوسرا اصغیر حسین کے ہوٹل پر۔ اس بستی کے کئی لوگوں نے ٹی وی کا نام تو سن رکھا تھا مگر اسے دیکھنے کا اتفاق، انہیں پہلی بار ہوا تھا۔ سو جب سے وہاں ٹی وی آیا تھا، بستی کے اکثر لوگوں نے وہاں وقت گزارنا شروع کر دیا تھا۔ جن میں دیلا اور میدا بھی تھے۔ صغیر حسین اپنے اصول کر کھرا بندا تھا۔ وہ ٹی وی کے سامنے صرف انہی لوگوں کو بیٹھنے دیتا، جو وہاں چائے پیتے یا کھانا کھاتے تھے، باقی افراد کو وہ کچھ دیر بعد ہی چلتا کر دیتا تھا۔ بہت سے لوگ اکثر اس کے اس رویے سے ناراض ہو کر وہاں سے چلے گئے تھے۔ کئی لوگوں نے اسے مغرور اور بے مروت بھی کہا تھا مگر اس نے کبھی ان کی پروا نہیں کی تھی۔ اگر وہ مفت میں مفت خوروں کو اپنے ہوٹل پر بیٹھے رہنے دیتا تو پھر اس نے کما کر کھا لینا تھا۔ سو جو بھی مفت خوروں کی بھیڑ جمع ہوتی، وہ فوراً ہی ان کو وہاں سے چلتا کر دیتا، تاکہ وہاں آنے والے گاہکوں کو آسانی سے جگہ مل سکے۔

......☆☆......

کوثر گھر میں داخل ہوئی تو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہہ رہے تھے۔ شما جو اس کے خلاف بھرا بیٹھا تھا اور اس کے نہ ملنے کی امید میں دل چھوڑے بیٹھا تھا، اسے دیکھ کر ایک اطمینان کی سانس لے کر رہ گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ کوثر کو آتے ہی گالیوں کے دو چار تحفوں سے نوازے گا، مگر کوثر کے بہتے ہوئے آنسوؤں نے اس کی زبان پر تالا ڈال دیا۔ شمے کے پوچھنے پر اس نے روتے ہوئے اسے ساری بات بتا دی۔ اسی دوران شاہ جی کی دکان پر گیا ہوا دیلا بھی لوٹ آیا تھا۔ کچھ باتیں اس نے بھی سن لی تھیں۔ کوثر نے شمے سے مزید کہا۔ ''میں بانو کو دودھ دے کر شانی کا پتہ کرنے جاتی ہوں۔ پتہ نہیں میرا بچہ کس حال میں ہوگا؟''

اس کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔ شاہ جی نے کہا۔

''بھابھی جی، تم عورت ذات ہو کر کہاں ماری ماری پھرو گی۔ منظور کا کلینک یہاں سے کافی دور ہے۔ آنے جانے میں بہت وقت لگ جائے گا۔''

اس نے اپنی بائیک کی چابی دیلے کی طرف بڑھائی۔ ''جا، تو جا کر شانی کو لے آ۔''

اس نے اپنی جیب سے بیس روپے نکالے۔

''اور یہ پیسے بھی لیتا جا، بچے کے لیے کچھ پھل فروٹ لیتے آنا۔''

کوثر کے آنسو بہتے رہے۔

دیلا جب ڈاکٹر کے کلینک پر پہنچا تو شبیر حسین شانی کے سر پر پٹی کرا کر کلینک سے باہر نکل رہا تھا۔ دیلے نے اس سے کہا۔

''بزرگو! اب بچے کو میرے حوالے کر دو۔ اس کے ماں باپ نے اسے لینے کے لیے مجھے بھیجا ہے۔ آپ کی بڑی مہربانی۔۔۔''

شبیر حسین نے اسے ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا۔ اسے ذاتی طور پر دیلے جیسے انسان پسند نہیں تھے۔

''ٹھیک ہے، اسے لے جانا ہے تو لے جاؤ، پر ڈاکٹر نے کہا ہے کہ خون کافی بہہ جانے سے بچہ کمزور ہو گیا ہے۔ اسے دو چار دن اچھی خوراک دی جائے، تاکہ جو خون ضائع ہو چکا ہے، اس کی کمی پوری ہو سکے۔ اور دو دن بعد آ کر، نئی پٹی بھی کرانی ہے''

''میں کہہ دوں گا، آپ بے فکر ہو جاؤ۔'' دیلا شانی کو لے شمے کے گھر پہنچا۔ اسے کوثر کے حوالے کیا تو وہ اسے بانہوں میں بھر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسے یہاں وہاں سے چومنے لگی۔ شانی بیچ میں

بہت کمزور ہو گیا تھا اور خون زیادہ بہہ جانے سے اس کا اپنے پیروں پر کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ کوثر اسے اپنا سہارا دے کر کمرے میں لائی اور چارپائی پر لٹا کر اس کے بازو اور ٹانگیں دبانے لگی۔ اس کے اب بھی آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ رو بھی رہی تھی اور ساتھ ساتھ شانی کو زخمی کرنے والے کو بددعائیں بھی دیئے جا رہی تھی۔

شما، دیلے کے سہارے کمرے میں آ گیا۔ شاہ جی بھی ان کے ساتھ تھا۔ اس نے کوثر کو حوصلہ دیا۔

''پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ بچے کو کچھ نہیں ہوا۔ بس تھوڑی سی کمزوری ہے، وہ دور ہو جائے گی تو بھاگنے دوڑنے لگے گا۔''

دیلے نے بھی تائید کی۔

''ہاں جی، ڈاکٹر نے بھی یہی کہا ہے کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ بس بچہ ذرا کمزور ہے، اس کے کھانے پینے کا خیال رکھا جائے تو کچھ دنوں میں ہی ٹھیک ہو جائے گا۔''

اس کے ساتھ اس نے شاہ جی کے پیسوں سے لیے ہوئے سیب اور کیلے بھی کوثر کی طرف بڑھا دیے۔

کوثر ان دونوں کو ذاتی طور پر پسند نہیں کرتی تھی۔ بلکہ اسے ان سے نفرت تھی، مگر اس وقت اس کا دل ان دونوں کا شکر گزار ہو رہا تھا، جو شانی کے لیے اتنا کچھ کہہ رہے تھے اور کیا تھا۔ شاہ جی اور دیلا کچھ دیر مزید وہاں رہے اور کوثر اور شمے کو تسلی دینے کے بعد واپس چلے گئے۔

......☆☆......

سکینہ کے جانے کے بعد دیلا ایک بار پھر اسی مقام پر آ کھڑا ہوا تھا، جہاں پہلے تھا۔ نشے پانی کی تو جو پریشانی اسے لاحق تھی سو تھی، اب دو وقت کے کھانے کا عذاب بھی اس کے سر پر آ پڑا تھا۔ سکینہ کے ہوتے ہوئے کم سے کم اسے کھانے پینے کی کبھی کوئی پریشانی لاحق نہیں رہی تھی۔ سکینہ کا باپ ان دونوں کا کھانے پینے کا سامان وہاں بغیر کسی کے کہے پہنچا جایا کرتا تھا۔

سکینہ کا خیال آتے ہی اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی۔ وہ اسے دل ہی دل میں دو چار گالیاں دے کر اپنے من کی بھڑاس نکال لیتا تھا۔ وہ اپنی ان تمام پریشانیوں کی وجہ اسے ہی سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر سکینہ اس کی بات مان لیتی تو آج وہ بھی خوش ہوتی اور اسے بھی ان پریشانیوں کا سامنا نہیں ہوتا۔ اس کے کھانے پینے اور نشے پانی کا بندوبست اکثر میدا ہی کرتا تھا۔ وہ خود اپنا گزارا کبھی ادھر اُدھر ہاتھ مار کر کر لیتا تھا۔ گزر تو خیر میدے کی بھی ہو رہی تھی مگر اس کے دل کا سکون ختم ہو گیا تھا۔ آنے والا کوئی دن ایسا نہیں تھا کہ جس کے بارے میں اسے امید ہو کہ کل صبح وہ اٹھے گا تو اسے دو وقت کا کھانا اور نشے پانی کا خرچہ پڑا ہوا ملے گا۔ اس دن بھی وہ اپنی طلب پوری کرنے کے لیے گھر سے نکلا اور میدے کی طرف چل دیا مگر میدا، جہاں جہاں اسے اس کے ملنے کی امید تھی، وہ وہاں کہیں نہیں ملا۔ کسی نے اسے بتایا کہ اس نے میدے کو حاجی کے ہوٹل پر دیکھا ہے۔ وہ وہاں پاکستان کا میچ دیکھ رہا ہے وہ 1992 کا سن تھا۔ پاکستان کا ورلڈ کپ کا فائنل میچ تھا۔ دیلے نے اپنے قدم حاجی چاچا کے ہوٹل کی طرف بڑھائے دیے۔ اسے میدا دور سے ہی دکھائی دے گیا۔ ایسا نہیں تھا کہ میدا کرکٹ کا شوقین تھا، نہیں، ایسا بالکل نہیں تھا۔ اس کی وہاں ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس دن پاکستان کا ورلڈ کپ کا فائنل میچ تھا، سو سب کی طرح وہ بھی وہاں میچ دیکھنے کے لیے رکا ہوا تھا اور سب کی طرح میدے نے بھی حاجی چاچا کے ہوٹل کا رخ کر رکھا تھا۔

اس بار حاجی نے کسی سے روک ٹوک نہیں کی تھی۔ وہ خود میچ کا شوقین تھا۔ سو اس دن اس نے ٹی وی باہر رکھا ہوا تھا اور پورا چوک لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ بچے بھی وہاں موجود تھے۔ بچوں کو کرکٹ کا تو زیادہ پتہ نہیں تھا، مگر آج کے لیے ٹی وی

ایک کمال کی چیز تھی۔ جس میں چھوٹے چھوٹے کالے اور سفید رنگ کے لوگ ادھر ادھر بھاگ کے پکڑتے تھے، باتیں کرتے تھے اور ان کی تفریح کا باعث بنتے تھے۔

میدے کے لاکھ انکار کے باد جود دیلا اسے اپنے ساتھ کھینچ کر وہاں سے دور لے آیا۔ وہ کچھ فاصلے پر آئے تو میدے نے خفا ہوتے ہوئے کہا۔

''یار کتنا زبردست مقابلہ چل رہا تھا، سارا مزہ خراب کر دیا تو نے۔ ایسی بھی کیا آفت آ گئی تھی کہ مجھے یہاں کھینچ لایا؟''

اس کا موڈ خراب تھا۔

''میچ کو دفع کر یار، ہمیں کسی کی ہار جیت سے کیا۔ یہ بتا، کوئی نیا کام دھندہ سوچا ہے کرنے کو یا نہیں؟''

''مجھے تو کوئی نیا کام سمجھ نہیں آ رہا۔ میں نے بہت سوچا پر۔۔۔''

دونوں اس موضوع پر کافی دیر تک بات کرتے اور سوچتے رہے اور اسی دوران وہ خادی کے ڈیرے پر جا نکلے۔ خادی ان کی مالی حیثیت سے اچھی طرح واقف تھا۔ اسے پتا تھا کہ وہ دونوں کنگال اور ضرورت مند ہیں۔ خود اسے بھی ان دنوں اپنے کام کے لیے ایسے دو بندوں کی ضرورت تھی، جو اس کے ساتھ مل کر اس کا کام کرتے۔

اس کے ساتھ جو دو بندے کام کرتے تھے، وہ کام چھوڑ کر کسی دوسرے شہر میں چلے گئے تھے۔ خادی نے ان دونوں کو دیکھا تو اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ دونوں اس کے کام آ سکتے ہیں۔ اس نے ان دونوں کو اپنے پاس بٹھایا اور بڑی بے تکلفی سے دیلے کے ایک کندھے پر بازو حمائل کر دیا۔ ''سناؤ جگر! آج کل کیا ہو رہا ہے؟''

اس کے لہجے میں بے تکلفی تھی۔ پتہ نہیں کیوں دیلے کے دل میں بے اختیار پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ وہ دن بھی کتنے خوب تھے، جب اس کی خادی سے دوستی ہوا کرتی تھی اور وہی ان کے نشے پانی کا خرچہ اٹھاتا تھا۔ دیلے کی بجائے میدے نے کہا۔

''بس خادی بھائی، کچھ نا پوچھو۔ کام کاج کوئی ملتا نہیں ہے اور نشے پانی سے بہت تنگ آئے ہوئے ہیں۔ میری تو خیر ہے۔ پر مجھ سے زیادہ دیلا پریشان ہے'' خادی بولا۔

''میرے پاس ایک کام ہے، اگر تم دونوں کرو تو۔۔۔ تم دونوں کا نشہ پانی بھی فری ہو گا اور سو سو روپے بھی ہر چکر پر دونوں کو ملیں گے۔''

''کام کیا ہو گا؟''

''کام یہی ہے، جو میں کرتا ہوں۔ میرے ساتھ پہلے عظیم اور باجا کام کرتے تھے۔ کچھ دن پہلے وہ کام چھوڑ کر کراچی نکل گئے ہیں۔ تمہارا کام یہ ہو گا کہ ہر ہفتے چوتھے دن، تمھیں میری بتائی ہوئی جگہ سے مال لے کر آنا ہے بس۔۔۔ جگہ میں تمھیں دکھا دوں گا۔'' دیلے کو مایوسی ہوئی۔ وہ کسی اور کام کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔

''مگر یہ تو بہت خطرناک کام ہو گا؟''

''اس میں خطرہ کیا ہے۔ تمھیں بس جانا ہے اور مال لے کر آنا ہے''

''اگر پولیس وغیرہ نے پکڑ لیا تو؟''

''ان کی فکر مت کرو۔ ہفتے کی ہفتے میں انہیں منتھلی پہنچا دیتا ہوں۔ وہ کچھ نہیں کہیں گے۔ تم ایک دو بار یہ کام کر کے دیکھو، اگر مناسب لگے تو کرنا، ورنہ چھوڑ دینا۔''

میدے نے دیلے کی طرف دیکھا۔

''کیا خیال ہے؟''

''جو تجھے ٹھیک لگے۔''

ان کے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا

''ٹھیک ہے خادی بھائی، ہمیں منظور ہے۔ اگر ہمیں یہ کام مناسب لگا تو ہم آگے بھی کرتے رہیں گے ورنہ جب ہمارا دل کرے گا چھوڑ دیں گے۔ چلو اب ایک ایک بھری ہوئی سگریٹ پلاؤ۔ ہم دونوں کو بہت

طلب ہو رہی ہے۔"
خادی نے دو سگریٹ جلا کر ان دونوں کو تھمائے اور پوچھا۔
"کیا خیال ہے، آج ہی دکھا آؤں تمھیں وہ اڈا؟ اصل میں، مال ختم ہوا پڑا ہے۔ میں نے ویسے بھی مال لینے جانا ہے۔ سوچتا ہوں کہ تمھیں بھی ساتھ لیجاؤں۔ تم بھی وہ جگہ دیکھ لینا۔ شہر بھی تو پاس نہیں ہے، آنے جانے کا بہت مسئلہ ہوتا ہے۔"
"ٹھیک ہے، جیسے تم کہو۔"
خادی اسی شام ہی ان دونوں کو اپنے ساتھ لے کر گیا اور وہ مخصوص اڈا دکھا آیا۔ ساتھ ہی وہ ان کا تعارف بھی کرا آیا کہ اب وہ دونوں اس کا مال لینے آئیں گے۔
اگلے کچھ دن دیلے اور میدے کے بہت مزے میں گزرے۔ وہ ہر ہفتے، چوتھے دن جاتے اور خادی کا مال لا کر اسے تھما دیتے۔ مال لے کر، خادی نا صرف ان دونوں کو سو سو روپے دیتا، بلکہ ان کی ضرورت کے مطابق ان کو مخصوص تعداد میں چرس بھی دیتا۔ دیلا اور میدا یہ کام کر کے بہت خوش تھے۔ دیلا، حاجی کے ہوٹل سے کھانا کھا لیتا تھا اور اس کی باقی ضرورتیں خادی پوری کر دیتا تھا۔ ایسا ہی کچھ حال میدے کا تھا۔
مگر ان کی خوشی کے یہ دن بہت مختصر ثابت ہوئے۔ ایک دن وہ خادی کا مال لے کر آ رہے تھے کہ راستے میں پولیس والوں کے ہاتھوں دھر لیے گئے۔ ان دونوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان دونوں کو بھی ایسی صورت حال کا بھی سامنا کرنا پڑ سکتا ہے اور نہ ہی انہیں خادی نے اس بارے میں کبھی کچھ کہا تھا کہ اگر کبھی ایسی کسی صورت حال کا سامنا ہو تو اس سے کیسے نمٹا جائے؟ پولیس والے انہیں دھر لینے بعد سیدھا تھانے میں لے گئے تھے اور ان دونوں کی وہ "خاطر مدارت" کی کہ ان دونوں کو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا تھا۔
جب انہیں سب انسپکٹر کے سامنے پیش کیا گیا تو ان دونوں کا بہت برا حال تھا۔ ان کو سب انسپکٹر کے سامنے پیش کرنے والے ایک کانسٹیبل نے کہا۔
"سر جی! ان دونوں کو کافی بھاری مقدار میں چرس کے ساتھ گرفتار کیا ہے ہم نے۔ لگتا ہے کہ نئے پنچھی ہیں پر انہیں پتہ نہیں ہے کہ۔۔۔۔"
سب انسپکٹر نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔ اسے پہلے ہی اس بارے میں ساری معلومات مل چکی تھی۔
"ہاں بھئی شہزادو! کب سے یہ کام شروع کیا ہے؟ سیدھی طرح سچ سچ بتا دو، نہیں تو اگلی بار اندر سے باہر آؤ گے تو اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں ہو گے۔"
میدا گڑگڑاتے ہوئے اس کے قدموں میں گر گیا۔
"سر جی! غلطی ہو گئی ہم سے، معاف کر دو۔ آج کے بعد ہم ایسا کچھ نہیں کریں۔" سب انسپکٹر نے ایک کرارا سا تھپڑ اس کے منہ پر جڑا۔
"جو بات پوچھی ہے، صرف اس کا جواب دو۔"
سب انسپکٹر کے گرجدار لہجے اور تھپڑ نے میدے کی شلوار گیلی کر دی۔ وہ زمین پر گر کر تھر تھر کانپنے لگا۔
انسپکٹر نے نفرت سے اسے دیکھا اور ایک کانسٹیبل سے کہا۔
"اس ماں کے یار کو کمرے سے باہر لے جاؤ۔ سارا کمرا ناپاک کر دیا سور کے بچے نے۔۔۔۔"
میدے کا حال دیکھ کر دیلے کا بھی پیشاب خطا ہونے کے قریب تھا۔ اس کے دل میں پولیس والوں کا جو خوف تھا، آج اس سے اس کا سامنا ہو گیا تھا اور اس کے بعد جو اس کا حال تھا وہ صرف وہی جانتا تھا۔ میدے کے کمرے سے جانے کے بعد وہ دیلے سے مخاطب ہوا۔
"ہاں بھئی۔۔۔ اب تو سچ بتائے گا یا پھر۔۔۔۔"
"سر جی۔۔۔ ہم نے تو پہلے ہی ان لوگوں کو سچ

بتا دیا ہے اور اب آپ کو بھی وہی بتائیں گے جو سچ ہے۔۔۔''

وہ عورتوں کی طرح آنسو بہا رہا تھا

''کب سے یہ کام کر رہے ہو؟''

''تت۔۔۔تین ہفتے ہوگئے ہیں۔۔۔''

''اپنا کام کرتے ہو یا۔۔۔۔۔؟''

''نہیں جی۔۔۔۔خادم حسین کے لیے کام کرتے ہیں۔آپ کسی کو بھیج کر اس بات کی تسلی کرالیں۔۔۔اگر یہ بات سچ نہ نکلے تو جو چور کی سزا وہ ہماری۔۔۔۔''

وہ اب روتے روتے ہچکیاں لینے لگا تھا۔حیات اللہ نے اسے ایک گالی دی۔

''دو گشتی کے بچے! اب یہ ٹسوے بہانہ بند کر۔نہیں تو۔۔۔''

وہ دوسرے کانسٹیبل سے مخاطب ہوا

''خادی کو کو جانتے ہونا؟''

''کمال کرتے ہیں سر۔یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔اچھے سے جانتا ہوں۔''

''فوراً جا کر اس کا پتہ کرو کہ یہ اسی کے بندے ہیں یا۔۔۔اگر ان کی بات جھوٹی نکلے تو انہیں ایک دن تک الٹا لٹکا کر رکھنا۔پھر ان کا میں خود فیصلہ کروں گا۔اور اگر ان کی بات سچ نکلے تو خادی سے اس بار کا سارا مال بھی ضبط کر لینا اور اس سے اس بار دوگنا منتھلی بھی وصول کرنا کہ اس نے اپنے بندے تبدیل کیے تو اس بارے میں بتایا کیوں نہیں؟ خود بھی پریشان ہوا اور ہمیں بھی پریشان کیا۔۔۔۔'' خادی تک جب یہ پیغام پہنچا اور اس نے تھانے پہنچ کر ان دونوں کا سامنا کیا تو وہ دونوں بہت برے حال میں تھے۔کچھ تھانے والوں کی مہربانی تھی، کچھ ان کا خوف سے برا حال تھا۔خادی بہت بھاری ''جرمانہ'' بھر کر انہیں اسی دن تھانے سے چھڑا لایا۔ان دونوں کے بدن بہت بری طرح دکھ رہے تھے۔دیلے کو بے اختیار وہ دن یاد آ رہے تھے، جب ایک بار چوری کرتے ہوئے پکڑے جانے پر بستی والوں نے ان کی مرمت کی تھی اور دو دن تک اسی طرح اس کا بدن دکھتا رہا تھا۔

دیلے کے گھر میں نہ ہی ماں تھی اور نہ ہی بیوی، جو اس کے درد سے چور وجود پر سکھ کا مرہم رکھتی۔خادی نے انہیں ایک ڈاکٹر سے درد اور سکون کی کچھ دوائیاں دلائیں اور ان کو رخصت کر دیا۔میدا اور دیلا اس بار بھی دو دن بعد کہیں چلنے پھرنے کے قابل ہو سکے تھے، پھر بھی ان کا وجود دکھتا رہا تھا۔پولیس والوں کی دہشت کچھ ایسی دیلے اور میدے کے دل پر بیٹھ گئی تھی کہ خادی کا سامنا ہونے پر انہوں نے صاف صاف کہہ دیا، وہ اب اس کے لیے کام نہیں کریں گے۔اگلی بار وہ پولیس کے ہاتھ چڑھ گئے تو وہ انہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

خادی نے انکا حوصلہ بڑھانا چاہا۔

''یار وہ ایک غلط فہمی تھی۔انہیں پتہ نہیں تھا کہ تم لوگ میرے لیے کام کرتے ہو۔اگر انہیں پتہ ہوتا کہ تم میرے بندے ہو تو وہ تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔۔۔اب انہیں پتہ چل گیا ہے، وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔میں ہر ہفتے انہیں منتھلی دیتا ہوں۔وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔''

مگر ان دونوں کو اس کی بات پر یقین نہ آیا۔وہ وہاں سے واپس چلے آئے۔اب انہیں خادی کی کسی بات کا بھروسہ نہیں تھا۔پچھلی بار بھی خادی نے انہیں یہی کہا تھا مگر خادی نے انہیں یہ بتانے سے گریز کیا تھا کہ ہر بار جب بھی بندے تبدیل ہوتے تھے، اسے دوگنا منتھلی ادا کرنا پڑتی تھی۔اس بار اس نے جان بوجھ کر تھانے میں اس بات کی اطلاع نہیں دی تھی۔نتیجتاً اس کا بھی اچھا خاصا نقصان ہوگیا تھا اور وہ دونوں بھی زیرِ عتاب آ گئے تھے۔

☆☆☆

کوثر دنیا کی ان خوش قسمت اور بدقسمت عورتوں میں سے ایک تھی، جن پر خوشیاں مہربان تو ہوتی ہیں،

پر زیادہ عرصے تک مہربان نہیں رہتیں۔

اس کے ماں باپ بچپن میں ہی عدم کو سدھار گئے تو اس کی ذمہ داری بڑے بھائی کے کندھوں پر آ پڑی۔ جب تک وہ بچپن اور لڑکپن کے دور سے گزرتی رہی، اس کا دانہ پانی بھائی کے گھر میں لکھا رہا، مگر جونہی اس نے سن بلوغت میں قدم رکھا، اس کے بھائی نے بیوی کے کہنے پر فوراً ہی اس کے ہاتھ پیلے کر دیے۔ اس کی بیوی جلد از جلد اس عذاب کو اپنے گھر سے نکالنا چاہتی تھی۔

خود کوثر کی زندگی وہاں کہاں چین سے بسر ہو رہی تھی؟ سو جب وہ پیا گھر سدھار کر شمے کے گھر آئی تو اس نے بھی خدا کا شکر ادا کیا۔ شما گو بہت امیر و کبیر انسان نہیں تھا مگر اس کا ایک ذاتی گھر تھا، جس میں کچی اینٹوں سے بنا ایک کمرا تھا، جس میں وہ صرف اکیلا رہتا تھا۔

ماں باپ اور بہن بھائی جیسے ہر رشتے سے وہ آزاد تھا۔ بینک میں چند ہزار موجود تھے اور اس کا ایک ذاتی تانگا تھا جو اس کا ذریعہ آمدنی تھا۔ معلوم نہیں اس نے کوثر کو کہاں دیکھا تھا کہ وہ چھوٹی موٹی سی لڑکی سیدھی اس کے من میں اتر گئی تھی۔ وہ ابھی تک شادی کے بندھن میں نہیں بندھا تھا، گھر میں کوئی بزرگ شخصیت بھی نہیں تھی جو اس کے رشتے کے لیے کہیں جاتی۔

سو اسے اپنا مدعا پاس کی اس خالہ کے پاس لے کر جانا پڑا، جس نے آس پاس کے بہت سے رشتے کرائے تھے۔ خالہ میدو نے اس کا رشتہ بھی خوش اسلوبی سے طے کرا دیا تھا اور یوں کوثر اس کی دلہن بن کر اس کی زندگی میں آ گئی تھی۔ اس کے چند ماہ تو کوثر کے ساتھ بہت اچھے گزرے اور پھر اس کا کوثر سے من بھرنے لگا۔ وہ شادی سے پہلے بھی اپنی جنسی خواہش ناجائز طریقے سے پوری کرتا تھا۔ شادی کے کچھ عرصے بعد پھر اسی عادت پر آ گیا۔ اس حوالے سے اس کی دیلے کے ساتھ دوستی اور یارانہ تھا۔ ان دنوں شمے کا کام ٹھیک ٹھاک تھا۔ روزانہ بیس، تیس کی دیہاڑی بنا آتا تھا۔ جس میں سے وہ آدھی دیلے پر خرچ کر دیتا تھا۔

مگر اس کی عیاشی کا یہ سلسلہ اس وقت آ کر تھما، جب ایک دن کام سے آتے ہوئے اس کا بہت بری طرح ایکسیڈنٹ ہوا۔ تانگا ٹوٹ کر کئی حصوں میں بٹ گیا۔

گھوڑا موقع پر ہی دم توڑ گیا اور وہ خود ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی دونوں ٹانگوں سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کی زندگی میں بھی ایسے دن بھی آ سکتے ہیں۔

مگر اب نا صرف اس کی زندگی میں ایسے دن آ چکے تھے، بلکہ وہ ان سے دو چار بھی تھا۔ گھر میں جو دو چار پیسے جمع تھے، وہ سب اس کے علاج پر خرچ ہو گئے اور جب وہ ٹھیک ہو کر گھر آیا تو گھر میں دیکھنے کو ایک بھی پیسہ نہیں تھا۔ تب تک اس کی شادی کو بارہ، تیرہ برس گزر چکے تھے اور وہ دو بچوں کا باپ بن چکا تھا۔

گھر میں فاقوں کی نوبت آئی تو کوثر کو شمے سے اجازت لے کر اپنے قدم گھر سے باہر نکالنے پڑے شمے نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر اسے یہ اجازت دی۔ اس بستی میں صرف ایک ہی کھاتا پیتا گھرانہ تھا اور وہ تھا چوہدریوں کا۔ کوثر نے کام کے سلسلے میں بڑی چوہدرانی سے بات کی تو اسے حویلی میں مناسب تنخواہ پر کام مل گیا، جس سے گھر والوں کے کھانے پینے کی ضرورت پوری ہونے لگی۔

اور یوں کوثر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بڑے چوہدری کے گھر میں کام پر لگ گئی۔ شروع شروع میں جب وہ کام پر جاتی تھی تو پردہ کرتی تھی۔ مگر جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ اس طرح وہ زیادہ عرصہ نہیں چل سکے گی۔ سو اسے اپنا برقع اتارنا پڑا۔

اس کی صورت سے بستی کی صرف چند ہی عورتیں واقف تھیں مگر جلد ہی اس کی شکل و صورت سے اور بھی

بہت سے لوگ واقف ہو گئے اور اس پر مرمٹے سب کو جلد ہی پتہ چل گیا کہ وہ شمے کی بیوی ہے اور ضرورت مند ہے۔ گھر کی ضرورتیں ہی اسے گھر سے باہر لے آئی ہیں۔

وہ بہت خوبصورت تھی اور یہ خوبصورتی اسے قدرت کی طرف سے ملی تھی۔ بہت سے لوگ پیسے کے زور پر یہ خوبصورتی خریدنا چاہتے تھے۔ اس حوالے سے بہت سے لوگوں نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا، مگر کوثر نے کسی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ وہ حویلی سے عزت کی روٹی کما رہی تھی اور شمے اور بچوں کو کھلا رہی تھی۔ یہی اس کے لیے بہت تھا۔

گناہ کی پوری چپاتی سے عزت کے ایک نوالے کو وہ بہتر سمجھتی تھی۔ کوثر پر پہلی ہی نظر میں مرمٹنے والوں میں شاہ جی سرفہرست تھا۔

اس نے کوثر کو پہلی بار برقعے میں اس دن دیکھا تھا، جب وہ اس کی دکان پر کچھ ضرورت کا سامان لینے آئی تھی۔ جب وہ سامان لے کر چلی گئی تو شاہ جی نے ساتھ کھڑے ہوئے شخص سے پوچھا۔ ''یار یہ عورت کون تھی؟ اسے پہلی بار دیکھا ہے اپنی دکان پر۔۔۔''

ساتھ والا شخص اس کی لاعلمی پر مسکرا دیا۔

''کمال ہے۔ تو اسے نہیں جانتا۔ یہ شمے کی بیوی ہے''

''تجھے کیسے پتہ کہ وہ شمے کی بیوی ہے؟''

''ایسا برقع، پوری بستی میں صرف وہی پہنتی ہے۔ ویسے یار سننے میں آیا ہے کہ شمے کی بیوی بہت خوبصورت ہے، کاش ایک نظر ہمیں بھی دیدار ہو جاتا۔'' اس شخص کے اس تبصرے نے شاہ جی کو بے چین کر دیا۔ وہ شراب اور شباب کا دیوانہ تھا۔ بہت سی جگہوں سے اپنے من کی مرادیں پوری کر چکا تھا اور اب فیضو کمہار کی بیوی سے تعلق قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ چالیس سال کا ایک صحت مند شخص تھا اور ابھی تک غیر شادی شدہ تھا۔ وہ اس بات کا قائل تھا کہ جب دودھ باہر سے ہی مل جائے تو پھر گھر میں بھینس باندھنے کی کیا ضرورت ہے؟ بستی میں پرچون کی سب سے بڑی دکان اسی کی تھی۔ سو مردوں کے ساتھ اکثر عورتیں بھی وہاں سامان لینے آتی رہتی تھیں۔ جن میں غریب عورتوں کی تعداد زیادہ ہوتی۔ جنہیں مجبوری کے عالم میں اُدھار سامان بھی لینا پڑ جاتا تھا، جو شاہ جی بہت شوق سے دیتا تھا۔ یہ الگ بات کہ جو وہ اُدھار واپس نہ کرتا یا دیر سے لوٹاتا، شاہ جی اس سے وہ قیمت دوسرے طریقے سے وصول کرتا۔ اس طرح اس کے بستی کی کئی عورتوں کے ساتھ مراسم قائم ہو گئے تھے۔ مگر ان میں صرف ایک دو ہی ایسی تھیں، جو خوبصورت تھیں۔ ورنہ باقی سب گزارے لائق تھیں اور شاہ جی حسین عورتوں کا دیوانہ تھا۔ اب جو اس نے ساتھ کھڑے ہوئے شخص سے کوثر کی خوبصورتی کی بات سنی تو وہ اس کی صورت دیکھنے کے لیے بے چین ہو گیا۔ کاش وہ کسی طرح اس کی ایک جھلک دیکھ سکتا اور اس کی یہ خواہش بہت جلد پوری ہو گئی۔

کوثر نے کب کا برقع اتار دیا تھا اور اب وہ ایک چادر میں ہر جگہ آنے جانے لگی تھی۔ شاہ جی کی دکان پر بھی وہ کچھ دنوں بعد چادر میں ہی آئی تھی۔ اس کی صورت دیکھتے ہی وہ اس پر جی جان سے مرمٹا تھا اور اب اس کی یہی خواہش تھی کہ کاش دوسری عورتوں کی طرح کوثر بھی اس کی دکان سے اُدھار سامان لے اور اتنا لے کہ اس کا ادھار واپس کرنا ناممکن ہو جائے اور شاہ جی اس کے ساتھ بھی ہوس کا وہ کھیل کھیلنا شروع کر دے، جو دوسروں کے ساتھ کھیل چکا ہے۔ اس کی یہ خواہش بھی بہت جلد پوری ہو گئی۔ اگلے دن کوثر اس کی دکان پر تھی اور اس سے کہہ رہی تھی۔

''شاہ صاحب، اگر مہربانی کریں تو کچھ دنوں کے لیے راشن پانی کا سامان اُدھار دے دیں۔ میں آپ کی احسان مند رہوں گی۔ میں چوہدری شفیق کے ہاں

کام کرتی ہوں۔ مجھے جونہی وہاں سے پہلی تنخواہ ملتی ہے، میں آپ کے سارے پیسے چکا دوں گی۔" شاہ جی کی امید بر آئی تھی۔ اس نے اپنے من کی خوشی دبا کر کہا۔

"لو جی، اس میں احسان کی کیا بات ہے؟ جو دل چاہے لو۔ ساری دکان آپ کی ہے۔"

"نہیں، بس یہ کچھ ضرورت کی چیزیں ہیں، یہ دے دیں۔"

اور شاہ جی نے اس کا بتایا ہوا سارا سامان اسے دے دیا۔ اس کے بعد کوثر وقتاً فوقتاً اس کی دکان پر آتی رہی اور ضرورت کا سامان لیکر جاتی رہی۔

اس کے ہر بار آنے پر شاہ جی کی، اسے پانے کی امید اور بڑھ جاتی۔ اس کے من میں اب یہ یقین سا بیٹھ گیا تھا کہ وہ دن اب دور نہیں، جب کوثر کا انگ انگ اس کی دسترس میں ہوگا۔ مگر اس کی ان امیدوں پر اس دن پانی پھر گیا، جب ایک ماہ بعد کوثر کو حویلی سے تنخواہ ملی اور اس نے سب سے پہلے شاہ جی کا اُدھار چکایا۔

کوثر سے اُدھار وصول کرتے ہوئے شاہ جی کا من بجھا ہوا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ کاش یہ اُدھار واپس نہ ہوتا اور۔۔۔

اور اس نے یہ بات کوثر سے کہی بھی تھی۔

"رہنے دیں جی، یہ آپ کی اپنی دکان ہے۔ ابھی آپ یہ پیسے کسی اور جگہ خرچ کریں۔ مجھے اگلی تنخواہ پر دے دینا۔"

پر کوثر نے اس کی بات خوش اسلوبی سے رد کر دی تھی۔ اسے اچھی طرح پتہ تھا کہ وہ اس پر یہ احسان کیوں کر رہا ہے۔ وہ اس کے بارے میں پھیلی ہوئی بہت سی کہانیاں سن چکی تھی اور خود اس کی آنکھوں میں بھی اپنے لیے ہوس کا پیغام دیکھ چکی تھی۔ سو اس شخص سے وہ جتنا بچ کر رہتی، اتنا بہتر تھا اور اس دن کے بعد اس کی زندگی میں ایسا کوئی دن نہیں آیا، جب اس نے شاہ جی کی دکان سے دوبارہ اُدھار لیا ہو اور یوں شاہ جی کی رہی سہی امید بھی دم توڑ گئی۔ اس کے بعد شاہ جی نے اور بہت سے طریقوں سے کوثر کو اپنے راستے پر لانے کی کوشش کی تھی، مگر وہ اس کی کسی بھی چال میں نہیں آئی۔ یہاں تک کہ اس نے کسی کے ہاتھوں، اس کے گھر کپڑوں، جوتوں اور نقلی زیورات کا بہت سا سامان پہنچایا تھا، مگر کوثر پھر بھی اس کے ہاتھ نہیں آئی تھی۔ بلکہ اُلٹا اس نے اسے پیغام بھجوا دیا کہ اب اگر اس نے ایسی کوئی بیہودہ حرکت کی تو وہ اسے ساری بستی کے سامنے ذلیل کرے گی کہ وہ یاد کرے گا اور شاہ جی اسی بات سے ڈرتا تھا۔ وہ یہ سب چوری چھپے کرنے کا عادی تھا، کھلم کھلا نہیں۔ سو اس نے کوثر کو حاصل کرنے کے لیے صبر و تحمل کے ساتھ دوسرا رستہ اپنانے کا سوچا۔ اس سلسلے میں اس نے ایک تو سب سے پہلے شمے سے دوستی کی اور اس کے گھر آنا جانا شروع کیا اور دوسرا اس نے اس معاملے میں دیلے سے بھی بات کر لی۔ دیلا کمینہ ہونے کے ساتھ ساتھ، اس کام کا ماہر انسان تھا۔ شاہ جی نے کوثر کو پانے کے لیے پیسہ پانی کی طرح بہانا شروع کر دیا۔ اس کے پاس پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اس نے دیلے کو اس کام کے لیے دو ہزار روپے دیے۔ اسے یقین تھا کہ اگر دیلے کی مدد شامل حال رہی تو وہ کوثر کو ضرور حاصل کر لے گا۔ اس نے دیلے سے کہا تھا کہ وہ اگر کسی طرح اس کے لیے کوثر کو راضی کر لے تو وہ دو ہزار کی مزید رقم اسے دے گا۔ ایک ایک گاہک سے بیس بیس، تیس تیس روپے حاصل کرنے والے کے لیے دو اور دو چار ہزار کی رقم بہت بڑی تھی۔ سو اس دن سے وہ بھی شمے سے دوستی کرنے کے بعد اپنا اکثر وقت اس کے گھر میں گزارنے لگا۔ اس نے اپنے ذہن میں ایک منصوبہ تشکیل دے لیا تھا۔ اسے یقین تھا، اب وہ دن زیادہ دور نہیں ہیں، جب وہ شاہ جی سے مزید دو ہزار بھی وصول کر لے گا۔

☆☆☆

ڈیلے اور میدے کو اس شخص کو پہچاننے میں ذرا بھی وقت نہیں ہوئی۔ وہ ان کا بچپن کا دوست شریف عرف شرفو تھا۔ شرفو نے بھی پہلی ہی نظر میں انہیں پہچان لیا۔ وہ تینوں اس وقت حاجی کے ہوٹل پر موجود تھے۔ سب سے پہلے حیرت کا اظہار ڈیلے نے کیا تھا۔

"ارے شرفو، یہ تو ہے نا؟"

اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"ہاں یار میں ہی ہوں، اور کون ہوگا؟"

وہ اٹھ کر اس کے گلے لگا۔ دوسرے ہی پل میدا بھی اس سے بغل گیر ہو چکا تھا۔

"سنا، کہاں اتنا عرصہ گم رہا؟ کتنے عرصے بعد مل رہے ہو۔"

شرفو مسکرایا۔

"بس یار، جب اپنا یہاں سے دانہ پانی اٹھ گیا تو میں نے کراچی میں ڈیرے لگا لیے۔ بڑی زبردست جگہ ہے وہ۔ میں تو بہت مزے کر رہا ہوں اور تم سناؤ، تم دونوں کا وقت کیسا گزرا؟ آج کل کیا کر رہے ہو؟"

"ہم نے تیری بہت کمی محسوس کی، قسم سے۔ ہم تیرے بغیر تو بالکل ہی بیکار ہو کر رہ گئے تھے۔ تجھے تو ہم اپنا استاد ماننے لگے تھے اور ابھی تجھ سے ہم کچھ سیکھ بھی نہیں پائے تھے کہ تو ہمیں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔"

"بس یار کیا کرتا، حالات تم دونوں کے سامنے تھے اگر میں یہاں سے اس طرح نہ گیا ہوتا تو دوبارہ ضرور آتا پر چوہدریوں کو تو تم جانتے ہو، ان کا کہا پتھر پر لکیر ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے خبر ملی تھی کہ بڑے چوہدری کا انتقال ہو گیا ہے بس یہ خبر پا کر تھوڑا حوصلہ ہوا کہ اس بستی میں جا کر تھوڑا چکر لگا آؤں اور یار دوستوں سے مل آؤں۔" وہ تینوں کافی دیر تک وہاں بیٹھے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ شرفو انہیں اپنے گزرے ہوئے وقت کے بارے میں بتاتا رہا اور وہ دونوں انہیں اپنی پریشانیوں کے بارے میں بتاتے رہے۔ شرفو کچھ دیر بعد تین سگریٹیں بناتے ہوئے بولا۔

"تم فکر نا کرو۔ میں آ گیا ہوں نا، میں سب سنبھال لوں گا۔ میرے ہوتے ہوئے تمہیں کسی بات کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم تینوں مل کر ایسا کام کریں گے، جو تم لوگوں نے آج تک نہیں کیا ہوگا۔"

"اچھا، ایسا کیا کام ہوگا۔" میدے نے پوچھا۔

"ہم تو ہر کام کر چکے ہیں۔"

"نہیں، تم نے یہ کام کبھی نہیں کیا ہوگا۔"

"اچھا! تو پھر بتاؤ، کیا کام ہے وہ؟"

"یہ میں تمہیں رات کو بتاؤں گا۔ بس رات کو عشاء کی نماز کے بعد مجھے یہیں مل لینا۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔"

وہ دونوں جب رات کو عشاء کی اذان کے بعد وہاں پہنچے تو شرفو انہیں وہاں سے لے کر بستی سے باہر نکل آیا اور خاموشی سے ان دونوں کو ساتھ لے کر ایک طرف کو چلنے لگا۔

دونوں کچھ اندازہ نہیں کر سکے کہ وہ ان دونوں کو کہاں لے کر جا رہا ہے مگر دونوں کو یہ تجسس ضرور تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور کیا کام کرنے والے ہیں۔

میدا تو خیر اپنے تجسس پر قابو پائے رہا مگر ڈیلا زیادہ دیر تک چپ نہ رہ سکا۔

"یار کہاں جا رہے ہیں ہم کچھ بتاؤ تو سہی۔" شرفو چلتا رہا۔

"بس تھوڑے فاصلے پر ہماری منزل ہے، وہاں پہنچ کر سب بتاتا ہوں۔"

ڈیلے کو مجبوراً چپ ہونا پڑا۔ شرفو، دس منٹ بعد اس بستی سے دور، اسی سڑک کے کنارے ایک طرف آ کر بیٹھ گیا۔

"یہ ہے ہماری منزل اور ہماری روزی روٹی"

"کیا مطلب؟" ڈیلا اس کی بات سے الجھ گیا۔

''مطلب یہ کہ ہم یہاں سے آدھی رات کو آتے جاتے لوگوں کو خنجر کی نوک پر لوٹیں گے۔''

ساتھ ہی اس نے اپنی شلوار میں اڑسا ہوا خنجر بھی نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ وہ چاندرات تھی۔ چاندنی کے روشنی میں وہ دونوں، خنجر دیکھ کر گھبرا گئے۔ دیلے کی حالت کچھ زیادہ ہی پتلی ہونے لگی۔

''نہیں یار۔

ہم..... ہم سے یہ کام نہیں ہوگا۔ ہم نے کبھی یہ کام نہیں کیا۔''

اس کے لہجے میں گھبراہٹ محسوس کر کے شرفو زور سے ہنسا۔

''یار تیری کیوں شلوار گیلی ہو رہی ہے؟ جو کروں گا، میں کروں گا۔ تم دونوں چپ چاپ میرے ساتھ کھڑے رہنا۔''

دیلے کو پھر بھی حوصلہ نہ ہوا۔

''نہیں یار، یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا''

اس بار شرفو کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔

''ٹھیک ہے، جیسے تم لوگوں کی مرضی۔ میں تو صرف پرانی دوستی کا خیال کر کے تم دونوں کے کام آنے کی سوچ رہا تھا۔

اگر تم نہیں چاہتے تو تمہاری مرضی۔ میں تو ویسے بھی اکیلا کام کرتا رہا ہوں، اب بھی کر لوں گا۔''

میدے نے دیلے کو ڈانٹا۔

''یار کیا کر رہا ہے۔ اتنی مشکل سے کوئی کام ملا ہے اور تو ہے کہ۔۔۔۔''

''ہاں۔۔۔ بہت اچھا کام ہے۔ اگر اس کام میں پولیس کے ہاتھ لگ گئے تو۔۔۔

میرے ساتھ پہلے ہی بہت ہو چکی ہے۔ میں اب اور پولیس تھانے کو نہیں سہہ سکتا۔''

''پولیس تھانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' شرفو نے کہا۔

''میں جہاں بھی کام کرتا ہوں۔ پہلے آس پاس کا ماحول دیکھتا ہوں اور پھر کام کرتا ہوں۔ میں نے پوری تسلی کر لی ہے۔ یہاں پولیس کا بالکل خطرہ نہیں ہے۔''

''مگر یار۔'' دیلے نے کچھ کہنا چاہا کہ میدے نے اس کی بات کاٹ دی۔

''یار تو اسے چھوڑ۔ یہ بتا، ہمیں کرنا کیا ہوگا؟''

''کچھ بھی نہیں، بس میرے ساتھ نقاب پہن کر چپ چاپ کھڑے رہنا، جو بھی کرنا ہوگا، میں خود کروں گا۔''

''چل ٹھیک ہے'' میدے نے ہامی بھر لی۔ ''تو جو کہے گا ہم کریں گے۔''

شرفو نے دو کپڑے ان کی طرف بڑھائے۔

''اس سے اپنا سر اور چہرہ اچھی طرح ڈھانپ لو آنکھوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آنا چاہیے'' میدے کو رضامند دیکھ کر دیلا بھی دل پر پتھر رکھ کر ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ ان دونوں کو کپڑا باندھنے میں تھوڑی دشواری ہوئی تو شرفو نے آگے بڑھ کر ان دونوں کی مدد کی اور انہیں صحیح طرح کپڑا باندھنا سکھایا۔ ایک دو بار کی کوشش میں وہ دونوں اس کام میں ماہر ہو گئے۔ شرفو کچھ دیر بعد انہیں اس سڑک سے کچھ دور لے آیا۔ اس نے اپنی جیب سے دو تین سگریٹ نکالے اور انہیں سلگانے کے بعد ان دونوں کو تھما دیے۔ دیلے کا بھی اب کچھ دل بندھ گیا تھا۔

وہ تینوں سگریٹ پیتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ ان دونوں کے پوچھنے پر شرفو انہیں اپنے بارے میں بتاتا رہا کہ وہ اتنا عرصہ کہاں رہا، کیا کام کرتا رہا۔ وہ دونوں حیرت اور دلچسپی سے اس کی باتیں سنتے رہے۔ اس دوران کافی وقت گزر گیا تو وہ ان دونوں کو ساتھ لے کر دوبارہ اسی سڑک پر، اسی جگہ آ کھڑا ہوا۔

''بس اب جو بھی آدمی یہاں سے گزرے گا، وہی عید کا شکار ہوگا۔'' شرفو نے کہا۔

''بس تم دونوں چپ چاپ میرے ساتھ کھڑے رہنا'' اور پھر کچھ ہی دیر بعد ہی جو شخص وہاں سے گزرا تھا، وہ سچ مچ ان کا شکار ثابت ہوا۔ شرفو نے نہایت دیدہ دلیری سے اسے خنجر دکھا کر اس کی جیب خالی کرالی تھی۔ اس کامیاب واردات کے بعد وہ دونوں بہت خوش تھے۔ اس شخص سے انہیں ساٹھ روپے ہاتھ لگے تھے، جو شرفو نے خود رکھنے کی بجائے ان دونوں میں آدھے آدھے بانٹ دیے تھے۔ اس کام کی یہ پہلی کمائی، شرفو نے ان دونوں کے نام کر دی تھی۔

''مجھے پتہ ہے کہ تم دونوں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں، سو یہ پیسے تم دونوں رکھ لو۔ البتہ کل سے جو کمائی ہوگی، اس کے ہم تین حصے کریں گے۔''

دیلا اور میدا وہ رقم پا کر بہت خوش تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ انہیں بیٹھے بٹھائے اتنے پیسے آسانی سے مل جائیں گے۔

وہ دونوں اس رات خوشی خوشی اپنی بستی میں لوٹے تھے۔ اگلے چار، پانچ دنوں تک ان تینوں نے سات، آٹھ وارداتیں بڑی کامیابی سے کی تھیں اور اس دوران انہیں ایک شخص سے کافی موٹی رقم ہاتھ لگی تھی۔ اس ساری رقم کو آپس میں بانٹ کر وہ بہت خوش تھے۔ دیلے کو بھی اب اس کام میں مزہ آنے لگا تھا۔ وہ جتنا اس کام سے ڈر رہا تھا، یہ اتنا ہی آسان کام ثابت ہوا تھا۔

اگلی ایک دو وارداتیں، شرد نے تھوڑی سی جگہ تبدیل کرنے کے بعد ان دونوں سے کرائی تھیں جو کہ کامیاب رہی تھیں۔ اس طرح ان کے حوصلے مزید جوان ہو گئے تھے۔

شرفو نے آخری واردات کے بعد انہیں کہا تھا۔

''دیکھ لیا؟ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ صرف تھوڑی سی حوصلے کی بات ہوتی ہے اور اس کے بعد دوسروں کی رقم تمہاری جیب میں۔۔۔ یہاں تو خیر کچھ زیادہ رقم ہاتھ نہیں لگتی، اگر کسی بڑے شہر میں کام کیا جائے تو وہاں کافی مال ہاتھ لگتا ہے۔ میں تو دو دن بعد کراچی جا رہا ہوں، وہاں کے اپنے مزے ہیں۔ اگر تمہارا دل مانے تو تم بھی میرے ساتھ وہاں چلو۔ تینوں دوست عیاشی کریں گے۔'' مگر دیلے اور میدے نے کہا کہ وہ وہیں خوش ہیں۔ دیلے نے مزید کہا۔

''یار میں تو گھر میں اکیلا رہتا ہوں۔ اگر میں تمہارے ساتھ گیا تو پیچھے سے کوئی بھی میرے گھر پر قبضہ کر سکتا ہے۔'' میدے نے بھی اپنی ایک دو مجبوریاں اسے سنا دیں۔

''اچھا ٹھیک ہے، جیسے تم لوگوں کی مرضی۔ میں نے ایک چھوٹا سا خنجر تمہیں بھی دے دیا ہے اور یہ کام بھی سکھا دیا ہے۔ اب تم دونوں آسانی سے یہ کام کر سکتے ہو۔۔۔ بس ایک بات کا خیال رہے۔ حد سے زیادہ لالچ نہیں کرنا اور ایک ہی جگہ دو چار وارداتوں کے بعد زیادہ ہاتھ نہیں دکھانا۔ یہاں بہت کام ہے۔ تم آس پاس کی بستیوں سے ہو کر شہر تک نکل جایا کرنا اور اپنا کام کر کے لوٹتے رہنا۔ اس طرح تم کبھی بھی نہیں پکڑے جاؤ گے۔ یہاں بس ہماری یہ آخری واردات تھی۔ اب یہاں اور کوئی واردات نہیں کرنی۔ فی الحال کافی مال ہے تم دونوں کے پاس۔ اسے کھاؤ، پیو بعد کی بعد میں دیکھنا۔'' ان دونوں نے وعدہ کر لیا کہ وہ ایسا ہی کریں گے مگر اگلے دن شرفو کے منع کرنے کے باوجود وہ اسی جگہ دوبارہ واردات کرنے کے لیے پہنچ گئے۔ جہاں وہ مسلسل تین چار دنوں سے کرتے آئے تھے اور اس دوران کافی مال ان کے ہاتھ لگا تھا۔ سو انہوں نے سوچا کہ ایک آخری واردات اور کر لینی چاہیے تاکہ کچھ اور مال ہاتھ لگ سکے۔ اس کے بعد وہ اس علاقے میں پھر کچھ عرصے کے لیے واردات نہیں کریں گے۔ مگر افسوس کہ یہ ذرا سی لالچ انہیں لے ڈوبی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

☆☆☆

پچھلے کئی دنوں سے سادی، بخار اور اذیت میں تڑپ رہی۔ جس سے رہائی پانا اس کے لیے کسی طور بھی ممکن نہیں تھا۔

بالی جب اسے اپنے گھر لائی تھی، اس وقت بھی اس کی حالت بہت نازک تھی۔

بالی اسے گھر لانے کے بعد یہ جاننے کے لیے بے چین تھی کہ یہ سب کس نے سعدیہ کے ساتھ کیا ہے اور کیوں؟

ویسے اسے اتنا اندازہ تھا کہ یہ سب وسیم نے، جیدے نے یا اس کی ماں نے کیا ہوگا۔ مگر بات پھر بھی وہیں آجاتی تھی کہ آخر انہوں نے ایسا کیوں کیا؟

جب بالی نے اس بارے میں سادی سے پوچھا تو اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔

”میں ہی بے وقوف عورت تھی جو ان پر اعتبار کر کے ان کے گھر چلی گئی تھی۔ میں سمجھی تھی کہ اب اس گھر میں میرے ساتھ ایسا ویسا کچھ نہیں ہوگا مگر یہ میری بھول تھی۔ اس گھر میں آنے کے دو دن بعد ہی جیدے نے میری عزت پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔ اس بار وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ یہ سب کرنے سے پہلے اس نے ایک کپڑے سے میرا منہ کس کر باندھ دیا تھا کہ میں پھر شور مچا کر محلے والوں کو اکٹھا نہ کرلوں۔

اس کی اس حرکت نے میرے اندر جیسے آتش فشاں بھر دیا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کاش اس وقت میرے ہاتھ کوئی ایسی چیز لگے جس سے میں اسے موت کے گھاٹ اتار سکوں اور یہ موقع مجھے اسی وقت ہی مل گیا تھا۔

جونہی جیدا مجھ سے اپنی ہوس کی تکمیل کر کے خباثت سے مسکراتا ہوا واپس پلٹا، میں نے کچھ ہی فاصلے پر پڑی ہوئی سبزی کاٹنے والی چھری اٹھائی اور اس پر وار کر دیا۔ یہ اس کی خوش قسمتی اور میری بدقسمتی تھی کہ اسے زیادہ گہرا زخم نہیں آیا۔ اس نے واپس پلٹ کر مجھ سے وہ چھری چھینی اور مجھ پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔ اس طرح اپنی تسلی کرنے کے بعد آخر میں اس نے کمرے کے دروازے میں پڑا ہوا کپڑے کوٹنے والا ڈنڈا اٹھایا اور پوری قوت سے میری ٹانگ پر دے مارا اور اس نے یہ عمل ایک بار نہیں کئی بار دوہرایا۔ اس دوران میں کتنی اذیت سے گزرتی رہی۔ یہ صرف میں جانتی ہوں۔

شام کو میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی جیدے نے وسیم اور اپنی ماں کو جانے کیا کہا کہ میرا سامنا ہوتے ہی انہوں نے مجھے لعنت ملامت کرنا شروع کر دی۔ وسیم نے تو آتے ہی مجھے دو چار تھپڑ بھی مارے تھے کہ الو کی پٹھی، تو نے میرے بھائی کو چھری سے قتل کرنے کی کوشش کی، تیری یہ جرأت؟ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ مگر اس کی ماں اسے پکڑ کر فوراً ہی کمرے سے باہر لے گئی تھی۔ ویسے اس وقت میں جس اذیت میں تھی، اس سے بہتر تھا کہ مجھے موت آجاتی۔ جیدے کی لگائی گئی ضربوں سے میری مضروب ٹانگ میں اتنا درد تھا کہ میں بتا نہیں سکتی۔ مجھے یوں لگتا تھا، جیسے کسی نے میری اس ٹانگ کو کسی تیز دھار آلے سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ اس کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میرا علاج کیا جاتا، مگر علاج تو دور کی بات، وہاں میرے لیے ہمدردی کے دو بول بھی کسی کے پاس نہیں تھے۔ اس تمام عرصے میں میرے منہ سے ایک پل کے لیے بھی کپڑا نہیں ہٹایا گیا۔ شاید انہیں خدشہ تھا کہ اگر انہوں نے میرے منہ سے کپڑا ہٹایا تو شاید میں چیخ چیخ کر محلے والوں کو نہ اکٹھا کرلوں اور پھر میں درد میں دن رات تڑپتی اپنے کمرے میں چارپائی پر پڑی رہی۔ اس دوران وسیم اور جیدے کو جب موقع ملتا وہ میری اذیتوں سے بے نیاز اپنی ہوس کی ضرورت پوری کرتے اور باہر نکل جاتے۔ اس دوران صرف روٹی کھلانے کے لیے میرے منہ سے کپڑا ہٹایا جاتا اور یہ

کام جیدا کرتا تھا۔ ویسے انہوں نے میرے ساتھ جو کیا تھا، اس کے پیش نظر مجھے بھوکا مرنا پسند تھا، اس گھر کا ایک لقمہ بھی کھانا پسند نہیں تھا۔ مگر مجھے وہ کھانا زبردستی زہر مار کرنا پڑتا تھا۔

اگر میں کھانا کھانے سے انکار کرتی تو جیدا مجھے شیطانی کھیل کھیلنے کی دھمکی دیتا اور یہ بات مجھے کسی طور گوارا نہیں تھی۔۔۔۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا، ویسے ویسے میرے درد میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ ویسے اس دوران انہوں نے مجھ پر اتنی مہربانی ضرور کی کہ وہ مجھے درد کی گولیاں لا کر دیتے رہے مگر اس سے مجھے زیادہ فائدہ نہیں ہوا۔

ایک دن وسیم نے غور سے میری ٹانگ کو دیکھا تو اسے اندازہ ہوا کہ میری ٹانگ دو جگہوں سے ٹوٹ چکی ہے۔ مجھے کہیں لے کر جانا ان کے نزدیک درست نہیں تھا۔ اس طرح ان کی کہانی پھیلنے کا خدشہ تھا۔ سو وسیم نے میری ٹانگ پر اپنی ''کاریگری'' شروع کر دی۔ اس نے ایک بڑا سا کپڑا پھاڑ کر اس کے کئی چھوٹے ٹکڑے کیے اور اس نے میری پنڈلی کو کس کر باندھ دیا۔

اس کے بعد اس نے ایک بڑا کپڑا میری ساری پنڈلی پر لپیٹ دیا۔ اس دوران میں درد سے تڑپتی رہی۔ وسیم کی اس حرکت سے مجھے آرام آنے کی بجائے اور تکلیف شروع ہوگئی۔ مگر مجھے اس سے یہ بات کہہ کر، اس کی کوئی مدد لینا گوارا نہیں تھا۔۔۔ مجھ سے جب تک ہوا، میں اس اذیت کو برداشت کرتی رہی اور پھر ایک دن میں اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھی۔ مجھے دن اور رات کا بالکل ہوش نہیں رہا۔ کب صبح ہو رہی ہے، کب شام، مجھے کچھ پتہ نہیں تھا۔ اور یہ آج کی بات ہے، جب تم مجھے وہاں سے لائی تھی۔۔۔۔''

سادی کی کہانی سن کر بالی کا دل دکھ سے بھر گیا۔ اسے اچانک وسیم سے، جیدے سے اور اس کی ماں سے بے انتہا نفرت محسوس ہونے لگی۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ ان کو فوراً موت کے گھاٹ اتار دیتی۔ سادی کی کہانی سن کر بالی نے اسے حوصلہ دیا۔ ''تو فکر مت کر، اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

اس دوران وہ اس کی پنڈلی سے لپٹے ہوئے سارے کپڑے اتار چکی تھی اور یہ دیکھ کر اس کا دل اور دکھ سے بھر گیا کہ سادی کی پنڈلی پر ایک نہیں دو تین زخم تھے اور وہ سارے ہی بے حد خراب ہو چکے تھے۔ اسے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ اگر جلد ہی سادی کو کسی ڈاکٹر کو نہ دکھایا گیا تو شاید بات بہت بڑھ جائے گی اور عین ممکن ہے کہ اس بستی میں صرف ایک ہی حکیم نما ڈاکٹر تھا اور اس کا کلینک بھی بستی کے آخری سرے پر واقع تھا۔ سادی وہاں تک اس کے ساتھ چل کر نہیں جا سکتی تھی۔ اسے وہاں کسی گدھا گاڑی پر ہی لے جانا ممکن تھا۔ بالی نے بالآخر چند روپے دے کر ایک گدھا گاڑی کا بندوبست کیا اور سادی کو ڈاکٹر زاہد کے پاس لے گئی۔ اس نے زخموں کا اچھے سے معائنہ کرنے کے بعد کہا۔ ''زخم بہت ہی خراب ہو چکے ہیں، اگر جلد ہی اسے شہر میں کسی اچھے اسپتال میں داخل نہ کیا گیا تو بات بہت بگڑ سکتی ہے اور عین ممکن ہے کہ اس کی ٹانگ ہی کاٹنی پڑ جائے۔''

ویسے یہ اس نے جھوٹ کہا تھا کہ بات بگڑ سکتی ہے۔ بات بگڑ سکتی نہیں، بگڑ چکی تھی۔ بالی اس سے کچھ دوائیں لے کر سادی کو دوبارہ گھر لے آئی۔ وہ سادی کو نہ ہی اس حالت میں دیکھ سکتی تھی اور نہ ہی رکھ سکتی تھی۔

سادی کو اکیلے شہر لے جانا اس کے بس سے باہر تھا اور اس کے علاوہ اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ وہ شہر کے کسی بڑے اسپتال میں اس کا اچھے سے علاج کرا سکتی۔

اچانک اس کا خیال ان لوگوں کی طرف گیا، جن سے اس کے ناجائز تعلقات قائم رہ چکے تھے۔

مگر ان میں بھی اسے ایسا کوئی دکھائی نہیں دیا، جو اس کی مدد کر سکتا یا اسے اتنے پیسے دے سکتا کہ وہ سادی

کوشہر لے جاسکتی۔ اچانک اس کا خیال چوہدری رفیق کی طرف گیا اور دوسرے ہی پل اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

......☆☆......

شرفو کے لاکھ منع کرنے کے باوجود ان دونوں نے اسی علاقے میں ایک اور واردات کی اور فوراً ہی پولیس کے ہاتھ چڑھ گئے۔ حیات اللہ نے لوگوں کے کہنے پر اس بات کا ایکشن لیا تھا۔ کیوں کے پیچھے کئی دنوں سے جو لوگ لٹ گئے تھے انہوں نے اپنی عرضی جمع کرائی تھی۔ ایک دو لوگوں کے کہنے پر تو حیات اللہ نے دھیان نہیں دیا تھا مگر جب دو چار اور لوگوں نے بھی اسی بات کی دہائی دی تو اسے ایکشن میں لینا پڑا۔ جب وہ دونوں تھانے میں سب انسپکٹر حیات اللہ کے سامنے پیش کیے گئے تو انہیں دیکھ کر وہ حیران رہ گیا

''اوئے! یہ وہی دونوں ہیں نا؟''

اس نے ایک کانسٹیبل سے تصدیق چاہی۔

''جی سر! یہ وہی بندے ہیں''

''کیوں بھئی یہ کام کب سے شروع کیا ہے اور کس کے ساتھ مل کر کر رہے ہو؟''

میدے اور دیلے کے دل میں پچھلے سب اذیت ناک واقعات تازہ ہوگئے۔

''بس سر جی! غلطی ہوگئی ہم سے۔ ہم کسی کے بہکانے میں آگئے تھے۔''

ایک کانسٹیبل نے اسے زوردار تھپڑ رسید کیا۔ ''صاحب نے جو پوچھا ہے، صرف اس کا جواب دو'' میدے کا پیشاب خطا ہوتے ہوتے بچا۔

''بب...... بس کچھ دن ہوئے ہیں یہ کام کرتے ہوئے۔ ہمارا ایک اور ساتھی ہے، شریف، اس کے کہنے پر ہم نے یہ کام شروع کیا تھا''

''کہاں رہتا ہے وہ؟''

''ساتھ والی بستی میں۔''

''جاؤ بھئی! اس مائی کو بھی لے آؤ۔ پتہ تو چلے کہ ایسا جگرے والا اور کون ہے اور ان دونوں کی ذرا اچھے سے اور خدمت کرو۔ پچھلی بار بھی کسر رہ گئی تھی۔ شام کو ان سے دوبارہ ملاقات ہوگی۔''

''خدمت'' کے نام پر میدے اور دیلے کی شلوار گیلی ہونے لگی۔ انہیں پتہ چل گیا تھا کہ اب ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ وہ رو رو کر اپنے لیے رحم کی بھیک مانگنے لگے، مگر کسی نے ان پر ترس کھانے کی کوشش نہیں کی۔ اس بار ان کے ساتھ پچھلی بار سے بھی زیادہ برا سلوک کیا گیا۔ شام کو وہ حیات اللہ کے سامنے پیش ہوئے تو اس نے کہا ''ہاں بھئی، اب بتاؤ تم دونوں کے ساتھ کیا کرنا ہے؟''

دیلا روتے ہوئے اس کے قدموں میں گر گیا۔

''سر جی، بس آخری بار معاف کردو۔ ماں قسم آج کے بعد ایسا کچھ نہیں کریں گے''

''پتر، یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ اس بار تم لوگوں نے معاف کردینے سے زیادہ کا کام کیا ہے۔ اب تو ایک ہی رستہ ہے یا تو کچھ عرصے کے لیے جیل کی ہوا کھاؤ یا پھر تم پانچ پانچ ہزار کا بندوبست کرلو'' اتنی بڑی رقم کا سنتے ہی ان دونوں کے ہوش اڑ گئے۔

اچانک ہی وہاں دو کانسٹیبل شرفو کو لے کر آ پہنچے۔ ''سر جی، یہ ہے ان کا سربراہ'' شرفو کی ان دونوں پر نظر پڑی تو فوراً ہی ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے ملامت بھری نظروں سے ان کو دیکھا۔ اسے دو باتوں کا دکھ ہوا تھا۔ ایک تو ان دونوں نے اس کی بات نہ مانتے ہوئے وہاں واردات کی تھی اور دوسرا خود تو جو پھنسے سو پھنسے، ساتھ میں اسے بھی پھنسا دیا۔ حیات اللہ نے اپنی چھڑی سے اس کی ٹھوڑی کو اونچا کیا۔

''بیٹا جی! یہاں کوئی ہماری مرضی کے بغیر پر نہیں مار سکتا اور تم نے اپنا دھندہ شروع کردیا۔ تمہیں یہاں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ کہاں سے آئے ہو؟''

شرفو کی دیلے اور میدے جیسی حالت نہیں تھی۔ وہ بہت بڑا اچکا تھا۔

"سر جی ان باتوں کو چھوڑیں۔ یہ بتائیں آپ ہمیں چھوڑنے کا کتنا لیں گے؟"

حیات اللہ نے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیوں، بہت مال جمع کر لیا ہے؟ پتر پندرہ ہزار لگیں گے تم تینوں کے۔ اگر ہو سکتے ہیں تو کرلو، ورنہ دو چار مہینے سکون سے جیل کا کھانا کھاؤ۔"

"آپ کو پیسے مل جائیں گے۔ بس کچھ دیر کے لیے مجھے رہا کرنا پڑے گا۔ میں جا کر پیسے لے آتا ہوں۔"

"نہ پتر نہ۔ ہم نے کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔ اگر تمہارا کوئی واقف کار ہے تو اس تک پیغام پہنچا دیں گے۔ وہ پیسے دے کر چھڑا لے جائے گا۔ تمہیں بھی اور انہیں بھی۔" حیات اللہ نے ڈیلے اور میدے کی طرف اشارہ کیا۔ شرفو نے اپنے ایک دوست کا پتہ بتایا اور کہا کہ اس تک پیغام پہنچا دیں وہ رقم لے آئے گا۔ اور پھر واقعی شرفو کا دوست رات تک رقم لے کر آیا اور انہیں چھڑا کر لے گیا۔ جب وہ تھانے سے جانے لگے تو حیات اللہ نے کہا۔

"اگر باہر جا کر یہی کام کرنے کا ارادہ ہے تو ہر ماہ ہمارا خرچہ پانی یہاں پہنچاتے رہو اور کھل کر کھلتے رہو۔ ورنہ ایک کے بدلے گیارہ گنا بھی ہمیں وصول کرنا آتا ہے۔" شرفو اس کی بات کا جواب دیے بغیر تھانے سے باہر چلا آیا۔ باہر آ کر وہ ڈیلے اور میدے پر بہت خفا ہوا۔

"میں نے تم جیسے بے وقوف اور بے مروت دوست کہیں نہیں دیکھے۔ تم خود تو پھنس گئے تھے، میرا نام کیوں لیا؟ میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا کہ وہاں واردات کرنا اب خطرے سے خالی نہیں ہے، پھر بھی تم دونوں نے اپنی مرضی کی۔ اگر مجھے پرانی دوستی کا خیال نہ ہوتا تو تم دونوں کو وہیں جیل میں سڑنے دیتا۔ میں نے سوچا تھا کہ تمہیں کسی قابل کر دوں گا، پر تم دونوں اس قابل ہی نہیں ہو۔ میں تو آج ہی کراچی کی بس پکڑتا ہوں۔ تمہارا جو جی چاہے تم وہ کرتے رہو۔"

ڈیلے اور میدے نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا تو شرفو نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روکا اور ان دونوں کو اکیلا چھوڑ کر اپنے راستے ہولیا اور پھر اسی رات شرفو نے واقعی کراچی کی بس پکڑ لی تھی۔

اس کے جانے کے بعد وہ دونوں ایک بار پھر اسی مقام پر آ کھڑے ہوئے تھے، جہاں پہلے تھے۔

☆☆

میدے نے ڈیلے سے کہا۔

"یار ہمارے پاس اب کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ میری مان تو جا کر بھابی کو لے آ۔ ہم اس بار ذرا دوسری طرح سے کام شروع کریں گے۔ بھابی کو شک بھی نہیں ہوگا اور ہمارا کام بھی ہوتا رہے گا۔" ڈیلے نے کہا۔

"یار ہم نے جو اس کے ساتھ کیا ہے، مجھے نہیں لگتا کہ وہ اس کے بعد واپس آنے کے لیے تیار ہو جائے گی۔"

"تو اس سے یہ تھوڑی کہے گا کہ تو اس سے دوبارہ یہی کام کرانا چاہتا ہے۔ تو چپ چاپ جا کر اس کے پاؤں پڑ جانا اور اس سے روتے ہوئے کہنا کہ تم سے بہت بڑی بھول ہوگئی، تم آج کے بعد اسے ایسے کسی کام کے لیے نہیں کہو گے۔ تمہیں صرف اس کی ضرورت ہے اور تم اس کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ساتھ میں دو چار قسمیں بھی کھا لینا۔ امید ہے کہ وہ مان جائے گی۔"

میدے کا پھر بھی دل نہیں بندھا۔

"یار اگر اس نے اپنے باپ کو ہر بات بتا رکھی ہوئی تو؟" میدا اس کی بات پر ہنسا۔

"بے وقوف! اگر ایسا ہوتا تو اب تک تیرا ماما تیری خبر لینے یہاں پہنچ چکا ہوتا۔ میرے خیال میں اس نے اپنے باپ کو اب تک یہ بات نہیں بتائی ہوگی۔ تو خوامخواہ کا وہم نہ پال۔ بس تو چپ چاپ جا اور اسے

لے آ۔“

”اگر ماما اور مامی نہ مانے تو؟“

”تو ان کے بھی پاؤں پڑ جانا۔ کہنا، ماما، ہر گھر میں اونچ نیچ ہو جاتی ہے۔ ہمارے گھر میں بھی ہوگئی۔ البتہ اب میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ امید ہے کہ وہ سکینہ کو تیرے ساتھ کر دیں گے۔“

”اچھا، تو کہتا ہے تو کچھ کرتا ہوں۔“

”کرتا نہیں، کر۔ وقت دھیرے دھیرے ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے۔“ دیلے نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تو فکر مت کر، میں آج ہی اسے لینے جاتا ہوں۔“

☆☆

سکینہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ دیلا اسے واپس لینے کے لیے بھی آ سکتا ہے۔ اس نے جو کچھ سکینہ کے ساتھ کیا تھا، اس کے بعد اسے یقین تھا کہ اگر دیلے میں تھوڑی سی بھی غیرت ہوگی تو وہ اسے لینے نہیں آئے گا مگر وہ اس کی امیدوں کے برخلاف اسے لینے آ گیا تھا۔

سکینہ اسے دیکھتے ہی اندر کمرے میں جا کر بیٹھ گئی تھی۔

دیلا اپنے ماما اور مامی سے ملا تو اس کے مامے کا موڈ بہت خراب تھا۔ وہ بمشکل خود پر قابو پائے رہا۔ اس دوران دیلا ان سے مل کر دعا سلام کر چکا تھا۔ جب سے وہ اس گھر میں داخل ہوا تھا، اس کا دل لاشعوری طور پر لرز رہا تھا۔ اسے بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ کہیں سکینہ نے اپنے باپ کو اصل بات بتا نہ دی ہو۔ اگر ایسی بات ہوئی تو نہ صرف وہاں اس کے ساتھ بہت برا ہونے والا تھا، بلکہ سکینہ بھی اس کے ساتھ جانے والی نہیں تھی۔ مگر اگلے ایک گھنٹے میں ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ میدے کے اندازے کے مطابق سکینہ نے وہ بات فی الحال وہاں کسی کو نہیں بتائی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کے گھر والوں کا رویہ اس کے ساتھ دوسرا ہوتا۔ شام کو وہ کھانا کھانے کے بعد کمرے میں مل جل کر بیٹھے تو دیلے نے کہا۔

”ماما، میں سکینہ کو لینے آیا ہوں۔ اس کے بغیر سارا گھر سونا پڑا ہے۔“

اس کے مامے کا غصہ ایک بار پھر عود کر آیا۔ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا

”پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے سکینہ کے ساتھ ایسا کیا سلوک کیا ہے کہ وہ اتنی مجبور ہوگئی، اسے وہ گھر چھوڑ کر یہاں آنا پڑا؟

ایک بات کان کھول کر سن لو۔ مجھ سے جھوٹ مت بولنا۔

میری سکینہ ایسی نہیں ہے کہ کسی چھوٹی موٹی بات پر گھر چھوڑ کر چلی آئے۔“

دیلے کا سانس سینے میں اٹک گیا۔ اسے سمجھ نہ آیا کہ وہ کس طرح جھوٹ بول کر اپنا بچاؤ کرے؟

اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا

”بس ماما، غلطی ہوگئی مجھ سے۔ ایک دن غلطی سے میرا ہاتھ سکینہ پر اٹھ گیا اور وہ مجھ سے خفا ہو کر یہاں چلی آئی۔“

”ایسا کیا قصور کیا تھا اس نے کہ تم نے اس پر ہاتھ اٹھا دیا؟“

”بس ماما غلطی ہوگئی مجھ سے۔“

”تو اس غلطی کی یہی سزا ہے کہ فی الحال اپنے گھر جاؤ اور دو چار ماہ آرام کرو۔ جب عقل اور ٹھکانے آ جائے تو پھر آنا“

دیلا چارپائی سے اٹھا اور اس کے پیروں میں بیٹھ گیا۔

”ماما، میری پہلی اور آخری غلطی سمجھ کر معاف کر دو۔ آج کے بعد ایسا پھر ہو تو جو مرضی سزا دینا۔“

اس بار وہ خاموش رہا۔ دیلے نے اپنے ہاتھ اپنی مامی کے پیروں پر رکھ دیے۔

”مامی، بس ایک بار سکینہ کو میرے ساتھ بھیج دو۔

آج کے بعد اگر پھر کبھی شکایت کا موقع ملے تو سو جوتے مارنا مجھے۔''

''پتر ہر ماں باپ کی طرح ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ تم دونوں اپنے گھر میں خوش رہو۔ ہم سکینہ کو گھر بٹھا کر کونسا خوش ہیں۔

وہ اندر بیٹھی ہے، اندر جا کر اس سے بات کر لو، اگر وہ راضی ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں''

سکینہ دروازے کی اوٹ میں کھڑی یہ ساری باتیں سن رہی تھی۔

کمرے میں جاتے ہی دیلا جلدی سے اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

سکینہ فوراً ہی دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ دیلے نے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔

''سکینہ''

تمہارے پیچھے میں اپنی اس غلطی پر اتنا شرمندہ ہوا کہ میں بتا نہیں سکتا۔ یقین کرو میں ایسا کبھی نہ کرتا، اگر میدا مجھے اس بات کے لیے نہ کہتا۔ اس نے مجھے اس کام کے لیے اکسایا تھا۔

میں نے تمہارے پیچھے اس سے بھی دوستی توڑ لی ہے اور ہر برے کام سے بھی توبہ کر لی ہے۔

یقین کرو، اب تم جیسا کہو گی، میں ویسا کروں گا بس ایک بار، صرف ایک بار مجھے معاف کر دو۔''

دیلے کے آنسو مسلسل بہتے جا رہے تھے۔ اس نے لہجہ بھی کچھ

ایسا اپنایا تھا کہ سکینہ کا دل بے اختیار پسیج گیا تھا۔ اسے یقین سا ہو گیا تھا کہ اس بار دیلا جو کچھ رہا ہے، سچ کہہ رہا ہے۔ اس نے مزید تسلی کرنی چاہی۔

''تم سچ کہہ رہے ہو نا؟''

''مجھے تمہاری قسم، خدا اور رسول کی قسم میں سچ کہہ رہا ہوں۔ بس ایک بار، صرف ایک بار میرا یقین کر لو۔ اگر میں پہلے جیسا ہوا تو جو چور کی سزا، وہ میری۔''

سکینہ ایک بار پھر اس کی باتوں میں آ گئی۔ اگلے دن وہ نئی امیدوں کے ساتھ ایک بار پھر دیلے کے ساتھ اس کے گھر جا رہی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ آگے اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

☆☆.....

دیلے کے کہنے پر میدے نے کہیں نہ کہیں سے نشہ آور دوا کا بندوبست کر لیا تھا اور وہ دوا دیلے کو تھما دی تھی۔ ساتھ ہی اس نے کہا تھا کہ جہاں سے وہ دوائی لایا ہے، دینے والے نے کہا ہے کہ دوائی دینے کے بعد کھانے والے کا اگر ہاتھ بھی کاٹ لیا جائے تو اسے پتہ نہیں چلے گا۔ دیلے کے خیال میں دوائی اتنی زود اثر تو خیر نہیں تھی، مگر اس سے شاید ان کا کام ہو سکتا تھا۔ دیلے نے اثبات میں سر ہلا کر اس سے دوائی لی اور کہا۔ ''اچھی بات ہے۔ پہلے میں خود تجربہ کرتا ہوں، اگر کوئی مسئلہ نہ ہوا تو پھر آگے دیکھیں گے۔''

''تو آج رات کو ہی یہ کام کر، صبح مجھے بتانا۔'' ''وہ تو میں تمہارے کہے بغیر بھی کرنے والا تھا۔ اچھا یہ بتا، تو نے کسی بندے کا بندوبست کیا یا نہیں؟''

''کر لیا ہے۔ ایک نہیں، دو دو بندے تیار ہیں۔ بس تیری دیر ہے۔ جونہی تیری طرف سے اجازت ملی، بندے آ جائیں گے۔''

اگلی صبح دیلے نے میدے کو بتایا کہ دوائی سچ میں بہت اچھی اور زود اثر ہے۔ سکینہ کو کھانے میں ملا کر دینے کے بعد وہ اس سے ساری رات اپنی من مانی کرتا رہا، مگر اس دوران سکینہ کی ایک بار بھی آنکھ نہیں کھلی۔

''تو پھر میں رات کو کسی کو لاؤں؟''

(ان شاء اللہ اگلا اور آخری حصہ آئندہ ماہ)

تاریک راہیں

عبدالخالق

معاشرہ خواہ کتنا بھی ترقی کرلے اس کی چکا چوند روشنی کے تلے تاریکی اپنا وجود لیے تڑپتی رہتی ہے یہ الگ بات ہے کہ ہم اس تاریکی کو دیکھ کر بھی قبول نہیں کرتے اور نہ ہی اس کا تدارک کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

تاریک راہوں میں بھٹکنے والی ایک معصوم روح کا فسانہ

زندگی میں بہت کم ایسا ہوا کہ میں نے رات اتنی بے چینی اور اذیت سے گزاری ہو، ساری رات پہلو بدلتے اور ٹہلتے ہوئے گزار دی، مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ مجھے اس سے محبت تھی۔

جب وہ پہلی بار ملی تو اس کی عمر پچیس سال تھی، کالے برقعے میں ملبوس کھلتا ہوا سرخی مائل گورا چہرہ، دبلا پتلا جسم، غزالی آنکھیں، گلاب کی پنکھڑی کی طرح لب۔ قدرت نے سب رنگ اس پر فیاضی سے استعمال کیئے۔

میں فون پر کسی سے بات کر رہا تھا ایک منٹ ہی گزرا تھا۔ ”جلدی کریں بچوں کی چھٹی کا وقت ہو رہا ہے، ہمیں دیر ہو رہی ہے۔“ اس نے غصے سے کہا اس کا غصہ بھی اس کی طرح خوبصورت لگا۔

اس وقت میری عمر ساٹھ سال سے زیادہ ہو چکی تھی، اس بڑھاپے کے باوجود بہت عرصہ کے بعد کسی نے دماغ کو چھوئے بغیر سیدھا دل پر اثر کیا، میں اپنی اور اس کی عمر کے درمیانی فرق کو بھول چکا تھا، دل میں ایک خواہش نے جنم لیا۔

”کاش یہ میری باہوں میں سمٹ آئے۔“

فون بند کر کے اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کو جس چیز کی ضرورت تھی دی وہ جلدی سے باہر نکل گئی۔

ریٹائرمنٹ کے بعد بازار میں میں نے ایک کریانہ اسٹور کھول لیا تھا، اب اکثر وہ دوسرے چوتھے روز کچھ نہ کچھ خریدنے کے لیے آجاتی جیسے ہی وہ سامنے آتی میرا دماغ کام کرنا چھوڑ دیتا، میری کوشش ہوتی باقی گاہکوں کو جلدی جلدی فارغ کروں اس کو آخر میں ڈیل کروں، میں نے محسوس کیا کہ پہلے دن کی طرح اب اس کو زیادہ جلدی نہیں ہوتی نہ ہی اس نے جلدی فارغ کرنے کو کہا جیسے کہ وہ بھی زیادہ سے زیادہ دیر رہنا چاہتی ہو۔

ایک دن جبکہ وہ اکیلی ہی اسٹور میں تھی۔ میں نے سامان تھماتے ہوئے اس کے ہاتھوں کو چھولیا،...... اس نے ہاتھوں کو وہیں روک لیا اور مسکرانے لگی ...... میں اپنے ہاتھ اس کی مخروطی انگلیوں والے گورے گورے ہاتھوں پر پھیرنے لگا، تو اس نے بھی اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا، میرے مردہ جسم ...... جس میں خون بھی چیونٹی کی رفتار سے چلتا تھا جان پڑ چکی تھی۔ میں نے محسوس کیا میرے اور دل کی دھڑکن کی رفتار میں اچانک اضافہ ہو گیا ...... میں نے سوچے بغیر کہا ”دوستی کرو گی“ ...... میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے ...... دل موہ لینے والی مسکراہٹ کے ساتھ ...... بولی ......“ دوستی تو ہو گئی۔ لیکن صرف ...... دوستی اس سے زیادہ کچھ نہیں۔“ میں نے ہاں میں ہاں ملا دی۔

اس کا نام مہرالنساء تھا۔ وہ معمولی پڑھی لکھی تھی۔ اس کا خاوند ان پڑھ تھا اور مزدوری وغیرہ کرتا تھا۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیرت زدہ کر دیا کہ وہ چار بچوں کی ماں

ہے۔ اس کی سولہ سال کی عمر میں شادی ہوگئی تھی۔ تیئس سال کی عمر تک اس کے یکے بعد دیگرے چار بچے پیدا ہو چکے تھے۔ ایک بیٹی تین بیٹے۔

اب اس کا میرے پاس آنا جانا زیادہ ہوگیا۔ جب بھی مجھے موقعہ ملتا، میں جنسی تسکین حاصل کرنے کے لیے اس سے "چھیڑ خانی" کی کوشش کرتا تو وہ کہتی۔

"ہماری صرف دوستی ہے اس سے آگے کچھ نہیں۔"

"مرد اور عورت کی دوستی کا کیا مطلب ہوتا ہے"...... میں کہتا لیکن پھر مجبوریوں اور خواہشات نے اسے مجھ جیسے بڈھے کے ساتھ دوستی سے آگے بڑھنے پر مجبور کردیا۔ اب جب میں ہاتھ بڑھاتا وہ منع نہ کرتی۔ وہ جو سودا سلف لیتی اس کے پیسے نہ لیتا۔

اور کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔........... اپنی عمر اور سفید پوشی کی وجہ سے اس کو کہیں اور لے جا بھی نہیں سکتا تھا۔ "شریف خاندان ہونے کی وجہ سے "وہ مجھے اپنے گھر بھی آنے نہ دیتی۔ وہ چاہتی بھی یہی تھی ایسا ہی چلتا رہے۔

محلے میں اس نے مجھے اپنا گھر بھی دکھا دیا تھا۔ کئی دفعہ میں اس کے گھر کے دروازے پر اس کو چیزیں دینے کے لیے بھی گیا۔ پہلی دفعہ جب میں اس کے گھر کے دروازے پر گیا تو اس حسن کی دیوی کو دیکھتا ہی رہ گیا پہلی دفعہ میں نے برقعہ کے بغیر دیکھا تھا۔ کھلے ہوئے بال گلابی رنگ کا لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ جس میں اس کا گلابی مائل گورا رنگ قیامت ڈھا رہا تھا وہ قدرت کا تراشا ہوا ایک حسین شہکار تھی۔ اس کے بعد میں اس کا اور بھی دیوانہ ہوگیا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کے میرے علاوہ اور بھی لاتعداد شکار ہیں۔ دوستی کے نام پر میرے جیسے لوگوں سے جو پیسے اکٹھا کرتی، اپنی خواہشات کے ساتھ ساتھ بچوں کی تعلیم پر خرچ کرتی تھی۔

پھر اچانک اس کا اس کے خاوند اور بچوں کا آنا جانا کم ہونا شروع ہوگیا۔ اب جب وہ کبھی آتی تو میں اس کو چھوتا تک نہ تھا۔ وہ جو بھی اپنی ضرورت کا سامان لیتی، اس کی ادائیگی کر دیتی۔ پھر ان لوگوں کا آنا جانا بالکل بند ہو گیا۔ مجھے اس کی کمی محسوس تو ہوتی لیکن میری حقیقت پسندی نے مجھے دیوانہ ہونے سے بچالیا، اس لیے کہ مجھے احساس تھا کہ میں حسین وجمیل گبرو جوان نہیں ہوں کہ وہ مجھ سے محبت کرتی۔ اس کی ضرورتوں اور خواہشات نے میرے جیسے بڈھے کو برداشت کرنے پر مجبور کیا، دوسری حقیقت اس کے بہت سارے میل ملاپ میرے علم میں آچکے تھے۔

کچھ عرصہ کے بعد میں نے دکان ختم کردی۔ بچوں نے یہاں سے کافی دور شہر کے پرسکون علاقے میں گھر لے لیا ہم وہاں منتقل ہوگئے۔

طویل عرصہ کے بعد سردیوں کی ایک ٹھٹھرتی شام کو شہر کے پوش علاقے میں سے گزر رہا تھا۔ اچانک میری نظر ایک بڑھیا پر پڑی، وہ بچوں کے ایک پارک کے باہر بیٹھی تھی۔ بہت ہی ضعیف اور لاغر، مجھے ایک عزیز کے گھر جانا تھا۔ آگے بڑھ گیا ایک گھنٹے کے بعد واپس آیا، تو وہ اس تخت سردی میں اسی طرح بیٹھی تھی۔ میرا تجسس بڑھا میں

اس کے قریب چلا گیا، وہ کالی چادر اوڑھے ایک پتھر پہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کی نقاہت سے ایسا لگتا تھا کہ آخری سانسیں چل رہی ہوں۔ میری تشویش بڑھی مگر تو نہیں گئی۔ میں نے ہمت کرکے سلام کیا، جواب نہ ملا دوبارہ پھر سلام کیا، تو اس میں حرکت ہوئی نحیف آواز میں سلام کا جواب اتنی آہستگی سے دیا کہ میں بمشکل سن سکا۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں پوچھا۔

اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

"ایک لمحے کے لیے دماغ کو جھٹکا سا لگا کچھ سمجھ نہ آیا کیوں؟"

"ٹھیک ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"آپ بہت دیر سے اس سردی میں بیٹھی ہوئی تھیں مجھے تشویش ہوئی شاید آپ کسی مشکل میں ہیں۔ معذرت چاہتا ہوں مخل ہوا۔" میں نے کہا۔

"نہیں نہیں آپ کا شکریہ آپ نے میرا خیال کیا اور خیریت دریافت کی۔" اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

"اس کی آواز اور چہرہ!"

میں گہری سوچ میں پڑ گیا کہیں اس کو دیکھا اور سنا ہے میرا تجسس بڑھ گیا۔

"معافی چاہتا ہوں اگر آپ اجازت دیں تو میں بیٹھ جاؤں۔" میں تھک چکا تھا، فارغ بھی تھا اور تجسس بھی، میں نے ایک پتھر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"خدا کی زمین ہے میں کون ہوتی ہوں اجازت دینے والی۔" اس کے اس ایک فقرہ میں جیسے دنیا جہاں کا دکھ اور درد بھرا ہوا تھا۔

"آپ کا گھر یہاں کہیں قریب ہی ہے۔" تھوڑی دیر کے بعد میں نے بات شروع کرنے کی کوشش کی۔

"جی ہاں۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"تو پھر آپ یہاں اس خون جما دینے والی سردی میں کیوں بیٹھی ہیں۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے جواب دینے کے لیے جیسے ہی سر اٹھایا، میری سانس رکنے لگی، دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ یا خدا یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ کیا یہ وہی ہے، یا میری نظر کچھ زیادہ ہی کمزور ہوگئی ہے۔ میں نے اور غور کیا تو ایسا لگا "جیسے مصور کی تخلیق کے رنگ جل چکے ہوں، اور کوئلے سے تراشا ہوا اسکیچ باقی رہ گیا ہو مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ وہی ہے۔

مہرو؟ میں بڑبڑایا۔

میری سرگوشی سن کر وہ چونکی۔ "کیا کہا آپ نے۔"

پہلی بار اس نے میری طرف غور سے دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کررہی ہو۔ "آپ کون ہیں؟ اور میرا نام کیسے جانتے ہیں؟"

اس کے صرف نقوش رہ گئے تھے۔ وہ بھی بہت دھندلے چہرے کی رنگت سیاہ ہوچکی تھی۔ آنکھیں اندر کو دھنس چکی تھیں۔ ہونٹ کالے پڑ چکے تھے۔ آنکھوں میں چمک نہ ہونٹوں پر دل آویز مسکراہٹ، ایسی چمک اور مسکراہٹ جو مردے کو بھی زندہ کردے۔ میں ماضی میں پہنچ گیا تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی کانپتی آواز نے مجھے تکلیف دہ حقیقت کا سامنا کرنے پر مجبور کردیا۔

میں نے آپ کے بارے میں پوچھا ہے "آپ کون ہیں اور میرا نام کیسے جانتے ہیں؟" اس نے اپنا سوال دہرایا۔

میرے چہرے پر سفید داڑھی آچکی تھی۔ جس میں ایک بھی کالا بال نہ تھا۔ سر پر سفید ٹوپی کمر جھک چکی تھی۔ ہاتھ میں سہارے کے لیے چھڑی، مجھے یقین تھا۔ ایسا نہ بھی ہوتا تو بھی وہ مجھے پہچان نہ پاتی۔

"نام بتانے کا کیا حاصل بتا بھی دیا تو بھی آپ مجھے پہچان نہ پائیں گی۔"

میں نے اس کے سوالیہ اور پرتجسس چہرے پہ نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔

"آپ بتائیں تو۔" اس نے بے چینی سے کہا۔

میں نے اپنا نام بتایا۔ وہ گہری سوچ میں پڑ گئی۔

"مجھے بھی غلط فہمی نہ رہتی کہ آپ کے دل و دماغ کے کسی گوشے میں میری بھی کوئی گنجائش رہی ہو۔" اس نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں نمی اور لبوں پہ تلخ مسکراہٹ تھی اس نے میرے کانپتے ہوئے ہاتھ کو اپنے یخ بستہ ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

"آپ کو میں کیسے بھول سکتی ہوں۔" اس کے لہجے میں دکھ تھا۔ "بیشک میری زندگی میں ان گنت کردار اور چہرے

آنے لیکن میں دو چہروں اور کرداروں کو کبھی بھول نہ سکی۔
اس سے پہلے کہ آپ میری آپ بیتی کے بارے پوچھیں۔
اس نے وقت کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے انتہائی دھیمی آواز میں بولنا شروع کیا۔

میں نے پنجاب کے ضلع اٹک کے دور دراز ایک پسماندہ گاؤں کے ایک غریب ترین گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ہم سات بہن بھائی تھے میں بہنوں میں سب سے بڑی تھی۔

باپ زمیندار کے پاس کھیت مزدور تھا۔ دو وقت کا کھانا بمشکل ملتا، اس میں سے بھی کسی کو کچھ ملتا کسی کو نہ ملتا، جیسے ہی کھانا تیار ہوتا ہم سب بھوکے جانور کی طرح ٹوٹ پڑتے کھانا بھی کیا روٹیاں اور چٹنی یا دال شوربے میں سے دال کو بھی تلاش کرنا پڑتا پھر بھی اکثر ماں بھوکی سوئی۔

گھر میں ایک شخص شہباز کا آنا جانا تھا۔ ہمارا دور کا رشتہ دار، ساتھ والے گاؤں میں رہتا تھا۔ راولپنڈی شہر میں ملازمت کرتا تھا۔ مالی لحاظ سے بہتر تھا۔ جاتے جاتے ماں کو پانچ دس روپے یہ کہتے ہوئے دے دیتا کہ بچوں کے کھانے لیے کچھ لے آئیے گا۔ ہم بہن بھائیوں کو بھی چونی اٹھنی پکڑا دیتا۔

میری عمر اس وقت لگ بھگ نو سال ہوگی، وہ جب بھی آتا مجھے اپنی گود میں بٹھا لیتا، پیار کرتا میرے گرد اپنی باہیں ڈال کر زور زور سے بھینچتا میری ماں کی طرف دیکھ کر کہتا مہرو بہت پیاری بچی ہے۔ شروع شروع میں عجیب سی گد گدی اور کوفت محسوس ہوتی لیکن اس کے بعد جب مجھے دوسرے بہن بھائیوں سے زیادہ پیسے دیتا تو وہ مجھے بہت اچھا لگتا۔ اس دن میں خوب جی بھر کر دکان سے چیزیں لے کر کھاتی پھر اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرتی۔

میرے والد کو جس دن زمیندار روک لیتا، وہ رات ہمارے گھر ہی گزارتا، اس روز ماں ہم بہن بھائیوں کو جلدی سلانے کی کوشش کرتی۔

یہ تھا وہ دوسرا شخص جس کو میں اپنی زندگی میں نہ بھلا سکی جس نے میری زندگی کے رخ کا تعین کیا، آپ کو اس لئے نہ بھلا سکی کہ باوجود انسانی کمزوریوں کے آپ نے ہمیشہ نہ صرف میری مدد کی بلکہ مجھے اس گندگی سے نکالنے کی مخلصانہ کوشش بھی کی لیکن بچپن ہی میں میری عادتیں پکی ہو چکی تھیں اور کچھ مجبوریاں۔

اب مجھے عادت سی ہوگئی تھی۔ کسی بھی ایسی گود کی تلاش میں رہتی تھی۔ جس میں بیٹھوں اور مجھے پیسے ملیں۔

اب میں بارہ سال کی ہوچکی تھی۔ میرے جسم میں تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ سوچ اور چال میں بھی تبدیلی آرہی تھی۔

شہباز اب بھی ہمارے گھر آتا تھا۔ چونکہ میں اب بڑی ہوگئی تھی۔ اس لیے وہ مجھے گود میں نہیں بٹھاتا تھا۔ بلکہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوتا مجھے گلے لگا لیتا، خوب چومتا، گلے لگا کر بھینچتا، پھر چارپائی پر بیٹھ کر باتیں کسی اور سے کر رہا ہوتا کھیل مجھ سے کھیلتا رہتا، میرے جسم کے مختلف حصوں پر ہاتھ پھیرتا یوں لگتا جیسے...... وہ مجھے کھا جانا چاہتا ہو۔ اب مجھے پیسوں کے علاوہ اس کا ایسا کرنا بھی اچھا لگتا۔ پھر معمول کے مطابق ہم بہن بھائیوں کو پیسے دیتا زور زبردستی ہمیں دکان پر بھیج دیتا ہماری امی اور وہ اکیلے...... رہ جاتے۔

میں نے اب پندرہ سال کی نوخیز اور الہڑ دوشیزہ کا روپ دھار لیا تھا۔ میرے چہرے کا نکھار اور جسم کے ابھار اتنے واضح تھے کہ تھی تو میں پندرہ سال کی لیکن دیکھنے میں اٹھارہ سال سے کم کی نہ لگتی تھی

اور پھر...... میری زندگی کا ایک اور موڑ آیا، ایک دن میں گلی میں سے گزر رہی تھی کہ زمیندار کے بیٹے کی نظر مجھ پر پڑ گئی، شام کو اس کے ایک مزارع کی بیٹی میرے گھر آئی تنہائی دیکھ کر بند مٹھی میں سے ایک کاغذ نکال کر میرے حوالے کیا اور تیزی سے ہمارے گھر سے نکل گئی۔

شروع شروع میں اسکول گئی تھی۔ اتنا پڑھا تھا کہ رقعہ پڑھ اور لکھ لیتی تھی۔ رقعہ کے اندر سو روپے کا نوٹ بھی تھا۔ اس وقت مجھے یہ تک معلوم نہ تھا کہ سو روپے کا نوٹ بھی ہوتا ہے۔ اور نہ ہی میں نے کبھی دیکھا تھا۔ میں نے تو کیا میرے باپ نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا ہوگا۔

زمیندار کے بیٹے نے رقعہ میں پہلے تو میرے حسن کی خوب تعریف کی، پھر مجھے اپنے ڈیرے پر بلایا کہ میں تمہیں اور بھی ایسے نوٹ دوں گا۔

سو کا نوٹ دیکھ کر میرا دماغ پہلے ہی فارغ ہو چکا تھا۔ میں شام کا بے چینی سے انتظار کرنے لگی، جیسے ہی

اندھیرا ہوا میں چپکے سے گھر سے نکلی اور اس کے ڈیرے پر پہنچ گئی، وہ اکیلا چارپائی پر لیٹا ہوا تھا جیسے ہی مجھے دیکھا اور ...... دیکھتا ہی رہ گیا، کافی دیر تک سکتے کے عالم میں رہا میری جھجک اور شرم تو نو سال کی عمر میں ہی ختم ہو چکی تھی۔

"ملک جی! کیا ہوا ایلا لیا ہے بیٹھنے کو نہیں کہو گے۔" میں نے بیباکی سے کہا۔

میری بیباکی پر وہ اور بھی پریشان ہو گیا "ہاں ہاں بیٹھو بیٹھو" اس نے لڑکھڑاتی زبان سے کہا۔

پھر وہ آہستہ آہستہ سنبھلنے لگا...... میری خوبصورتی کی تعریف کرنے لگا اور میرے ساتھ ہی چارپائی پر بیٹھ گیا پہلے... میرا ہاتھ پکڑا، پھر میرے بالوں کی لٹ کو سنوارا مجھے ... کچھ پرواہ نہیں ہوئی میں نے سوچا چھیڑ چھاڑ کرے گا تھوڑی دیر کھیلے گا...... پھر مجھے سو والا نوٹ دے گا اور میں بھاگتے ہوئے گھر چلی جاؤں گی ...... لیکن...... اس کے بعد مجھے ہوش اس وقت آیا......... جب میں...... ایک نئی دنیا میں پہنچ چکی تھی۔ جس کا میں نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ اب میری بیباکی اور تیزی طراری......... نہ جانے...... کہاں چلی گئی...... وہ مجھے چھیڑ رہا تھا اور میں دوپٹے میں منہ چھپا رہی تھی...... میں چاہتی تھی کسی طریقے سے وہاں سے جلدی سے بھاگ جاؤں...... وہ میرا ہاتھ پکڑتا رہ گیا اور میں بھاگ کھڑی ہوئی، وہ مجھے نوٹ پکڑانے کی کوشش کرتا رہا لیکن میں نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا...... میں کیسے گھر پہنچی ...... گھر پہنچتے ہی کس نے کیا آواز دی...... کس نے کیا کہا...... میں چارپائی پر اوندھے منہ لیٹ گئی...... ماں نے کھانے کا پوچھا میں نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کیا...... اور پھر...... دوسری صبح اس وقت آنکھ کھلی جب ماں مجھے زور زور سے آوازیں دے رہی تھی...... ایسی نیند ...... میں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی...... چارپائی سے اتری تو ٹانگیں ایسے گھوم رہی تھیں جیسے شرابی کی......

"مہرو اب طبیعت کیسی ہے" ماں نے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں ماں"...... میں نے مختصر جواب دیا۔

اب...... اس کے بعد... جب بھی موقع ملتا... میں ہوتی...... وہ ہوتا... اس نے مجھے ہر طرح سے... مالا مال کر دیا۔

اب جب شہباز آتا تو میں اس سے بات تک نہ کرتی۔

"مہرو کو کیا ہو گیا ہے؟"...... وہ ماں سے شکوہ کرتا... اب مجھے وہ ایک آنکھ نہ بھاتا میں چاہتی تھی وہ ہمارے گھر نہ آیا کرے، جب وہ مجھے پیسے دیتا میں اٹھا کر پھینک دیتی۔ خدا ناراض ہوتا ہے مہرو! رزق زمین پر نہ پھینکا کرو ماں سادگی سے مجھے ڈانٹتی۔

اور...... پھر وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا...... ایک صبح اٹھی دماغ چکرا رہا تھا...... زور سے قے ہوئی...... ماں بھاگتی ہوئی آئی...... اس کو کون بتاتا...... کیا ہوا...... سر پکڑ کر بیٹھ گئی...... مجھ سے بار بار پوچھا... وہ کون ہے؟ پہلے تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ کس کے بارے میں پوچھ رہی ہے لیکن جب سمجھ میں آیا تو میں نے چپ سادھ لی۔

بھائی کو شہباز کے گاؤں بھجوایا...... دونوں نے سر جوڑ لیے...... رات کو باپ گھر آیا وہ بھی شامل ہو گیا ...... تیسرے دن میری شادی راولپنڈی شہر میں ...... شہباز کے دور کے رشتہ دار سے مجھے بتائے بغیر کر دی گئی۔

اس نے انتہائی مکاری سے میری شادی ایسے گھر کرائی جہاں اس کو آنے جانے میں رکاوٹ نہ ہو۔

میں اب شہباز کی رکھیل جیسی تھی۔ میں سمجھ چکی تھی میری آزادی اس کی مرہون منت ہے، اس لیے میں نے اپنے آپ کو مکمل طور پر اس کے حوالے کر دیا۔ وہ جب چاہتا میرے کمرے میں گھس آتا، مجھے برا نہ لگتا اس لیے کہ مجھے اس کی ضرورت تھی۔

اس کے بعد مجھے دوبارہ شہزاد سے کبھی ملنے کا موقع نہ دیا گیا، زمیندار کے بیٹے کا نام شہزاد تھا۔ وہ شہر میں یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا، کلین شیو گورا چٹا، یہی وجہ ہوئی کہ اب کلین شیو خوبرو نوجوان میری کمزوری بن چکے تھے، جب بھی میری نظر کسی ایسے نوجوان پر پڑتی میں وہیں ڈھیر ہو جاتی۔ میرے جیسی خوب صورت اور نوجوان لڑکی کو انکار کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ اپنی مالی ضروریات پورا کرنے کے لیے میں آپ جیسے بڈھوں کی تلاش میں رہتی تھی۔ جن سے میری مالی ضروریات خوب پوری ہو جاتیں۔ میرا دس سالہ تجربہ تھا، آپ جیسے بڈھے بے ضرر اور مال لٹانے والے ہوتے ہیں، مجھے معلوم تھا، میرے جیسی خوبصورت لڑکی

سامنے ہوتو مردہ کا مردہ بھی ایک دفعہ اٹھ بیٹھے گا۔

اور پھر...... ایک دن مراد اور شہباز کے درمیان کسی بات پر تکرار ہوگئی۔ بد کلامی سے بات بڑھتی ہوئی ہاتھا پائی تک پہنچ گئی، دونوں آپس میں گتھم گتھا ہوگئے اور پھر وہ ہو گیا...... جس کا میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ شہباز کا دھکا لگنے سے مراد کا سر زور سے پلنگ کے کونے سے ٹکرایا۔ مراد خون میں لت پت فرش پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ شہباز اور مجھ پر سکتہ طاری ہوگیا، سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہوگیا اور اب کریں کیا، اسی دوران شور کی آواز سن کر میری دیورانی جن کے اور ہمارے گھر کے درمیان ایک دیوار تھی آ گئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سارا محلہ اکٹھا ہوگیا۔ ایک بزرگ سمجھ دار نکلے انہوں نے ایدھی سنٹر فون کیا ایمبولینس آ گئی۔ مراد کو اسپتال لے گئی لیکن خون اتنا زیادہ بہہ چکا تھا کہ ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ چکا تھا۔

تیس برس کی عمر میں بیوہ اور میرے بچے یتیم ہو چکے تھے۔ مراد کے بھائی اپنے اپنے گھروں والے تھے لیکن تھے تو بھائی وہ ہر لحاظ سے مضبوط تھے۔ جنہوں نے شہباز کو پھانسی کے پھندے تک پہنچا کر دم لیا۔

تھوڑا عرصہ سوگ کی کیفیت رہی کہتے ہیں...... انسان کی عادات قبر تک جاتی ہیں۔ اب میں اپنی خواہشات پورا کرنے کے لیے مکمل طور پر آزاد تھی۔ میں نے اپنا مکان جو کہ میرے خاوند کے حصے میں آیا تھا بیچ دیا اور شہر کے پوش علاقے میں ایک مکان کرائے پر لے لیا۔

بچے بڑے ہو رہے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت پر مکمل توجہ نہ دی، وہ بے راہ روی کا شکار ہو رہے تھے جس کی وجہ سے مختلف جرائم میں ملوث ہو رہے تھے۔ کئی دفعہ تھانے اور جیل کے چکر بھی لگا چکے تھے۔ لیکن اپنے تعلقات کی وجہ سے ان کو وہاں زیادہ نہ رہنے دیا۔

میری بیٹی جو کہ اب جوان ہو چکی تھی میرے ایک چاہنے والے کے ساتھ بھاگ گئی۔ اس نے بھی اس کو آگے کسی اور کے حوالے کر دیا۔

چونکہ میری جوانی اب مجھے خیر باد کہہ چکی تھی، اس لیے میرے چاہنے والوں نے میرے در پر آنا کم کر دیا۔ میرا ایک بیٹا کافی عرصہ سے لاپتا ہو چکا تھا، دوسرا نشے کا عادی ہوگیا، تیسرا بینک ڈکیتی کے دوران فائرنگ کے تبادلہ میں ہلاک ہوگیا۔

میری آمدن کے ذرائع ناپید ہو چکے تھے۔ میں نے ایک چھوٹے سے محلے میں بیٹھک کرائے پر لے لی اور انتہائی کسمپرسی کی زندگی گزارنے لگی۔ اب میں بیمار بھی رہنے لگی تھی بخار ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹرز کی دواؤں سے ایک آدھا دن افاقہ ہوتا دوبارہ پھر شروع ہو جاتا۔ ڈاکٹروں نے ٹیسٹوں کا کہا لیکن ان کے لیے پیسے کہاں سے لاتی۔ کمزوری بہت زیادہ ہوگئی، اب نوبت فاقوں تک پہنچ گئی، بہن بھائی عزیز رشتہ دار میری کارستانیوں کی نذر ہو چکے تھے۔

اب ایک ہی راستہ رہ گیا...... پہلے برقعے میں منہ چھپا کر ذلت کی ایک انتہا تک گئی تھی اور...... اب...... چادر میں منہ چھپا کر...... دوسری انتہا...... کسی نہ کسی چوراہے پر جھولی پھیلا کر بیٹھ جاتی۔

ایک دن...... ایک چمکتی دمکتی گاڑی کے اندر ہاتھ پھیلایا تو ایک لڑکی نے نوٹ میرے ہاتھ پر رکھا...... میں روایتی قسم کی دعائیں دینے لگی...... میری آواز سن کر لڑکی چونکی......

مائی...... بات سن...... لڑکی نے گاڑی سے باہر نکلتے ہوئے مجھے آواز دی...... میرے انتہائی قریب آکر اس نے اچانک چادر...... میرے منہ سے اتار دی...... میں اسے اور...... وہ مجھے دیکھتی رہ گئی، ہم دونوں کے منہ سے کچھ نہ نکلا...... اسی عالم میں اس نے مجھے تقریباً گھسیٹتے ہوئے گاڑی میں ڈالا۔ چلو...... اس نے ڈرائیور سے کہا۔ وہ میری بیٹی ثمرین تھی۔

سارے راستے نہ تو اس نے اور نہ ہی میں نے کوئی بات کی۔ کافی دیر کے بعد گاڑی ایک عالی شان مکان کے گیٹ کے سامنے کھڑی تھی۔ یہ شہر کا پوش علاقہ تھا۔ گاڑی پورچ میں رکی ہم اسی خاموشی سے گھر میں داخل ہوئے۔ جیسے ہی ہم کمرے میں داخل ہوئے ہمارے تمام بندھن ٹوٹ گئے، ہم گلے لگ کر بہت دیر تک روتی رہیں۔

ماں یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے، اپنی کیا حالت کر لی ہے...... اس نے میرے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تم کہاں چلی گئی تھیں ماں؟'' ہم دونوں کے ایک

دوسرے کے بارے ان گنت سوالات تھے۔

''ہاں...... تمہارے راستے پر چلتے ہوئے میں بہت دور نکل آئی ہوں...... میں تمہیں چھوڑ کر اپنی مرضی سے چلی تو گئی تھی لیکن واپسی کا راستہ...... میرے اختیار میں نہ تھا...... بکتی گئی...... ایک سوداگر سے دوسرے سوداگر کے ہاتھوں...... واپسی کا راستہ مل بھی جاتا ...... تو...... کون سے وہاں...... پر...... مصلے بچھے تھے۔

یہ شرفاء کی بستی ہے جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ یہ ٹھکانہ بھی سماج کے ایک ٹھیکیدار کی ملکیت ہے، اس میں ایک کمرہ میرا ہے۔ اسی طرح اس میں کئی کمرے ہیں، جن میں میری طرح کی بھٹکی ہوئی تاریک راہوں کی مسافر تھکا دینے والی سیاہ راتوں میں نورانی چہروں کا دل بہلاتی ہیں اور سارا دن تھکاوٹ اتارتی ہیں۔

ماں میں تمہیں یہاں اپنے پاس نہ رکھ سکوں گی، ثمی نے دوٹوک لہجے میں کہا اور ہاں...... یہاں کسی کو یہ بھی بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں آپ کی بیٹی ہوں۔ یہاں قریب ہی کہیں ایک کمرے کی رہائش کا بندوبست کردوں گی۔''

''ثمی نہ تو مجھے تم سے کوئی شکوہ ہے اور نہ ہی تم پر کسی طرح کا حق اس لیے کہ میں نے تم بچوں کو دیا بھی کیا ہے بلکہ تم بہن بھائیوں کو اپنی خواہشات کی نذر کردیا ہے۔ مجھے اس سے پہلے جو سزا مل چکی ہے یا آئندہ ملے گی وہ میرے کردہ گناہوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں''

چند دنوں کے بعد میں اسی آبادی میں ایک چھوٹے سے کمرے میں شفٹ کردی گئی۔ مجھے ثمرین بہت کم ملنے آتی پیسے کسی کے ہاتھ بھجوا دیتی دن بدن کمزور ہو رہی تھی، میرے ٹیسٹ کرائے گئے جو کہ بہت مہنگے تھے۔ جس کے سارے اخراجات ثمرین نے برداشت کیے۔

اس کے بعد وہ دیر تک خاموش رہی...... میں اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا...... سناٹا زیادہ طوالت اختیار کرنے لگا تو مجھے بےچینی ہونے لگی...

''مہرو...... خاموش کیوں ہوگئی ہو... بولو...!'' میں مضطرب ہو رہا تھا۔

دوسری طرف مکمل خاموشی...... میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر جھنجوڑا...... اس کے ہاتھ کچھ زیادہ ہی ٹھنڈے ہو رہے تھے...

''بہت دنوں سے سوچ رہی ہوں کہ یہ سب خدا...... کی طرف سے ہوتا ہے؟ سماج کی طرف سے؟...... یا پھر...... انسان...... خود اس کا ذمہ دار ہوتا ہے؟۔ میں...... اپنی مرضی سے تو ایسے گھر میں پیدا نہیں ہوئی تھی جہاں...... ایک وقت کے کھانے کو ترسا جاتا ہو اور پھر پیٹ خالی ہو...... تو سوچ خالی پیٹ سے آگے نہ بڑھتی ہو'' اس نے ایک ہی سانس میں سوال بھی کیا اور جواب بھی خود ہی دینے لگی۔

وہ پھر خاموش ہوگئی۔''

''ٹسٹوں سے بیماری کی تشخیص ہوئی۔'' میں اس کے جواب کا منتظر رہا۔

طویل خاموشی کے بعد نہایت مدھم لہجے میں اس نے کہا۔

''ہاں!...... ہوئی۔''

''کک...... کیا؟۔'' میں نے نہایت بےچینی اور تجسس سے دریافت کیا۔ اس نے سر اٹھا کر میری آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی نگاہیں بالکل سرد تھیں۔ سرد منجمد برف کی طرح اور اس کا چہرہ ہر طرح کے جذبات و تاثرات سے یکسر خالی تھا جیسے کوئی زندہ لاش۔ لاش کے ہونٹ ہلے اور وہ دھیرے سے پھسپھسائی۔

''ایڈز!'' پھر وہ دھیرے سے اٹھی اور کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح کمزور لڑکھڑاتے قدموں سے ایک تاریک گوشے کی جانب چل پڑی۔ میں اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا اس کے ہیولے کو گہری دھند میں گم ہوتا دیکھتا رہ گیا۔

دیس بدیس نئے اور پرانے لکھاریوں کی
رنگارنگ تحریریں جو آپ کے دل کو چھولیں گی

ایک ادھوری کہانی	ڈاکٹر اسلم جمشید
پشپ گرام کا اتہاس	ابرار مجیب
دوسرا مرد	فوزیہ قریشی
لاپتا نوجوان	سلمان عبدالصمد
گناہ	علی نثار
بے نشان کب تک	ثانیہ عبدالغفور
صنم لاگی تم سے من کی لگن	مہوش ملک

ایک ادھوری کہانی

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری

"پھر یوں ہوا کہ اچانک شہزادہ غائب ہو گیا۔"

شادمانی بیگم سانس لینے کو رکیں تو بچوں کے سوالوں کی بوچھار ہونے لگی۔

"نانی آپا! ایسا کیسے ہو گیا۔۔۔؟" سبحان کا تجسس اس کی زبان پر آ گیا۔

"دادی آپا! شہزادہ کہاں چلا گیا؟ کیا پری اسے لے گئی؟" سمیہ کی حیرانی بڑھ گئی تھی۔

"کیا وہ اب کبھی نہیں آئے گا" حمیرا نے بھی اپنا سوال چھوڑا۔ وہ آنکھیں پھاڑے بیگم شادمانی کو دیکھ رہی تھی۔ ریحان اور حیا بھی گم صم سے بیٹھے تھے۔

بیگم شادمانی اپنے پوتے۔ پوتیوں، نواسے۔ نواسیوں کے درمیان گھری بیٹھی تھیں۔ بچے ان سے ضد کر کے کہانی سن رہے تھے۔ بیگم شادمانی کہانی سنانے میں ماہر تھیں۔ بچے ان سے بہت مانوس تھے۔ وہ جب بھی رات کو نماز اور کھانے سے فارغ ہو کر اپنے بستر میں جاتیں، بچے ایک ایک کر کے ان کے بستر میں آ دھمکتے۔ بیگم شادمانی بچوں کو راجا۔ رانی، دیو۔ جن، پری، شہزادہ۔ شہزادی کی دلچسپ کہانیاں سناتیں اور بچے بڑے انہماک سے سنتے۔ بعض بچے تو سنتے سنتے نیند کی وادی میں چلے جاتے۔ بعض کو نیند کے جھونکے آتے رہتے، مگر وہاں سے جانے کو راضی نہ ہوتے۔ دیر رات ان کی مائیں اپنے بچوں کو اپنے کمروں اور بستروں میں لے جاتیں۔ اکثر بیگم شادمانی سے کہانی سننے کے بعد ہی بچوں کو نیند آتی۔ انہیں زیادہ تر لوگ شادمانی آپا کہتے۔ 'آپا' ان کے نام کے ساتھ ایسا جڑا گویا ان کی کنیت ہو۔ کیا بچے، کیا بڑے، سبھی انہیں آپا کہتے۔ حد تو یہ ہو گئی کہ کوئی انہیں شادمانی آپا کہتا، تو کوئی انہیں پھوپھی آپا، پوتے۔ پوتیاں، نواسے۔ نواسیاں تو انہیں نانی آپا اور دادی آپا کہتے۔ ابھی کل ہی تو وہ ایک دلچسپ کہانی سنا رہی تھیں کہ ان کی لاڈلی پوتی سمیہ، جو چھ سال کی تھی ضد کرنے لگی۔

"دادی آپا، دادی آپا، ہمیں اپنی کہانی سناؤ نا! ہمیں آپ کی کہانی سننی ہے۔"

پوتی کے منہ سے یہ سن کر شادمانی بیگم لمحہ بھر کو چونک گئی تھیں۔ وہ ماضی جو وہ بھول گئی تھیں اور جسے یاد کرنے کی نہ ہمت تھی نہ ضرورت۔ بچی کی فرمائش پر پہلے تو انہوں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

"بیٹا میری کوئی کہانی نہیں، میں تمہیں 'سمارا پری' کی کہانی سناتی ہوں"

"نہیں دادی آپا! ہم نہیں سنتے۔" سمیہ نے اس طرح منہ بنایا اور دوسری طرف گھوم گئی، گویا ناراض ہو گئی ہو۔ کتنی چنچل تھی، شیطان کی نانی کہیں کی۔

"نانی آپا! ہم تو آپ کی کہانی سنیں گے بس" سبحان نے معاملے کو اور الجھا دیا۔

"اچھا میں کل سناؤں گی" بیگم شادمانی نے پھر ٹالنے کی کوشش کی۔

"او کے نانی آپا" سبحان بولا۔

"میری پیاری نانی آپا" حمیرہ نے بھی ساتھ دیا۔ حیا تو لپک کر ان کی گود میں بیٹھ گئی۔

اس دن تو بات ٹل گئی تھی لیکن بچے کہاں ماننے والے تھے۔ انہوں نے بیگم شادمانی کو اگلے دن وقت مقررہ پر پکڑ ہی لیا۔ بیگم شادمانی بمشکل تمام اس سخت مرحلے کے لیے تیار ہوئیں۔

"اچھا تو لو سنو۔۔۔ میں تمہیں ایک شہزادے کی، سچ مچ کے شہزادے کی کہانی سناتی ہوں۔۔۔ ایک شہزادہ تھا، واقعی شہزادہ تھا وہ، وہ رنگ میں تو سانولا تھا مگر ذہن اور عقل و فہم میں، اخلاق و کردار میں، خدا ترسی میں، غریب پروری میں اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کے پردادا انگریزوں کے زمانے میں ایس پی تھے۔ ان کی انگریزوں سے خوب چھنتی تھی۔"

"دادی، یہ چھنتی، کیا ہوتا ہے؟"

سمیہ نے بیچ میں ٹوک دیا۔ معصوم سے سوال پر بیگم شادمانی کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور سمیہ کا گال تھپتھپاتے

ہوئے بولیں۔

''چھنی کا مطلب ہوتا ہے۔ دوستی ہوتا، جھیں؟''

''انگریز تو انگریزی بولتے ہوں گے پھر وہ کیسے سمجھتے ہوں گے؟'' سبحان بھی بول پڑا

''ارے بھیا دان کے پردادا بھی انگریزی جانتے تھے اور انگریزی میں باتیں کرتے تھے۔''

''اچھا سنو! وہ شہزادہ ریاست دولت پور کا رہنے والا تھا۔ دولت پور بہت بڑا قصبہ تھا۔ اور سیدوں کا قصبہ کہلاتا تھا۔ وہاں زیادہ تر سید آباد تھے۔ اور سب کے سب رئیس تھے۔ دولت پور باغات کے لئے مشہور تھا۔ آم کے باغات میں دسہری لنگڑا گلاب جامن، چوسا اور رٹول کی فصل ہوتی۔ آم کے علاوہ لیچی اور امرود کے باغات بھی تھے۔ دولت پور کے نچلے طبقے کے لوگ اور غریب مزدور باغات میں محنت مزدوری کرتے۔ باغات کے علاوہ کھیتی باڑی بھی ہوتی۔ سال میں دو بار فصلیں اگاتے۔ گیہوں، چاول اور مکئی کے علاوہ یہ علاقہ گنے کے لئے بھی مشہور تھا چھوٹے بڑے ہر طرح کے کسان تھے۔ کچھ تو خود اپنی کھیتی کرتے۔ زیادہ تر نچلے طبقے کے لوگ امیروں اور رئیسوں کے باغات اور کھیتوں میں کام کرتے۔ باغات کی فصل کا جب موسم آتا تو علاقے کی رونق دیکھنے لائق ہوتی۔ ہر طرف آم ہی آم۔ باغ کے ٹھیکے دو سال کے لئے چھوڑے جاتے۔ ٹھیکے میں سو پچاس پیٹی آم مالک کو الگ سے ملتے۔ جن کا استعمال اکثر لوگ سرکاری افسروں اور دوست احباب کے یہاں تحفے بھیجنے میں کرتے ہیں۔ اس طرح جاڑوں کے موسم میں جب گنے کا موسم ہوتا تو پورے علاقے کی رونق دو بالا ہو جاتی۔ زیادہ تر کسان اپنا گنا چینی ملوں میں لے جاتے وہاں سے پرچی ملتی، پرچی سے بعد میں بینکوں سے پیسے مل جاتے۔ بہت سے کسانوں نے کولہو بھی لگا رکھے تھے۔ کولہو پر گنے سے گڑ تیار کیا جاتا۔ جب گڑ کڑھاؤ میں کھولتا تو اس کی میٹھی میٹھی خوشبو سے پورا علاقہ معطر ہو جاتا۔

میں جس شہزادے کی کہانی تمہیں سنا رہی ہوں۔ اس کا گھر اور اس کا خاندان دولت پور کے پڑھے لکھے لوگوں اور سرکاری عہدوں کی وجہ سے بڑے بڑے دولت مندوں سے زیادہ مشہور تھا۔

''کچھ پتہ ہے اس شہزادے کا نام کیا تھا۔؟''

''نہیں نہیں۔ آپ بتاؤ نا!'' ایک ساتھ سبھی بول پڑے

''اس کا نام سید قمر الدین تھا۔ قمر یعنی چاند واقعی وہ شہزادہ پورے علاقے میں چاند جیسا ہی تھا۔ ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ اس کے پردادا سید عبدالحیٰ انگریزوں کے دوست تھے۔ اور ضلع کے ایس پی تھے۔ اکثر انگریز ان کے گھر مہمان ہوتے۔ جب بھی انگریز آتے۔ عبدالحیٰ کے گھر دیکھنے والوں کی بھیڑ لگ جاتی۔ سفید چٹے اور سرخ سفید رنگت والے انگریزوں کو لوگ یوں دیکھتے گویا نئی مخلوق دنیا میں آ گئی ہو۔ انگریز دن میں وسیع و عریض دالانوں میں آرام فرماتے۔ ان کے آرام کے لئے نوکر چاکروں کی پوری ٹیم لگی ہوئی تھی۔ مشروب آ رہے ہیں۔ کھانے کی انواع و اقسام حاضر ہیں۔ انگریز ویسے تو سگار کے شوقین تھے لیکن دولت پور آ کر انہیں حقہ اتنا پسند آیا کہ انہیں اس کی لت لگ گئی تھی۔ ہر دم حقہ تازہ کیا جاتا۔ چلم بھری جاتی اور انگریز خوبصورت چادر بچھی چارپائیوں دکاؤچ (لیٹ جانے والی کرسیاں) اور نواڑ کے پلنگوں پر لیٹے اور بیٹھے حقے کی لمبی سی نے منہ میں دبائے حقہ گڑ گڑاتے رہتے۔ انہیں حقے کا گڑ گڑانا بہت اچھا لگتا تھا۔ انگریز جب ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی بولتے تو گاؤں اور قصبے کے لوگ ہنسا کرتے۔

''او مین! تم کیا کرتا۔۔''

''تم وہاٹی، ہنستا۔۔''

اور لوگوں کے پیٹوں میں ہنستے ہنستے بل پڑ جاتے۔ رات کو عبدالحیٰ انگریزوں کو شکار پر لے جاتے۔ گھنے جنگلوں میں بارہ سنگھا، ہرن، نیل، دسا بھر، پہاڑ اکا کڑ اور کبھی کبھی تیندوے کا بھی شکار ہو جاتا۔ انگریزوں کی بندوقیں بہت اچھی تھیں۔ ایک بھی فائر نشانے پر لگتا تو جانور ڈھیر ہو جاتا تھا۔ جانور کے گرتے ہی ملازمین جا کر اسے ذبح کرتے اور گوشت بناتے۔ انگریزوں کو گوشت کا بڑا شوق تھا۔ وہ بھنا ہوا گوشت اور کباب بہت زیادہ پسند کرتے تھے۔ شکار کے جانوروں کی

کھال سکھائی جاتی، پھر اس میں دوائیاں اور مسالے لگائے جاتے، بعد میں ان میں بھس اور دوسری ہلکی چیزیں بھر کر ایسا بنا دیا جاتا گویا دوبارہ زندہ ہو اٹھے ہوں۔ پورا جانور، جانوروں کے سر اوران کی کھالوں کو مہمان خانے کے بیچ میں، دیواروں پر اور کونوں میں سجایا جاتا۔ مہمان خانے میں داخل ہوتے ہی بعض لوگ تو ڈر ہی جاتے۔ ان سے کیا رعب قائم ہوتا تھا، کیا شان ٹپکتی تھی۔ شکار، دولت پور کے زیادہ تر سیدوں کا شوق بھی تھا اور کمزوری بھی۔

شہزادہ قمرالدین کے دادا سید نجم الدین اپنے وقت کے بہت بڑے ڈاکٹر تھے۔ دولت پور اور آس پاس کے لوگوں کا علاج کرتے۔ پھر جب جنگِ آزادی کی لڑائی میں گاندھی جی نے 'عدم تعاون' تحریک چلائی تو سید نجم الدین بھی اس تحریک میں شریک ہو گئے۔

''دادی، دادی، یہ عدم تعاون تحریک کیا ہے؟'' حمیرا نے اپنا تجسس ظاہر کیا

بیگم شادمانی مسکرائیں اور بولیں۔

''بچو تمہیں یہ تو پتہ ہے کہ ہمارے ملک پر انگریزوں کا قبضہ تھا؟''

''جی! دادی۔''

''انگریزوں سے ملک کو آزاد کرانے کے لئے ہمارے لیڈروں نے بڑی بڑی تحریکیں چلائیں۔ انہیں میں سے ایک تحریک جو گاندھی جی نے چلائی تھی، اس کا نام عدم تعاون تحریک ہے۔ عدم تعاون یعنی ہم ہر کام میں اب آپ کی مدد نہیں کریں گے۔ جب گاندھی جی نے یہ نعرہ دیا تو لوگوں نے سرکاری عہدے چھوڑ دیئے۔ وکیلوں نے وکالت چھوڑ دی۔ سرکار کی مدد کرنے اور اس کی مدد لینا، دونوں کام چھوڑ کر لوگ میدان میں آ گئے۔ بچو، اس سے آزادی کی لڑائی کو بہت طاقت ملی۔۔۔ اونہہ۔۔۔ انھو۔۔۔ اکھ۔۔۔ کھا'' اور بیگم شادمانی کو کھانسی آ گئی، کھانسی پر قابو پاتے ہوئے انہوں نے دوبارہ کہانی شروع کی

''شہزادہ کے والد بہت بڑے تاجر یعنی بزنس مین تھے۔''

''دادی، جلدی سے شہزادے کے بارے میں بتائیے نا!'' بچوں نے یک زبان کہا۔

''بتاتی ہوں! شہزادہ اپنے گھر کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی تین بہنیں تھیں۔ بچپن ہی سے شہزادہ بہت ذہین، تیز طرار اور شرارتی تھا۔ شہزادہ کی دادی بھی بڑی نیک اور گھریلو خاتون تھیں شہزادہ کی ماں معمولی پڑھی لکھی تھیں۔ مگر انہیں پڑھنے کا خوب شوق تھا۔ افسانے اور ناول پڑھنا ان کا جنون تھا۔ وہ خود بھی کہانیاں لکھا کرتی تھیں۔ بہت سمجھ دار خاتون تھیں۔ عورتوں کی تعلیم کی حامی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بچپن ہی سے شہزادہ اور اس کی بہنوں کو علم کے زیور سے آراستہ کیا۔ شہزادے کو دہلی کی جامعہ میں اور اس کی بہنوں کو علی گڑھ میں تعلیم کے لئے بھیجا۔ شہزادے نے جامعہ میں خوب نام کمایا۔ ہر طرح کے مقابلوں میں ہمیشہ اول آتا۔ بیت بازی کا ماہر تھا اور خود بھی شعر کہنے لگا تھا۔ اس کی نظمیں تو بڑی پر اثر ہوتی تھیں۔ پھر شعر پڑھنے کا اس کا الگ انداز۔ جامعہ میں پڑھنے کے دوران ہی شہزادے کے والد کا انتقال ہو گیا۔ شہزادہ مشکل سے اٹھارہ سال کا ہوگا۔ اچانک سر سے سایہ اُٹھ جانے سے شہزادے کو بہت رنج و ملال ہوا۔ مگر مرضی الٰہی کے آگے سر جھکانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ شہزادہ پر اب گھر کی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی آ گیا تھا تین تین بہنیں اور ماں، اب سب کچھ اسے ہی دیکھنا تھا۔ اسی لئے اس نے دہلی سے پڑھائی ختم کر کے دولت پور میں ہی پڑھنے کا ارادہ کر لیا۔

کہانی سناتے سناتے بیگم شادمانی نے دیکھا سمیہ سو گئی ہے۔ حیا اور سبحان بھی اونگھ رہے ہیں۔ باقی بچے بھی کچھ جاگے کچھ سوئے لگ رہے تھے۔

''بچو چلو اب اپنے اپنے بستروں میں جاؤ۔ اب کہانی کل ہوگی۔''

بیگم شادمانی نے کہانی بیچ میں روکنے کے فیصلے سے ناراض سبحان، آنکھوں میں نیند لئے وہاں سے جانے تو لگا مگر جاتے جاتے بولا۔

''نانی آپا! میں تو کل ضرور شہزادے کی آگے کی کہانی سنوں گا۔''

"ٹھیک ہے۔ خدا حافظ، شب بخیر سب کہئے شب بخیر۔"

"شب بخیر۔"

سارے بچے ایک ساتھ بول پڑے۔

بچے جا چکے تھے۔ بیگم شادمانی اپنے بستر پر تنہا رہ گئی تھیں۔ انہیں یاد آیا آج تو انہوں نے عشاء کی نماز بھی نہیں پڑھی۔ گھڑی دیکھی رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ انہوں نے وضو کیا اور نماز کی چوکی سنبھال لی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد اللہ سے گڑگڑا کر دعائیں مانگنے لگیں۔

"اے اللہ تو انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرنا۔ اللہ ہم سب کو بخش دینا، میرے بچوں کو نیک راہ پر چلانا۔"

بیگم شادمانی کے ایک بیٹا سید ضیاء الدین اور ایک بیٹی سید صبا قمر تھی۔ بیٹی ایک پرائیویٹ کمپنی میں بڑے عہدے پر تھی۔ اس کے شوہر سید سلمان ایک بڑی کمپنی میں جی ایم تھے۔ ان کے دو بچے، سبحان اور حیا تھے۔ بیٹا ضیاء میڈیکل کالج میں پروفیسر تھا۔ اس کی دو بیٹیاں سمیہ اور حمیرا اور ایک بیٹا ریحان تھا۔ سارے بچے چھوٹے تھے۔ چار سال سے دس سال تک کے بچے، جب بھی گرمی کی چھٹیاں ہوتیں، صبا بھی آجاتی اور سارے بچے مل کے گھر سر پر اٹھا لیتے، ساتھ میں دادی اور نانی یعنی بیگم شادمانی کو بھی ساتھ لئے پھرتے۔ بیگم شادمانی پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کو دیکھ کر خوش ہوتی رہتیں۔ کہانی سنانا ان کا بچپن کا شوق تھا۔ جب وہ چھوٹی تھیں تو اپنی دادی اور نانی سے خوب کہانیاں سنتی تھیں۔ اور اب جب بزرگی نے اپنا لیا تو کہانیاں سنانا، ان کا محبوب مشغلہ بن گیا تھا۔ وہ اپنی دادی۔ نانی کی ادھوری کہانیوں کو پورا کرتیں اور دلچسپ انداز میں کہانیاں سنایا کرتیں۔ ان کے شوہر کا انتقال ابھی پانچ چھ سال قبل ہی ہوا تھا۔ بھرا پرا گھر، آندھی میں تنکوں کی طرح بکھر کے رہ گیا تھا۔ بیٹا جاب کے سلسلے میں باہر تھا۔ بیٹی کی شادی ہو چکی تھی، وہ بھی دوسرے شہر میں تھی۔ شوہر کے انتقال کے بعد اب ان کا کوئی نہیں تھا۔ یوں تو ان کا میکہ بھی دولت پور میں ہی تھا۔ بھائی، بھابھیاں، والدین، سب تھے مگر ان کی ذاتی تنہائی دور کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

اگلے دن شام ہوتے ہی ریحان ان کے آس پاس منڈلانے لگا تھا۔

"بیٹا ابھی جاؤ، کچھ پڑھائی کرلو۔"

سمیہ پڑھائی کی شوقین تھی۔ حیا کو بھی پڑھنا اچھا لگتا تھا، وہ دونوں خود کتابیں لے کر بیٹھ جاتیں۔ تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ اچانک شور ہوا اور ضیاء اور صبا، ان کے بچے وغیرہ بھی آدھمکے۔ بچوں نے اپنے والدین کو بتا دیا تھا کہ دادی آپا، شہزادے کی سچی کہانی سنا رہی ہیں۔ تو بچے اپنے والدین کو بھی گھسیٹ لائے۔

"امی! ہم بھی سنیں گے کہانی۔۔۔" ضیاء نے جب کہا تو بیگم شادمانی جذباتی ہو گئیں، انہیں اپنے شوہر کی یاد آ گئی۔ وہ اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے بولیں۔

"کیوں نہیں بیٹا! آؤ، تم بھی بیٹھ جاؤ۔۔"

"ارے حنا، ذرا امی کے لئے ایک کپ چائے لیتی آنا۔"

ضیاء نے اپنی بیوی کو پکارا۔ حنا چائے لے کر آئی تو خود بھی مجلس میں بیٹھ گئی۔ صبا بھی کاموں سے فارغ ہو کر شامل ہو چکی تھی۔

"لو سنو! تو ہوا یہ کہ والد کے انتقال کے بعد شہزادے نے سب کچھ سنبھال لیا۔ پڑھائی بھی کرنی اور کاروبار بھی دیکھنا۔۔ کھیتی باڑی، باغات، نوکر چاکر۔۔۔ سب پر انہوں نے اپنا کنٹرول کر لیا تھا۔ شہزادے کو شکار کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے بچپن ہی میں بندوق چلانے اور نشانہ بازی سیکھ لی تھی۔ دراصل دولت پور کے سیدوں میں شکار کے ساتھ ساتھ نشانہ بازی کا بھی شوق تھا۔ کئی بچے تو نشانہ بازی میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر نام کما چکے تھے۔

اکثر شہزادہ رات کو شکار پر نکل جاتا۔ صبح تک شکار کھیلتے اور کئی جانور شکار کر لاتے۔ ذبح کر کے گوشت پورے محلے میں تقسیم کر دیا جاتا۔ غریبوں کا خاص خیال رکھا جاتا۔ ایک بار کی بات ہے۔۔۔ شہزادہ رات میں شکار کھیلنے جاتا تو میں

ان کے دوست جو نیپال سے آئے ہوئے تھے، اور ملازمین بھی تھے۔ ایک بارہ سنگھا کے پیچھے جیپ دوڑ رہی تھی۔ اچانک گاڑی کی ہیڈ لائٹس کے سامنے تیندوا آ گیا۔ ڈرائیور مہندر نے زور سے بریک لگائے۔ سارے لوگ آگے کی طرف جھک سے گئے تھے۔ تیندوے کو دیکھ کر سبھی خوفزدہ سے تھے۔ شہزادے نے بندوق سنبھالی، نشانہ لگایا اور فائر کر دیا۔ جنگل کی خاموشی اور تیندوا، دونوں نے دم توڑ دیا۔ شہزادہ جیپ سے کود کر تیندوے کی طرف دوڑ پڑا۔ اچانک مردہ تیندوے میں جان پڑ گئی، وہ زخمی حالت میں ہی شہزادے پر جھپٹ پڑا۔ ملازمین اور شہزادے کے نیپالی دوست ہکا بکا سے جیپ میں بیٹھے تماشا دیکھ رہے تھے۔ کسی میں ہمت نہیں تھی کہ شہزادے کی مدد کرتا۔ شہزادہ تیندوے سے متصادم تھا۔ تیندوے کی دہاڑ پورے ۔۔۔۔۔۔ علاقے کو دہلا رہی تھی۔''

بیگم شادمانی تھوڑی دیر کے لئے چائے لینے کو رک گئیں۔ تو ایک ساتھ سوالوں کی بوچھار ہونے لگی۔

''آگے کیا ہوا دادی.....''

''کیا شہزادہ مر گیا''

''کیا شہزادے کو تیندوے نے کاٹ لیا۔''

''بس کرو۔ میں بتاتی ہوں۔ شہزادے کے ہاتھ میں بندوق ضرور تھی لیکن اس کے کارتوس ختم ہو چکے تھے۔ شہزادہ بہت ہمت والا تھا۔ اس نے بندوق کو لاٹھی کی طرح استعمال کر لیا۔ دو تین وار زخمی تیندوے پر کیے کئی وار خاصے سخت تھے۔ تیندوا خطرناک دہاڑوں کے ساتھ زمین بوس ہو گیا۔ پیچھے سے ملازمین دوڑے اور زخمی شہزادے کو جیپ میں ڈال کر فوراً اسپتال لے آئے۔

''پھر کیا ہوا'' سوال نے پھر ہمت کی۔

''کیا شہزادہ بچ گیا۔'' دوسرا سوال بھی قطار میں لگ گیا تھا۔

''کئی ہفتے کے علاج کے بعد شہزادے کے زخم بھر گئے تھے۔ اب وہ پہلے کی طرح صحت مند ہو گیا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ شہزادے کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ اب تو شہزادہ راتوں رات اسٹار بن گیا تھا بس ... کہانی ختم ...''

''نہیں نہیں کہانی اتنی جلدی کیسے ختم ہو گئی۔'' حمیرا نے احتجاج درج کیا

''دادی یہ تو چیٹنگ ہے....'' سمیہ بھی بول پڑی۔ ''ہم تو پوری کہانی سنیں گے۔''

''شہزادے کی شادی ہوئی یا نہیں دادی'' بچوں نے اور ساتھ ہی بچوں کے والدین نے بھی شور مچانا شروع کر دیا۔

''اچھا، چلو تم کہتے ہو تو اس کی شادی بھی کر دادیتے ہیں۔''

بیگم شادمانی یہ کہتے ہوئے ایک عجیب سے جذبے سے معمور ہو گئی تھیں۔ ان کی آواز رندھنے لگی تھی۔

''بچو! شہزادے کی شادی کی کہانی سنو گے؟''

''ہاں۔ سنیں گے....'' سب یک زبان تھے۔

''تو سنو، اس سے قبل کہ شہزادے کی شادی ہو میں تمہیں شہزادے کی ہونے والی بیوی، یعنی شہزادی کی کہانی سناتی ہوں ''

....

''واہ! اب آئے گا مزہ'' ریحان خوشی سے بے قابو ہو رہا تھا۔ وہ اپنی امی کی گود میں چڑھ کر بیٹھ گیا۔

جس دولت آباد کا میں ذکر کر رہی تھی۔ اسی میں سیدوں کا ایک اور باوقار گھرانہ تھا، سید سلیم الدین کا پورے علاقے میں چرچا تھا۔ ان کا بڑا رعب داب تھا۔ ان کے والد سید اللہ رضی بہت بڑے زمین دار تھے۔ ان کے گھر پر ہی عدالت لگا کرتی تھی۔ اس خاندان میں پیسہ بھی تھا اور سیاسی قوت بھی۔ آس پاس کے علاقے میں شہرت تھی، جب دولت پور میں پنچایتی انتخاب شروع ہوئے تو اسی گھرانے کے لوگ چیئرمین چنے گئے۔ نصف صدی سے بھی زائد سے اس گھرانے کے لوگ چیئرمین بنتے آئے ہیں۔ سید سلیم الدین کے بیٹے، سید تسیم الدین دو بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ سید تسیم الدین بہت ملنسار، خوش اخلاق، ماہر سیاست داں اور بڑے زمین دار تھے۔ وہ عبادت و ریاضت میں کافی آگے نکل چکے تھے۔ ان کی بزرگی

کے بھی بہت چرچے تھے۔ ان کی سب سے چھوٹی بیٹی شادیہ بے حد خوبصورت تھی۔ بارہ۔ تیرہ سال کی ہی تھی کہ اس کی خوبصورتی اس قدر نکھری کہ دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ جاتے تھے۔ گول مٹول سا چہرہ، پتلے پتلے ہونٹ، موتی جیسے چمکتے دانت، آنکھیں گویا پیالوں میں سمندر، بوٹا سا قد، بالکل گوری چٹی ٹھوڑی پر کالا مسہ گویا قدرت نے نظر بد سے بچانے کو ہمیشہ کے لئے لگا دیا ہو۔ کالے سیاہ لہراتے بال جیسے برسات کے موسم میں آسمان پر لہراتا بادل کا ٹکڑا۔ چال میں پھرتی ہرن بھی شرما جائے۔ کام میں چستی، وقت خود پر لجائے۔ آواز میں مٹھاس اور سریلا پن ایسا جو سنے، سنتا ہی رہ جائے۔ وہ واقعی شہزادی تھی۔ دولت پور کی سرزمین پر اتر آئی ایک پری تھی۔ وہ ننھیال کی طرف سے بھی بڑے زمین دار سید غلام مصطفیٰ کے خاندان اور ددھیال کی طرف سے بھی نامور خاندان سے تھی۔ دونوں خاندانوں میں بلکہ پورے دولت پور میں کوئی لڑکی اس کی ہمسر نہیں تھی۔ گاؤں میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد شہزادی کو علی گڑھ بھیج دیا گیا۔ وہاں بھی شہزادی نے سب کا دل موہ لیا۔ استانیاں اس کے حسن پر فدا تھیں۔ سہیلیاں اسے دیکھ کے عش عش کرتیں۔

''دادی ذرا رکو، نا یہ بتاؤ کیا وہ آپ سے بھی خوب صورت تھی؟'' سمیہ نے معصومیت سے ایسا سوال کیا کہ بیگم شادمانی ایک لمحے تو چکرا کے رہ گئیں۔ پھر سنبھل کر بولیں۔

''سمیہ بیٹا، میں کوئی خوبصورت ہوں۔ میری عمر دیکھو پھر اس کی عمر کتنا فرق ہے؟''

سمیہ نے غلط نہیں کہا تھا۔ بیگم شادمانی ساٹھ کی ہونے کے بعد بھی بہت خوبصورت اور چاق چوبند تھیں۔ ان کے چہرے سے نور ٹپکتا تھا۔ ان کی آنکھیں بہت پرکشش تھیں۔

''اچھا بچو! چلو بس۔۔ اب کہانی یہیں ختم۔۔ پھر کل ملیں گے۔''

''دادی، دادی۔۔'' سمیہ برا سا منہ بنا کر بولی۔

''نانی۔۔۔ اور کہو نا۔۔۔ شہزادی کے بارے میں اور بتاؤ نا۔۔۔'' حیا نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

''نہیں اب کل۔۔۔ چلو۔۔ سب اپنے بستروں میں، کل اسکول بھی جانا ہے۔''

اور سب ایک ایک کر کے یوں چلے گئے، جیسے میلے کی دوکانیں اٹھ گئی ہوں۔ بیگم شادمانی نے نماز کی چوکی سنبھال لی۔ دیر رات تک عبادت میں مشغول رہیں اور پھر نیند نے انہیں اپنی نرم گرم بانہوں میں چھپا لیا۔

انہوں نے دیکھا وہ ایک دکان کے اندر کھڑی ہیں۔

''ذرا وہ سوٹ دکھا دیں۔ ہاں وہی ہرے رنگ کا۔''

''یہ کس ریٹ کا ہے؟''

''بہن جی! یہ ہزار روپے کی رینج کا ہے۔ آپ کو جو کچھ بھی چاہئے لے لیجئے، مناسب پیسے لگ جائیں گے۔''

''اچھا تو وہ سفید، سیلف والا، اور وہ، ہلکا نیلا بھی نکال دیں۔ ان سب کے پیسے بتا دیں''

''بہن جی چار ہزار دو سو ہوتے ہیں، آپ چار ہزار دے دیں۔''

وہ ابھی پیسے گن ہی رہی تھی کہ ایک آواز نے انہیں حیران کر دیا۔

''میرے لئے بھی ایک شرٹ لے لو۔۔''

یہ آواز تو وہ لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔ ابھی ایک حیرت سے پردہ اٹھا بھی نہیں تھا کہ انہوں نے دیکھا، ضیاء کے ابو دوکان میں داخل ہو رہے ہیں۔ وہ بہت کمزور لگ رہے تھے۔ وہ مبہوت سی انہیں دیکھے جا رہی تھی کہ اچانک وہ باہر کی طرف چلے گئے۔ دوکان دار کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔

''بہن جی! یہ بل ہے آپ کا''

دکاندار نے بل اور لفافے تھما دئے تھے، وہ جلدی سے دوکان کی سیڑھیاں اترتی ہوئی باہر آئیں، اور ایک طرف کو چل دیں، ادھر ادھر دیکھتے ہوئے وہ ان کو تلاش کرتی رہیں۔ مگر ان کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ یا خدا یہ کیا تھا؟ بہت زور کے بریک لگنے اور ہارن کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ وہ ایک کار سے ٹکراتے ٹکراتے بچیں، اور ان کا خواب ادھورا رہ گیا۔

اگلے دن انہوں نے غریبوں میں کپڑے صدقے کر دیئے تھے۔
ایک صبح جب وہ فجر کی اذان پر سو کر اٹھیں تو انہیں ہلکا ہلکا بخار تھا۔ نماز پڑھ کر وہ پھر بستر میں بیٹھ گئیں اور تسبیح پڑھنے لگیں۔ اتنے میں ضیاء ان کے کمرے میں داخل ہوئے۔
''السلام علیکم امی جان۔''
شادمانی بیگم نے سلام کا جواب دیا۔ بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرا، ہاتھ ذرا چہرے سے چھوا تو ضیاء اچانک اچھل گئے۔
''ارے امی! آپ کو تو بخار ہے۔ آپ لیٹ جائیں۔ چائے وغیرہ پی کر دوا لے لیں۔ میں ابھی حنا کو بھیجتا ہوں۔''
اور تھوڑی دیر میں حنا کوزی سے ڈھکی چائے، دودھ، چینی اور بسکٹ لئے حاضر ہوگئی۔
''امی لیجئے! چائے لیجئے۔'' حنا نے چائے بنا کر شادمانی بیگم کو دی اور خود بھی چائے لے کر ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔
''امی اب آپ آرام کیا کریں۔ آپ کی عمر ایسی نہیں ہے۔''
''میں کیا کرتی ہوں بیٹا، بس تھوڑا ٹہل لیتی ہوں، دو ایک گھنٹے تلاوت، نمازیں اور بچوں کے ساتھ بچہ بن جاتی ہوں، بس۔۔۔ یہ بھی کوئی کام ہیں۔''
''امی اب آپ کو زیادہ آرام کی ضرورت ہے۔ ان چھوٹے موٹے کاموں سے بھی تھکاوٹ ہو جاتی ہے۔ بستر پر ہی نماز ادا کر لیا کریں۔ اور یہ کہانی وہانی سنانا آج سے بند۔ دو تین گھنٹے آپ بے آرام رہتی ہیں۔'' حنا کو اپنی خوش دامن جو اس کی پھوپھی بھی تھیں، کا بہت خیال تھا۔
''نہیں بیٹا! اس طرح تو میں اکیلی ہو جاؤں گی اور زیادہ بیمار پڑ جاؤں گی، پھر مجھے تنہائی اور اکیلا پن کاٹنے کو دوڑتا ہے۔''
''اچھا اب آپ آرام کریں۔ اور یہ دوا لے لیں''
حنا نے شادمانی بیگم کو تازہ پانی سے دوا کھلائی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ شادمانی بیگم نے بہو کو دعائیں دیں اور بستر پر دراز ہو گئیں۔ انہیں اپنی بہو، حنا پر بڑا ناز تھا۔ خود مانگ کر لائی تھیں بھائی سے۔ حنا نے واقعی گھر سنبھال لیا تھا۔ حنا کی شادی سے، ان کے میکے سے رشتہ داری ایک بار پھر تازہ ہو گئی تھی۔ شروع شروع تو حنا انہیں پھوپھی آپا ہی کہتی تھی۔ لیکن شادمانی بیگم نے امی کہلوانا شروع کیا تو پھر حنا امی کہنے لگی تھی۔ شادمانی بیگم کو لگتا ان کے ایک نہیں دو بیٹیاں ہیں۔ وہ دونوں میں کوئی فرق نہیں پاتیں، بلکہ حنا خدمت کے معاملے میں صبا سے بہت آگے تھی۔ روزانہ ان کے پاؤں دبانا، کھانے پینے کا خیال رکھنا، کپڑے دھلوا کر، پریس کروانا، اور ہمیشہ طبیعت کے بارے میں پوچھتے رہنا، حنا کی ذمہ داریوں میں شامل تھا۔
اسکول سے آنے اور کھانے سے فارغ ہونے کے بعد سمیہ دادی کے پاس آگئی اور بولی۔
''دادی آپا! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے۔؟'' پھر وہ اپنے ہاتھ جوڑ کر خدا سے دعا مانگنے لگی۔
''اے اللہ میاں، ہماری دادی کو ٹھیک کر دے، ورنہ ہماری کہانی، بیچ میں رہ جائے گی۔''
شادمانی بیگم کو سمیہ پر بہت پیار آیا۔ انہوں نے سمیہ کو سینے سے بھینچ لیا، اور خوب پیار کیا۔ اللہ نے سمیہ کی دعا سن لی تھی اور اس رات ایک بار محفل پھر سجی۔ بچے بڑے سبھوں نے شادمانی بیگم کو گھیر لیا تھا اور حنا کے منع کرنے کے باوجود شادمانی بیگم، بچوں کی فرمائش اور اپنی کہانی سنانے کی خواہش کو دبا نہیں پائیں۔ ایک ادھوری کہانی پھر شروع ہوگئی۔
''ہاں تو بچو! میں کہہ رہی تھی کہ شہزادی ابھی پڑھ ہی رہی تھی کہ اس کے رشتے آنے لگے۔ پر شہزادی کے والدین ابھی تیار نہیں تھے۔ مگر جب شہزادہ کا رشتہ آیا تو سب نہ صرف تیار ہو گئے بلکہ بے انتہا خوش بھی۔ ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں رقص کرنے لگیں۔ رشتہ منظور کر لیا گیا۔ شہزادی چودہ سال کی ہی تھیں کہ ان کی منگنی کی رسم ادا کر دی گئی۔
کیا شاندار پروگرام منعقد ہوا۔ شہزادے کی بہنیں آئیں۔ حویلی کو خوب سجایا گیا۔ دولت پور میں شہرت ہوگئی۔ شہزادی نے گہرے نیلے رنگ پر سنہرے رنگ کے کام والا بے حد دیدہ زیب لباس پہنا تھا۔ طلائی زیور خود پر رشک کر رہے تھے۔ ان کا حسن آنکھوں میں اترا جا رہا تھا۔ مانو دولت پور کے اندھیری زمین پر، آسمان سے چاند اتر آیا ہو۔ جو بھی دیکھتا

دیکھتا ہی رہ جاتا۔ شہزادے کی بہنیں تو ان پر واری واری جا رہی تھیں۔ دولت پور کی میراثنیں، ڈھولک پر تال لینے لگیں۔ باہر بینڈ باجے کا شور، ادھر شہزادے کی کوٹھی میں رونق اور شادابی نے ہر طرف شامیانے لگا رکھے تھے۔ بجلی کے قمقمے، رنگ برنگی روشنیاں، آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھیں۔ شاندار دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ہزاروں مہمان مدعو تھے۔ دولت پور کے ہر خاص و عام کی موجودگی۔ ایسا لگ رہا تھا گویا لنگر عام ہو، جوق در جوق لوگ آ اور جا رہے تھے۔ شہزادے نے زردوزی والی سفید شیروانی پہنی تھی، جس میں ان کے مردانہ وقار میں اضافہ ہو گیا تھا۔ پورے دولت پور میں شہزادے اور شہزادی کی منگنی کی دھوم تھی۔

شہزادی اتنی خوبصورت لگ رہی تھی گویا ابھی ابھی پرستان سے اتری ہو۔ گھر کی بزرگ عورتوں نے انگلیاں چٹخا کر بلائیں لیں۔

''خدا آپ کو ہمیشہ محفوظ رکھے۔''

ہم عمر سہیلیاں اسے چھیڑ رہی تھیں۔ کوئی کچھ کہتی تو کوئی کچھ۔۔

''اور شہزادے کی شہزادی۔۔۔ چاند کی چاندنی۔۔۔''

شہزادی، جب شہزادے کے بارے میں سوچتی تو اس کی آنکھیں جھک جاتیں۔ چہرے پر حیا کے رنگ بکھر جاتے۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ شہزادہ اس کی قسمت میں ہوگا۔ ہاں تصور میں ضرور شہزادے کو بسا رکھا تھا۔ شہزادے کی شرافت، وضع داری اور اخلاق و اطوار کے قصے اس نے بہت سنے تھے۔ منگنی کے کچھ دن بعد، شاید عید کا موقع تھا۔ شہزادہ قمرالدین، شہزادی کے محلے میں آئے تھے۔ ان کے گھر بھی آ گئے۔ وہ زنان خانے سے اپنی ہی دھن میں نکل رہی تھی کہ اچانک شہزادے سے سامنا ہو گیا۔

''ارے آپ! ہماری تو عید ہو گئی۔۔۔''

شہزادی نے سر نیچے جھکا لیا تھا۔ اس نے آج پہلی بار شہزادے کو اتنے قریب سے دیکھا تھا۔ اسے تو کچھ بھی ہوش نہیں تھا۔ وہ تو شہزادے کے شرارت بھرے جملے پر چونکی۔

''حضور آپ تو واقعی عید کا چاند لگ رہی ہیں۔۔۔''

شہزادے کی حاضر جوابی کے بھی چرچے اس نے سنے تھے۔ وہ بھی کوئی کم نہیں تھی۔ اس نے سوچا جب قمر مخاطب ہے تو چاندنی کو بھی ساتھ دینا چاہیے۔

''جی! ویسے چاند تو آپ کے نام کا حصہ ہے۔''

شہزادہ کہاں ہار ماننے والا تھا۔ اس نے نہلے پر دہلا مارتے ہوئے جواب دیا۔

''جی، ہاں اب وہ میری زندگی کا بھی حصہ بننے والا ہے۔''

اور شہزادی، شرم کے مارے سرخ ہو گئی تھی۔ کوئی جواب نہیں بن پڑا تو کمان سے نکلے تیر کی مانند واپس زنان خانے میں سما گئی۔

منگنی کے بعد شہزادی کے دل میں، شہزادے کی محبت روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر وقت شہزادے کا خیال، مستقبل کے منصوبے بنانے لگتی کہ شہزادے کے ساتھ پہاڑوں پر گھومنے جائے گی۔ باہر ملکوں میں گھومے گی۔

پھر وہ دن بھی آ گیا جب دونوں گھرانوں میں شادی کے شادیانے بجنے لگے۔ شادی کے وقت شہزادی کی عمر اٹھارہ سال کی ہی تھی جبکہ شہزادے خاصی پختہ عمر میں داخل ہو چکے تھے۔ ان کی عمر ستائیس اٹھائیس رہی ہوگی۔ سہیلیوں کے شہزادے کی عمر پر تبصرہ کرنے پر وہ کہتی۔

''عمر سے کچھ نہیں ہوتا، مردوں کی عمر تو ان کی پختگی اور ذمہ دار ہونے کی دلیل ہوتی ہے۔''

''بھئی کوئی ایک گلاس پانی پلا دو۔۔'' شادو مائی بیگم کا گلا سوکھ رہا تھا۔ پانی پینے کے بعد انہوں نے کہانی پھر شروع کر دی۔

"شادی کا کیا بیان کروں۔۔؟ پورا دولت پور شادی کے جشن میں ڈوبا ہوا تھا۔ کئی کئی دن قبل سے دونوں طرف رسومات کا سلسلہ جاری تھا۔ عورتیں رات رات بھر شادی کے گیت گاتیں۔

"بنو تیرا جھومر لاکھا کاری۔۔۔"

"بنو تیرا ٹیکہ ہے ہزاری۔۔۔"

"کونے میں کیوں بیٹھی لاڈو، آنگن میں پکار ہے۔۔۔"

"کار ہے دروازے کھڑی دولہا بھی تیار ہے۔۔۔"

کبھی ہلدی کی رسم ہو رہی ہے، تو کبھی مہندی لگائی جا رہی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ گانے بھی بدل رہے ہیں۔ فلمی گانوں پر جھوم جھوم کر ملازمائیں اور ان کی لڑکیاں، رقص کر رہی ہیں۔ عورتوں کا ہجوم ہے۔ زنان خانے میں پاؤں رکھنے کو جگہ نہیں۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں اپنے کاموں کے علاوہ ہنسی مذاق، چھیڑ چھاڑ اور عشق و معاشقے میں بھی کونے کھدروں کا فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ آخر بارات کا دن آ گیا۔ سید نسیم الدین کی حویلی اور آس پاس کی عمارتوں کو سجایا گیا تھا۔ ہر طرف روشنی کی چادر پھیلی ہوئی تھی، دن کا سا سماں تھا۔ بارات اور مہمانوں کے استقبال کا شاندار اہتمام کیا گیا تھا۔ مرکزی وزراء، ایم پی، ریاستی وزیر، ایم ایل اے، میئر، کمشنر، کے علاوہ پولس انتظامیہ اور سیاسی پارٹیوں کے لوگوں کا جم غفیر تھا۔ انواع و اقسام کے کھانوں کے اسٹال لگے تھے۔ ویج اور نان ویج کے علاقے الگ الگ۔ پھر خواتین کا انتظام بالکل الگ۔ کبابوں کے الگ اسٹال، آئس کریم الگ، میٹھے کئی اقسام کے۔ چائے کافی، چاٹ پکوڑے، بچوں کے کھانے اور کھیلنے کے سامان الگ، مشروبات کی تو بات ہی کیا؟ پنواڑی، خوشبو دار پان کھلا رہے ہیں۔ شہنائی بجانے والے، اپنی دھنوں پر لوگوں کو مست کر رہے ہیں۔ اُدھر شہزادے کے گھر بارات کا اہتمام جاری ہے۔ ہاتھی، گھوڑے، بگھی، رتھ، موٹر کار، سج دھج کے تیار ہیں۔ گولہ دار، بارات کے آگے آگے گولے داغتے جاتے ہیں۔ بارات ایک طویل قافلے کی شکل میں جب سید نسیم الدین کی حویلی پہنچی تو اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔

دو، رویہ قطاروں میں ایک ہی رنگ کے کپڑے پہنے لڑکوں نے بارات کو سلامی دیتے ہوئے استقبال کیا۔ ہر باراتی کو گلاب کا ایک پھول پیش کیا جاتا اور فضا میں خوشبو کے فوارے چھوڑے جاتے۔ وسیع و عریض احاطے، میں جس کے تین اطراف دالان تھے۔ درمیان میں شامیانے لگے تھے۔ بیچوں بیچ ایک اسٹیج بنایا گیا تھا۔ باراتیوں کے بیٹھنے کے لئے صوفے اور کرسیاں موجود تھیں۔ بارات کے نشست اختیار کرنے کے بعد مشروبات کا دور شروع ہوا۔ جو کافی دیر تک چلتا رہا۔ نکاح کا وقت آیا تو بڑی سادگی سے سارے مراحل پورے ہوئے۔ دونوں طرف کے لوگوں نے اپنی اپنی بندوقوں کا مظاہرہ کیا۔ فضا گولیوں کے دھماکوں سے گونج اُٹھی۔ کھانے سے فارغ ہو کر رخصتی کی تیاری ہوئی۔ رخصتی سے قبل دولہے میاں کو اندر زنان خانے میں سلامی کے لئے لے جایا گیا۔ عورتوں کے ہجوم میں شہزادے کو دیکھنے کی اور تحفے دینے کی ہوڑ سی لگی تھی۔ چلنے کو ہوئے تو پتہ چلا کہ جوتے چوری ہو گئے ہیں۔ شہزادی کی سالیاں آ گئیں۔

"ہم تو بہت سارے پیسے لیں گے، تب جوتے دیں گے۔"

شہزادے کی حسِ مزاح بھڑک اُٹھی۔

"ٹھیک ہے آپ جوتے رکھ لیں، ہم دوسرا جوڑا ابھی لائے ہیں۔"

اور یہ کہتے ہوئے انہوں نے ساتھ آئے ملازمین سے دوسرا جوڑا لانے کو کہا۔

"چل ہٹ! ایہ نہیں چلے گا۔۔" شہزادی کی پھوپھی زاد نے ٹوک کر کوڈا اتا۔

"پیسے نکالو۔۔۔ پورے دس ہزار لوں گی۔۔۔" پھر وہ شہزادے سے مطالبہ کرنے لگیں۔

"ذرا سا ریٹ کم ہو سکتا ہے۔۔؟"

"بالکل نہیں! ہم اتنی پیاری شہزادی جو دے رہے ہیں۔"

"چیک چلے گا۔۔" شہزادہ شرارت کا کوئی موقع گنواتا نہیں تھا۔

''شہزادی بھی ادھار رہی۔۔۔''

''اچھا بابا۔۔''

اور شہزادے نے روپے نکال کر دئے اور پھر جوتے ان کے قدموں میں آ گئے۔

شہزادی کے لئے ایک بہت خوبصورت ڈولی کا انتظام کیا گیا تھا۔ کہاروں نے ڈولی اُٹھائی۔ شہزادی کی بہنیں آئیں اور شہزادی کو آخری بار ڈولی میں پانی پلا کر رخصت کیا۔ بارات دھوم دھام سے شہزادے کے محلے میں آئی تو یہاں شہزادی کے استقبال میں زمین و آسمان ایک کر دئے گئے۔ آتش بازی اور بندوقوں کے فائر ہوتے رہے اور شہزادی کو عورتوں کا ایک گروہ کوٹھی کے اندر لے کر چلا۔ شہزادہ بھی ساتھ ساتھ تھا۔ اچانک شہزادے کی بہنوں نے راستہ روک لیا اور بولیں۔

''بھیا، پہلے ہمارا نیگ دو، نہیں تو ہم اندر جانے نہیں جانے دیں گے۔ راستہ بند.....''

شہزادے نے اپنے گلے سے سونے کی چین اتاری اور نوٹوں کی ایک گڈی بڑھاتے ہوئے کہا۔

''لیجئے اب تو راستہ مل جائے گا۔''

اور اس طرح شہزادی کو ان کے کمرے تک پہنچا دیا گیا۔ کمرہ اس طرح سجایا گیا تھا کہ ہر طرف سے خوشبو کے جھونکے آ رہے تھے۔ موتیا اور موگرا کے پھولوں کی لڑیاں الگ سماں پیش کر رہی تھیں۔ گلاب کے پھولوں کا رنگ اور خوشبو فرحت بخش رہی تھی۔ محلے کی عورتوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ ہر عورت شہزادی کو دیکھ کر کہتی

''چاند کا ٹکڑا ہے۔ اللہ دونوں کو خوش رکھے۔''

منہ دکھائی میں زیورات اور پیسوں کی بوچھار ہو رہی تھی۔

''ارے، ذرا پانی لاؤ، میرا تو حلق خشک ہو گیا۔'' اچانک شادمانی بیگم رک گئی تھیں۔ کہانی نے سب کو مٹی کی مورتیوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ سب اتنے محو تھے کہ انہیں یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ رات کے بارہ بج چکے ہیں۔

حنا نے پانی لا کر دیا۔ اور کہا۔

''امی اب بس کیجئے۔ پھر کل سن لیں گے۔''

''نہیں۔ نہیں۔ ہم تو آج ہی سنیں گے۔'' بچے مچل گئے۔

''نہیں چلو۔ صبح اسکول بھی جانا ہے۔ دیر سے سوؤ گے تو آنکھ نہیں کھلے گی'' اور بحالتِ مجبوری، مجلس برخواست ہو گئی۔ سب اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے گئے۔ شادمانی بیگم نے بھی اللہ سے لو لگالی۔

''ہاں تو یہ ہوا کہ ......''

اگلے دن شادمانی بیگم نے کہانی کو یوں شروع کیا۔

حجلۂ عروسی میں شہزادے اور شہزادی کا ملن ہوا۔ ایک طرف ٹیپ ریکارڈر سے گانے بج رہے تھے۔ محمد رفیع کی آواز کانوں میں رس گھول رہی تھی۔

''دو ستاروں کا زمین پر ہے ملن آج کی رات۔''

واقعی آج دو ستاروں کا ملن تھا۔ دو بڑے گھرانوں کا ملن تھا۔ دولت پور کے لئے تاریخی دن تھا۔ پورے علاقے میں اس شادی کو لے کر خوب چرچے تھے۔ کوئی دعوت کا ذکر کرتا، تو کوئی بارات کی رونق کی بات کرتا۔ کسی کی زبان پر شہزادی اور شہزادے کی جوڑی کی تعریف ہر طرف خوشیوں کا رقص، جذبات اور امنگوں کے میلے، بہنوں اور ماں کے ارمانوں کی تعبیریں تھیں۔

وقت کا پرندہ، پرواز کرتا رہا، دولت پور دن بہ دن ترقی کرتا گیا۔ شہزادہ اور شہزادی میں اتنی محبت تھی کہ دوسروں کے لئے مثال تھی۔ شہزادہ ہر وقت شہزادی کا خیال رکھتا۔ جہاں شہزادی قدم رکھتی شہزادہ اپنی پلکیں بچھا دیتا۔ شہزادی نے بھی اپنے حسن اور اخلاق و کردار سے شہزادے کی والدہ اور ان کی بہنوں اور دیگر افراد کا دل جیت لیا تھا۔ دونوں نے مل کر شہزادے کی سبھی بہنوں کی شادی کے فرائض بھی ادا کئے۔ شہزادی اور شہزادے کو خوشی سجدے کرتی رہی۔ ان کے دو بچے ایک بیٹا اور

ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ بچے بہت خوبصورت تھے۔ شہزادے کے گھر رونق میں اضافہ ہوتا رہا۔ وہ ان سبھی خوشیوں کے لئے شہزادی کا احسان مند ہوتا کہ جب سے شہزادی نے اس گھر میں قدم رنجہ فرمائے ہیں گھر خوشیوں کی آماجگاہ بن گیا ہے۔

دولت پور کے پاس کوئی ۲۰ کلومیٹر پر جہانگیر آباد تھا۔ شہزادے نے بچوں کی تعلیم کے سبب اپنی ایک رہائش شہر بنالی تھی۔ اب زمانہ بدل چکا تھا، پرانے اسکول کالج، واقعی پرانے ہو گئے تھے۔ اب انگریزی کا زمانہ تھا۔ انگلش میڈیم اسکولوں کا بول بالا تھا۔ شہزادے نے دونوں کا داخلہ کانوینٹ اسکول میں کرادیا۔

''پھر ایک دن وہ سیاہ رات آئی۔ جس کی سیاہی بہت خطرناک تھی۔ وہ رات، وہ رات۔۔۔۔''

کہتے کہتے بیگم شادمانی کی آواز بند ہو گئی۔

''نانی......نانی کیا ہوا۔''

ریحان نے آگے بڑھ کر نانی کی پیٹھ سہلائی۔ اور حنا جلدی سے ایک گلاس پانی لے آئی۔ پانی پی کر شادمانی بیگم تازہ دم ہوئیں۔ جذبات پر قابو پاتے ہوئے انہوں نے کہانی کو جاری رکھا۔

''وہ رات بہت خطرناک تھی۔ شہزادہ کھانا کھا کر چہل قدمی کر رہا تھا۔ کہ اچانک انہیں دل کا شدید دورہ پڑا۔ کسی طرح سنبھل کر وہ وہیں بیٹھ گئے۔ انہیں گھر لایا گیا۔ ان کی حالت خراب ہو رہی تھی انہیں پسینہ آرہا تھا۔ ڈاکٹرز کو بلایا گیا۔ اسپتال کے ہارٹ سیکشن میں انہیں مصنوعی سانس پہنچانے کی کوشش کی گئی۔ بجلی کے شاک سے بھی کام لیا گیا۔ مگر سب بے سود ثابت ہوا۔ شہزادے کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی تھی۔ ہر طرف کہرام مچ گیا۔ اسپتال سے جب جسدِ خاکی لایا گیا۔ تو حویلی میں پاؤں رکھنے کو جگہ نہیں تھی۔ ہر کوئی شہزادے کا دیدار کرنا چاہتا تھا۔ شہزادی کا تو بہت ہی برا حال تھا۔ وہ اس اچانک افتاد سے ایسی ہو گئی گویا سانپ نے ڈس لیا ہو۔ آواز بند، چہرے کا رنگ زرد، آنکھوں میں ویرانی ہی ویرانی۔ انہیں کچھ بھی احساس نہیں تھا کہ کیا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب انہوں نے شہزادے کا جامد وساکت جسم دیکھا، تو اچانک جیسے ندی پر لگا بندھ ٹوٹ گیا ہو، شہزادی نے دہاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا تھا۔ لوگ انہیں سنبھال رہے تھے مگر لوگوں کو کیا پتہ شہزادی کا کیا کھو گیا تھا۔ وہ تو تہی دامن ہو گئی تھی۔ بھیڑ میں تنہا کی مثال شہزادی پر فٹ ہو رہی تھی۔

اگلے دن جنازے میں ہزاروں کی بھیڑ۔۔۔۔ دولت پور میں ایسا جنازہ کبھی نہیں ہوا۔ جنازہ جب قصبے سے باہر نکلا تو دکاندار، ٹھیلے والے، کاریگر، مزدور، جوق در جوق جنازے میں شریک ہوتے رہے۔ ایسا لگ رہا تھا گویا دولت پور کی سب سے قیمتی دولت ہمیشہ کے لئے رخصت ہو کر جا رہی ہے۔۔ دولت پور کے محلے ویران تھے۔ ہر طرف شہزادے کا ذکر، اس کے اخلاق و کردار کے تذکرے، مزدوروں، کام والوں، کی زبانوں پر ان کے احسانات کا بیان۔ ہر زبان پر یہی تھا۔

''بھیا ایسے تھے، بھیا ویسے تھے، بھیا نے ہمیں زندگی دی۔''

تین بہنوں کا بھائی، ماں کی آنکھوں کا اکیلا تارا، چراغ اندھیرے سے لڑتے لڑتے، روشنی پھیلاتے پھیلاتے اچانک غائب ہو گیا تھا۔ ایک سورج کو گھنے سیاہ بادلوں نے ڈھانپ لیا تھا۔

شادمانی بیگم کی آواز رندھ گئی تھی۔ بچے بھی رونے لگے تھے۔ صبا، ضیا، اور حنا کی بھی ہچکی بندھ گئی تھی۔

اچانک شادمانی بیگم نے زور کی ہچکی لی۔ اور وہ ایک طرف کو لڑھک گئیں۔

''امی!!!'' ضیا، حنا اور صبا ان کے بستر کی طرف لپکے۔

''دادی۔۔۔دادی۔۔۔نانی۔۔۔نانی'' بچے بلک پڑے

فوراً ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ ڈاکٹروں نے گردنیں جھکالی تھیں۔

گھر میں کہرام مچ گیا۔ قصہ گو خاموش ہو گیا تھا۔ کیسی کہانی؟ کہاں کے قصے سنانے والے؟ کیسے سامع؟ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ بچوں کی چیخیں، عورتوں کی آہیں، کوئی انسانوں کے سمندر کی آماجگاہ بن گئی تھی۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔

وقت دبے قدموں گذرتا رہا۔ دن، مہینے اور مہینے سال میں تبدیل ہوتے رہے۔

سمیہ پہلے بیگم سمیہ اور پھر سمیہ دادی، نانی بن گئی اور اسے بچوں نے گھیر رکھا تھا۔ اس نے کہانی شروع کی

"ایک تھی شہزادی"

"ہاں ایک تھی شہزادی، اس کا نام تھا شادمانی۔"

"سچی کہانی ہے یہ بچو! شادمانی بیگم کو ہم نے دیکھا تھا۔ ہم نے ان کے منہ سے کہانیاں سنی تھیں۔ لیکن ہمیں پتہ نہیں تھا کہ ہماری دادی شادمانی بیگم ہی دراصل شہزادی تھیں۔ وہ اپنی اصل کہانی سنا رہی تھیں اور ہم شہزادے، شہزادی کی کہانی میں گم تھے۔"

سمیہ تھوڑی دیر کو رکی تو اس کے نواسے، نواسیاں، پوتے، پوتیاں ایک ساتھ بول پڑے۔

"پھر کیا ہوا۔۔۔؟"

"پھر یہ ہوا کہ شہزادے کے انتقال کا واقعہ سناتے سناتے شہزادی بھی اپنے شہزادے کے پاس چلی گئی۔۔۔"

"بچو چلو۔ سو جاؤ۔ آج کہانی یہیں ختم، باقی کہانی کل پوری کروں گی۔۔۔"

......☆☆......

پشپ گرام کا اتہاس

ابرار مجیب / جمشید پور، جھار کھنڈ

پشپ گرام چندر لیکھا پہاڑیوں کی گود میں جنگل کے چھور پر آباد تھا۔ گرام سے کوس بھر دوری پر سوگندھا ندی بہتی تھی۔ یہ گرام بہت سارے گراموں کی طرح کنبہ، برادری پر مبنی تھا اور ہر آدمی دوسرے آدمی کا سمبندھی تھا۔ گھر ہی کتنے تھے، یہی کوئی پچاس، ساٹھ، پورے گاؤں کی مشترکہ زمین تھی اور ہر آدمی اور عورت کی ذمہ داری متعین تھی۔ کچھ لوگ گاؤں کی زمین پر ہل چلانے، بیج بونے اور فصل کاٹنے کے ذمہ دار تھے، کچھ فصلوں کی دونی کرنے، اناج یکجا کرنے اور انہیں مشترکہ گودام میں حفاظت سے رکھنے کے ذمہ دار تھے۔ کچھ لوگ اناج کا بٹوارہ کرنے پر مامور تھے۔ کچھ جانوروں کا اور ان کے چارے کا خیال رکھتے تھے۔ ہر گھر ایک خاندان کی شکل میں تھا اور سارے خاندان ایک مشترکہ وراثت اور مشترکہ اجداد سے وابستہ تھے۔ پشپ گرام ایک خوشحال گاؤں تھا۔

پشپ گرام میں جیون ویدک ریت کے مطابق گزارنے کا رواج تھا۔ زندگی کے پہلے پچیس سال ودیارتھی، پچیس سے پچاس سال گرہستھ یعنی شادی بیاہ کر کے خانگی زندگی، پچاس سے پچھتر سال وان پرست یعنی دنیا میں ادھر سے ادھر گھومنا اور موکش کے لیے علم حاصل کرنا اور پچھتر سے سو سال سنیاس یعنی ترک دنیا۔ چندر لیکھا پہاڑیوں کی چوٹی جو گاؤں کے کمل کنڈ کی طرف تھی وہ بار تھیوں کے گروکل کے لیے وقف تھی اور گرو راج کے ساتھ دوسرے گرو دیو بھی شکشا دیتے تھے۔ لوگ معصوم تھے، زندگی خوشگوار تھی، نہ چھل نہ کپٹ، نہ دویش نہ راگ۔ پشپ گرام اپنے نام کے مطابق پھولوں کی نگری تھی۔ راستوں کے دونوں طرف طرح طرح کے پھولوں کے پودے مسکراتے تھے۔ گاؤں کے کنارے کنول کنڈ تھا جس میں گلابی کنول اور کنول کی کلیاں کھلی تھیں۔ یہ کنڈ گاؤں کی عورتوں کے لیے تھا، اسی طرح ایک کنڈ گاؤں سے باہر مردوں کے لیے بھی بنایا گیا تھا۔

گودھولی کا وقت تھا، دور کھیتوں کی طرف سے جانوروں کی واپسی ہو رہی تھی۔ فضا میں ہلکی دھند تھی۔ جانوروں اور چرواہوں کے قافلے کے ساتھ دو اجنبی بھی پشپ گرام میں داخل ہوئے۔ ایک عورت، دودھ اور سیندور کی آمیزش سے بنا ہوا اس کا رنگ، اوپر سے سیاہ ساری میں ملبوس، سر کے آنچل سے جھانکتے اس کے گھنگھریالے کیس نما لگ رہے تھے جیسے ابھی ابھی نہا کر آئی ہو۔ آنکھیں چمکیلی کہ کوئی نظریں نہ ملا سکے، پلکیں لانبی لانبی، بدن کا ہر ایک انگ جاگتا محسوس ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا پورا بدن سانسیں لے رہا ہو۔ اس کے ساتھ ایک مرد تھا، سر پر بھاری پگڑی، آنکھوں میں کچھ ایسی بات تھی جس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ بہت گھاگ قسم کا آدمی ہے۔ مونچھیں بہت بڑی اور گھنی جس نے اوپری ہونٹ کو پوری طرح سے ڈھک لیا تھا۔ ان دونوں کے ساتھ ان کا سامان بھی تھا ایک گدھے پر۔ پشپ گرام کے لوگ حیرت سے

انہیں دیکھ رہے تھے۔ عورت بہت شرمائی لجائی سی تھی اور مرد بار بار لوگوں کو پرنام کر رہا تھا۔
گاؤں کے پروہت کے پوچھنے پر عورت تو خاموش رہی لیکن مرد نے بتایا کہ وہ بہت دکھیارے ہیں۔ یہ اس کی بیٹی ہے، اسوروں کے حملے میں ان کا گاؤں تباہ ہوگیا، ان لوگوں نے گاؤں کی کنیاؤں کو اٹھا لیا، مردوں کو مار دیا، ہم باپ بیٹی کسی طرح سے جان بچا کر نکل آئے، دس دن کی مسافت طے کرکے یہاں تک پہنچے ہیں۔
لوگوں کو ان دکھیاروں کی بپتا سن کر بہت دکھ ہوا۔ پشپ گرام کے ذمہ دار لوگوں نے آپس میں مشورہ کیا اور باپ بیٹی کو کنول کنڈ کے پاس وہ مکان رہنے کے لیے دے دیا جسے گاؤں والے اتیھی گرہ (مہمان خانہ) کہتے تھے۔ ان کے کھانے پینے کا انتظام اس طرح کیا گیا کہ ہر گھر سے ان مہمانوں کو باری باری کھانا مہیا کرایا جائے۔ مہمان دو چار روز تو لوگوں کا کھانا کھاتے رہے لیکن ایک دن انہوں نے پروہت سے کہا کہ وہ بھکاریوں کی طرح دان پن پر گزارہ نہیں کر سکتے، انہیں بھی پشپ گرام میں کچھ کام دیا جائے، لوگوں نے مشورہ کیا، یہ گاؤں کی روایت کے خلاف بات تھی کہ کسی مہمان کو گاؤں کا انگ بنایا جائے۔ گاؤں تو سمبندھیوں پر مشتمل تھا۔ ان لوگوں کو کس بنیاد پر گاؤں کے کاموں میں حصہ دیا جاتا؟ بہت سوچ وچار کیا گیا، ان سے پوچھا گیا کہ کیا وہ آریہ ہیں، ان لوگوں نے کہا ہاں وہ آریہ ہیں۔ گاؤں والوں کو اس سے یہ اطمینان ہوگیا کہ چلو سمبندھی نہیں لیکن آریہ تو ہیں اور آریہ آریہ کہیں نہ کہیں سے سمبندھی ہو ہی جاتے ہیں کیونکہ آریوں کے پوروج تو ایک ہی ہیں۔ آخر میں اس سندر استری کو اناج گھر میں اناج صاف کرنے کا کام دے دیا گیا اور اس کے باپ کو جانوروں کو چارہ کھلانے کا۔
اس کے چند دنوں بعد ہی ودیارتھی مہیندر شرون نے ایک سپنا دیکھا۔ آدھی رات کی بیلا، چندرما پورے تیج کے ساتھ آکاش پر چمک رہا تھا۔ چاندنی پورے کنڈ پر بکھری ہوئی ہے۔ پانی پر تیرتے کنول اور کنول کی کلیاں۔ کنول کے سبز پتے زمرد کی طرح چمک رہے ہیں۔ اس کنڈ میں ایک ادبھت سندری نہا رہی ہے۔ کیا یہ امر پالیکا ہے، سپنے میں اس نے سوچا، امر پالیکا جس نے بدھ کو ساون ون دان دیا تھا کہ بھکشو ساون میں وشرام کر سکیں۔ نہیں، پھر یہ کون ہے۔ مہیندر شرون دیکھتا ہے کہ وہ ایک سیاہ گھوڑے پر سوار کمل کنڈ کے کنارے آکھڑا ہوا ہے۔ سندری نے نہاتے نہاتے اسے پلٹ کر دیکھا، اس کی آنکھوں میں عجیب چمک تھی، اس چمک سے اسے ڈر لگا، اس نے اپنی آنکھیں ہٹالیں مگر اسے محسوس ہوتا رہا کہ اس سندری کی چمکتی آنکھیں اس کے شریر پر دوڑ رہی ہیں۔ دوڑتے دوڑتے وہ آنکھیں اسے اپنے شریر کے خاص انگ پر ٹھہرتی محسوس ہوئیں۔ اسے اچانک لگا کہ شریر سے سارا لہو نچوڑا جا رہا ہو اور وہ پتھر کا بنتا جا رہا ہو۔ ودیارتھی جیون میں اسے پہلی بار ایسا تجربہ ہوا تھا۔ اس نے ہمت کرکے کنڈ کی طرف دیکھا تو وہ اب تک کھڑی اپنے نینوں سے اسے نچوڑ رہی تھی۔ پھر اس نے ایک ڈبکی لگائی اور جب ابھری تو کمل کنڈ کا شفاف پانی دھیرے دھیرے سرخ ہونے لگا، جیسے کہیں سے اس میں لہو گھل رہا ہو۔ سندری کا ایک ہاتھ نیچے گیا اور جب باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک بچے کا شریر تھا، ایک مردہ بچے کا شریر جس کی آنکھیں غائب تھیں۔ مہیندر شرون کی آنکھیں کھلیں تو وہ حیران و پریشان تھا۔ اس کی سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں۔
اس دن مہیندر شرون گروکل سے پڑھ کر گھر پہنچا تو گھر میں ماتا اور بہنیں اس نئی عورت کی باتیں کر رہی تھیں۔ ماتا جی اناج گھر میں کام کرنے والی عورتوں کے کاموں کا بٹوارہ کرتی تھیں۔ وہ بتا رہی تھیں کہ یہ عورت جس کا نام کنک لتا ہے، بہت پیاری ہے۔ اس کے مکھ سے پھول جھڑتے ہیں۔ باتوں سے سگندھ آتی ہے۔ بڑھ بڑھ کر سب کے کام خود کرتی ہے۔ ساری کام گار عورتیں اس سے بہت خوش ہیں۔ کنک لتا پشپ مالا بھی بہت اچھا بناتی ہے اور گیت اتنی سندرتا سے گاتی ہے کہ آدمی مدہوش ہو جائے۔ ایک دن اناج گھر میں کنک لتا نے اپنے ہی گیت کے بول پر نرتیہ بھی کیا۔ سب عورتیں منتر مگدھ رہ گئیں۔ اناج گھر کے سامنے کھلیان میں دوائی کرتے مردوں نے بھی اس کے گیت کے سریلے بول سنے اور شاید اس کے نرتیہ کو بھی دیکھا، یہ محسوس کرکے کنک لتا تھوڑا شرما گئی۔ مہیندر شرون کی بہنوں نے ماتا جی سے فرمائش کی کہ وہ بھی کنک لتا کا گیت سنے گی اور اس کا نرتیہ بھی دیکھے گی۔ ماتا نے کہا، یہ تو ہماری پرمپرا نہیں لیکن کسی چندر ماشی کی رات گھر پر اس کو بلاتی

ہوں۔

مہیندر شرون نے اس رات بھی وہی کنول کنڈ دیکھا اور وہی سپنا، پھر یہ سپنا جیسے اس سے چمٹ کر رہ گیا۔ وہ گرو کے آشرم میں علم سیکھ رہا تھا، لیکن اس سپنے کو دیکھنے کے بعد اس کا من ویدوں کے فلسفہ اور آریہ بھٹ کے سوریہ سدھانتوں سے اچاٹ گیا تھا۔ وہ چرک کے آیوروید کا گیان حاصل کر کے لوگوں کے دکھوں کو دور کرنا چاہتا تھا لیکن اب اس کا من کسی کام میں نہیں لگتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہی چمکیلے نین اور لٹکتا ہوا مردہ بچہ تھا جس کی آنکھیں غائب تھیں۔

ماتا جی نے چندر ماشی کی رات کنک لتا کا سواگت گھر کے آنگن میں کیا۔ آنگن میں کیلے کے پیڑ لگائے گئے تھے اور کنول کے پھولوں کو لتاؤں میں پرو کر پورے اُسارے کو سجایا گیا تھا۔ کنک لتا اس روز پشپوں کے زیور سے سجی تھی لیکن اس کے گلے میں موٹے منکوں کی مالا تھی۔ اس کی چمکیلی آنکھوں میں گہری لالی نظر آ رہی تھی۔ گیندے کے پھولوں کے رنگ کی ساری اور کالی انگیا میں وہ کسی اپسرا کی طرح لگ رہی تھی۔ گاؤں کی عورتوں کو پہلے ہی دعوت دے دی گئی تھی کہ کنک لتا آج ایک انوکھا گیت گائے گی اور نرتیہ بھی پیش کرے گی۔ گاؤں کی عورتیں اور بالائیں آنگن میں جمع تھیں، مردوں کو اس محفل میں شرکت کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن کنک لتا کے کلا پردرشن کی خبر مردوں کو بھی مل چکی تھی، کچھ اتاولے لوگوں نے گھر کے آس پاس پیڑوں کو پہلے ہی سے اپنا ٹھکانہ بنا لیا تھا۔ کنک لتا کے کلا کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے کچھ متوالے دو یار تھی بھی ہوشیاری سے ایسی جگہوں کو ڈھونڈھ چکے تھے جہاں سے آنگن کا نظارہ کیا جا سکے۔

ماحول بنا ہوا تھا، آکاش پر چندرما پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ کنک لتا نے چاروں طرف ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ پیڑوں اور کونے کھدروں میں چھپے ہوئے پرشوں کو لگا کہ کنک لتا کی آنکھیں ان کی آنکھوں سے دو چار ہو رہی ہیں۔ اس کے ہونٹوں پر مدھر مسکان تھی۔ مہیندر شرون بھی ایک خاص جگہ سے کنک لتا کو دیکھ رہا تھا، اسے بھی محسوس ہوا کنک لتا صرف اور صرف اسی کو دیکھ کر مسکائی، آنگن میں عورتیں اور بالائیں بھی دم سادھے منتظر تھیں۔ ایک سناٹا سا طاری ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ کنک لتا اپنے گیت کی تان چھیڑے، اچانک فضا میں کسی الو کی تیز چیخ گونجی اور ساتھ ہی سیاروں کے ایک جھنڈ نے کھیتوں میں آسمان کو سر پر اٹھا لیا۔ کنک لتا اس سے بے نیاز اٹھی اور ایک ہاتھ کی ہتھیلی کان پر رکھ کر دوسرے ہاتھ کو ہوا میں پھیلا کر گیت کا مکھڑا گانے لگی۔ سارے لوگ منتر مگدھ سے کنک لتا کی آواز کے رس میں کھو گئے۔

گیت کے ساتھ ساتھ کنک لتا نے ٹھمکنا شروع کیا، گیت کے بول تیز ہوتے گئے، اور کنک لتا کے رقص کی رفتار بھی تیز ہوتی گئی۔ رات ڈھل گئی، پیڑ پر چڑھے ایک دو لوگ رقص اور گیت میں اس قدر منہمک تھے کہ نیچے گر پڑے۔ کنک لتا کا گیت اور رقص ختم ہوا، اس کے ساتھ ہی سبھوں کو لگا جیسے وہ مدہوشی کے عالم سے نکل آئے ہوں۔ دور کھیتوں میں سیاروں نے دوبارہ چیخنا شروع کر دیا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ کنک لتا کے نرتیہ اور گیت کے دوران سیار خاموش ہو گئے تھے یا مسلسل چیخ رہے تھے اور لوگ اس بے مثال نرتیہ اور سریلے گیت میں اتنا مگن تھے کہ انہیں سیاروں کی آوازیں سنائی ہی نہیں دے رہی تھیں۔

چند دن گزرے کہ بھورے بھور گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ کنول کنڈ کے گرد سرکنڈوں کی جھاڑیوں میں گرام سیوک کی بیوی کی لاش ملی۔ نہ جانے پشپ گرام کا اتہاس کتنا پرانا تھا، لیکن اس گاؤں کے لوگوں کے ذہن میں قتل تو دور کی بات ہے، کسی کے گمبھیر روپ میں گھائل ہونے کا واقعہ بھی نہیں تھا۔ یہ گاؤں تو امن و شانتی کا گہوارہ تھا۔ سارا گاؤں ہی ایک خاندان تھا۔ ہتھیا اور وہ بھی پشپ گرام میں۔ اور ایک عورت کی ہتھیا؟ لوگ حیران تھے، پریشان تھے۔ لوگ گرام سیوک کے گھر کی طرف دوڑے لیکن وہ تو گھر میں تھا ہی نہیں۔ کدھر گیا، کسی کو پتہ نہیں تھا۔ اس کا چھوٹا سا بچہ جس کا چند دنوں پہلے منڈن ہوا تھا گھر کے اُسارے پر بلک بلک کر رو رہا تھا۔ مہیندر شرون بھی گرام سیوک کے گھر گیا۔ سب ایک دوسرے سے گرام سیوک کے بارے میں پوچھ رہے تھے لیکن کسی کو کچھ خبر نہ تھی۔ مہیندر شرون وہاں سے کنول کنڈ کی طرف بڑھ گیا۔ کنول کنڈ کے پاس کنک لتا کے گھر کے سامنے اس کا باپ چارپائی بچھائے حقہ پی رہا تھا۔ اس نے ایک نظر مہندر شرون کو دیکھا اور پھر حقہ کا کش لگانے میں مشغول ہو گیا۔ سامنے کھڑکی سے لگ کر کنک لتا کھڑی ہوئی تھی، مہیندر شرون کی جب اس سے نظریں ملیں

تو وہ مسکرائی۔ اس کی آنکھوں کی مخصوص چمک ویسے ہی تھی۔ مہندر شروَن کو اپنے بدن میں سہرن محسوس ہوئی، وہ نظریں جھکا کر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

کافی دن گزر گئے اس واقعہ کو، گرام سیوک کا کچھ پتہ نہ چلا کدھر گیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اسی نے اپنی پتنی کا قتل کیا ہوگا۔ مگر کیوں، یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اس کے بچے کو بوڑھی دائی کے حوالے کردیا گیا جو بے ماں باپ کے بچوں کو گرام سمیتی کے حکم پر پالتی تھی۔ خود دائی بھی اس کام میں خوشی محسوس کرتی تھی۔

مہندر شروَن نے کافی دنوں کے بعد اس رات ایک دوسرا خواب دیکھا۔ وہ ایک ویرانے میں چلا جارہا تھا، زمین دور دور تک سنسان اور بنجر تھی۔ وہ ایک سیاہ گھوڑے پر سوار تھا۔ دور اسے پرچھائیاں نظر آرہی تھیں۔ وہ تیزی سے بڑھتا جارہا تھا۔ جب وہ اس جگہ پہنچا جہاں پرچھائیاں تھیں تو اسے پرچھائیوں کی جگہ ایک شخص نظر آیا جو نیچے جھکا ہوا کچھ کھا رہا تھا۔ جب مہندر شروَن نے غور سے دیکھا تو اس کی آنکھیں پھٹ گئیں، وہ تو کسی عورت کے جسم کو اپنے دانتوں سے بھنبھوڑ رہا تھا۔ اس کے منہ کے کناروں سے خون بہہ رہا تھا۔ مہندر شروَن خواب میں حیران ہوا کہ وہ کوئی اور نہیں گرام سیوک ہے لیکن یہ کیا اس نے تو سیاہ ساری پہنی ہوئی اور اپنے سینے پر سرخ چولی باندھی ہوئی۔ وہ کھڑا ہوا اپنے ہاتھوں کو ہوا میں لہرا کر ایک گیت الاپنے لگا، ساتھ ہی ساتھ نرتیہ بھی کرنے لگا۔ ناچتے ناچتے وہ مہندر شروَن کے نزدیک آگیا اور اپنے ہاتھوں میں پکڑے گوشت کے ٹکڑے کو اس کی طرف بڑھا دیا۔ ایک چیخ اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی اور آنکھیں کھل گئیں۔

اس کے بعد تو گاؤں میں عجیب وغریب واقعات کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ گاؤں کے گرہستھ اپنے کاموں سے جی چرانے لگے، اکثر لوگوں کو کنول کنڈ کے اطراف چکراتے ہوئے دیکھا جانے لگا۔ گاؤں کی عورتوں میں کھسر پھسر شروع ہوئی۔ ایک روز گاؤں کی کچھ عورتیں کنک لتا کے گھر کے پاس جمع ہوگئیں۔ کنک لتا کا باپ چارپائی پر بیٹھا حقہ پیتا رہا۔ کنک لتا کھڑکی سے لگی مسکراتی رہی۔ اس نے عورتوں کو اندر آنگن میں بلایا۔ عورتیں پتہ نہیں کنک لتا سے کیا کہنے آئی تھیں۔ لیکن کنک لتا نے جب ان کو بٹھا کر کمہار کے تازہ کٹوروں میں شربت پلایا تو یہ عورتیں سب بھول گئیں۔ کنک لتا نے مکان کو بہت سجا لیا تھا۔ زندگی کی آسائش کا سارا سامان نظر آرہا تھا۔ کنک لتا کے گلے میں موتے منکوں کی مالا تو وہی تھی لیکن باقی سارے سورن ابھوشن (سونے کے زیور) اس کے شریر پر سجے اس کی سندرتا کو چار چاند لگا رہے تھے۔ عورتیں کچھ دیر بیٹھی رہیں پھر سورن لتا کو دھنیہ واد دے کر چلی آئیں۔

پشپ گرام میں لوگوں کا اپنی ذمہ داریوں سے موہ بھنگ کیا ہوا، گاؤں کا انتظام ہی چرمرانے لگا۔ جانور دبلے ہونے لگے، گائیں کم دودھ دینے لگیں۔ کھیتوں میں بیج بونے کا وقت گزر گیا اور لوگ یوں ہی بیٹھے رہے۔ پشپ گرام کے راستوں کے کنارے لگے پھولوں کے پودوں کو جنگلی لتاؤں نے نگل لیا۔ اس کے ساتھ ہی گاؤں میں عجیب وغریب واقعات کا سلسلہ چلتا رہا۔ ہر دوسرے، تیسرے دن کوئی سہاگن مرجاتی، کیسے مرتی یہ اندازہ لگانا بہت مشکل تھا۔ لوگ کبھی کسی عورت کو کسی پیڑ سے لٹکا ہوا پاتے، کسی کو بستر پر ہی مردہ پاتے، اس طرح کہ اس کا جسم نیلا پڑ چکا ہوتا۔ کوئی خود ہی اپنے ہاتھوں کی رگ کاٹ لیتی۔ عورتیں ایک ایک کرکے مر رہی تھیں۔ اور مہندر شروَن بہت پریشان تھا۔

پشپ گرام کی رونق دھیرے دھیرے ختم ہوتی جارہی تھی۔ کنول کنڈ میں کنول کی جگہ جل کمبھی نے لے لی تھی۔ سارے کنڈ کو جل کمبھیوں نے ڈھک لیا تھا۔ کھیت ویران اور اجڑے ہوئے تھے۔ گاؤں میں اکادکا عورتیں نظر آجاتیں تو آجاتیں۔ بہت ساری سہاگنیں پراسرار طور پر مرگئی تھیں۔ لیکن ان کے شوہر بے پرواہ نظر آتے تھے۔ اناج گھر میں اناج کم ہونے لگا۔ اناج کی تقسیم میں افراتفری نظر آنے لگی۔ کنک لتا نے اب ماتا جی کی ذمہ داری سنبھال لی تھی۔ ماتا جی ایک روز اناج گھر سے واپس آئیں تو تھکن سے نڈھال تھیں۔ سیدھے چارپائی پر گر پڑیں اور ایسی گریں کہ دوبارہ اٹھ نہ سکیں، چارپائی ہی سے سٹ کر رہ گئیں۔ گرام ادھیشک نے مردوں سے صلاح کی اور سب نے ایک زبان ہوکر کنک لتا کو اناج گھر کی پرکھ سیویکا بنا دیا۔ گاؤں کی بچی کھچی عورتوں کو یہ فیصلہ پسند نہیں آیا لیکن گرام ادھیشک کے فیصلے کو بدلنا ناممکن تھا۔ عورتیں کیا کرتیں۔ گاؤں کے اناج گھر کا اختیار دراصل پورے گاؤں پر ادھیکار کے برابر تھا۔ اب گاؤں کے بھوجن کی کنجی

کنک لتا کے ہاتھ میں تھی۔

مہیندر شردن اپنے خوابوں سے مسلسل ہراساں اور تکلیف میں تھا۔ دن بھر سوچتا کیا کرے، یہ خوفناک سپنے اسے کیوں آتے ہیں، ان سے چھٹکارہ پانے کا کیا طریقہ ہے۔ کیا ان سپنوں میں کوئی بھید ہے۔ کیا یہ سپنے کیول مجھے ہی آتے ہیں یا کوئی اور بھی ہے جو ایسے سپنے دیکھتا ہے۔ ایک دن اس نے گرو دیو کو اپنے سپنوں کے بارے میں بتایا۔

دھیان کے کمرے میں بیٹھے گرو نے پوچھا۔ ''یہ سپنے کب سے آرہے ہیں تجھے؟''

''کچھ یاد نہیں گرو دیو، ہاں ایک بات یاد آتی ہے، ہمارے گاؤں میں اسوروں کی ستائی ایک استری آئی تھی اس دن، کنک لتا۔''

''اسور!'' گرو دیو نے گہرائی سے کہا اور دھیان میں مگن ہو گئے۔ ''ہے بالک کیا تم نے آسوروں کو دیکھا ہے؟''

''نہیں گرو دیو۔''

''آسور اتہاس (تاریخ) بھی نہیں جانتے، تمہیں گیان نہیں کہ تمس کیا ہے، چھل کیا ہے۔''

''ستیہ وچن گرو دیو۔'' مہیندر شردن نے شردھا سے سر جھکا لیا۔

تب گرو دیو نے آسوروں کا اتہاس بتایا۔ ''ہے بالک جب ہمارے پوروج (اجداد) اتر کی طرف سے اس دھرتی پر لوہا لے کر آئے، لوہا جو کاٹتا تھا، مارتا تھا، لوہا جو لہو کو پیتا تھا، وہ پہلی بار ہمارے پوروج لے کر آئے۔ یہاں آسوروں کے بڑے بڑے نگر تھے اور نگر کے چاروں اور پور (قلعے کی دیواریں) تھے۔ ہمارے پوروج میں گرج اور چمک کے دیوتا اندر نے آسوروں کے دیوتا شیش ناگ کا سر کچلا اور پوروں کو توڑ ڈالا۔'' گرو دیو ر کے اور اوپر کی اور دیکھنے لگے۔ ''اندر اور ان کے ساتھیوں نے گھوڑوں پر سوار ہو کر لوہ کا استعمال کیا اور اس دھرتی پر موجود آسوروں کو ختم کرنے لگے۔ آسوروں کے نگر ویران ہو گئے، یہ نگر سندر شلپ کلا کا نمونہ تھے۔ یہاں سڑکیں تھیں، دو منزلہ، تین منزلہ مکان تھے۔ نالیاں تھیں، حمام تھے۔ ہمارے پوروج گھمکڑ تھے، کسی ایک جگہ ٹکتے ہی نہیں تھے، گھوڑوں پر سوار اپنے جانوروں اور پریوار جنوں کے ساتھ کبھی یہاں کبھی وہاں۔ آسور ہمارے پوروجوں کے خوف سے دکشن کی اور گھنے جنگلوں میں چلے گئے اور وہاں انہیں تمس کی پراپتی ہوئی۔''

''تمس۔'' میں سمجھا نہیں گرو دیو

''تمس یعنی اندھکار۔ انہوں نے اندھکار کی جے کی اور تامسی ہو گئے۔ انہوں دیوتا تمس کی پوجا ارچنا کی، انہیں اپنے وش میں کیا اور اپنے بھیتر راکشش کے گن پراپت کیے۔ میں نے تم سے پوچھا تھا کہ چھل کیا؟''

''ہاں گرو دیو، پرنتو میرا گیان ادھورا ہے۔''

''چھل، یعنی دھوکا، چھل سے چھنال شبد نکلا ہے بالک۔''

''میں سمجھا نہیں گرو دیو، چھنال؟''

''اس سے زیادہ گیان دینے کی مجھے آگیا نہیں بالک، اب جاؤ اور اپنے پرشنو کا جواب خود تلاش کرو۔'' اتنا کہہ کر گرو دیو نے آنکھیں بند کر لیں اور دھیان مگن ہو گئے۔

مہیندر شردن دکھی من سے اٹھ کر چلا آیا اسے گرو دیو کی باتوں میں چھپے بھیدوں کا ارتھ سمجھ میں نہ آیا۔ ابھی تو اس نے اپنشد کا پاٹھ بھی شروع نہیں کیا تھا، پھر اتنے گہرے فلسفہ تک اس کی رسائی کیسے ہوتی۔ چندر لیکھا پہاڑی پر بنے گروکل سے نکل کر مہیندر شردن نے نیچے دیکھا، سندھیا اترنے والی تھی، پشپ گرام پر ایک سناٹا طاری تھا، دور تک پھیلے جنگل کے درخت کسی سوگ میں سر جھکائے کھڑے تھے۔ کمل کنڈ جو جل کنبھی سے ڈھک چکا تھا گہرا سبز نظر آرہا تھا۔ مہیندر شردن کو ہوا میں ایک ناگوار بو پھیلی محسوس ہوئی، جیسے کچھ سڑ رہا ہو۔ یہ بو کمل کنڈ ہی کی طرف سے آرہی تھی، شاید یہ میرا بھرم ہو، مہیندر شردن نے خود سے کہا کیوں کہ کمل کنڈ کے اس طرف کنک لتا کے دوار پر بڑی چہل پہل تھی۔ پشپ پوری کے کئی گرہستھ اور دوویارتھی وہاں جمع تھے۔

مہیندر شروَن جب کنک لتا کے دروازے کے پاس پہنچا تو ایک عجیب نظارہ تھا وہاں، پشپ پوری کے گرہستھوں اور طالب علموں کے علاوہ گاؤں کی بہت سی عورتیں بھی جمع تھیں۔ گرہستھ اپنی بیویوں کو ڈانٹ رہے تھے لیکن سہاگنیں بہت بے چین تھیں۔ وہ بار بار کنک لتا کی طرف ہاتھ اٹھاتیں اور اپنے سینے پر مارتیں جیسے ماتم کر رہی ہوں۔ کنک لتا لوگوں کی بھیڑ میں بہت معصومیت کے ساتھ حیران آنکھوں سے ان عورتوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا باپ ان باتوں سے بے پروا سر جھکائے حقہ پینے میں معروف تھا۔ کنک لتا کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں اور اس میں ایک عجیب سی سرخی کی آمیزش تھی۔ اس نے اپنے ہونٹوں کو بھینچ رکھا تھا۔ گاؤں کی بالائیں کنک لتا کے گرد جمع تھیں اور اسے ہمدردی اور دکھ بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ سہاگنوں کی حرکتوں سے گرہستھوں کے اندر غصے کا لاوا پھوٹنے کے لیے بے تاب ہو۔ وہ بار بار اپنی بیویوں کو دھکیل کر کنک لتا سے دور رکھنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن سہاگنیں کنک لتا کو جان سے مارنے کے درپے نظر آ رہی تھیں۔ گاؤں کے طالب علم بھی کنک لتا کے آس پاس اور بالاؤں کے اردگرد کھڑے تھے اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے دلوں میں بھی کنک لتا کے لیے ہمدردی کے جذبات ہیں۔ مہیندر شروَن یہ دیکھ کر حیران بھی ہوا اور پریشان بھی کہ اس کی تینوں کنواری بہنیں کنک لتا کو بڑے پیار سے، بڑی کرونا سے دیکھ رہی ہیں۔ ان کی انگیا نمایاں ہے اور ساری کا آنچل زمین پر گرا ہوا ہے۔ شروَن نے آنکھوں کے اشارے سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی لیکن بے سود وہ اس کی باتوں کو سمجھ کر بھی انجان بنتی رہیں۔ مہیندر شروَن بہت اداس ہو گیا، سہاگنوں کی بھیڑ میں اچانک ایک عورت گر پڑی، مہیندر شروَن نے دیکھا وہ گربھ وتی تھی (حاملہ) اسے گرتے دیکھ کنک لتا بہت تیزی سے اس کے پاس دوڑی اور اسے سہارا دے کر اس چارپائی تک لے آئی جس پر اس کا باپ ساری دنیا سے بے خبر حقہ پی رہا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تو کنک لتا نے اس گربھ وتی سہاگن کو چارپائی پر لٹا دیا۔ اس کی آنکھوں سے پانی کے کچھ قطرے ٹپک کر عورت کی پیشانی پر پڑے اور آنکھوں کی لالی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ مہیندر شروَن کو ایسا لگا جیسے وہ ایک سحر کی کیفیت میں مبتلا ہوتا جا رہا ہے۔ گاؤں کے کنوارے نوجوانوں کی طرف اس نے ایک

کشش محسوس کی اور اس کا جسم اس طرف کھنچنے لگا، تبھی اس کی نظر دور گروکل کے مندر کے کلش پر لہراتے جھنڈے پر پڑی اور ایک ہیولا بھی نظر آیا، یہ گرودیو تھے۔ مہیندر شروَن کو لگا کہ جس مقناطیسی عمل کے تحت وہ کھنچ رہا تھا اس کے تار ٹوٹ رہے ہیں، اس نے اپنے سر کو جھٹکا اور لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا تیر کی طرح گروکل کی طرف بھاگنے لگا۔ گروکل میں جب وہ دھیان کے کمرے میں داخل ہوا تو گرو نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا، ان کے مکھ پر چنتا اور دکھ کے بادل تیر رہے تھے۔

"آج اَتم پورن ماشی ہے مہیندر شروَن، یہ تمہارا مضبوط ارادہ اور گرو بھگتی ہے کہ تم ادھر چلے آئے۔" گرودیو نے گہرا سانس لیا۔

"اَتم پورن ماشی، یہ کیسے ممکن ہے گرودیو؟ پورن ماشی تو ہر ماہ ہوتی ہے۔ پورا چندرما آتا ہے، چاندنی کا پرکاش پھیلتا ہے۔"

"چندرما ادشیہ لکلا کرے گا بالک، پرنتو تمس کے مکھ سے۔"

"تمس!"

"ہاں کل سے تامسی یگ کی شروعات ہو گی۔ ایک نہ ختم ہونے والا اندھکار، تمہیں اس اندھکار سے لڑنا ہے۔"

"درشن (فلسفہ) کی اتنی گہری باتیں مجھے ابھی سمجھ میں نہیں آتیں گرودیو، ابھی میں نے اپنشد کا پاٹھ شروع نہیں کیا ہے۔"

"تمس کو سمجھنے کے لیے تمہیں اتھروید کا پاٹھ کرنا چاہیے۔ تمس، چھل اور جھنال کی ساری بھوشیہ وانی (پیشن گوئی) اس کتاب میں موجود ہے۔"

"اتھروید کے منتروں کا پاٹھ کرتے ہوئے مجھے بہت بھئے (ڈر) محسوس ہوا گرودیو اور میں نے تاسکوں (چپٹی ناک والوں) کے بارے میں گیان پراپت کرنا تیاگ دیا۔"

"اگر تم نے گیان پراپت کیا ہوتا تو تمہیں اپنے پرکھوں کا ارتھ سپنے کی پہلی بھور کول گیا ہوتا۔ اب تمس ہی تمس ہے۔" اتنا کہہ کر گرو دیو خاموش ہو گئے۔ مہیندر شرون ودیارتھی وشرام گھر کی اور نکل گیا۔ کھلے میں اس نے آکاش کی اور دیکھا، چندرما پورے تیج کے ساتھ چمک رہا تھا لیکن ہوا ٹھہری ہوئی تھی اور سارا سنسار خاموشی کے گربھ میں دم سادھے پڑا ہوا تھا۔ تبھی ایک عورت کی چیخ نے ماحول کے کلیجے کو چیر دیا۔ مہیندر شرون ودیارتھی وشرام گھر سے گھبرا کر باہر نکلا اور نیچے کمل کنڈ کی طرف دیکھا تو ایک عجیب نظارہ نظر آیا۔ اگنی کی لپلپاتی زبانیں ہر طرف روشن تھیں۔ اور بہت سی پرچھائیاں متحرک۔ وہ تیزی سے نیچے اترا اور کمل کنڈ کے پاس پہنچا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ آدھی رات کا سمے، چندرما سیروں پر چمک رہا تھا اور یہاں پشپ گرام کے گرہستھ، ودیارتھی اور کنواری بالائیں ہاتھوں میں مشعل لیے کھڑی تھیں۔ ساری بالاؤں کے جسم کا اوپری حصہ عریاں تھا۔ ان کے درمیان کنک لتا پوری نروستر (ننگی)، آنکھیں بند کیے گربھ وتی استری کی جانگھوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھامے ہوئے تھی۔ یہ گربھ وتی زور زور سے چیخ رہی تھی۔ دور اس بھیڑ سے پرے چند سہاگنوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا گاؤں سہاگنوں سے خالی ہو چکا ہے اور اب صرف یہی ایک گربھ وتی بچی ہے۔

اچانک گربھ وتی نے فلک شگاف چیخ ماری اور اس کی گردن ایک طرف لڑھک گئی۔ کنک لتا نے اس جانگھوں کے درمیان سے اپنا ایک ہاتھ نکالا اور بلند کیا، اس کے ہاتھوں میں وہی بچہ تھا جسے مہیندر شرون نے اپنے سپنے میں دیکھا تھا۔ وہی مردہ بچہ جس کی آنکھوں کی جگہ دو غار تھے۔ کنک لتا نے بچے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں بلند کیا اور کھڑی ہو گئی۔ وہ آگے آگے چل رہی تھی اور اس کے پیچھے پیچھے گرہستھوں، ودیارتھیوں اور آدھ ننگی بالاؤں کی ٹولی۔ فضا میں اچانک کنک لتا کی سریلی آواز میں ایک بھیانک گیت کے بول ابھرے اور لوگوں پر ایک جنونی کیفیت طاری ہو گئی۔ سب پاگلوں کی طرح ناچتے ہوئے گاؤں سے باہر جانے والے راستے کی طرف بڑھنے لگے۔

دھیرے دھیرے یہ بھیڑ بہت دور سایوں میں بدل گئی، لیکن پھیلی ہوئی چاندنی میں ان سایوں کے درمیان سے تاریکی کا دھواں ابھرا اور دھیرے دھیرے پوری کائنات پر پھیل گیا۔

پشپ گرام کے راستوں پر ناگ پھنی کے پودے اگ آئے جس میں سیاہ پھول کھلتے ہیں۔ آتے جاتے راہ گیر دیکھتے ہیں کہ ایک ادھیڑ ہوتا ہوا جٹا دھاری ان پودوں کو لوہے سے کاٹتا رہتا ہے۔ لیکن تامسی پھول ختم نہیں ہوتے۔

......☆☆......

دوسرا مرد

فوزیہ قریشی لندن انگلینڈ

"جب مرد کسی سے محبت کرتا ہے تو کیا سچ مچ واقعی اسی سے محبت کرتا ہے، کیا پھر اس سے شادی بھی کر لیتا ہے؟"

وہ مجھ سے آج رو رو کر پوچھ رہی تھی۔ ساون کی کالی گھور گھٹاؤں کی طرح اس کی آنکھوں میں آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ اسکی خوبصورت چمکدار آنکھیں سوجن اور سرخی کی وجہ سے آج بھدی دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کی انہی خوبصورت آنکھوں پر تو کئی شاعروں نے بارہا غزلیں کہی تھیں۔ وہی جھیل سی سندر، سمندر سے گہری آنکھیں آج گویا کسی اجڑے تالاب کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ وہ آنکھیں جو کسی زمانے میں چشم آہو کی طرح پرکشش ہوا کرتی تھیں۔"

میرے پاس اس کے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"مجھے تو یقین نہیں ہے کہ مرد کسی ایک عورت سے محبت بھی کر سکتا ہے، پھر تمہیں اتنے یقین سے کیسے کہہ دوں؟" میرا لہجہ کافی تلخ تھا۔

"محبت کا بیج تو رب کی جانب ہی سے بویا جاتا ہے۔ پہلے پہل دل کی زمین میں کسک سی ہوتی ہے پھر کہیں یہ بیج پھوٹتا ہے اور دل کا لہو پی کر اک نازک سے پودے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ محبت تو دلوں میں اگتی ہے۔ اک نازک سے ننھے

ننھے پودے کی طرح مسکرا کر لہلہاتی ہے، جو آہستہ آہستہ اپنی جڑیں مضبوط کر لیتا ہے تو پھر بڑے سے بڑا طوفان بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

باہر زور سے سیٹیاں بجاتی، سرسراتی طوفانی ہوائیں جیسے باولی ہو کر بے تحاشا شور مچا رہی تھیں۔ شاید ان کو بھی اس کے دل میں اٹھتے عجیب سے طوفان کی خبر ہو گئی تھی۔

"بڑا کٹھن سفر ہے، جسے اختیار کرنے کے لئے پل صراط پار کرنا پڑتا ہے۔ نجانے کتنے لوگ اس پل کو پار کرنے کی لگن لئے نیچے بھڑکتی آگ میں گر جاتے ہیں۔ اس آگ کے دریا کو شاید کوئی قسمت والا ہی پار کر سکتا ہے"۔

گمبھیر سے غم ناک لہجے میں اس نے اپنی بات جاری رکھی۔۔۔

باہر مست ہواؤں کا شور مزید اونچا ہو گیا تھا۔۔۔ بلیوں کی طرح لڑتی یہ ہوائیں کیا میرا درد جانتی ہیں؟۔۔۔ اس نے دکھ سے سوچا۔

"تم کہیں اس سے محبت تو نہیں کرنے لگ گئیں۔ اوہ۔۔۔ زونیہ جی۔ ایسا کبھی مت کرنا، میں یہ بالکل درست کہہ رہی ہوں، کل کلاں کو یہ مت سوچنا کہ میں نے تمہیں سمجھایا تک نہیں۔ دیکھو وہ بال بچوں والا ہے۔۔۔ شاید تمہیں فریب بھی دے رہا ہے۔۔۔ اور یہ محبت کا فریب بڑا ظالم ہوتا ہے۔ تم اس کے بچھائے جال کے دھوکے میں کبھی مت پڑنا۔۔۔ تم اس وقت اس کی نرمی، شفقت اور ہمدردی کو غلط طور پر محبت سمجھ بیٹھی ہو۔"

وہ جو کافی دیر سے چپ تھی، یک دم چونکی۔ "نہیں نہیں۔۔۔ وہ سچ مچ مجھ سے بے پناہ محبت کرتا ہے، بس بے حد مجبور ہے بیچارہ۔۔۔ بیوی، بچے ہیں اس کے۔۔۔ اور پھر اس کی ماں بھی تو کافی سخت مزاج ہے۔ وہ بھلا کیسے سب رشتوں کو داؤ پر لگا سکتا ہے؟"

"تم ذرا اپنے آپ کو اس کی جگہ پر رکھ کر خود سوچو۔"

باہر بجلیاں کڑکڑائیں اور زور کی بارش شروع ہو گئی۔ ایک دھماکے کے ساتھ بجلی چلی گئی۔۔۔

اس نے اُٹھ کر موم بتی روشن کی۔۔۔ اور جھک کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"زونیہ۔۔۔ میری جان، خدا کے لئے سنبھل جا۔ وہ محبت کے نام پر تجھے نقد خرید لے گا اور تو۔۔۔ کم عقل، لاچار اور مجبور۔۔۔ دو بچوں کی ماں ہو کر بھی دوسرے مرد کے چکر میں کہیں کی نہیں رہے گی۔

بتا رہی ہوں تجھے۔۔۔

دیکھ! ان معصوموں پہ تجھے کیا ذرا بھی ترس نہیں آتا؟ جن کا باپ ہی ان کا اپنا نہ ہو سکا، کیا یہ دوسرا مرد اس خلا کو پر کر سکے گا؟

تیری مشکل تو اگرچہ حل ہو جائے گی لیکن کیا وہ ان بچوں کو بھی باپ کا پیار دے پائے گا؟" ٹمٹماتی موم بتی کے دھندلے سے ملگجے اندھیروں میں اسے اپنے ڈولتے سائے عجیب سے لگے۔۔۔ دھیمے سے ہمدردی بھرے لہجے میں اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

"اچھا سب چھوڑ۔۔۔ ایک بات مجھے سچ سچ بتا کہ وہ شادی کے بارے میں کیا کہتا ہے؟۔ اس معاملے میں اس کے کیا نیک ارادے ہیں؟"

وہ غمگین لہجے میں بولی، "کبھی کہتا ہے۔۔۔ شادی کر تو لوں۔۔۔ لیکن۔۔۔ ماں جی سے بہت ڈر لگتا ہے۔۔۔"

"تو نہیں جانتی اس کی ماں کو، وہ اس کو ناراض بھی تو نہیں کر سکتا۔" ٹمٹماتی شمع سے اٹھتے ہلکے ہلکے سے دھوئیں کی طرح وہ بھی من ہی من میں سلگ کر بلک اٹھی۔۔۔

"بس تو نہیں سمجھ سکتی میرے دل کی حالت کو، جیسے میں مجبور ہوں، بالکل ویسے ہی وہ بھی تو لاچار ہے۔۔۔" اک چمکتا ستارہ سا اس کی گھنیری پلکوں تک آ کر ٹھٹک گیا۔

"میں اس کے رنگ روپ کی دیوانی تو بہت بعد میں ہوئی تھی۔ مجھے تو اس کے حب الہی، اس کی بندگی نے دیوانہ بنا دیا تھا۔۔۔ پھول جھڑتے ہیں اس کے منہ سے۔۔۔
جب وہ مجھے اللہ اور اس کے رسول کی باتیں بتاتا ہے۔
پانچ وقت کا نمازی ہے وہ۔۔۔ ہر وقت اپنے رب کو راضی کرنے والا۔ رمضان شریف میں تو وہ تراویح تک کی امامت بھی کرواتا ہے۔ مت کر اس کی برائی۔۔۔ ورنہ گناہ ملے گا تجھے"۔
"اچھا!"
میں بولی۔۔۔ "واہ۔۔۔ بھئی بڑا دیندار ہے وہ، ہے نا۔۔۔ پگلی۔ تو پیار میں سچ مچ اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھی ہے۔۔۔ زلیخا ہو گئی ہے زلیخا"۔
"تو نہیں جانتی کیا؟
مرد کسی ایک عورت سے محبت تو کر ہی نہیں سکتا۔ پانچ بچوں کا باپ ہے، دیندار، نمازی۔۔۔ پرہیز گار اور اللہ کی بندگی کرنے والا۔ مگر دیکھ تو۔ کیسے تجھے دھوکا دے رہا ہے؟۔ کسی نامحرم عورت اور وہ بھی دو بچوں کی ماں۔۔۔ سے محبت جتا رہا ہے۔ کتنا دین دار ہے؟، خود اسی سے اندازہ لگا لو۔۔۔ اس کی دینداری کا۔ اور تیری تسبیح ہے کہ بغیر وضو کے بھی اسی کے ورد میں مشغول ہے۔۔۔ جھلی نہ ہو کہیں کی۔۔
اری او پیار کی اندھی۔ یہ کیسا مرد ہے؟ جو اپنی محبت کو بیچ چوراہے میں اس طرح تڑپتا چھوڑ رہا ہے۔ محبت۔۔۔ ہونھ۔۔۔ یہ محبت ہے؟۔ ایسی ہوتی ہے محبت۔ کیوں ہزار حیلے بہانے کر رہا ہے۔۔۔؟ بول۔۔۔"
"ارے 90 فیصد کیسسز میں مرد محبت نہیں کرتا کیونکہ، وہ صرف فلرٹ کرتا جاتا ہے۔۔۔ پھر جسے تو اس کی مجبوریاں کہہ رہی ہے۔ وہ مجبوریاں نہیں ہیں۔۔۔ صرف بہانے ہیں بہانے۔۔۔ اس کے۔
مرد ہو اور مجبور ہو؟؟.......... جو مرد خود کو مجبور کہتا ہے وہ سچ مچ جھوٹا ہے"۔
"تم انسانی تاریخ کو اٹھا کر دیکھ لو...... مرد کو جب بھی کسی عورت سے محبت ہوئی ہے...... حقیقی محبت...... تو اس نے ہر قیمت پر اپنی محبت کو پانے کی کوشش ہی کی ہے...... اسے دولت سے ہاتھ دھونے پڑے ہیں تو اس نے اپنے بھاری نقصان کی بھی پروا نہیں کی...... جان داؤ پہ لگانی پڑی ہے تو وہ اس حد تک بھی گیا ہے...... پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ شادی کے بارے میں مجبور ہو گیا ہے؟ مجبوری کا تعلق کمزوری سے ہوتا ہے اور اگر ہم آج کے مرد کو مجبور مانتے ہیں تو پھر کیا اسے کمزور بھی مان لیں؟"
"تم سمجھتی ہو اگر شادی نہ ہو سکے تو اس کا مطلب صرف یہی ہے کہ محبت سچی نہیں تھی؟؟" وہ ہکلا کر بولی۔
"دیکھو! مرد اگر کسی عورت سے محبت کرتا ہے اور پھر اس سے شادی نہیں کرتا تو اس کا مطلب کیا ہے؟...... اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ عورت کو کسی دوسرے مرد کی بیوی بننے کے لئے چھوڑ رہا ہے اور جس عورت سے مرد محبت کرتا ہے وہ بھلا یہ کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ اس عورت کو کوئی دوسرا مرد دیکھے، چھوئے، اور وہ کسی دوسرے مرد کے گھر میں ہو؟۔ بولو۔۔۔ عورت کسی مرد سے محبت کرتی ہو تو اسے کسی اور کا ہونے دیتی ہے؟۔۔۔ نہیں۔۔۔ اس دوسری عورت سے حسد بھی کرتی ہے اور مرد کو ورغلاتی بھی ہے...... مرد تو پھر مرد ہے جب اسے محبت ہو جاتی ہے تو وہ اپنی محبوبہ کے در کا غلام بن جاتا ہے۔ اس وقت تک وہ در نہیں چھوڑتا، جب تک محبت کا قرب حاصل نہ کر لے۔ اسی چکر میں وہ اپنی انا اور غیرت تک کو بھی داؤ پر لگا دیتا ہے۔۔۔ لیکن ہار نہیں مانتا تو پھر یہ کیوں نہیں کر سکتا؟۔
"بتایا تو ہے۔۔۔ بہت مجبور ہے بیچارہ"۔
آنسو اس کی موٹی موٹی آنکھوں سے ڈھلک ہی پڑا۔ ہوا کے جھونکوں سے ٹمٹماتی شمع بھی گویا اس کے غم میں پٹ پٹ آنسو بہا رہی تھی۔
"کل رات باتیں کرتے وہ بھی رو پڑا۔۔۔ بچ بچ بچوں کی طرح رو رہا تھا وہ۔ مجھے بہت ترس بھی آیا۔ کاش میں اس

کے پاس ہوتی تو اس کے تمام غم اپنے دامن میں سمیٹ لیتی۔۔۔ لیکن ہائے یہ دوریاں۔۔۔ یوں تو کہنے کو دوسری ہی گلی میں اس کا گھر ہے لیکن۔۔۔ یوں لگتا ہے جیسے مجھ سے کوسوں دور ہے۔"

"کاش یہ دوری نہ ہوتی"۔

میں نے بات بدلتے ہوئے اس سے پوچھا

"اچھا اس کا اب کیا حال ہے؟۔

بچوں سے ملتا بھی ہے یا کہیں مر کھپ گیا۔۔۔ تیرا وہ پہلا مرد۔۔۔ ظالم"

وہ زار و قطار روتے ہوئے بولی۔۔۔

"میرے لیے تو وہ اسی دن مر گیا تھا جب اس نے طلاق کے تین بول میرے منہ پر دے مارے تھے۔۔۔ سچ سچ بہت زور سے لگے تھے۔ آج تک ان کے نشان میرے ماتھے پر داغ کی طرح سجے ہوئے ہیں۔۔۔ روح کی گہرائیوں تک بڑے گہرے زخم آئے تھے۔ بہت تڑپی تھی میں بھی۔۔۔ بن پانی کی مچھلی کی طرح۔۔ اب تو وہ زخم ناسور بن چکے ہیں۔ جب جب رستے ہیں تو سچ۔۔۔ اللہ پاک کی قسم۔۔۔ بڑا درد ہوتا ہے۔ راتوں میں یہ دل کا درد مجھے بالکل سونے نہیں دیتا۔ آنکھوں سے جب جب یہ ساون برستا ہے نا۔۔ تو اس کا بہاؤ کسی سیلاب سے کم نہیں ہوتا۔۔۔ اور جب یہ سیلاب سن کے سارے بند توڑ کر اپنا راستہ بناتا ہے تو بڑی تباہی مچاتا ہے۔۔۔ پھر سب کچھ تہس نہس ہو جاتا ہے۔۔۔ جب یہ سیلاب کسی کے وجود سے گزرتا ہے تب اس کی تباہی بڑی بھیانک ہوتی ہے۔۔۔ بدن کے گھاؤ نمایاں ہو جاتے ہیں۔ کھائیاں اور گڑھے وجود کی عمارت کو وقت سے پہلے ہی کھنڈر بنا دیتے ہیں۔۔۔"

میں اس کے آنسو پونچھ کر گویا ہوا۔

"یار اس کے بارے میں اس لئے نہیں پوچھا تھا کہ تو دوسرے مرد کے غم سے نکل کر پہلے والے کے عطا کردہ دکھ کی آغوش میں چلی جائے۔ اس دوسرے نے بھی یہی کرنا ہے تیرے ساتھ۔۔۔ سنبھل جا، کہیں تو بول اسے، تجھ سے نکاح کرلے۔۔۔ اور پھر تجھے کہیں دور گھر لے کر دے۔ بیوی اور ماں کو بھی بھلے بے شک نہ بتائے۔ دیندار ہے تو بجائے تجھے نماز روزے کی تلقین کرنے کے، تجھ سے نکاح کر لے اور ثابت کرے کہ وہ کتنا دیندار ہے۔ دوٹوک بات کیوں نہیں کرتی اس سے؟ کیوں اب تک محبت کی سولی پر لٹک رہی ہے؟"

وہ سسکی لے کر بولی۔

"کی تھی بات اس سے۔۔۔ کہ سیدھی طرح نکاح کرو۔۔۔ یا پھر مجھ سے بات نہیں کرو۔۔۔ آئندہ۔۔۔"

میں نے پھر پوچھا۔۔۔

"تو پھر کیا ہوا؟۔ کیا کہا اس نے؟"

"وہ پہلے تو مجھے پیار سے اپنی مجبوریاں سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ جب میں نہیں مانی تو۔۔۔ میں بھی بضد تھی کہ آج ہی فیصلہ ہو جائے۔۔۔ کیوں بے صبری تھی میں؟"

اس نے بے بسی سے خود کو کوستے ہوئے کہا۔۔۔ آنسوؤں سے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

"نجانے میری انا کی دیوار اتنی اونچی کیسے ہو گئی تھی اس رات۔۔۔ میں جو ہر بات میں اس کی ہاں میں ہاں ملاتی تھی۔۔۔

تیری انہی باتوں نے مجھے گمراہ کر دیا۔۔۔"

پھر وہی ہوا، جس کا مجھے ڈر تھا۔ وہ بلک بلک کر روتی ہوئی کہہ رہی تھی۔۔۔

"اس نے مجھے کہا: آئندہ وہ مجھ سے کوئی رابطہ نہیں رکھے گا اور میں بھی اس سے ملنے کی کبھی کوشش نہ کروں۔۔

تو سننا چاہے گی اس کے آخری الفاظ۔۔

"میں تیرے لئے مر گیا اب، بس تو روز رات کو میری قبر پر پھولوں کی چادر چڑھا دینا۔ جانتی ہے، آج پانچواں دن

ہے۔گھڑی کی سوئی جب رات کے بارہ بجاتی ہے، میں اپنے موتیوں جیسے آنسوؤں کی لڑیوں سے اک چادر بنتی ہوں۔
پھر اسے اپنے ارمانوں کے مزار پر چڑھا دیتی ہوں۔''
تیز ہوا کے جھکڑ سے ٹمٹماتی ہوئی شمع بجھ گئی۔اندھیروں میں اس کے آنسو کسی جلتی بجھتی آپ ہی آپ پگھلتی شمع کی مانند چمکتے تھے

......☆☆......

لا پتہ نوجوان

سلمان عبد الصمد

وہی دل نواز مسکراہٹ فیضی کے چہرے پر تھی، جسے دیکھ کر غم سے چور دل بھی مسکرا اٹھے۔وہ تھا واقعی شوخ، چنچل اور خوش ادا۔

رات اندھیروں میں ڈوبی تھی۔ٹرین تاریکی کے سینہ کو چاک کرتی چلی جارہی تھی۔
فیضی کی مسکراہٹ کے پیچھے تلخ حقیقت کی ایک دنیا آباد تھی، لیکن اندازہ کرے تو کون ماں کہاں تھی، جو چہرہ پر آتی جاتی لکیروں کو پڑھ کر بیٹے کے دکھ درد کا پتہ لگا سکے رات مزید گہری ہوتی جارہی تھی۔ٹرین کے مسافر نیند کی بانہوں میں مست تھے۔فیضی کی مسکراہٹ درحقیقت ذومعنی تھی۔دلنواز تو تھی ہی، ساتھ ہی ساتھ قاتل بھی۔
فیضی میں ماں بیٹی دونوں کے لیے کشش کا جمع ہونا بھی تعجب خیز تھا۔
ابی جو زرینہ اولاد سے محروم تھی، شاید فیضی کے اپنائیت بھرے بول اور لپک کر کر دینے والے کام نے ابی کے دل کو گد گدا دیا تھا۔
فیضی کی مسکراہٹ نے جہان نہ جانے کتنوں کو گھائل کیا، وہیں ثانیہ بھی بچ نہ سکی۔وہ تو چند منٹوں میں گھائل ہوگئی، ثانیہ کو یقین تو اب آیا کہ مسکان بھی قاتل ہوتی ہے۔
ابی کے ساتھ ثانیہ ٹرین میں تھی۔ابی خوش تھی، سفر کی تکان کا انہیں ذرا بھی احساس نہیں ہوا۔فیضی جو بن گیا یورنگ کا دشمن! دن کیسے تمام ہوا کسی کو کچھ پتہ نہیں چلا ثانیہ کو بھی نہیں مگر ثانیہ کے لئے رات پہاڑ ہوگئی، کاٹے نہیں کٹتی تھی۔آنکھ لگ گئی تو کچھ احساس نہیں، کھلی تو جہنم۔رہ رہ کر کھل ہی جاتی تھیں اس کی آنکھیں۔کر بھی کیا سکتی تھیں، سوائے اس کے سائڈ برتھ پر پڑے اپنے 'قاتل' پر میڈل برتھ سے بس اک نظر ڈال لے۔
کہتے ہیں نا کہ مسلسل جو کوئی کئی رات نہ سوئے، سولی پر بھی سو سکتا ہے۔فیضی کئی رات نہ سونے کے باوجود بھی آج رات نہیں سو پارہا تھا۔مانو بستر ڈس رہا ہو۔کروٹ بدل بدل کر یوں ہی رات تمام کررہا تھا۔ثانیہ کے لئے اس کی بدلتی کروٹوں میں شاید سکون کا راز تھا، وہ سوچتی تھی کہ شاید فیضی کی نیند میں سنے ہی!
وہ تخیلات کی وادی میں ہچکولے کھاتی رہی۔دو تہائی رات گزرنے کے بعد کسی طرح اس کے پپوٹوں پر نیند کا پہرا ہوا۔
تخیلات کا سلسلہ تھما تو خوابوں کی حسین وادی۔
'فیضی بولوں! میرا دل کچھ کہنا چاہتا ہے، کیا سنے گا تمہارا دل بھی

'ہاں! بولو نا'
'دل کی آواز تو دل ہی سنتا ہے، دل نے کچھ کہا، پتہ چلا تمہیں وہ خواب میں ثانیہ انہیں خیالوں سے کھیل رہی تھی۔فیضی کی ہاں کی خوشیوں سے اس کی باچھیں کھل گئی تھیں، مگر یہ خوشیاں طویل نہیں ہوئیں کہ آنکھیں کھل گئیں اور خواب بس خواب ہی رہ گیا۔دل کی تسلی کے لئے بکھرے خیالات کی دنیا سے نکل کر اپنے قاتل پر نظر ڈالنے کی کوشش کی، مگر اب سائڈ برتھ پر ہنس مکھ قاتل کا دور دور تک کچھ پتہ نہیں۔کئی گھنٹے گزر گئے۔اس کو واپس نہیں آنا تھا نہیں آیا۔
اسٹیشن کے باہر فیضی کے ہاتھوں میں کئی اخبارات تھے

باس کی بڑی سی مسکان بھری تصویر میں اس کی آنکھیں کھو گئیں۔ اس کو لگا کہ ان کے ہاتھوں کا ایوارڈ بھی اس سے کئی سوال کر رہے ہیں۔ تاہم اس کے دماغ میں دھمکیوں کے پٹاخے تھے۔

ادھر ثانیہ اب لاپتہ نوجوان کے لیے بیقرار تھی۔ انجانے خدشات سے اس کے سینے میں ہلچل مچا تھا۔ حالت اس کی بدلتی جا رہی تھی۔ ابھی اداس اداس تھی کہ آخر وہ ہنس مکھ اور چنچل گیا کہاں، منزل تو اس کے مطابق وہی تھی تو جوائن کی تھی، مگر درمیان سے لاپتہ ہونا ہر ایک کے لیے تعجب خیز تھا۔

تجسس بھری نگاہوں سے سب ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ اسی درمیان امی چند منٹوں کے لیے اٹھ کر کہیں گئیں۔ ثانیہ کی نظریں ادھر ادھر تیز گردش کرنے لگیں اور سائڈ پر پڑی ڈائری پر ایک بار پھر جا ٹکی، جسے گھنٹوں سے وہ دیکھے جا رہی تھی۔ شاید اس میں سکون کا کوئی سامان ہو۔ شاید امی کی موجودگی ڈائری کی محافظ تھی، اس لیے ڈائری کو ہاتھ بھی نہیں لگی۔ تاہم محافظ کے پل بھر ہٹتے ہی ڈائری کو گداز لرزتی داہنی کلائی کا لمس محسوس ہوا۔

ڈھک ڈھک کلیجہ اور غیر مرتب سانسوں کے درمیان وہ ڈائری کے ساتھ اپر برتھ پر چلی گئی۔ ڈائری سرسری دیکھنے کے بعد تجسس کی پھول کیاریاں لہلہا اٹھیں اور حاضر دماغی سے پڑھنے میں وہ مصروف ہو گئی۔

ڈائری میں فیضی کی زندگی کے حسین لمحات تھے اور تلخ تجربات بھی۔ بچپن کی نازک خیالی تھی لڑکپن کی بے پروائی بھی۔ ڈائری کے صفحات پر زندگی کی چکی بہت تیز گھومتی جا رہی تھی۔ اس کے نشیب و فراز میں ثانیہ کے لیے عجیب شگفتگی تھی اور حیرانگی بھی۔ سچ اس کے چہرے پر ابھرنے والی لکیریں تھیں ہی قابل دید نی۔

وقت اب کوئی گیارہ بجے کا تھا۔ موسم خوشگوار تھا۔ مگر ثانیہ کا چہرہ اتر گیا۔ اس کی سرمگیں آنکھیں جیسے آنسوؤں میں تیر رہی ہوں۔ ابھی وہ نیم دراز تھی۔ کپکپاتے دل کو تھاما اور بے اتفاقی سے اٹھ بیٹھی۔ اپنے پیروں کو نیم دراز کیا اور دونوں گھٹنوں پر دونوں ہتھیلیاں رکھ دیں۔ اپنی صراحی نما گردن خم کر کے بند آنکھیں ہتھیلیوں پر رکھ کر نہ جانے کہاں کھو سی گئی۔ سامنے ڈائری بھی کھلی تھی۔ مگر ماں کے مسلسل اصرار پر ناشتہ کے لیے نیچے اتر آئی۔

ڈائری تو کھلی ہی تھی، صفحات الٹ پلٹ رہے تھے، ایک صفحہ پر کچھ یوں تھا

'ہم نے ایک حد تک روایتی تعلیم مکمل کر لی ہے۔ ذریعہ معاش کی فکر سے دماغ پھٹا جا رہا ہے۔ نئے شہر میں ہوں، راستہ اجنبی، لوگ اجنبی۔ تنگ و تاریک ایک کرایہ کا کمرہ، جو سچ مانیں تو غریب الوطن چار افراد کے لیے ناکافی ہے۔ اس بھری گرمی ہے۔ پانی اتنا گرم کہ پیاس اور جگا دے۔ کہتے ہیں نا کہ دبیز اور نرم گداز بستروں سے کہیں زیادہ نیند کو ٹوٹی چٹائی پر راحت ملتی ہے۔ اس کا صحیح اندازہ آج ہوا کہ میرے علاوہ بقیہ تینوں ساتھی گہری نیند میں ہیں، لیکن غموں کے ڈنک نے میری نیند اڑا دی۔ میری انگلیوں میں قلم رقص کر رہا ہے اور سیاہ ہوتے صفحات میری ہتھیلیوں کے نیچے بے دم پڑے ہیں۔ داہنی دیوار پر لگی کھڑکی کے ٹوٹے شیشوں سے لمس ہو کر اسٹریٹ لائٹ کی مدھم روشنی ایسے آ رہی ہے، جیسے غریبوں کے گھر جا کر ٹوٹی چٹائی اور چٹنی روٹی کی سیاست کرنے والے اجنبی سیاستداں! خاموش رات میں ہوں، میرا قلم اور سیاہ ہوتے صفحات'

ثانیہ کے ہاتھوں نے ایک بار پھر ڈائری تھام لی اور صفحہ نظروں کے بوسہ سے متلذذ ہونے لگا۔

'رات نیند اڑی تھی اب دماغ دھواں دھواں ہے۔ گھر کی فون کال بڑی تکلیف دہ تھی۔ کوئی ساڑھے تین ماہ گزر گئے، کب تک بے روزگاری کی مار جھیلوں...... ہائے ری میری قسمت!'

ثانیہ آب دیدہ ہو گئی۔ مسکان میں لپٹا فیضی کا سراپا ناچ گیا۔ کئی صفحات سے درد بھرا رشتہ قائم کیے ثانیہ اپنے اسٹیشن سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔

دردناک لمحات کے بعد ایک صفحہ نے ٹھنڈی سانس لینے کا موقع دیا۔ فیضی کی زندگی کے کروٹ لیتے لمحات سے ہلکی سی خوشی کا احساس ہوا۔ سیاہ اور گھنی زلف سے جو ریشم جیسے چند بال کی لٹ ڈائری اور آنکھوں کے سامنے آ گئی تھی، اسے انگلیوں کے سہارے ٹھہر ٹھہر کر کندھے پر رکھ دیا۔ پھر ایک بار نگاہ ڈائری پر ٹک گئی۔

'اجنبی شہر میں کوئی چار ماہ گزر گئے۔ آج کسی فرشتہ صفت انسان سے ملاقات ہوئی وہ سخی ہیں، ملنسار ہیں اور غم خوار بھی۔ ان کی کشادہ پیشانی پر مروت کی لکیریں ابھری ہیں۔ انہوں نے حالات زندگی سن کر فی الحال ایک معمولی کام مجھے سپرد کر دیا مگر معاوضہ امید سے زیادہ، بہت زیادہ دل سے بے ساختہ نکلا سبحان تری قدرت!'

ثانیہ نے ایک اور صفحہ الٹ دیا، ہونٹوں پر تبسم، چہرے پر خوشیوں کی لکیریں، طبیعت میں شگفتگی، یعنی فیفی کی مسکان سے میل کھاتا صفحہ!

'کچھ دنوں قبل جو مضمون مجھ سے لکھ گیا، وہ شاید میری زندگی کا سب سے اچھا ہے۔ ملازمت اختیار کیے اب کوئی سال بھر کا عرصہ گزر گیا۔ اس درمیان اچھے لکھنے پڑھنے والوں سے رابطے ہوئے، میرے 'باس' کے پاس وہ سب ہمیشہ آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان آنے جانے والوں میں سے کئی ایک نے میرے اس مضمون کو شاہکار بتایا ہے۔ ان کے مشوروں پر ہی اس مضمون کو اسی رسالہ میں شائع ہونے بھیج دیا ہے، جس میں ہر پندرھویں روز میرے باس کے 'نام' سے ایک مضمون جلی عنوان میں شائع ہوتا ہے۔ میڈیا میں بنا رہنا ان کا شوق تھا یا مجبوری انتظار کر کر کے تھک گیا مگر چھ ہفتے بعد بھی میرے اس مضمون کو کوئی جگہ نہیں مل پائی۔ کہتے ہیں نا کہ جہد مسلسل کامیابی کی شاہ کلید ہے، اب تو ہر ہفتہ اپنے 'غم خوار مالک' کی طرح ایک مضمون اپنے نام سے بھی بھیجنے لگا، اس امید پر کہ شاید کسی ہفتہ جگہ ملے اور'

ثانیہ کی انگلیوں کے اشارہ پر ایک اور صفحہ نے کروٹ بدلا:

'میرے اہل خانہ اب بہت خوش ہیں۔ انہیں فی ماہ امید سے زیادہ بہت کچھ مل جاتا ہے۔ ادھر میرے باس نے شاید خوش ہو کر میری تنخواہ مزید بڑھا دی ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ میری مشغولیت ان کے لیے اور بڑھے گی مگر اب تک تو انھوں نے ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا۔ آگے اللہ مالک!'

چند ثانیہ کے بعد ثانیہ کی نگاہ اس پر آ گئی:

'ایک بار پھر الجھنوں نے مجھے آلیا۔ اب تو پیسے بھی ہیں۔ فاقوں کی نوبت آتی ہی نہیں۔ گھر سے درد بھری فون کال بھی نہیں۔ بستر بھی نرم گداز ہے۔ گرمی کے موسم میں سامنے ٹھنڈا پانی ہی نہیں دیگر ٹھنڈے مشروبات بھی ہیں، مگر حیران ہوں، راتوں کی نیند پھر حرام ہے۔ آج اور زیادہ کچھ ڈائری لکھنا نہیں چاہتا، ویسے تو کئی کئی صفحات سیاہ کر ڈالتا ہوں'

ثانیہ اب کسی دوسرے صفحہ پر ہے:

'آج پندرہ مارچ ہے، صبح پہلی فلائٹ سے باس کی بیرون ملک روانگی ہے۔ ان کی کال آئی تھی کہ مجھے بھی ان کے ساتھ ایئر پورٹ جانا ہے۔ عالی شان محل کے سامنے کئی چمچماتی کاریں لگی ہیں۔ ایئر پورٹ جاتے ہوئے ایک کار میں ہم دونوں کے سوا ڈرائیور ہے، پیچھے کی سیٹ پر انہوں نے میری بڑھتی ذمہ داریوں کا احساس کچھ اس طرح دلایا:

'فیفی دیکھو! کوئی ایک مہینہ کے لیے جا رہا ہوں۔ تمہاری ذمہ داری کچھ بڑھ گئی ہے۔ دو اخبارات کئی ہفت روزہ رسالہ کے لیے تم ہمارے لیے لکھتے تو تھے ہی، اب ایک اور روزنامہ کو میرا آرٹیکل مسلسل جائے گا، اس کی ذمہ داری بھی۔'

'باس تو باس ہیں۔ حکم کی تعمیل کی ہر ممکن کوشش کی، مگر کوئی دس دن بھی نہیں گزرے کہ ان کی کال آئی۔ پھر کسی اور روزنامہ میں لکھنے کی ایک اور ذمہ داری۔'

"سر" ٹھہر کر۔ "سر" ان کے فون کے جواب میں میری زبان فقط اتنی ہی حرکت کر سکی۔

اب کیا تھا! ان کے تیور سخت تھے، سخت لہجے میں برسنے لگے۔ میرے ساتھ کی گئیں تمام 'ہمدردیوں' کو گنوانا شروع کر دیا۔ صرف یہیں تک بس نہیں۔ دھمکی آمیز لہجہ میں کہا۔ 'تمہاری سانسوں پر بھی اختیار ہے مجھے، جب چاہوں چھین لوں میری مرضی۔ دلی میری ہے میری'۔

کاموں کا ہجوم ہے۔ ایک ہفتہ میں اتنے مضامین کب کھاؤں، کب پیوؤں، کب دیگر ضروریات سے فراغت! چنانچہ سانسوں کی واپسی سے پہلے میرا شاید لاپتہ ہو جانا ہی میری سلامتی کے لیے ضروری ہے۔ یہ سوچ کر میں اب ٹرین میں ہوں'

ڈائری کا یہ آخری صفحہ تھا۔ ثانیہ کی آنکھوں سے اس کے صبیح رخسار پر آنسوؤں کے قطرے ڈھلک ڈھلک کر خشک ہوتے چلے جا رہے تھے اور ثانیہ کا دل صرف یہی سوال دہرائے جا رہا تھا کہ وہ لاپتہ نوجوان اب مل پائے گا یا نہیں مجھے؟

......☆☆......

گناہ

علی نثار

اس کے والدین نے عشق کیا تھا زمانے کی مانیں تو عشق ایک خطرہ ہے، ایک آگ ہے اور وہ اس آگ سے کھیلے تھے۔ ایک دوسرے کو پانے کے لئے ساری دنیا تیاگ دی تھی۔ سارے زمانے کے جھگڑے اور آنسو مول لئے تھے اور ایک لمبی جدوجہد کے بعد دونوں ایک ہو گئے تھے۔ تو کہانی ختم۔! ظاہر ہے جب دونوں خوشی خوشی رہنے لگیں گے تو کہانی ختم ہوتی ہی ہے کہ دونوں کی زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں تھیں، لیکن نہیں کہانی میں ٹوئسٹ تو اب شروع ہوتا ہے کہ حقیقی کہانی تو یہیں سے شروع ہوتی ہے۔! اور اس شروعات میں ہی اس کی بنیاد پڑی تھی۔ اسے نہیں معلوم کہ اس کی بنیاد شہوانی لذت کا نتیجہ تھی یا اولاد کی خواہش کا خیال اس لذت میں شامل تھا۔ جب تک وہ ماں کی کوکھ میں رہی اسی ادھیڑ بن میں رہی۔ کبھی دنیا اسے خوبصورت لگتی کہ اس کی خواہش رکھ کر اس کی تشکیل کی گئی ہے اور کبھی مایوسی اسے گھیر لیتی کہ وہ والدین کی جنسی تسکین کا نتیجہ تو نہیں......؟

اور جب اس نے آنکھیں کھولیں تو دنیا اسے اتنی خوبصورت نہیں لگی۔ یوں تو وہ سب کچھ پا رہی تھی۔ اس کی بالیدگی، اس کے ظہور میں کوئی کمی نہیں تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ لڑکپن اور معصومیت کی حدود سے نکل کر جسم کے بھیدوں بھری دنیا سے متعارف ہوئی اور تب اس نے پایا کہ وہ بیمار ہے۔ جسمانی نہیں، ذہنی طور پر اور یہ روگ اسے اس کے سگوں نے دیا تھا۔ اسے ماننا پڑا کہ وہ ہوس کا نتیجہ تھی۔

اسے اپنے آپ سے نجاست محسوس ہوئی۔ اس نے اپنے وجود کو گناہ تصور کیا۔ وہ مایوس تھی، خوف زدہ تھی، ڈر اس کی شخصیت کا حصہ بن گیا اور وہ سہم سہم سی گئی۔۔۔ اپنے ماں باپ کو دیکھ کر۔ ان کے درمیان جو ہو رہا تھا اسے دیکھ کر۔ ان کے ٹھہرے ہوئے رشتے کو دیکھ کر۔ اسے معلوم تھا، دونوں نے عشق کیا تھا۔ زمانے سے لڑ کر ایک دوسرے کو حاصل کیا تھا۔ جب دونوں ایک دوسرے کے حصول میں نہیں تھے۔ بیتابی تھی، بے قراری تھی، دیوانگی تھی، تو کیا ان کا عشق جسم کی منزل پانے بھر تھا۔ جسمانی ملاپ کے بعد سب کچھ ٹھہر گیا۔ شادی سے پہلے چاندنی رات میں جو لڑکی دنیا کی سب سے خوبصورت لڑکی نظر آتی ہے، شادی کے بعد برتن مانجھتے وقت بری اور بھدی کیوں دکھنے لگتی ہے۔۔ گھر سے باہر چوری چھپے، سب سے نظریں بچا کر سمندر کے کنارے، کسی ریستوران میں، سینما ہال میں، یا کسی پارک میں جس لڑکے کے بدن کی خوشبو دیوانہ کرتی ہے. شادی کے بعد جب وہ کام سے تھکا ہارا لوٹتا ہے تو اسکے بدن سے نکلنے والے پسینے کی بو سے نجاست کیوں محسوس ہوتی ہے......؟ کیوں...... آخر کیوں؟

جب سے اس نے آنکھیں کھولی تھیں دونوں کو چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑتے دیکھا تھا، جھگڑتے دیکھا تھا۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں، چھوٹی چھوٹی مشکلیں مشترکہ تھیں ہی نہیں، تھا تو اپنا وجود۔ اپنی انا۔۔ اور کچھ باقی رہ گیا تھا، تو وہ تھا۔ ایک رشتہ۔ جسے ڈھویا جا رہا تھا ایک تعلق۔۔۔ جسے نبھایا جا رہا تھا اور ان سرد جذبوں کو ڈھوتے، ٹھنڈے رشتے کو نبھانے کے عمل میں اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوتا۔ وہ سوچتی۔ جو رشتے ہمیں جنم سے ملے ہوں انہیں تو ہر حال میں نبھانا ہی پڑتا ہے، ہم ماں کو نہیں چن سکتے، کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہم باپ کو نہیں چن سکتے، کوئی راستہ نہیں ہے. ماں، باپ، بھائی، بہن یہ سارے رشتے دیئے ہوئے رشتے ہیں جو جنم کے ساتھ ملتے ہیں. اس میں تبدیلی، کوئی پھیر بدل، کوئی پسند نہیں۔ ان رشتوں کے پہلے ہم ہیں ہی نہیں جو یہ طے کر سکیں کہ ہمیں کیسی ماں، کیسا باپ، کیسی بہن یا کیسا بھائی چاہیئے...... اور اسلئے ان رشتوں کو نبھانا پڑتا ہے، ان رشتوں کو ڈھونا پڑتا ہے۔ اور یہاں نبھانے اور ڈھونے کی بات سمجھ میں آتی ہے لیکن قدرت نے ایک رشتہ ایسا دیا ہے،

جسے ہم خود طے کر سکتے ہیں کہ وہ کون ہوگا، کیسا ہوگا؟ اور جب قدرت نے، معاشرے نے ہمیں یہ موقع دیا ہے تو اس رشتے میں ڈھونے اور نبھانے کی بات کہاں آتی ہے؟ اکثر اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہو جاتی اور وہ اپنی ماں سے پوچھ بیٹھتی۔

"تم نے ایسے ہی سپنے دیکھے تھے...... بہت پیار تھا نا تم دونوں میں، زمانے سے لڑ کر، جھگڑ کر ایک لمبی جدوجہد کے بعد تم نے اپنا پیار پایا تھا نا...... پھر چوک کہاں ہوئی، غلطی کس کی ہے؟ تمہاری وہ دیوانگی، وہ آہیں، وہ آنسو، وہ بیقراری، وہ تڑپ ان سب کا کیا مطلب تھا، وہ سب کچھ کیوں ہوا جو عام طور پر ہر گھر میں ہوتا ہے...... سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ تم نے تو عشق کیا تھا نا...... چاہا تھا ایک دوسرے کو...... زندگی خوشگوار ہوگی ایسے سپنے دیکھے تھے نا...... تم نے لمحے میں صدیاں جی کر صدیوں کو بے کیف، بے لطف کیوں کر دیا۔ تمہارے سپنے بے رنگ کیوں ہو گئے ماں......؟"

لیکن اس کی ماں کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ شادی کے بعد عشق حاشیے پر چلا گیا تھا۔ عام طور پر یہی ہوتا ہے۔ اپنا وجود سامنے آجاتا ہے...... اور ایسا ہی ہوا تھا! ایسا اس کے ماں باپ کے ساتھ ہی ہوتا تو شاید وہ اسے ایک اتفاق مان کر مطمئن ہو سکتی تھی، لیکن اپنے گرد و نواح میں ایسا ہی ہوتا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ شادی اپنی پسند کی ہو یا گھر والوں کی رضامندی سے طے شدہ...... رشتے ہر جگہ ڈھونے جا رہے تھے اور وہ خوف زدہ تھی ایک ڈر، ایک وحشت اس کے وجود، اس کی شخصیت کا حصہ بن گئی تھی اور جب اس نے دیکھا...... اس ڈر، اس خوف، اس وحشت کے زیر اثر اس کا وجود، اس کا اپنا آپ کہیں کھوتا جا رہا ہے، گم ہوتا جا رہا ہے تو...... بالآخر اس نے ایک فیصلہ کیا تھا...... اور اس دن اس نے خود کو ایسا ہی ہلکا اور نیا محسوس کیا تھا جیسے ہر ماہ کچھ تکلیف دہ دن گزارنے کے بعد وہ خود کو ہلکا اور نیا محسوس کرتی تھی...... ذہن پر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ بہت آرام، بہت سکون محسوس کر رہی تھی...... اور اب وہ بیمار نہیں تھی...... ساری عمر رونے کے خوف سے اس نے مسکرانا چھوڑ دیا تھا، مگر اب وہ مسکرانے کے لئے تیار تھی۔ بائیس سالوں تک...... ماں باپ کی رنجشیں، ان کے جھگڑے، ان کی ناچاقیوں کو جھیلتے ہوئے جس ڈر، جس خوف کے سائے میں اس کا وجود پروان چڑھا تھا اور جو خوف، جو وحشت اس کی شخصیت کا حصہ بن گئی تھی، اس سے خود کو نکال لیا تھا اس نے۔ اور اب وہ مسکرا رہی تھی......!

اس نے دیکھا۔ جس اور گھٹن کہیں نہیں ہے اسے دن خوبصورت، شام سہانی اور رات حسین لگنے لگی اور تب اس نے اپنے وجود میں کئی تبدیلیاں محسوس کیں۔ اس کا رنگ روپ نکھر آیا، مایوس آنکھیں مسکرا اٹھیں، گھنٹوں آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر خود کو نہارتی...... کیوں وہ اب تک خود سے ناآشنا تھی؟ کتنے حسین راز اسے اپنے جسم کی ساخت میں پوشیدہ ملے اور انہیں دنوں جب دن اسے خوبصورت لگ رہے تھے...... ایک لڑکا اس کی زندگی میں آیا اسے لڑکے سے محبت ہوگئی۔ محبت میں شدت تھی، دیوانگی کا روپ لے لیا اور اس بات نے اسے سکون بخشا کہ لڑکا بھی اس سے محبت کرتا تھا۔ آگ دونوں طرف تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو چاہا، ٹوٹ کر چاہا اور ایسا چاہا کہ ان کی محبت نے نگاہوں سے دل اور دل سے روح تک کا سفر طے کر لیا...... اور اب دیوانگی کا یہ عالم تھا کہ دونوں ایک دوسرے کو چھونا چاہتے تھے، ایک دوسرے کو جینا چاہتے تھے، ایک دوسرے میں اترنا چاہتے تھے۔ ایک دن لڑکے نے سرگوشی کی۔

"اے سنو، میں تمہارے جسم کو جینا چاہتا ہوں۔ میرے پاس آؤ...... مجھے اپنے اندر بھر لو...... پھر میں تمہارے جسم کے ایک ایک عضو کو تشریح دونگا، ایک نیا معنی عطا کروں گا......"

اس کی نشیلی باتیں اسے مدہوش کر گئیں، کئی جوانیاں نزاکت کے ساتھ لڑکی کے جسم میں مچلنے لگیں۔ لڑکے کی نگاہیں بہک رہی تھیں۔ اس کی بے ترتیب انگلیاں لڑکی کے جسم پر رینگنے لگیں...... لڑکی کی دھڑکنوں کی رفتار تیز ہوگئی...... لیکن روح سے جسم کی منزل تک پہنچنے کے لئے لڑکی نے جانے کون سی حد طے کر رکھی تھی، اس ڈوبتی ابھرتی سانسوں کے درمیان بہت مضبوطی اور خود اعتمادی کے ساتھ اس نازک اور کمزور لمحوں میں خود کو بچا گئی۔ لڑکا یہ بات سمجھنے سے قاصر تھا اسے شہ دے کر، اس کے قریب آکر وہ لوٹ کیوں گئی۔ اسے مجھ پر، میرے پیار پر بھروسہ کیوں نہیں؟ لڑکا مایوس ہو گیا کئی دنوں تک لڑکی سے نہیں ملا اپنی ناراضگی کا اظہار کرانے کا اس سے اچھا طریقہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ لڑکی نے اس کی ناراضگی کا کوئی نوٹس نہیں لیا کوئی پہل نہیں کی۔ دونوں ضد پر تھے، جھکنے کو کوئی تیار نہ ہوا اس درمیان لڑکی کے والدین میں ناچاقی اتنی بڑھی کہ انہوں

نے علیحدگی اختیار کرلی۔ اچانک گھر میں سناٹا پسر آیا۔ اس کا باپ اس عورت کے پاس چلا گیا جو اس علیحدگی کی وجہ بنی تھی۔ لیکن اس نے اس گھر کے ٹوٹنے میں اس عورت کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا کہ گھر تو تبھی ٹوٹنے لگا تھا جب برتنوں کے ٹوٹنے کی آوازیں آنی شروع ہوئی تھیں اور یہ آوازیں اس نے تبھی سے سنی تھیں جب وہ اپنی ماں کی کوکھ میں تھی۔

گو کہ وہ ایک طرح سے اس عورت کی شکر گزار ہی تھی کہ اس نے دانستہ یا نادانستہ اس کے والدین کو اس رشتے سے نجات دلائی تھی جو ڈھونے جا رہے تھے اور جو اس کی نظر میں گناہ تھے اس کے باوجود بڑا تکلیف دہ دور تھا وہ بات کرتے کرتے اس کی ماں کی آنکھیں چھلک پڑتیں۔ ماں کے آنسو پونچھنے اور اسے دلاسہ دینے کے عمل میں اس کی آنکھیں بھی چھلک پڑتیں۔ ماں کی اداسیاں، محرومیاں اسے بھی اداس کر گئیں۔ وہ مغموم رہنے لگی اور ایسے نازک لمحوں میں جب اسے کسی سہارے کی سخت ضرورت تھی لڑکا اسے کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ اپنی ناراضگی بھول کر پل پل اس کے قریب رہا، بچے کی طرح اسے سنبھالا اور ایک دن جب اسے لگا کہ لڑکی تھوڑا سنبھل چکی ہے تو اس نے اسے قریب بٹھایا، اس کے بال سنوارے، اس کی پیشانی چومی اور اپنا حتمی فیصلہ اسے سنایا۔

"میں تمہیں اس حال میں نہیں چھوڑ سکتا، ہم دونوں کو اب شادی کرنی ہی پڑے گی"۔ لڑکی سمجھ گئی...... وہ کیا چاہتا ہے...... مگر...... لڑکی کے ارادے کچھ اور تھے...... وہ اٹھی، دلبرانہ انداز میں اس کے قریب آئی...... اور پھر اس سے لپٹ گئی۔ لڑکا تیار نہیں تھا۔ چونکا، سنبھلا پھر اس کی شہ پر سلگ اٹھا...... لڑکی کی سپردگی نے اسے بتایا کہ زندگی کی انجانی لذتیں کس طرح پھوٹ پھوٹ پڑتی ہیں اور وہ جب بے قابو ہوا تو...... لڑکی کو ایسی ایسی دنیاؤں میں لے گیا جہاں کا تصور بھی وہ نہیں کر سکتی تھی۔ برسوں بعد اس کی بے چین روح متوازن ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اور جب طوفان تھما اسے ہوش آیا سب سے پہلے اس نے لڑکی کا ردعمل جاننا چاہا۔ اسے قدرے اطمینان ہوا یہ دیکھ کر کہ لڑکی انتہائی پرسکون انداز میں اس کے قریب لیٹی ہوئی تھی، لڑکی نے اس عمل کو گناہ سے تعبیر نہیں کیا، جسم کا سفر طے کرتے وقت لڑکے کے ذہن میں تشویش کے جو بادل چھائے ہوئے تھے وہ چھٹ چکے تھے۔ تھوڑی بے چینی تھی کہ ذہنی کشمکش نے بے خودی کی آخری سرحد طے کرنے سے ایک قدم پہلے اسے روک دیا تھا۔ بہر حال وہ خوش تھا کہ وہ اسے حاصل کر چکا تھا اس نے دیکھا کہ لڑکی بڑے فاتحانہ انداز میں اس کی پہلو میں لیٹی تھی۔

لڑکی ان دنوں کافی خوش تھی۔ اپنی زندگی اپنے طور پر جی رہی تھی۔ لڑکا بھی خوش تھا۔ لیکن یہ بات سمجھنے سے قاصر تھا کہ پہلی بار نازک اور کمزور لمحوں میں خود کو بچا لینے والی لڑکی کی خود سپردگی کی آخر وجہ کیا ہے۔ بہر حال اسے لڑکی کی خوشیاں عزیز تھیں۔ وہ خوش ہے یہ اطمینان اس کے لئے کافی تھا۔ وہ بھی اس کے ساتھ جی رہا تھا ایک خوبصورت زندگی۔ لڑکی ہر بار اسے ایک نئی دنیا کی سیر کرا جاتی۔ وہ بھی اس کے جسم کے ایک ایک عضو کو ہر بار ایک نیا معنی عطا کر رہا تھا۔ دونوں سیراب ہو رہے تھے ایک بار اس کے پہلو میں لیٹی لڑکی نے سرگوشی کی

"تم بستر پر ضدی، بے ترتیب اور ایک حد تک بے رحم بھی ہو جاتے ہو۔" لڑکا مسکرایا

"اس معاملے میں بے ترتیبی مجھے پسند ہے۔۔ سب کچھ حد سے باہر ہونا چاہئے"

"پریشان کر دیتے ہو مجھے۔" لڑکی مصنوعی غصے میں اسے گھونسے مارنے لگی تو وہ ہنستے ہوئے بولا

"وہ پیار ہی کیا جو کسی کو کیا جائے اور وہ پریشان نہ ہو"

"جانور" لڑکی نے اس کے بالوں بھرے چوڑے سینے میں اپنا چہرہ رگڑتے ہوئے سرگوشی کی۔۔

اسے یہ لقب پسند آیا اور اس نے لڑکی کو اپنی بانہوں میں بھینچ لیا دونوں خوش تھے۔ خاص کر لڑکی کہ وہ اپنی زندگی اپنے طور پر اپنی شرطوں پر جی رہی تھی۔ ایک دن لڑکا بے چین تھا۔ لڑکی کی بانہوں کی نرمی اور جسم کی گرمی بھی اسے چین و قرار نہیں دے پائی تو لڑکی تڑپ اٹھی...... وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ اس کی محبت میں جنونی کیفیت تھی۔ اسے اس طرح بے چین نہیں دیکھ سکتی تھی۔ بضد ہوگئی کہ اپنی بے چینی کا سبب بتائے۔

"ہمیں شادی کر لینی چاہئے......"

"اوہ! تو بے چینی یہاں ہے...... میری خود سپردگی سے تم خوش نہیں ہو...... میں تو کب کا تمہیں اپنا آپ سونپ چکی ہوں"

"ہاں ٹھیک ہے، مگر شادی تو ضروری ہے نا......" لڑکے کے لہجے میں ترشی تھی۔

"کیوں۔ کیوں ضروری ہے؟" لڑکی پرسکون تھی۔

"کیوں کے ہم گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔" لڑکا مشتعل ہوا تھا...... "کب تک ہم ایسی زندگی جئیں گے...... کب تک خود کو، ایک دوسرے کو، سماج کو سب کو دھوکا دیتے رہیں گے۔"

لڑکی چیخ اٹھی ...... "ہم کوئی گناہ نہیں کر رہے، کسی کو دھوکا نہیں دے رہے، جسمانی تقاضوں کو ایک دوسرے کی رضامندی سے پورا کرنا کسی بھی صورت میں گناہ نہیں گناہ تو وہاں ہے جہاں رشتے ڈھونے جاتے ہیں، نبھائے جاتے ہیں ...... گناہ وہاں ہے جہاں عشق جسم کی منزل پاتے ہی فنا ہو جاتا ہے...... گناہ وہاں ہے جہاں کسی نئے وجود کی آمد میں اس کی آرزو، اس کی جستجو، اس کی خواہش نہ ہو کر شہوانی لذت اور جسم کی بھوک کے علاوہ کچھ نہ ہو......" لمحہ بھر کے لئے وہ رکی پھر ذرا نرم لہجے میں بولی۔

"دیکھو میں پل پل کو جی رہی ہوں۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں، تم سے مطمئن ہوں، خوش ہوں۔ ڈھونڈے اور نبھائے جانے والے رشتے میری نظر میں گناہ ہیں تم مجھے اس گناہ کا مرتکب بننے کے لئے مجبور نہ کرو...... کیوں کہ ہم اس رشتے کو جی رہے ہیں...... اور ہم کوئی گناہ نہیں کر رہے"

"تو تم شادی کو گناہ تصور کرتی ہو؟"

"نہیں شادی کے بعد عشق کا حاشیہ پر چلا جانا گناہ ہے"۔

"کیوں گناہ ہے...... عشق ساری زندگی تو نہیں ہے۔ جب چھوٹی چھوٹی ضرورتیں، چھوٹی چھوٹی مشکلیں ازدواجی زندگی سے ٹکراتی ہیں تو عشق کا حاشیے پر چلا جانا واجبی ہے، یہ گناہ کیسے ہوا؟"

"چھوٹی بڑی تمام ضرورتیں تم بھی تو میری پوری کرتے ہو...... بجلی کا بل، فون کا بل، کتنی خوش دلی سے تم جمع کرا آتے ہو...... باتھ روم کا نل ہو یا کچن کا، ذرا سا ٹرپ ٹرپ کی آواز سنی اور پلمبر کو بلا بھیجا۔ آئرن خراب ہو گیا ہو یا ایمرجنسی لائٹ، خود کھول کر انجینئر بن جاتے ہو...... بنا تو بنا نہیں بنا تو ریپئرنگ کے لئے دکان پر لے جاتے ہو نا...... میں نے تو کبھی نہیں دیکھا کہ ان کاموں کو کرتے ہوئے تمہارا عشق حاشیے پر چلا گیا ہو۔ ہاں میں نے ڈیڈی کو دیکھا تھا...... انہیں سب چھوٹی بڑی باتوں میں الجھتے ہوئے...... لڑتے اور جھگڑتے ہوئے......"

"دیکھو جان تم نے ٹوٹتے ہوئے گھر کو بڑے قریب سے دیکھا ہے ایک ڈر، ایک خوف تمہارے اندر دبکا ہوا ہے...... تم خود کو اس خوف، اس ڈر سے نکال نہیں پا رہی ہو...... نکال کر تو دیکھو، کوئی ضروری نہیں کہ جو تمہارے والدین کے ساتھ ہوا ویسا ہی کچھ ہمارے ساتھ بھی ہو......!"

"ہو سکتا ہے کہ تمہارے ساتھ ایسا نہ ہو یا ہو سکتا ہے، ابھی تمہارے ساتھ جو رشتہ میں جی رہی ہوں، آگے چل کر اس میں بھی وہی سب ہو جو شادی کے بعد اکثر ہوتا ہے، تو یقین جانو میں اسے بھی ٹھوکر مار دونگی۔ مجھے ایسا کوئی رشتہ منظور نہیں جو محض نبھایا جاتا ہو......" پھر وہ اس کے کندھے پر اپنا سر رکھ کر کہتی ہے۔

"سنو...... سنو...... مجھے اتنا پتا ہے کہ شادی کا نام اگر رفاقت ہے تو وہ مجھے حاصل ہے...... اور یہ رفاقت میں کھونا نہیں چاہتی، کسی بھی قیمت پر نہیں"۔ لڑکی اپنے موقف پر قائم تھی اور اس نے اپنے ارادے صاف کر دیے تھے
لڑکا گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا اور ڈوبتا ہی گیا تھا۔

......☆☆......

بے نشاں کب تک

ثانیہ غفور راجہ

متنازعہ اداکارہ و ماڈل قندیل بلوچ غیرت کے نام پر قتل- بھائی کا اعتراف جرم

جہیز نا ملنے پر، بہو کو آگ لگا دی ،شوہر موقع سے فرار، ساس گرفتار اخبار پہ نظریں دوڑاتے ہوئے صبا نے اونچی آواز میں اپنے اسٹوڈنٹس کو خبریں سنائیں آئے روز اخبار میں نت نئی ظلم کی داستانیں پڑھ کر صبا بہت دکھی ہو جاتی تھی اسے میڈیا اور اخبارات پر غصہ آتا تھا جو ظلم و زیادتی کو بہت سنسنی خیز بنا کر پیش کرتے

صبا حسن، حبیبہ بیگم اور حسن احمد کی اکلوتی بیٹی تھی وہ بہت ہونہار لڑکی تھی اور مقامی کالج سے بی-اے کی تعلیم حاصل کر رہی تھی حبیبہ جیسی نیک اور نرم دل ماں کی تربیت نے اس کی شخصیت کو نکھار دیا تھا، اور بہت حساس دل رکھنے والی لڑکی تھی کسی طرح کی زیادتی برداشت نہیں کر سکتی تھی یہی وجہ تھی کہ وہ نت نئی خبروں سے پریشان ہو جاتی تھی

گھر کے کام کاج سے فراغت کے بعد صبا محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے کا شوق بھی بخوبی پورا کر رہی تھی

''صبا بیٹی ،صبا بیٹی ۔'' حبیبہ بیگم نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے صبا کو آواز دی۔

''جی امی جی ابھی آئی۔'' صبا دروازے کی طرف لپکی اور ماں کے ہاتھوں سے سامان لیا۔

''آپ بیٹھیں اور ہوا لگوائیں میں ابھی آپ کے لئے ٹھنڈا ٹھنڈا شربت لائی۔'' صبا سامان لئے کچن کی طرف بڑھی۔

''یہ لیجیے ٹھنڈا ٹھنڈا روح افزا اور روح اور دل کو راحت پہنچائیں۔ صبا نے مسکراتے ہوئے ماں سے کہا

''آج بڑے لاڈ ہو رہے ہیں ماں سے ،کیا بات ہے، پھر کوئی نئی فرمائش تو نہیں ہونے والی؟'' حبیبہ بیگم نے مصنوعی خفگی سے کہا-

''ارے میری پیاری ماں جان ،کیسی باتیں کرتی ہیں آپ؟ آپ بازار سے تھکی ہاری لوٹی ہیں تو کیا آپ کا خیال کرنا میرا فرض نہیں۔'' اس نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر محبت سے جواب دیا۔

''ارے میری پیاری بیٹی ہو تم تو۔'' حبیبہ بیگم نے ان کے سر پہ بوسہ لیتے ہوئے کہا

''آخر کو آپ کی فرمانبردار بیٹی ہوں امی جان۔'' صبا نے کھلکھلا کر ماں سے کہا۔

حبیبہ بیگم بیٹی کی باتیں سن کر مسکرانے لگیں اور تخت پر آرام کی غرض سے لیٹ گئیں

☆☆

''امی جان دوپہر کے لئے پلاؤ اور رائتہ بنا لیتی ہوں شام کیلیے کچھ اور اہتمام کر لیں گے۔'' صبا نے کچن سے ہی ماں کو کھانے کی تفصیل بتائی

دروازے پر دستک کے ساتھ ہی شمسہ خالہ نمودار ہوئیں

''ارے صبا بیٹی دیکھو تو دروازے پر کون ہے؟'' حبیبہ بیگم نے تخت پہ لیٹے لیٹے آواز لگائی

''دیکھتی ہوں امی جان۔'' صبا کچن سے باہر نکلتے ہوئے بولی اور پھر وہیں رک کر ماں سے کہنے لگی

''ارے امی جان یہ تو اپنی شمسہ خالہ ہیں بہت دنوں بعد آئی ہیں خالہ آپ۔'' صبا نے محبت سے مسکراتے ہوئے خالہ سے پوچھا۔

''بس بیٹی اس عمر میں تو گھٹنوں کا درد ہی کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں دیتا، ورنہ تم سب سے ملنے کے لیے ہر روز پہنچ جایا کروں شمسہ خالہ صبا کی محبت پہ نثار ہوتے ہوئے بولیں اور اس سے گلے ملنے لگیں

''بیٹھیں خالہ میں ابھی آپ کے کھانے کے لئے بندوبست کرتی ہوں۔'' صبا عجلت میں کچن کی طرف دوڑی وہ ہر مہمان کی دل سے خاطر تواضع کرتی تھی سبھی اس کی فرمانبرداری اور محبت کے گن گاتے تھے۔

☆☆

''اے ہے حبیبہ تم کیوں ایسے لیٹی پڑی ہو تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔''
شمسہ خالہ نے تخت پہ لیٹی حبیبہ کو دیکھتے ہوئے سوال کیا

جی شمسہ آپا اللہ پاک کا کرم ہے۔ٹھیک ہوں بس بازار کا چکر لگا کر آئی ہوں ضرورت کا کچھ سامان لینا تھا مگر گرمی کی وجہ سے حالت کافی خراب ہو جاتی ہے بازار سے خریداری کرتے ہوئے حبیبہ بیگم نے جواب دیا
''بس ذرا کمر سیدھی کرنے کی غرض سے ہی لیٹ گئی تھی اللہ کرے جلد ہی ابر کرم برسے تو موسم کچھ اچھا اور خوشگوار ہو۔
حبیبہ بیگم کہتے ہوئے اٹھ بیٹھیں
ہاں بس دعا ہے کہ اللہ بارش کا کوئی سامان کرے۔''شمسہ خالہ نے بھی جواب دیا
اتنے میں صبا بھی ٹھنڈا مشروب اور کچھ پھل لیے کچن سے نکلی
یہ لیں شمسہ خالہ، پہلے پیٹ پوجا، پھر کام دوجا۔اس نے سرعت سے سب کچھ پلیٹ میں نکال کر خالہ کے سامنے رکھا
شمسہ خالہ تو اتنی سی محبت سے ہی نہال ہو گئیں
شمسہ خالہ ان کے محلے کی ایک معزز اور بڑی خاتون تھیں بھلے وقتوں کی میٹرک پاس تھیں، بیاہ کر اس چھوٹے سے محلے میں آئیں تو پھر شوہر کی مفارقت کے بعد یہاں سے باہر نہ گئیں سبھی کے ساتھ سکھ دکھ کا ناتا اور ابھی اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ اچھا گزارا کر رہی تھیں محلے کے سبھی لوگوں کے دکھ سکھ میں کام آتیں اور سب کی مزاج پرسی کرنے پہنچ جاتیں سب چھوٹے بڑے ان سے بہت عزت احترام سے پیش آتے اور وہ بھی ہمیشہ سب سے پیار محبت سے ملتیں۔
مگر اب کچھ ماہ سے جوڑوں اور گھٹنوں کی تکلیف نے انہیں گھر بند رہنے پہ مجبور کر دیا تھا
شمسہ خالہ کیا بات ہے آپ کچھ خاموش اور پریشان ہیں صبا نے ان پہ نظریں جماتے ہوئے استفسار کیا
''بس صبا بچی کیا بتاؤں یہ وقت انسان کو کیا کیا دکھا رہا ہے اور اس نام نہاد معاشرے میں کیسے کیسے ظلم و جبر ہو رہے ہیں۔''انہوں نے دکھی لہجے میں صبا کی بات کا جواب دیا
''شمسہ آپا، کیا بات ہو گئی؟ آپ بہت دکھی اور مایوس لگ رہی ہیں۔''حبیبہ بیگم نے بھی حیرانی سے سوال کیا
شمسہ خالہ کافی مضبوط دل کی مالک تھیں اور جلد پریشان نہیں ہوتی تھیں مگر آج ان کے عمر رسیدہ چہرے پہ دکھ کی پرچھائیں صاف دکھ رہی تھی
''اپنے محلے کی مائی میراں کو تو جانتی ہو گی ناں؟ جو حیدر آباد سے آ کر یہاں آباد ہو گئی تھیں۔بہت عرصہ پہلے شمسہ آپا نے بات شروع کرتے ہوئے حبیبہ بیگم سے پوچھا
''ارے جی شمسہ آپا انہیں تو سب جانتے ہیں بہت اچھی عورت ہیں وہ اور کافی محنت مزدوری بھی کی انہوں نے یہاں آ کر اب تو انکی عمر بھی کافی زیادہ ہو چکی ہے۔کیا ہوا انہیں؟ سب خیریت تو ہے ناں؟''حبیبہ نے الجھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا
''جب نصیب ہی ساتھ نہ دیں تو کیا اچھا ہو سکتا ہے حبیبہ اس کی بیٹی اسی کے آبائی گاؤں میں بیاہی گئی تھی اس کے بھائی کے گھر۔''شمسہ آپا نے بات جاری رکھی۔
''مائی میراں کے چھوٹے بھتیجے کی گوٹھ کے کسی وڈیرے سے پانی کے مسئلے پہ بحث چل رہی تھی بات بڑھتے بڑھتے نوبت ہاتھا پائی پہ جا پہنچی اور مائی کے بھتیجے کے ہاتھوں وڈیرے کا لڑکا مارا گیا۔''
شمسہ خالہ نے آخر پریشانی والی بات کا ذکر کر ہی دیا
شمسہ خالہ کے لہجے اور اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور صبا بھی جانے کب سے ان کے درمیان آن بیٹھی تھی اور سب باتیں غور سے سن رہی تھی
ان ماں بیٹی کا دل بھی یہ بات سن کر پریشان ہو چلا
''اب پھر کیا فیصلہ ہوا خالہ جان ان کے اس جھگڑے اور قتل کا؟''صبا نے ازلی نرم دلی سے سوال کیا
''کیا ہونا تھا صبا بٹی بات پانی کے تنازعے سے خون خرابے تک جا پہنچی ہے۔وڈیرے کا بیٹا مر گیا ہے اور یہ وڈیرے کتنے سنگدل اور ظالم ہوتے ہیں تمہیں پتہ تو ہو گا۔''خالہ نے اسے جواب دیا۔

"وڈیرے نے انصاف کے لئے قانون کی مدد لینے کی بجائے خود ہی فیصلہ سنادیا ہے۔"
"کیسا فیصلہ؟" صبا بے چینی سے آگے ہوئی اور پوچھا۔
"وڈیرے نے قتل کے بدلے میں اپنے معذور اور پاگل بیٹے کے ساتھ مائی میراں کی نواسی کی شادی کی شرط رکھ دی ہے اور انکار کی صورت میں مائی کے بھتیجے کو بھی مارنے کی دھمکی دی ہے۔"
شمسہ خالہ آزردہ ہوتے ہوئے بولیں
صبا کے معصوم دل پہ ہاتھ پڑا۔اس نے شمسہ خالہ سے اس وڈیرے کے لڑکے اور مائی کی معصوم نواسی کی عمر پوچھی۔
وہ پاگل وڈیرا پچاس سے اوپر کا ہے اور مائی کی نواسی تو ابھی دس سال کی ہوئی ہے مگر انہیں اپنے بیٹے کی زندگی سے زیادہ اس معصوم کی زندگی کا خیال نہیں ہے۔انہوں نے شرط مان کر اپنی پھول سی بچی ان وڈیروں کے حوالے کردی۔"
حبیبہ بیگم نے آنکھوں میں آئی نمی پونچھتے ہوئے صبا کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں سے آنسو قطار میں نکل رہے تھے وہ اپنی بیٹی کی حساسیت سے واقف تھیں تبھی انہوں نے شمسہ آپا سے سوال کیا
"کیا اس کی ماں نے کوئی اعتراض نہیں کیا آپا اور بیٹی ان کے حوالے کردی؟"
"ہاں حبیبہ،اس غریب کا رونا اس کے شوہر اور ساس سسر کو نظر نہیں آیا انہیں اپنے بیٹے کی زندگی عزیز تھی پوتی کی قربانی دے کر اپنے بیٹے کو بچالیا سنا ہے وڈیرے نے سب کو اپنی لڑکی سے ملنے سے منع کیا ہے اور ان کے رسم ورواج بھی بہت ظالمانہ ہیں۔"
صبا سے یہ سب برداشت نہیں ہورہا تھا وہ غم اور صدمے کی شدت سے پھٹ پڑی۔
"بھلا یہ کیسا انصاف تھا خالہ؟" اور انہیں اپنی معصوم پوتی نظر نہیں آئی بس اپنے بیٹے کے لیے اسے داؤ پہ لگا دیا" وہ اپنی ازلی جذباتی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہوئے بولی۔
یہ "ونی" کی رسم کہلاتی ہے بیٹی اور ایسے علاقوں میں یہ روایت صدیوں سے چلی آرہی ہے یہاں مرد کی غلطیوں اور جرائم پر عورت جیسی کمزور جنس ہی قربان ہوتی آئی ہے۔اللہ پاک ہی اس معصوم کی حالت زار پہ رحم کرے
انہوں نے اس کے مزاج کو سمجھتے ہوئے اسے سمجھایا۔
مگر صبا تو جیسے کچھ سن سمجھ ہی نہیں رہی تھی وہ تو بے بسی سے دل پہ ہاتھ رکھے آنسو بہائے جارہی تھی
"مجھ سے تو مائی میراں کا رونا تڑپنا دیکھا نہیں گیا حبیبہ، بہت نازک حالت تھی اس کی رو رو کے سینہ کوبی کرتی ہوئی اس بدنصیب کی حالت پہ سب ہی اشکبار ہو گئے تھے مگر کوئی کیا کرسکتا ہے بھلا؟" شمسہ خالہ نے صبا کو ساتھ لگا کر تسلی دیتے ہوئے کہا۔
صبا رقت آمیز لہجے میں ماں سے بولی،
"یہ کیسا معاشرہ ہے؟ یہ کیسے نام نہاد مسلمان ہیں؟ یہاں پر کیا قیامت تک ایسے ہی عورت کسی کے کیئے کا بھگتان بھرتی رہے گی؟ اسلام نے تو ہر مرد وزن کو اس کے حقوق وفرائض سے آگہی دے دی ہے پھر مرد کے کئے گناہ پر وہ سزا کسی عورت کو کیسے دینے کا حق رکھتے ہیں۔
وہ دکھ کی حالت میں سوال پہ سوال اٹھائے جارہی تھی اور حبیبہ بیگم اپنی بیٹی کی حالت پر دل کو کٹتا ہوا محسوس کررہی تھیں۔
"بس کرو صبا بیٹی مت خود کو اتنا ہلکان کرو۔یہ مردوں کا معاشرہ ہے یہاں یہی سب ہوتا آیا ہے اور ناں جانے کب تک ہوتا رہے گا؟" حبیبہ بیٹی سے مخاطب ہوئیں۔
نہیں امی جان، یہ ظلم ہے اس معصوم پر۔اس کی تو عمر ابھی کھیلنے کی ہے کہاں اسے اتنی بڑی حقیقت کا ادراک ہوگا کہ اس کے نصیب پہ اسکے چچا کے جرم کی سیاہی پھر گئی ہے؟"
صبا متواتر ایک ہی بات کی گردان کررہی تھی
"مردوں کو اپنے حقوق کا اتنا خیال رہتا ہے مگر عورتوں کی بات پر ان کے دل پر قفل پڑ جاتے ہیں اتنے جدید اور ترقی

یافتہ دور میں بھی ہمارے معاشرے کی کمزور عورت ایسے مظالم اور زیادتیوں کی چکی میں چپ چاپ بنا احتجاج کیے پس رہی ہے کیوں۔"
نامور لوگوں کی چھوٹی بات پر بھی میڈیا اتنا شور کرتا ہے مگر غریب کی گوٹھ بستیوں پر ہوئے ظلم اور جبر کی آواز تک نہیں پہنچتی ان نام نہاد صحافیوں تک۔
دنیا ترقی کرتے ستاروں پہ کمند ڈال آئی مگر ہمارے ملک میں آج بھی معصوم بیٹیاں "ونی" کی بھینٹ چڑھائی جا رہی ہیں یہ کہاں کا قانون ہے کیسا انصاف ہے غیرت کے نام پہ قتل ہو تو عورت، جہیز کے نام پہ آگ لگائی جائے تو عورت، مرد کے گناہوں پہ پردہ ڈالے تو عورت اور اپنی باپ بھائیوں کی قتل و غارت پہ اپنا آپ قربان کرے تو عورت آخر کب تک عورت یوں خاموشی سے یہ سب سہتی رہے گی؟ آخر کب تک وہ ایسے بے نشان رہے گی؟
کہاں تو شرمین عبید جیسی عورتیں ایسے مظالم پہ ڈاکیومینٹریز بنا کر آسکر جیت رہی ہیں اور کہاں ان گلی محلوں اور گوٹھوں تک کسی تنظیم کی رسائی تک نہیں۔
مسلسل بولنے اور رونے سے صبا کی آواز رندھ چکی تھی مگر شدت غم سے وہ ابھی تک ایک ہی زاویے پہ بیٹھے ہوئے تکرار کر رہی تھی مگر اس کے سوالوں کا جواب اس کی ماں اور شمسہ خالہ کے پاس نہیں تھا کیونکہ وہ بھی اسی معاشرے کی چپ چاپ زندگی گزار دینے والی عورتیں تھیں
وہ بھی یہی جاننا چاہتی تھیں کہ آخر کب تک عورتیں ایسے قربانی دیتی رہیں گی بنا آواز اٹھائے بنا سوال کیے؟ جب پیامبر اسلام نے عورتوں کے حقوق مقرر کر دیے تھے تو پھر کب تک انہیں اپنے حقوق کے ساتھ جینے کی آزادی ملے گی؟ اسے کب نشان اور پہچان ملے گی جس کی وہ حقدار ہے؟
صبا نے سوال کرنے کی ہمت تو کر لی ہے مگر اس کے کسی سوال کا جواب ہے کسی کے پاس؟
گر آپ کے پاس ہے تو ضرور جواب دیجیے

......☆☆......

صنم لاگی تم سے من کی لگن

مہوش ملک

اصفان حیدر تمہاری آنکھیں اتنی خاموش کیوں ہیں؟ تم مسکرا تو رہے ہو مگر تمہاری آنکھیں تمہارا ساتھ نہیں دے رہیں۔
تمہارا وہم ہے ماورا حسن، اصفان حیدر نے اس کی بات کی نفی کرتے ہوئے کہا۔ اسے میرا وہم کہو یا کچھ اور مگر تمہاری آنکھوں میں چھپے اس درد کو میں اپنے دل پہ محسوس کر رہی ہوں۔ ماورا نے اسے جھٹلاتے ہوئے کہا۔
"لگتا ہے آج کل کوئی میری آنکھوں پر ریسرچ کر رہا ہے۔" اصفان حیدر نے اسے چھیڑا۔
"بات کو بدلو مت اصفان حیدر مجھ سے تمہاری بے توجہی بالکل بھی برداشت نہیں ہوتی۔" ماورا نے نروٹھے پن سے کہا۔
"میری ساری توجہ اور محبت کا مرکز صرف تم ہو ماورا حسن۔ پھر کیوں واہمات کا شکار ہوتی ہو۔" اصفان حیدر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ محبت میں وہم تو ساتھ ساتھ ہی رہتا ہے نا اصفان حیدر انسان چاہ کر بھی اسے دل سے نہیں نکال سکتا۔"
"ماورا اداس مت ہوا کرو۔ بس خوش رہا کرو ہر لمحہ ہر پل۔
اچھا جی ٹھیک ہے مگر ایک شرط پر۔"
"آپ کی ہر شرط زبان سے نکلنے سے پہلے ہی ہمیں منظور ہے ماہ دام۔۔ خیر حکم کیجیے۔ اصفان نے شوخی سے کہا۔
"تم مجھ سے بھی کچھ نہیں چھپاؤ گے اپنی ہر چھوٹی سے چھوٹی بات مجھ سے شیئر کرو گے سمجھے۔

''او کے بابا چلو آو چلتے ہیں کلاس کا ٹائم ہوگیا۔'' اصفان حیدر نے گھاس پہ رکھی اپنی بکس اٹھاتے ہوئے کہا۔۔ ماورا نے بھی چپ چاپ اس کی تقلید کی اور اصفان حیدر کے ساتھ چلنے لگی کتنی ہی نگاہوں نے رشک سے اُن دونوں کو دور جاتے دیکھا تھا۔

اصفان اور ماورا کلاس فیلوز تھے۔۔ ایم ایس سی کیمسٹری کے ذہین فطین اسٹوڈینٹس۔ پہلے پہل تو دونوں ایک دوسرے کی ذہانت سے متاثر ہوئے تھے اور انکی وقتی دوستی کب گہری محبت میں بدلی انہیں پتہ ہی نہ چلا۔ بہت تھوڑے وقت میں وہ ایک دوسرے کیلئے لازم وملزوم ہوگئے تھے۔۔

''ہماری چٹکی کیا کر رہی ہے؟'' اصفان گھر میں داخل ہوا تو زدشیہ پر نظر پڑی جو پھولوں کے پاس بڑی اُداس سی کھڑی ہوئی تھی۔

''کچھ نہیں۔'' زدشیہ نے شکوہ کناں نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا جس پر اصفان نگاہیں چرا گیا کیسے بتاوں تمہیں کے تم میرے لیے کیا ہو۔ بس جو تم چاہتی ہو وہ میرے بس میں نہیں اصفان نے تھکے تھکے انداز میں قدم اندر کی جانب بڑھا دیے اور زدیشہ کی خاموش نظروں نے اندر تک اس کا تعاقب کیا۔

......☆☆......

اصفان بیٹا کس دن تم فارغ ہو گے مجھے ڈھیر دں شاپنگ کرنی ہے میں اپنے گھر میں آنے والی خوشیوں کو دھوم دھام سے منانا چاہتی ہوں فاطمہ بیگم نے اصفان کے کپڑے تہہ کرتے ہوئے کہا جو پاس ہی لیپ ٹاپ پر مصروف تھا۔

''کیا زدشیہ کے لیے رشتہ مل گیا اماں......؟'' اس نے جان بوجھ کر سوال کیا۔

''ہاں مل گیا ہے دُلہا بھگوڑا ضرور ہے مگر میں اسے منالوں گی۔ اماں جواب دیتے ہی کمرے سے نکل گئیں کیونکہ وہ اس وقت بحث کے موڈ میں نہیں تھیں۔۔ اور اصفان حیدر اپنا سر پکڑ کے بیٹھ گیا تھا۔

......☆☆......

اسے پتہ تھا کہ زدیشہ انتہائی خوش فہم لڑکی ہے ہر بات سے اپنی پسند کے مطالب خود ہی اخذ کرلیا کرتی۔ مگر اپنے بارے میں زدیشہ کے خیالات سن کر اصفان کا سر چکرا گیا تھا۔ وہ اصفان کے خیال رکھنے، فکر کرنے کو اس کی محبت سمجھ بیٹھی تھی۔ ہاں وہ اس سے محبت کرتا تھا مگر ایک بھائی کی حیثیت سے خالہ کے گزر جانے کے بعد ان لوگوں نے کبھی اسے ماں کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا تھا وہ فقط دو برس کی تھی جب والدین سے محروم ہوگئی تھی اور تب فاطمہ بیگم اپنی مرحوم بہن کی ننھی پری کو ہمیشہ کیلئے اپنے ساتھ ''حیدر ولا'' میں لے آئی تھیں۔۔ اس کے ددھیال والوں نے کبھی پلٹ کر خبر تک نہ لی تھی اور نہ ہی فاطمہ بیگم نے ان لوگوں سے کوئی رابطہ رکھا تھا۔ اصفان حیدر اس وقت ۵ برس کا تھا اور جیتی جاگتی گڑیا کو پا کر تو وہ انتہائی خوش تھا۔۔۔

مگر اب زدیشہ کی آنکھوں میں اپنا نام دیکھ کر اصفان عجب دوراہے پر آ کر کھڑا ہوگیا تھا۔ ایک طرف اس کی ماں کی خواہش اور زدیشہ کی خوشی تھی تو دوسری طرف اس کا پیار تھا۔ ماورا اس کا عشق تھی جنون تھی الگ بات کہ ماں کے سامنے اس کا ذکر تا حال نہ کر پایا تھا۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ ماوف ہوتا جا رہا تھا۔ زدیشہ معصوم تھی وہ کیسے اس کانچ سی گڑیا کے کچے خواب پل بھر میں زمین بوس کر دیتا مگر اپنے خوابوں سے دستبردار ہونا بھی اس کیلئے جان لیوا تھا ماورا سے دستبرداری کا خیال ہی سوہانِ روح تھا۔

اے رب دو جہاں میری مدد فرما۔ میں مشکل میں نہیں ہوں بلکہ مشکلوں نے مجھے گھیر لیا ہے۔ میرے لیے فیصلہ کرنا بہت کٹھن ہے مجھے راستہ دکھا۔

......☆☆......

کتنا خوش تھا وہ اپنی زندگی سے یونیورسٹی کا ہیرو، ماں باپ کی آنکھوں کا تارا اور زدیشہ کا سب سے بہترین دوست زندگی مکمل سی ہوگئی تھی ہر طرف سکون ہی سکون تھا۔۔ ستمبر کی ایک خوشگوار صبح وہ بڑے مزے سے بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا اور ساتھ

ساتھ ماورا کے مسلسل آنے والے میسجز انجوائے کر رہا تھا جب اماں نے اس کے سر پہ دھماکا کیا تھا۔ میں تمہاری اور زونیشہ کی شادی کرنا چاہتی ہوں اصفان۔

"کیا......!" اس نے بڑی حیرت سے فاطمہ بیگم کی طرف دیکھا تھا۔ جو اپنی بات مکمل کرنے بعد بڑے سکون سے کھڑی اسے دیکھ رہی تھیں۔

"یہ کیسے ممکن ہے اماں؟ وہ بہن ہے میری۔" اصفان نے احتجاج کیا۔

"بیٹا شادی سے پہلے ہر لڑکی بہن ہی ہوتی ہے اور میں نے تو بہت پہلے ہی زونیشہ کو اپنی بہو بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں یتیم بچی کو پرائے ہاتھوں میں نہیں سونپنا چاہتی۔"

"اماں زونی سے بات کی آپ نے؟ (اسے یقین تھا کہ وہ فوراً انکار دے گی)۔

"ہاں بات کی تھی اور اسے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" اماں کے جواب نے اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑا دیئے۔

"اماں آپ ایک دفعہ پھر زونیشہ سے پوچھ لیں۔" میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کئے بیٹا۔ زونیشہ بہت خوش ہے۔

......☆☆......

اس دن کے بعد اصفان کیلئے زندگی امتحان مسلسل کی طرح ہوگئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی زونیشہ کی آنکھوں میں حیا کے سارے رنگ اتر آتے وہ فوراً کمرے میں بھاگ جاتی۔ اماں اس کے پیچھے پڑی ہوئی تھیں وہ ہر بار انہیں ٹال جاتا اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ماورا سے وہ دور بھاگنے لگا تھا۔۔ وہ جب کال کرتی تو کاٹ دیتا اور یونیورسٹی میں تو کلاس ختم ہوتے ہی غائب ہو جاتا تھا۔

......☆☆......

وہ صبح یونیورسٹی جانے کے ارادے سے گھر سے نکلا تھا۔ مگر پھر بلا ارادہ ہی گاڑی اپنے دوست عمیر کے گھر کی جانب موڑ دی۔ عمیر اسے اس وقت اپنے گھر دیکھ کر حیران ہوا مگر کہا کچھ نہیں۔

"یونیورسٹی جا رہے ہو۔" اصفان نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"ہاں مگر اب تمہاری طرف دیکھ کر ارادہ بدل گیا۔" عمیر نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ اچھا یہ بتا کیا لے گا؟

"کچھ نہیں یار بس ناشتہ کر کے آیا ہوں۔"

اتنا پریشان کیوں لگ رہا ہے اور میں کافی دنوں سے دیکھ رہا ہوں تو ماورا سے دور بھاگ رہا ہے۔"

عمیر میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔۔ آگے کنواں ہے تو پیچھے کھائی۔ اصفان نے اسے پوری بتاتے ہوئے کہا۔

"اصفان تم آنٹی کو بتا دو سب کچھ۔"

"بتا تو دوں مگر زونیشہ کا کیا ہوگا اس کی آنکھوں میں جلتے دیپ کیسے بجھا دوں؟

"تو کیا تو ماورا کو چھوڑ سکتا ہے۔"

"ماورا کے بنا جینے کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا وہ ہے تو میں ہوں۔" اصفان نے ٹوٹتے ہوئے انداز میں کہا۔

"وقت نے اپنا بہاؤ بدل لیا ہے اصفان حیدر اس لئے اب وقت سے الجھنے کا کوئی فائدہ نہیں اگر حالات سے بغاوت کرو گے تو مشکل میں پڑ جاؤ گے۔ اس لئے میری مانو تو اپنے دماغ کی سنو۔

عمیر نے مخلصانہ مشورہ دیا۔

اور اصفان حیدر نے خود کو مکمل طور پر بے رحم وقت کے حوالے کر دیا۔

اس نے بڑی بے دلی سے زونیشہ کیلئے ہاں کر دی تھی۔ دل کی دنیا کیا اجڑی اسے ہر چیز ہی ویران لگ رہی تھی۔ دو دن بعد اس کی منگنی تھی۔ وہ یونیورسٹی جاتا اور کلاس ختم ہوتے ہی واپسی کیلئے بھاگ کھڑا ہوتا۔ اس کی نظریں ماورا کو ڈھونڈ رہی تھی جو کہیں نظر نہیں آرہی تھی اس نے اپنا موبائل چیک کیا مگر کوئی میسج نہ دیکھ کر وہ مایوس ہو گیا۔۔ اس نے واپسی کیلئے قدم بڑھا دیئے۔

"اصفان تم سے کوئی ملنے آیا ہے۔"
ابھی وہ گھر لوٹا ہی تھا کہ زرونی نے پانی کا گلاس پکڑاتے ہوئے کہا۔
"کون آیا ہے؟" اصفان نے کنپٹیوں کو مسلتے ہوئے پوچھا۔
"تمہاری کوئی دوست ہے کب سے تمہارے کمرے میں بیٹھی انتظار کر رہی ہے جاؤ مل لو میں وہیں کھانا لے کر آتی ہوں۔۔اصفان اثبات میں سر ہلاتا اپنے کمرے کی جانب چل دیا

......☆☆......

سامنے صوفے پہ بیٹھی ماورا کو دیکھ کر اس کے قدم دروازے میں ہی تھم گئے۔
"آؤ اصفان حیدر وہاں کیوں کھڑے ہو؟"
اصفان سست روی سے چلتا ہوا اس کے مقابل آن کھڑا ہوا۔
"کیسی ہو۔"
"کیسی ہو سکتی ہوں؟" ماورا نے الٹا اسی سے سوال کر دیا۔۔اصفان سے کوئی جواب نہ بن پایا تو اس نے رخ پھیر لیا۔ ماورا کی آنکھوں میں ناچتی وحشت نے اسے پل میں بے چین کر ڈالا تھا۔۔
"اصفان حیدر میری طرف دیکھو، مجھے میری غلطی بتاؤ۔۔چاہے جتنے دن مرضی ناراض رہ لو مگر پلیز میرے پاس لوٹ آؤ۔" اس کے لہجے کی تڑپ نے اصفان کو تڑپا ڈالا تھا۔
"کہاں آسان ہے تم سے جدا ہونا، پل پل مر رہا ہوں میں۔پلیز ماورا واپس چلی جاؤ۔ میں واپس کیسے چلی جاؤں اصفان حیدر۔۔تم سے الگ ہو کر کہاں جی پاؤں گی۔
پرسوں کو میری منگنی ہے زوبیشہ کے ساتھ چاہو تو آ جانا۔
"نہیں اصفان حیدر تم کسی اور کے نہیں ہو سکتے۔کیوں اذیت دے رہے ہو خود کو اور مجھے تمہیں انکار کرنا ہوگا اصفان۔" ماورا نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔
"میں اماں اور زرونی کو دکھ نہیں دے سکتا۔"
"اور میرا دکھ تمہیں کیوں نظر نہیں آ رہا۔" ماورا نے شکوہ کناں نگاہوں سے اصفان کو دیکھا۔
"مجھے پتہ ہے میری ماورا بہت بہادر ہے۔ماورا بے شک ہم الگ ہو جائیں مگر ہمارے دل تو ایک ساتھ دھڑکتے ہیں نا۔" اصفان نے ہاتھوں کے پیالے میں اس کا چہرہ لیتے ہوئے کہا۔
"اصفان حیدر خدا کیلئے ایسا مت کرو۔
"تمہیں میری قسم ماورا احسن واپس لوٹ جاؤ۔"
اور ماورا احسن ہچکیوں کے ساتھ روتے ہوئے کمرے سے بھاگ گئی تھی۔اور اس کے پیچھے لپکتے اصفان حیدر کی نظر دروازے میں بت بنی کھڑی زوبیشہ پر پڑی تھی۔جو اسے دیکھتے ہی اپنے کمرے کی اور چل دی تھی۔چال میں واضح لغزش تھی۔
خالہ جانی میں یہ منگنی نہیں کروں گی۔" سب لوگ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے شام کی چائے پی رہے تھے جب زوبیشہ نے دھماکا کیا۔
"کیا ہوا بیٹا ایسے کیوں کہہ رہی ہو؟ کیا اصفان نے کچھ کہا؟ فاطمہ بیگم نے شاکی نظروں سے اصفان کو گھورا۔
"نہیں خالہ جانی، وہ مجھے بھلا کیوں کچھ کہیں گے بلکہ وہ تو ایک یتیم لڑکی کا ہاتھ تھام کر اس پر احسان کر رہے ہیں۔
بکواس مت کرو زرونی کیسی باتیں کر رہی ہو تم؟ اصفان حیدر کو حقیقتاً بہت غصہ آیا تھا۔
میں بکواس نہیں کر رہی، اگر ایسا نہیں ہے تو پھر کیوں اپنی محبت کی قربانی دے رہے ہیں آپ؟؟ کیوں خود کو میری وجہ سے اذیت دے رہے ہیں؟
"یہ تم کیا کہہ رہی ہو صاف صاف بتاؤ۔" فاطمہ بیگم دونوں کی طرف الجھن سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"زونی خدا کیلئے خاموش ہو جاؤ۔"

"آپ چپ کر جائیں اصفان۔ پہلے ہی مجھے بہت گناہگار کر چکے ہیں آپ۔ دو دلوں کو الگ کرنے کا موجب بنی ہوں میں۔" زونیشہ نے روتے ہوئے کہا۔

"آپ کو پتہ ہے خالہ جانی یہ اپنی کلاس فیلو سے محبت کرتے ہیں اور میری وجہ سے انہوں نے اسے چھوڑ دیا۔"

"کیا یہ سچ کہہ رہی ہے اصفان۔ اس مرتبہ حیدر صاحب نے پوچھا۔ مگر اصفان بالکل خاموش تماشائی بنا کھڑا رہا۔

"کیا آپ کو میں اتنی خود غرض لگتی ہوں اصفان جو کسی اور کو توڑ کر خود اپنی خوشیوں کا جشن مناوں گی۔ کیا یہی تھی ہماری دوستی؟ مانتی ہوں میں آپ سے پیار کر بیٹھی مگر یقین جانیے جتنا پیار ماورا کے لہجے میں آپ کے لیے تھا اتنا تو شاید میں پوری زندگی بھی نہ کر پاتی۔"

"اصفان بیٹا تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا ماں ہوں تمہاری کوئی دشمن تو نہیں۔" فاطمہ بیگم نے دکھ سے کہا۔

"اچھا بابا اب تو پتہ چل گیا نا معاف کر دو مجھے۔ اصفان حیدر نے زونیشہ کے آگے ہاتھ جوڑے۔

"معافی تو بس آپکو تب ملے گی جب آپ ماورا کو میری بھابھی بنا کے گھر لائیں گے۔

"آپ کا حکم سر آنکھوں پہ۔" اصفان حیدر نے ہنستے ہوئے جواب دیا تھا۔ اور فوراً ماورا کو آئی ایم بیک کا میسج سینڈ کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ماورا اسے دیکھتے ہی سب کچھ بھلا دے گی۔

حیدر ولا" میں مایوسیوں کی جگہ خوشیوں نے لے لی تھی اور فاطمہ بیگم نے آگے بڑھ کر دونوں کو گلے لگاتے ہوئے زونیشہ کا ماتھا چوما تھا جس کی وجہ سے ان کے بیٹے کی زندگی میں بہاریں پھر سے لوٹ آئیں تھیں اور اصفان حیدر بڑی سرشاری کے عالم میں اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا اپنے مالک کے حضور سجدہ شکر ادا کرنے کیلیے۔۔ ایک طوفان تھا جو تھم گیا تھا اور ایک احسان تھا جو اصفان حیدر کی ذات پر کر دیا گیا تھا۔

سنو جاناں
تمہارے بن
کہاں تکمیل ممکن ہے؟
مکمل تم سے ہی ہوں میں
بھلا تم بن کہاں ممکن
میری سانسیں
میری دھڑکن
میرا ہر پل
میرا ہر کل
بھلا تم بن کہاں ممکن
میرا جیون
میری خوشیاں
میری چاہت
میری راحت
فقط تم سے ممکن ہے
میری تکمیل تم ہی ہو

ذوقِ آگہی

سیاس گل

طرز تخاطب

ایک تاجر نے ایک بہلول کو دیکھا تو کہنے لگا۔
''یا شیخ میں کون سا مال خریدوں کہ مجھے فائدہ ہو؟''
بہلول نے جواب دیا۔
''روئی اور لوہا خرید لو۔''
تاجر نے ایسا ہی کیا کچھ عرصے میں اس کی قیمت کئی گناہ بڑھ گئی اور تاجر کو بہت زیادہ فائدہ ہوا۔ کافی عرصے کے بعد تاجر نے ایک بار پھر بہلول کو دیکھا تو کہنے لگا۔
''اے پاگل بہلول! اس سال میں کون سا مال خریدوں کہ مجھے فائدہ ہو۔''
''اس سال پیاز اور تربوز خرید لو۔'' تاجر نے ایسا ہی کیا لیکن کچھ ہی دن میں پیاز اور تربوز سڑ گئے' اس مرتبہ تاجر کو بہت نقصان ہوا۔ تاجر نے بہلول سے جاکر اس غلط مشورے کے بارے میں دریافت کیا تو بہلول نے کہا۔
''اے تاجر تم نے پہلی بار مجھے یا شیخ کہہ کر پکارا تھا' اس لیے میں نے عقل و منطق کے ساتھ تمہیں مشورہ دیا تھا لیکن دوسری بار مجھے پاگل کہہ کر مخاطب کیا' اس لیے میں نے تمہیں اپنے پاگل پن میں مشورہ دیا ہے' پس تم اپنے نقصان کے خود ذمہ دار ہو کیونکہ کوزے میں سے وہی نکالا جاتا ہے جو اس میں ڈالا گیا ہو۔''

اسما بنت حسن...... رحیم یار خان

اللہ کی رضا

خدا نے جو کچھ میرے لیے مقرر کر دیا ہے میں اس پر راضی ہوں۔ اور میں نے اپنا کام اپنے خالق کے سپرد کر دیا ہے۔ جس طرح اس نے گزشتہ زندگی میں احسان کیا۔ اسی طرح باقی زندگی میں بھی احسان کرے گا۔ تجھے جو کچھ مشکل درپیش ہے وہ تیرے طرز زندگی کی وجہ سے ہے، ورنہ جو لوگ آسان زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں وہ آسانی سے زندگی گزار دیتے ہیں۔
(تم لوگوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرو خدا تمہارے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرے گا۔)

مولانا روم رحمتہ اللہ علیہ

انتخاب: آبرو نبیلہ اقبال...... راولپنڈی

بہت قیمتی باتیں

جو کام خود کر سکتے ہو اس کے لیے دوسروں سے درخواست مت کرو۔
مصیبت کا بوجھ خوش اسلوبی سے اٹھانے والا ہی سب سے بہتر کام کر سکتا ہے۔
جتنی محنت سے لوگ جہنم میں جاتے ہیں اس سے آدھی محنت سے لوگ جنت میں جا سکتے ہیں۔
وہ اعتماد جس سے پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہٹایا جا سکتا ہے وہ انسان کا اپنی ذات پر بھروسہ ہے۔
مسکراہٹ ایک ایسا نذرانہ ہے جسے غریب سے غریب آدمی بھی پیش کر سکتا ہے۔
کامیابی کا تالا ہمیشہ محنت کی کنجی سے کھلتا ہے۔
مشکلات کا مقابلہ کرنے کا نام زندگی اور ان پر غالب آجانے کا نام کامیابی ہے۔
غذا سے جسم اور قناعت سے روح کو راحت ملتی ہے۔
انسان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اپنے دل اور زبان کو قابو میں رکھے۔

عامر خان چاند...... کوٹ ادو

اے انسان

اے حضرت انسان ذرا غور کر
تو نے خدا کو پہچانا مگر اس کی مغفرت کا حق ادا نہ کیا۔
تو نے قرآن مجید پڑھا مگر اس پر عمل نہ کیا۔
تو نے محبت رسول ﷺ کا دعویٰ کیا مگر اس کی سنت پر عمل نہ کیا۔
تو نے عداوت شیطان کا دعویٰ کیا مگر اس کی مخالفت نہ کی۔
تو نے جنت کو چاہا لیکن اس میں داخلے والے اعمال نہ کیے۔
تو نے جہنم سے پناہ مانگی مگر خود اپنے نفس کو اس میں ڈال دیا۔
تو نے موت کو حق جانا مگر اس کے لیے تیاری نہ کی۔
تو نے بھائیوں کی عیب جوئی کی مگر اپنے عیب نہ دیکھے۔

تو نے اللہ تعالیٰ کی نعمتیں کھائیں مگر ان کا شکرانہ ادا نہ کیا۔
تو نے مردوں کو دفن کیا مگر ان سے عبرت حاصل نہ کیا۔
ریاض بٹ.....حسن ابدال

سرد موسم

آج بہت عرصے بعد کچھ لکھنے کو جی چاہا تو ایک کپ چائے لے کر حسین دہلیز پر بیٹھ گیا جہاں کبھی ہم دونوں ساتھ ہنستے اور گنگناتے تھے وہی بھیگی شام، سرد ہوا اور چائے.....بس تم ساتھ نہیں تھیں میرے آنسو کپ کے اندر گرتے گئے اور تمہارا عکس آنکھوں میں دھندلا گیا۔ پھر تمہاری کچھ باتیں یاد آ گئیں کہ سردیوں کی سرمئی شامیں اور کہر میں لپٹی صبحیں انسان کو اپنا دیوانہ بنا دیتی ہیں۔ جاناں میں سردیوں کو روک تو نہیں سکتی مگر اس کی ہر شام یہ نوید دے کر گزر جاتی ہے کہ تم ضرور آؤ گی مجھے شام کی ان بھیگی ہواؤں سے اپنائیت محسوس ہوتی ہے، بالکل تمہاری طرح تمہارے احساس کی طرح۔

میں بہت دیر تک سڑک پر اکیلا چلتا رہا اور سوچ رہا تھا کہ تمہارے بغیر موسم بھی رک سا گیا ہے میں پھر زندگی تمہارے بن کس طرح جیوں، یہی سوچتے ہوئے میں واپس گھر کو لوٹ گیا اچانک دل میں خیال آیا کہ زندگی کا ایک اور دن آج تمہارے بغیر بیت گیا ہے۔

دل نے شدت سے چاہا کہ کاش میں اس برس تمہیں برف کی یہ سفید چادر دکھا سکتا جو تمہیں بہت پسند تھی جس پر اب میں اکیلا چل رہا ہوں اور تمہاری یاد میں آنسو بہا رہا ہوں۔

احسان سحر.....میانوالی

دوستی

دوستی ایک نازک سا پھول ہے جو ذرا سی بھی سختی برداشت نہیں کر پاتا۔ اگر احتیاط نہ کی جائے تو یہ نازک سا رشتہ پل بھر میں ٹوٹ جاتا ہے جب تم کسی کو اپنا دوست بناؤ تو اپنے دل میں ایک قبرستان جس میں اس کی برائیوں کو دفن کر سکوں۔ اس کے متعلق دوسروں سے پوچھتے مت پھرو ہو سکتا ہے کہ اس کا دشمن تمہیں کوئی غلط بات بتا دے اور یہ غلط فہمی تمہاری جدائی کا سبب بن جائے اور یوں تم ایک اچھے دوست سے محروم ہو جاؤ پھر یہ کہتے پھریں گے کہ

بے وفا وقت تھا وہ تھے یا مقدر میرا
بات جو بھی تھی بہر حال انجام جدائی نکلا
محمد احمد رضا.....کوٹ ادو

وقت نزاع

وقت نزاع یعنی موت جو ہر جاندار کو آنی ہے موت کے آنے کی تو سو فیصد گارنٹی ہے لیکن یہ کب اور کس حال میں آئے گی یہ کوئی نہیں جانتا اکثر لوگ موت کو اتنی قریب دیکھ کر واپس لوٹ آتے ہیں کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے اور حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہے دین حق کے علاوہ دنیا میں اور بہت سے عقائد و مذاہب کے لوگ پائے جاتے ہیں لیکن ایسا کوئی بھی عقیدہ اور مذہب نہیں جو موت سے انکار کرتا ہے، یہ بات اور کہ ایسے بہت سے لوگ گزرے ہیں جنہوں نے ہزار سال جینے کا سوچا پر افسوس ہزار سال کے بعد بھی موت کا تصور ختم نہیں کیا جا سکا، موت کے نام پر روح کانپ جاتی ہے پر چونکہ یہ انسانی زندگی کی ایک تلخ حقیقت ہے، جس سے کسی طور انکار نہیں کیا جا سکتا اس لیے اکثر میں موت پر سوچتا ہوں کہ جب مجھے موت یعنی وقت نزاع آئے گا اس وقت میں کن حالات اور کس حالت میں ہوں گا اور اس وقت جینے کی اتنی خواہش باقی ہوگی میں ضعیفت کی کون سی منزل پر ہوں گا یا پھر ضعیفت سے پہلے ہی بلوا لیا جاؤں گا سائنسی لحاظ سے مرنے کے بعد بھی دل و دماغ زندہ رہتے ہیں کچھ دیر تک یعنی کہ میں اپنی موت کو محسوس کروں گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مردہ کو نرم ہاتھ لگایا جائے یعنی کہ مردہ ہر چیز محسوس کرتا ہے، مرنے کے بعد کیا موت صرف میری خواہشات اور تکبر کو آئے گی یا پھر میرے وجود کو بہر حال مرنے کے بعد میت کے چہرے پر اذیت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔
حسین جاوید.....تحسین آباد

دکھوں سے نجات

انسانی عمارت کو گھن کی طرح کھا جانے والے یہ دکھ، ہنستے چہروں کو رلا دینے والے یہ دکھ، دن کے اجیاروں میں رات کی سیاہی جیسے یہ دکھ، زندگی کو قلیل کر دینے والے یہ دکھ، جاگتی آنکھوں میں قبر اوڑھ کر سو جانے والے یہ دکھ، جو نصیب میں لکھ دیے جاتے ہیں اور بہر صورت ان کو سہنا پڑتا ہے ایک راستہ ہے دعا کا کہ ہاتھ آسمان کی طرف

انھیں اور آنکھیں اشکبار ہو جائیں کہ اے ہمارے رب کریم، ہم تیرے بے بس بندے تیری ہی ثنا کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں ہمیں ان تکلیفوں پر صبر کرنے کی قوت عطا فرما ہمیں معاف فرما ہم بہت گناہگار ہیں اللہ پاک تو اپنے بندوں سے بہت محبت کرتا ہے تو ہر لمحہ ہمارے ساتھ ہے تو ہی ہمیں دکھوں سے نجات دلا۔

پرنس افضل شاہین...... بہاولنگر

پھل دار درخت

بیرم خان مغل بادشاہ جلال الدین محمد اکبر کا سپہ سالار اور استاد تھا۔ یہ شخص جس قدر عالی مرتبہ شجاع اور بہادر تھا اسی قدر رحم دل فیاض و سخی بھی تھا۔ ایک دن بیرم خان گھوڑے پر سوار بڑی شان سے کہیں جا رہا تھا کہ ایک شخص نے اسے تاک کر پتھر دے مارا۔ بیرم خان نے گھوڑے کو روک لیا اور ملازم کو حکم دیا کہ اس شخص کو اشرفیوں کی ایک تھیلی دے دی جائے۔ ملازم نے اشرفیوں سے بھری ایک تھیلی اس شخص کو دے دی۔ وہ شخص چلا گیا تو ملازم نے حیران ہو کر عرض کی۔ ''اے مالک اس شخص نے آپ کے ساتھ گستاخی کی، اسے سزا دینے کے بجائے آپ نے انعام سے نوازا اس میں کیا حکمت ہے؟''

بیرم خان نے مسکرا کر جواب دیا۔

''پھل دار درخت کو لوگ پتھر مارتے ہیں تو درخت انہیں پھل دیتا ہے نہ کہ سزا۔''

آصف بٹ...... کراچی

دعا

میں نے دعا مانگی
زمین کی سلامتی کی
اس پر رزق کی فراوانی کی
درختوں کی پناہ گاہیں آباد ہونے کی
ہجرت کر کے جانے والے پرندوں کی واپسی کی
لیکن ان سب دعاؤں سے پہلے
میں نے دعا مانگی
زمین کی رہائی کی

طیب خان...... بہاولنگر

ایک اہم نصیحت

کچھ چیزیں وزن میں اتنی ہلکی ہوتی ہیں کہ وہ پانی کے ساتھ بہہ جاتی ہیں مثلاً کاغذ، لکڑی اور گھاس پھوس وغیرہ لیکن کچھ چٹانیں ہوتی ہیں جو پانی کے ساتھ بہتی نہیں ہیں بلکہ وہ پانی کا رخ موڑ دیتی ہیں۔ ہم مومن ہیں اس لیے ہم گھاس پھوس اور تنکے نہ بنیں بلکہ ہم چٹان بن جائیں اور بہتے ہوئے پانی کا رخ موڑ دیں۔

نور سحر...... بنو کراچی

جن کا یہ کلیہ تھا

ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا ''یہ بتاؤ کہ اپنے ملک کا شریف آدمی کون ہے؟''

دوست نے کہا: ''یہ بتا کر میں اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بننا چاہتا۔''

''اچھا...... تو سب سے بے ایمان شخص کون سا ہے؟''

''یہ بتا کر میں تم سے دشمنی نہیں مول لینا چاہتا۔'' دوست نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

عنبر رانی...... فیصل آباد

واصف علی واصف

☆ جاگنے والے زندہ ہوں تو سونے والوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

☆ جاگنے والے نہ رہیں تو سونے والے بھی نہ رہیں گے، گڈریا سو جائے تو بھیڑیے ریوڑ کھا جاتے ہیں۔

☆ لوگ فوری نتیجوں پر غور کرتے ہیں اور اس طرح انتہائی نتائج سے بے خبر رہتے ہیں۔

☆ ہم شاید جانتے ہیں کہ ہمارے فیصلوں کے اوپر ایک اور فیصلہ نافذ ہو جایا کرتا ہے، یہ وقت کا فیصلہ ہے۔

☆ تذبذب اس مقام کو کہتے ہیں جہاں آگے جانے کی ہمت نہ ہو اور واپس جانا ممکن نہ ہو۔

☆ جب زمانہ امن کا ہو اور حالات جنگ جیسے ہو تو سمجھو عذاب ہے۔

☆ منافق وہ ہوتا ہے جو اسلام سے محبت کرے اور مسلمانوں سے نفرت۔

محمد کمال...... فیصل آباد

سچے موتی

☆ محبت بانٹنے سے بڑھتی ہے۔
☆ درد بانٹنے سے کم ہوتے ہیں۔
☆ مسکراہٹ درد چھپانے کا اوزار ہے۔

☆ جو سوچو گے وہی پالو گے اس لیے اپنی سوچ مثبت اور تعمیری رکھیں۔
☆ شک رشتوں کو کھوکھلا اور جذبات کو پامال کر دیتا ہے۔
☆ بامقصد زندگی انسانیت کا پتا دیتی ہے۔
☆ دنیا سے مانگ کر شرمندگی اٹھانے کے بجائے رب کائنات سے مانگ کر سرخرو ہونا بہتر ہے۔
☆ نیکی صرف مغرب کی جانب منہ پھیر لینا نہیں کسی کی آنکھ سے اشک چرا لینا' چہروں پر مسکراہٹیں بکھیرنا بھی نیکی اور صدقہ ہے۔

سیدہ سحر......راولپنڈی

میراثی

دو میراثی ایک بارات کے ساتھ گئے وہاں جا کر بیٹھ گئے تو ان کو بار بار پانی پیش کیا گیا۔
ایک میراثی نے تنگ آ کر کہا۔
''بھئی تھوڑے سے چاول دے دو پانی حلق میں پھنس گیا ہے۔''

سحرش ناز......خانیوال

گوہر نایاب

▪ اپنے ہمسایوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر عمل کرنے کے مترادف ہے۔
▪ اگر تم ایک عظیم انسان بننا چاہتے ہو تو قرآن اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پر عمل کرو۔
▪ زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنا چاہتے ہو تو اساتذہ کی قدر کرو۔
▪ اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جو اپنے بندے کے ہر گناہ پر پردہ ڈالتا رہتا ہے جب کہ ہم انسان ایک دوسرے کے گناہوں کو دنیا کی تاریکی ہی میں ظاہر کر دیتے ہیں۔

سدرہ زبیر......ملیر' کراچی

خلیل جبران خلیل

☆ اگر تم نے ہر حال میں خوش رہنے کا فن سیکھ لیا ہے تو یقیناً تم نے دنیا کا سب سے بڑا فن سیکھ لیا۔
☆ جب کوئی شخص قتل کرتا ہے تو قاتل کہلاتا ہے لیکن اگر کوئی جج کسی شخص پر موت کا پروانہ جاری کرتا ہے تو منصف کہلاتا ہے۔
☆ انسان کی حقیقت ان چیزوں میں نہیں ہوتی' جو وہ ظاہر کرتا ہے بلکہ ان چیزوں میں مخفی ہوتی ہے جنہیں وہ ظاہر نہیں کرتا۔
☆ مجھے چاہیے کہ میں زمانے کا قیاس اپنے اس قول سے نہ کروں کہ ''کل تھا اور کل ہوگا۔''
☆ اگر تم کسی سے محبت کرتے ہو تو اسے آزاد چھوڑ دو' اگر وہ واپس نہ آیا تو سمجھ لو کہ وہ کبھی تمہارا تھا ہی نہیں اور اگر وہ واپس آ گیا تو اس کی قدر کرو۔
☆ اس خوشی اور مسرت سے دور رہو جو کل غم کا کانٹا اور زندگی کا روگ بن جائے۔
☆ اس دنیا میں اتنی بلند و بالا دیواروں والے محلات میں نہ رہو جس سے تمہاری آواز ہی گھٹ جائے۔
☆ نصیحت وہ کچی بات ہے جسے ہم کبھی غور سے نہیں سنتے' خوشامد اور چاپلوسی ایسا بدترین دھوکا اور فریب ہے کہ ہم اسے بڑے غور اور توجہ سے سنتے ہیں۔
☆ عقل مند سوچ کر بولتا ہے اور بیوقوف بول کر سوچتا ہے۔
☆ باطل ہیں وہ تمام اعتقادات' نظریات' خیالات اور تعلیمات جو انسان کی زندگی میں بدقسمتی لائیں۔
☆ وہ سب جذبے' خیال اور نظریات جھوٹے ہیں جو انسان کو مایوسیوں کی طرف لے جائیں۔
☆ انسان کا یہ فطری اور پیدائشی حق ہے کہ وہ اس زمین پر کامیاب اور کامران زندگی بسر کرے۔

عبیدایوب......ناظم آباد' کراچی

خوش بوئے سخن

نوشین اقبال نوشی

غزل

دیکھتے کیا ہو مرے دیدۂ حیرانی میں
بہہ گئے درد بھرے اشک کہیں پانی میں
کبھی ایسا ہو کہ تقلید کرے ہر کوئی
کاش کچھ آئے نظر طرزِ مسلمانی میں
تمہیں معلوم نہیں فقر کے سب بھید میاں
لطف درویشی میں جو ہے نہیں سلطانی میں
ڈر گیا دیکھ کے شیشے میں میں اب کے خود کو
یہ کبھی آسیب نہ ہو قالب انسانی میں
حوصلے بنتے گئے زادِ سفر رستے میں
گھر سے نکلا تھا میں تو بے سر و سامانی میں
آؤ آباد کریں شہرِ محبت مل کر
کچھ نہیں رکھا میاں دشت کی ویرانی میں
کوئی چارہ ہی نہیں عشق کا جب عاکف تو
ڈھونڈتے کیا ہو بھلا حکمتِ لقمانی میں

شاعر: عاکف غنی...... فرانس

نظم

شام کے ایک اداس لمحے
شام کے ایک اداس لمحے
جب ہواؤں کے سنگ
تیری یاد کا اک جھونکا
مجھ سے ٹکرایا تھا
تب میری
آنکھوں میں آتی نمی نے
میرے گالوں پہ آ کہ کہا تھا
جب ساتھ تو اس کے تھی
تو پھر کیوں
اس نے بےوفا کہا تھا؟
ایک ہی منزل پے
جاتے راستوں کو
جدا آخر کیوں کیا تھا؟
تیری محبت کو رسوا
کیوں سرِعام کیا تھا؟
میری آنکھوں میں آتی نمی نے
مجھ سے یہ سوال کیا تھا
جب تیری یادوں نے
شام کے ایک اداس لمحے
آ کے مجھے برباد کیا تھا

کنول خان...... ہری پور ہزارہ

غزل

سفر کی دھوپ میں آبلہ بناتے چلے
رہِ وفا میں نقشِ پا بناتے چلے
تمہارے ہجر نے شوق کو جلا بخشی
سوادِ عشق میں قافلہ بناتے چلے
نہیں ہے پہلا سرا یہ تو دوسری جانب
خیالِ یار کا ہر زاویہ بناتے چلے
طوالت آئے گی رستے میں یہ کسے معلوم
بے چہرگی کو آئینہ بناتے چلیں
بہت سا شور سب کو کہاں سنائی دے
اپنے اسلوب سے اپنی صدا بناتے چلے

ظریف احسن...... گلستان جوہر کراچی

آنسو

میرے پہلو میں جو بہہ نکلے ہیں تمہارے آنسو
بن گئے شام محبت کے ستارے آنسو
دیکھ سکتا ہے بھلا کون یہ پیارے آنسو
میری آنکھوں میں نہ آجائیں تمہارے آنسو
اپنا چہرہ گریباں میں چھپائی کیوں ہو
دل کی دھڑکن کہیں سن نہ لے تمہارے آنسو
شمع کا عکس جھلکتا ہے جو ہر آنسو میں
بن گئے بھیگی ہوئی رات کے تارے آنسو
مینہ کی بوندوں کی طرح ہوگئے سستے کیوں
آج
موتیوں سے کہیں مہنگے تھے تمہارے آنسو
صاف اقرار محبت ہو زباں سے کیوں کر
آنکھ میں آگئے یوں شرم کے مارے آنسو

ہجر ابھی دور ہے میں پاس ہوں اے جان وفا
کیوں ہوئے جاتے ہیں بے چین تمہارے آنسو
کلام :اختر شیرانی
انتخاب :پرنس افضل شاہین...... بہاولنگر

سیلاب

فصلیں ہیں ڈوبی ہوئی ہر طرف خسارہ دکھتا ہے
میں تو کہوں یہ قدرت کا بے درد نقارہ دکھتا ہے
سیلاب جسے تم کہتے ہو عذاب اسے میں کہتا ہوں
اس قوم کے بد تر عملوں کا یہ مجھے کفارہ دکھتا ہے
آج فضائی جائزہ حاکم نے لیا جب اوپر سے
بولا کدھر تباہی ہے یہ تو خوب نظارہ دکھتا ہے
اس سے بڑھ کر اور بھلا مکافات عمل کیا ہوگا
وہ سردار کئی دیہاتوں کا اب بے سہارا دکھتا ہے
گر نا خدا نے کشتی کو بیچ سمندر چھوڑ دیا
اس کا بھی کوئی جرم نہیں بڑی دور کنارہ دکھتا ہے
پانی میں ڈوبتے بوڑھے کی فریاد سنے تو کون سنے
دربار شاہی میں شامل ہر فرد ناکارہ دکھتا ہے
فاروق بھلا کب تک تم اس بات کا نوحہ لکھو گے
یہ سیلاب جسے تم روتے ہو ہر سال دوبارہ دکھتا ہے
عمر فاروق ارشد......فورٹ عباس

غزل

ہمیں نا معتبر بھی معتبر محسوس ہوتا ہے
کہ یوں ہر شخص منظور نظر محسوس ہوتا ہے
ہمیں جو مل گیا اس کو غنیمت جان لیتے ہیں
جو مل جائے وہی زاد سفر محسوس ہوتا ہے
خداوند زباں بندی کا کیسا دور آیا ہے
جو سب کچھ جانتا ہے بے خبر محسوس ہوتا ہے
عجب یہ ہے کہ جو میرے نہاں خانہ دل میں ہے
وہ چہرہ دو گھڑی میں بام پر محسوس ہوتا ہے
ہمیں خوش فہمیوں نے اس قدر الو بنایا ہے
جہالت کا اثر علم و ہنر محسوس ہوتا ہے
ہے منہ کھولے ہوئے بیگانگی عفریت کی صورت
ہمیں تو اپنے لوگوں سے بھی ڈر محسوس ہوتا ہے
یہاں بھی خامشی ہے اور وہاں بھی ہو کا عالم ہے
یہ ویرانی ہمیں اپنا ہی گھر محسوس ہوتا ہے
ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم

محبت

محبت چیز ایسی ہے
محبت ایسا رستہ ہے
یہ دل سے دل کا رشتہ ہے
ساری کائنات اس سے وابستہ ہے
یہ تجھ میں بھی پیوستہ ہے
اور مجھ سے بھی اس کا رشتہ ہے
محبت چیز ایسی ہے
یہ جب پروان چڑھتی ہے
پھر نئے نئے رنگ دکھاتی ہے
محبت سے ملنے کی خاطر
یہ بے چین بہت ہی کرتی ہے
اور بہت تڑپاتی ہے
منزل کو پانے کی خاطر
یہ سفر بھی کراتی ہے
محبت چیز ایسی ہے
یہ دکھوں کو لے کر آتی ہے
اور خوشیاں بھی دکھاتی ہے
مجبوریوں کا نام لے کر
جدائیاں بھی کراتی ہے
جو کوئی اپنا چھوڑ جائے تو
پھر بہت تڑپاتی ہے

کسی پل بھی چین نہیں ملتا
تو دن رات رلاتی ہے
محبت چیز ہے ایسی
یہ تب سمجھ میں آتی ہے
اور حوصلہ بڑھاتی ہے
سب کے لیے تجھ کو جینا ہے
غم خوشی کا جام بھی پینا ہے
کبھی زندگی سے نہیں گھبراتا ہے
ہمیشہ پیار کا دامن تھام کر رومی
محبت سے چلتے جانا ہے
عبدالجبار رومی انصاری...... چوہنگ سٹی

غزل
شکر ہے ہم ضرب گل بھی سہہ گئے
ریزہ ریزہ ہوتے ہوتے رہ گئے
کیسی دیواریں کہاں کے بام و در
خار و خس تھے بارشوں میں بہہ گئے
جن سے رفتار سفر منسوب تھی
وہ غبار راہ بن رہ گئے
خندہ پیشانی سے مل اے زندگی
تیرے جتنے وار تھے ہم سہہ گئے
چاند کیسا اور کہاں کی چاندنی
بجھ گیا خورشید سائے رہ گئے
حسین جاوید...... عثمن آباد

غزل
مل جاتی ہے محبت وفا آسانی سے نہیں ملتی
کلی تو کھل جاتی ہے نگاہ آسانی سے نہیں ملتی
باقی رہے ذرا انسیت دل کے دھڑکنے کو
دم آتا جاتا ہے رفتہ آسانی سے نہیں ملتی
بدلا ہے درون میں پھر تری چاہت کا مطلب
مروت نثار ہو رہتی ہے انا آسانی سے نہیں ملتی
سزا خودی سے لوں تو دوجے سے رہے یاری
چلو بٹ جاتا ہے اداو آسانی سے نہیں ملتی
رزق انسان کا ہے آدمی ہونے کا غرور
ترا حسن دو چند رہتا ہے ثنا آسانی سے نہیں ملتی
کبھی یاد رہ جاتی ہے یوں دہرانے سے نفرت
معافی ممکن رہتی ہے رہا آسانی سے نہیں ملتی
شفقت ہے تو نگری ہے تیرے پاس توفیق بھی رہے
دولت نمو خوب لیتی ہے فنا آسانی سے نہیں ملتی
سید عبداللہ توفیق......حیدر آباد

غزل
میں کہاں ہوں مرا ٹھکانہ کہاں
لے کے آیا ہے آب و دانہ کہاں
ابھی سامان جا رہا ہے مرا
میں ہوا ہوں ابھی روانہ کہاں
صبح کا خواب دیکھنے سے مجھے
روک سکتا ہے آب و دانہ کہاں
میرے حالات تو نہیں بدلے
خرچ ہوتا رہا خزانہ کہاں
گھیر لیتے ہیں مسئلے مجھ کو
موڈ رہتا ہے شاعرانہ کہاں
لے کے آئی ہوائے دربدری
اس نگر میں ہے آشیانہ کہاں
یعقوب اختر انصاری......سعودی عرب

غزل
عشق ان سے لڑا رہا ہوں میں
اپنی گردن کٹا رہا ہوں میں
داستان الم سُنا کر آج
پتھروں کو رُلا رہا ہوں میں
چھپ کے رو لیتا ہوں میں شام و سحر
دردِ دل یوں چھپا رہا ہوں میں
وہ مرے نام سے بھی بھاگیں ہیں
جن کو دل میں بسا رہا ہوں میں
خون سے ان کے ہاتھ رنگیں ہیں
جن سے نظریں ملا رہا ہوں میں
ان کی یاد آ رہی ہے رہ رہ کر
جن کو دل سے بھلا رہا ہوں میں
میری خوش قسمتی تو دیکھو ذرا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

ان کو بھی یاد آ رہا ہوں میں
ان کی یادوں پہ اے وسیم حزیں
جان اپنی لٹا رہا ہوں میں
وسیم علی...... سعودی عرب

غزل

کچھ میں بھی ضد کی پکی تھی
کچھ وہ بھی ضبط گنوا بیٹھا
کچھ میں خود سے بھی انجان رہی
کچھ اس نے دل اپنا قربان کیا
کچھ میں بھی راہوں میں بھٹکتی رہی
کچھ وہ بھی منزل پا نہ سکا
کچھ میں اس کی دیوانی تھی
کچھ اس کی محبت میں فراوانی تھی
کچھ یادوں پہ اس کا پہرا تھی
کچھ خوابوں میں بھی اس کا چہرہ تھا
کچھ میں اس کی شیدائی تھی
کچھ اس کے جذبوں میں سچائی تھی
کچھ میں نے بھی اس سے وفا نہ کی
کچھ وہ بھی فریب کھو بیٹھا
کچھ میں نے اسے برباد کیا
کچھ اس نے مجھے آباد کیا
کچھ میں نے بھی ہار تسلیم نہ کی
کچھ وہ جیت کر بھی ہار بیٹھا
کچھ پچھتاوا بھی بنا مقدر میرا
کچھ وہ بھی مداوا کر بیٹھا
مدیحہ مدو...... بورے والا

دسمبر تم نہ جانا......
ابھی لمحے نہیں بکھرے
ابھی موسم نہیں بچھڑے
میرے کمرے کی ٹھنڈک میں
ابھی کچھ دھوپ باقی ہے
میری ڈائری کے کچھ صفحے
ابھی کچھ کہہ نہ پائے
میرے آنگن کے سب پودے
ابھی گنگناتے ہیں
میرے بے جان ہونٹوں پر
ابھی مسکان باقی ہے......
کسی کے لوٹ آنے کا
ابھی امکان باقی ہے
دسمبر بات اک سن لو
سنو......
تم مان جاؤ ناں
کہ جب تک وہ نہیں آتا
دسمبر تم نہ جانا......
دسمبر تم نہ جانا......
جاذبہ عباسی...... دیوال شریف

کوئی یاد بہت آئے

جب ہجر کے لمحوں میں
کوئی یاد بہت آئے
اور درد بھی ایسے میں
حدوں سے گزر جائے
پھر دل کے دریچے سے
ایک چاند کو تم تکنا
بے تاب دھڑکنوں کو
قابو میں مگر رکھنا
گزرے ہوئے لمحوں کو
چپکے سے بلا لینا
مظہر میرے کیا ہو
تم تو میرے جہاں ہو
اب ایک پل بھی تم بن
مجھ سے رہا نہ جائے
جب ہجر کے لمحوں میں کوئی یاد بہت آئے
اور درد بھی ایسے میں حدوں سے گزر جائے
صائمہ ناز...... نارو جب

ڈیول

زرین قمر

سمیر احمد فاروقی کوئی عام نوجوان نہیں تھا وہ ماں کے پیٹ سے ذہین پڑھنے کی خداداد صلاحیت لے کر پیدا ہوا تھا۔ خطرے کا احساس اسے وقت سے پہلے ہوجاتا تھا لیکن اس کی سترہویں سالگرہ پر اسے احساس ہوا کہ وہ کتنا مختلف ہے پھر ایک حادثے نے اسے احساس دلایا کہ اسے اپنی خداداد صلاحیت کو بڑھانے کی ضرورت ہے ورنہ اس کا جینا ناممکن ہوگا۔ چنانچہ اس نے اپنی صلاحیتوں کو بڑھانا شروع کردیا اور سپر ہیرو بن گیا لیکن کوئی نادیدہ قوت تھی جو اسے مارنا چاہتی تھی۔

اس کہانی کے نام، کردار، جگہیں اور واقعات رائٹر کے ذہن کا تخیل ہیں اور کسی سے ان کی مماثلت صرف اتفاقیہ ہوگی۔

مشہور زمانہ جیکی ایک ویران علاقے میں کھڑا تھا۔ لمبی لمبی گھاس تھی اور قریب ہی جھیل میں کنول کے پھول کھلے ہوئے تھے وہ ماحول پر نظریں جمائے کسی سوچ میں تھا۔ شام کو جلدی اندھیرا پھیل چکا تھا۔ دور دور تک کوئی انسان نظر نہیں آرہا تھا۔ جیکی کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کسی کا انتظار کر رہا ہے حالانکہ اسے کبھی بھی کسی کا انتظار کرنا پسند نہیں تھا وہ توانا جسم اور لمبے قد کا مالک تھا اس کی عمر پچیس سال تھی لیکن دیکھنے میں وہ دس سال چھوٹا لگتا تھا وہ خاصا خوش پوش واقع ہوا تھا۔ اس وقت بھی اس نے کالی جینز کے ساتھ بلو شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس نے کسی کی آہٹ محسوس کی تو وہ چوکنا ہو گیا۔ چند ہی لمحوں بعد اس کا اسسٹنٹ ساجد اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''جیکی!۔'' چند لمحوں بعد ساجد اپنی ہمت جمع کر کے اس سے مخاطب ہوا۔

''مجھے اپنی ناکامی کا قصہ مت سنانا۔'' جیکی نے اس کا انداز بھانپتے ہوئے کہا۔

''ہمیں جیسا تم نے حکم دیا تھا ہم ویسا ہی کر رہے تھے لیکن......'' ساجد نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن کیا؟''

''لیکن ایک لڑکی درمیان میں کود پڑی۔'' ساجد نے جلدی سے اپنی بات مکمل کی۔

''کیسی لڑکی؟''

''میں نہیں جانتا......وہ سمیر کے ساتھ تھی...... میرا خیال ہے وہ اس کی حفاظت کر رہا تھا وہ دونوں ایک دوسرے سے خاصے بے تکلف تھے۔''

''ناممکن ہے......سمیر احمد کسی لڑکی سے ملے؟ ایسا ہو ہی نہیں سکتا......یہ اس کی نیچر میں شامل نہیں......ضرور کوئی اور بات ہے۔'' جیکی نے سوچتے ہوئے کہا۔

''آپ جو بھی کہیں جناب......وہ کوئی بھی تھی اس نے میرے دو آدمیوں کو پچھاڑ دیا چند ہی لمحوں میں...... ہماری ناکامی کی وجہ بھی وہی لڑکی ہے......ورنہ ہم نے سمیر پر قابو پالیا تھا۔'' ساجد نے کہا تو جیکی اس کی بات پر اچانک چونک گیا۔

''عالیہ کامران......اوہ یہ وہی ہو سکتی ہے۔'' جیکی نے تیزی سے کہا۔

''وہ خلیل کامران کی بیٹی ہے۔''

''خلیل کامران کی بیٹی؟'' ساجد نے حیرت سے دہرایا۔

''ہاں! وہ ریلوے اسٹیشن پر بھی تھی......یہ وہی ہو سکتی ہے بھلا سمیر اور کس کی حفاظت کرے گا۔ اپنے جگری دوست کی بیٹی کے علاوہ۔'' جیکی نے کہا۔

''مجھے یاد ہے اس لڑکی نے چاقو پھینک کر مجھے بھی نشانہ بنایا تھا اور زخمی کر دیا تھا لیکن میں تو سوچ رہا تھا کہ وہ اس حادثے کے بعد یہاں سے چلی گئی ہوگی۔''

''لیکن وہ تو یہیں ہے۔'' ساجد نے کہا۔

''اوہ! اس سمیر کا بیڑا غرق ہو یہ ہمیشہ بازی لے جاتا ہے۔'' جیکی نے اپنا ماتھا سہلاتے ہوئے کہا۔

''جیکی! شاید تمہیں ایک بات جان کر حیرت ہو۔'' ساجد نے کہا۔

''کیا؟''

''جب وہ لڑ رہی تھی اس کا انداز بالکل اپنے باپ خلیل کامران سے مل رہا تھا اسے اس نے خود ہی ٹریننگ دی ہوگی۔''

جیکی نے کہا۔

''اور یا پھر کچھ کچھ وسیم چارلی سے جو باکسنگ کا بہترین فائٹر ہے اور ایک گروہ کا سرغنہ بھی ہے۔ تم اسے جانتے ہو؟''

''وسیم چارلی؟......ہاں......دیکھو ساجد......تم جانتے ہو کہ عام حالات میں، میں فوراً ہی ایکشن لیتا ہوں۔'' جیکی نے کہا۔

''اگر تم کہو تو میں اس لڑکی کو ٹھکانے لگا دوں؟''

''نہیں ابھی نہیں۔'' جیکی نے تنبیہ انداز میں کہا۔

''لیکن تم نے کہا تھا کہ تم مزید انتظار نہیں کرنا چاہتے ہو؟'' ساجد نے کہا۔

''میں نے کہا عام طور پر......لیکن یہ حالات نارمل نہیں ہیں ابھی سمیر بہت چوکنا ہوگا اور ہر طرح سے اسے ہم سے محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہوگا۔ ہم انتظار کریں گے......اور جب اسے یقین ہو جائے گا کہ وہ لڑکی محفوظ ہے تب ہم وار کریں گے۔'' جیکی نے کہا۔

''ہم انتظار کریں گے۔'' اس نے دہرایا اور ساجد اس

کی بات سمجھ کر واپسی کے لیے مڑ گیا معاملہ کچھ وقت کے لیے رک گیا تھا۔

❋ ...... ❋ ...... ❋ ...... ❋

عالیہ کو اس کے گھر پر ڈراپ کرنے کے بعد سمیر ڈریم سینٹر چلا گیا تھا جہاں اس نے اپنے زخم کی دوبارہ بینڈیج کروائی تھی اور اپنے آفس میں جا کر بیٹھ گیا تھا وہ کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا اس نے اپنی جیب سے اپنی گن نکالی تھی اور اس کا میگزین چیک کرنے لگا تھا اس وقت وسیم چارلی اس کے آفس میں داخل ہوا تھا۔

''تم ٹھیک تو ہو؟'' وسیم چارلی نے اندر آتے ہوئے کہا۔

''ہاں! میں ٹھیک ہوں۔'' سمیر نے گن اپنے سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ وہ وسیم چارلی کو بغور دیکھ رہا تھا اس کا جسم توانا اور مضبوط تھا بالکل ایسا ہی جیسا کہ ایک بہترین باکسر کا ہونا چاہیے جو کہ وہ تھا اس علاقے میں اس کا باکسنگ جم بھی تھا اور اس نے انتیس سال کی عمر میں ہی ڈریم سینٹر کے لیے کام کرنا شروع کردیا تھا وہ یہاں کے لوگوں کو ٹریننگ دیتا تھا سمیر بھی اس کی صلاحیتوں کا معترف تھا۔

''لڑکی کا کیا چکر ہے۔'' اس نے بے تکلفی سے سمیر سے کہا اور سمیر حیران رہ گیا کیونکہ جب وہ وسیم سے ملا تھا کبھی اس کی زندگی میں کوئی لڑکی نہیں آئی تھی۔ سمیر نے ناپسندیدگی سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہر کسی کو اپنی طرح مت سمجھا کرو وسیم۔'' اس نے ناراضگی سے طنز کیا۔

''واقعی......؟ لیکن مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے...... میں نے علاقے میں کچھ اڑتی اڑتی سنی ہے۔'' وسیم نے کہا۔

''وسیم میں پہلے ہی پریشان ہوں تم کیا باتیں لے کر بیٹھ گئے ہو۔'' سمیر نے اکتاہٹ سے کہا۔ جس پر وسیم کو افسوس ہوا۔ وہ تو سمیر سے بے تکلف ہونے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا تھا لیکن سمیر پچھلے چند سالوں میں اس کی طرف سے ہونے والی کچھ غلطیوں کی وجہ سے اس سے فاصلہ ہی رکھتا تھا۔

''یہ بات ایک خاص لڑکی کے بارے میں ہے۔'' وسیم نے کہا اور سمیر نے سوچا کہ اگر اس کا اشارہ عالیہ کی طرف ہے تو اس بارے میں اسے کیسے پتہ چلا۔

''میں نے خود تمہیں اس کے ساتھ دیکھا ہے۔'' وسیم نے کہا۔

''بہت خوب۔'' سمیر نے کہا۔

''لیکن میرا خیال ہے وہ لڑکی تمہارے لیے نہیں میرے لیے اچھی رہے گی۔''

''تمہارے لیے تو ہر لڑکی اچھی رہتی ہے۔'' سمیر نے طنز کیا۔

''تو پھر اگر میں اس کے ساتھ کچھ وقت گزاروں تو تمہیں اعتراض نہیں ہوگا؟'' وسیم نے کہا۔ وہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ سمیر کو اس کی بات بری لگتی ہے یا نہیں۔

''میں جانتا ہوں تم کیا چاہ رہے ہو وسیم۔'' سمیر نے کہا اور گن کو دراز میں رکھ کر اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وسیم کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے وسیم کا کاندھا تھپتھپایا تھا۔

''اچھی کوشش تھی۔'' سمیر نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

جیکی گروپ کے ساتھ عالیہ اور سمیر کی مڈبھیڑ ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا اور اس عرصہ میں عالیہ کئی بار سمیر سے بحث کر چکی تھی کہ وہ اس کام میں اس کا ساتھ دینا چاہتی ہے لیکن سمیر نے ہر بار اس کی سخت مخالفت کی تھی اس کے گھر پر بھی سخت پہرہ تھا لیکن اس کے باوجود اس معاملے کو یونہی نہیں چھوڑ سکتی تھی۔

جیکی گروپ نے اس کے والد کو مارا تھا اور وہ اسے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھے اس دن کے واقعات کو وہ اب تک بھول نہیں سکی تھی اور اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اگر سمیر اسے ڈریم سینٹر کے پلیٹ فارم سے اس کام کے کرنے کا موقع نہیں دے گا تو وہ تن تنہا یہ کام کرے گی اور اپنے والد کے قتل کا انتقام لے گی لیکن وہ جانتی تھی اس کے لیے اسے مزید ٹریننگ کی ضرورت ہے اس نے مقامی اخبارات سے ڈھونڈ کر ایسی جگہ کا ایڈریس حاصل کرلیا تھا جہاں وہ یہ مقصد حاصل کرسکتی تھی پھر اس وقت اس ایڈریس پر پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔

تھوڑی سی محنت کے بعد اسے مطلوبہ جگہ مل گئی تھی وہ ایک بوسیدہ سی عمارت تھی جس میں w.charly

center کا بورڈ لگا تھا۔ یہ جگہ اس علاقے میں خاصی مشہور تھی لیکن اس کی شہرت اچھی نہیں تھی بہت کم لوگ اس عمارت میں جانے کی جرات کرتے تھے اسے بھی تلاش کے دوران کئی پتہ سمجھانے والوں نے وہاں سے دور رہنے کی ہدایت کی تھی اور اس جگہ کے مالک کے بارے میں کچھ بھی بتانے سے انکار کردیا تھا۔

عالیہ نے بیرونی دروازے پر دستک دی تو کسی نے دوسری جانب سے دروازہ کھولا اور وہ عمارت میں داخل ہوگئی۔ لیکن وہ عمارت کمروں پر مشتمل نہیں تھی بلکہ دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی عالیہ کی نظروں کے سامنے ایک بہت بڑا ہال تھا جہاں جگہ جگہ لوگ باکسنگ کی پریکٹس کررہے تھے۔ بڑے بڑے پنچنگ بیگز تھے جن پر ککے برسارہے تھے اور ان کے ٹرینر چیخ چیخ کر انہیں ہدایت دے رہے تھے۔

جیسے ہی عالیہ نے دو قدم آگے بڑھائے تو کسی نے پیچھے سے اس کی جیکٹ پکڑی تھی لیکن عالیہ تیزی سے مڑی تھی اور جیکٹ چھڑوالی تھی۔

''اے بیوٹی یہ جگہ تم جیسی نازک لڑکیوں کے لیے نہیں ہے۔'' ایک موٹے سے شخص نے کہا لیکن وہ جواب دینے کے بجائے پھر پلٹ کر آگے بڑھی جس پر اس شخص نے اس کے پیچھے سے ایک زوردار ہاتھ مارا اور یہ اس کی بڑی غلطی تھی۔ عالیہ ایک دم اچھلی تھی اور اس نے گھومتے ہوئے اس شخص کے جبڑے پر ایک زوردار پنچ مارا تھا پھر دوسرا گھونسہ اس کے منہ پر پڑا تھا وہ شخص لڑکھڑا رہا تھا اور عالیہ نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اچھل کر اپنے تین انچ اونچی ایڑی کے بائیکر بوٹ سے اس کی ٹانگ پر ایک ضرب لگائی تھی پھر وہ لگاتار ایک دو تین ضربیں لگاتی چلی گئی تھی اور وہ شخص فرش پر ڈھیر ہوگیا تھا۔

''دوبارہ مجھے چھونے کی کوشش مت کرنا۔'' اس نے پھنکارنے والے انداز میں کہا ساتھ ہی وہ اپنے جوتے کی ایڑی سے اس کا ہاتھ کچلتی ہوئی آگے بڑھی تھی اس نے محسوس کیا کہ اس ہال میں مکمل سناٹا چھا گیا تھا اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو وہاں مشقیں کرنے والے تمام افراد ساکت کھڑے حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''میرے ساتھ آؤ۔'' کسی نے کہا تو عالیہ نے مڑ کر دیکھا اس کی پشت پر ایک خوبرو نوجوان کھڑا تھا۔ جس نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا وہ تھوڑا ہچکچائی۔

''وسیم چارلی...... مالک ہے یہاں کا' مجھے اس سے ملنا ہے۔'' عالیہ نے کہا وہ اس سے بے خبر تھی کہ ہال میں موجود ایک شیشے کی دیوار کے پیچھے سے وسیم چارلی اسے دیکھ رہا تھا اور پہچان بھی گیا تھا کیونکہ وہ اسے سمیر کے ساتھ دیکھ چکا تھا اور سوچ رہا تھا کہ وہ وہاں کیا کررہی تھی۔ لیکن اس شیشے کی دیوار کے پیچھے کون موجود ہے؟ کیا ہورہا ہے یہ عالیہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔

عالیہ جب وسیم چارلی کے سامنے پہنچی تو اس نے بغور اس کا جائزہ لیا تھا اس نے جینز کے ساتھ لمبے جوتے پہنے ہوئے تھے۔ وہ بلا کی خوب صورت اور اسمارٹ تھی پھر عالیہ سے نظریں ملتے ہی پہلے اپنا چہرہ دوسری طرف موڑ لیا تھا اور سیٹ پر بیٹھ گیا تھا اور عالیہ کو بھی سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا وہ بیٹھ گئی تھی۔

''اس نے پہل کی تھی مجھے پیچھے سے مارا تھا۔'' عالیہ نے کہا وسیم نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا وہ اس کی خوب صورتی اور بہادری سے خاصا متاثر ہوا تھا اس کی نیلاہٹ مائل آنکھوں سے جرات نمایاں تھی اور سنہرے بال شانوں پر لہرا رہے تھے وہ اسے پہچان گیا تھا یہ وہی لڑکی تھی جسے کئی بار وہ سمیر کے ساتھ دیکھ چکا تھا اب اسے اندازہ ہوا تھا کہ اگر سمیر اس کے اتنا قریب تھا تو اس میں سمیر کا کوئی قصور نہیں تھا وسیم نے اسے ہمیشہ دور سے ہی دیکھا تھا اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی خوب صورت ہوگی۔

''مجھے اس شخص کی پروا نہیں ہے وہ ہے ہی اسی قابل۔'' کچھ دیر بعد وسیم نے عالیہ کی بات کا جواب دیا تھا جس پر عالیہ دھیرے سے مسکرائی تھی اور وسیم کا دل سینے سے باہر آنے کے لیے بے چین ہوگیا تھا۔

''تمہارا نام؟''

''عالیہ۔''

''عالیہ......؟ صرف عالیہ؟'' وسیم نے پورا نام جاننا چاہا۔

''جی... صرف عالیہ۔'' اس نے جواب دیا اور وسیم مسکرانے لگا لیکن اس نے پورا نام جاننے کے لیے زور نہیں دیا تھا۔

''اچھا تو یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیوں آئی ہو؟'' وسیم نے پوچھا۔

''میں چاہتی ہوں کہ مجھے ٹریننگ دو۔'' عالیہ نے کہا اور وسیم کو اس کی جرات پر حیرت ہوئی۔ اس نے کوئی تمہید باندھنے کے بجائے اپنی بات براہ راست کہہ دی تھی۔

''لیکن میرا خیال ہے کہ تمہیں اس کی ضرورت نہیں۔''

''میں کچھ تھوڑا بہت جانتی ہوں لیکن مزید سیکھنا چاہتی ہوں۔'' عالیہ نے کہا اور وسیم سوچ رہا تھا کہ اسے یہ سب سیکھنے کی کیا ضرورت ہے وہ محض دل بہلانے کے لیے تو نہیں سیکھنا چاہتی ہوگی اس کا کوئی مقصد ضرور ہوگا۔

''کیوں؟'' اس نے پوچھ ہی لیا۔

''بس' میں کچھ کرنا چاہتی ہوں۔'' عالیہ نے کرسی پر بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا اسے اتنے سوالوں سے الجھن ہو رہی تھی جب کہ وسیم سوچ رہا تھا کہ وہ یقیناً کسی سے لڑنے کا ارادہ رکھتی تھی جب کہ اس کے پیشے کا یہ اصول تھا کہ وہ صرف دفاع کرنے کے لیے ٹریننگ دیتا تھا اور وہ ڈریم سینٹر سے تعلق رکھتا تھا جہاں جارحانہ انداز نہیں سکھایا جاتا تھا اسے ڈریم سینٹر کی طرف سے اجازت تھی کہ وہ اپنے باکسنگ جم میں لوگوں کو سیلف ڈیفنس کی ٹریننگ دے سکتا ہے اور جو ایگریمنٹ سائن کروایا گیا تھا اس میں مزید سخت شرائط تھیں۔

''عالیہ! یہ صرف ایک باکسنگ جم ہے۔'' وسیم چاری نے کہا وہ اس کی ہمت افزائی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ عالیہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''مسٹر وسیم! میں اس جگہ کی شہرت جانتی ہوں۔''

''اور پھر بھی تم یہاں آگئیں...... بہت خوب...... بہت بہادر ہو...... ہے نا؟'' وسیم نے طنزیہ کہا اور عالیہ نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا وہ سوچ رہی تھی کہ وہ اسے باتوں میں الجھانا چاہتا تھا اور یہ بات عالیہ کو پسند نہیں آرہی تھی۔

''کم از کم ایک آدمی مجھے خوف زدہ کرنے کے لیے کافی ہے۔'' عالیہ نے چبھتی ہوئی آواز میں کہا۔

''تم مجھے چاری کہہ سکتی ہو۔'' اس نے کہا وہ عالیہ سے نظریں ہٹانا چاہتا تھا لیکن اس کا حسن مکمل طور پر اسے مسحور کیے ہوئے تھا۔

''تم کیا چاہتی ہو میں تمہیں کیا سکھاؤں؟'' اس نے پوچھا۔

''قوت' تکنیک اور نظم یعنی خود کو اصولوں کا پابند رکھنا یہی کسی بڑے فائٹر کے اصول ہیں۔'' عالیہ نے کہا اور ان الفاظ میں وسیم چاری کو سمیر کی آواز سنائی دی وہ بھی کل اس کو یہی کچھ کہہ رہا تھا اور عالیہ سے دور رہنے کی ہدایت کر رہا تھا اسے تب ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ غیر معمولی لڑکی تھی اور اسے حکم مل چکا تھا کہ وہ اس سے دور رہے۔

''بولو! کیا تم مجھے ٹریننگ دو گے؟'' عالیہ نے پوچھا۔

''نہیں...... میں ایسا نہیں کرسکتا۔'' وسیم نے کہا اور عالیہ اس کے جواب پر حیران رہ گئی۔ یہ جواب اس کی توقع کے خلاف تھا وہ تو اندازہ لگا رہی تھی کہ وہ اسے ٹریننگ دینے میں دلچسپی لے رہا تھا۔

''اچھا...... تو پھر میرا خیال ہے کہ ہماری میٹنگ ختم ہوگئی۔'' عالیہ نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا اور دروازے کی طرف بڑھی اور وسیم پریشان ہوگیا وہ خود بھی حیران تھا کہ وہ پہلے کبھی کسی کے لیے یوں پریشان نہیں ہوا تھا وہ تیزی سے اٹھا اور دروازے کے قریب پہنچ گیا پھر اس نے دروازے پر ہاتھ رکھ کر عالیہ کو دروازہ کھولنے سے روک دیا تھا اس کے جسم کی گرمی کو وہ محسوس کرسکتی تھی وہ تیزی سے پیچھے ہٹی۔ وسیم اس کو بغور دیکھ رہا تھا وہ کچھ پریشان ہی ہوگئی تھی۔

''پیچھے ہٹو۔'' عالیہ نے کہا اور وہ پیچھے ہٹ گیا عالیہ بھی پیچھے ہٹی تھی۔

''تو' کیا تم چاہتے ہو کہ میں انتظار کروں؟'' عالیہ نے پوچھا۔

''ممکن ہے ہم کسی نتیجے پر پہنچ جائیں۔'' وسیم نے کہا جس پر عالیہ نے اپنی جینز کی جیب سے ایک کاغذ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ میرا فون نمبر ہے...... جب فیصلہ کرلو تو بتا دینا۔'' عالیہ نے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

وسیم وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا جب وہ ہال میں پہنچی تو وہ شخص وہاں موجود تھا جس سے عالیہ کی مڈبھیڑ ہال میں داخل ہوتے وقت ہوئی تھی۔ اس کے ارادے اچھے نہیں تھے اور شاید وہ بدلا لینا چاہتا تھا لیکن عالیہ نے اسے اتنا

وقت نہیں دیا تھا وہ تیزی سے گھومی تھی اور اس نے اس شخص کی گردن دبوچ لی تھی اور اسے زمین پر پٹخ دیا تھا اس کے ساتھ ہی وہ عمارت سے باہر نکل گئی تھی۔

❁......❁......❁......❁

ایک ہفتے بعد سمیر، وسیم چاری کے باکسنگ جم میں داخل ہوا تھا۔ کافی شام ہوچکی تھی اس کے خیال میں اس وقت تک جم بند ہوجانا چاہئے تھا لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ وسیم اس وقت بھی کسی کو ٹریننگ دے رہا تھا وہ ایک لڑکی تھی اس کی پشت پر اس کے سنہرے بال بکھرے ہوئے تھے۔

''میں نے مارا تو ہے۔'' وہ لڑکی بولی۔

''تم اسے مارنا کہتی ہو......'' وسیم نے کہا اور اس لڑکی کے پیٹ پر ایک مکا مارا اور وہ لڑکی گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اس نے اپنے ہاتھوں کی مدد سے خود کو فرش پر گرنے سے بچالیا تھا۔

''تم نے مکا پوری قوت سے نہیں مارا تھا تم خود بھی اچھی طرح جانتی ہو...... تم خود کو ایک فائٹر کہتی ہو......؟ چلو...... اٹھو...... مجھے مارو۔'' وسیم نے چلا کر کہا اور عالیہ نے تیزی سے گھوم کر اس کے چہرے پر مکا مارا تھا کہ وہ لڑکھڑا گیا تھا لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

''ہاں...... یہ ٹھیک ہے...... یہ پہلے سے بہتر ہے۔'' وسیم نے کہا۔

''لیکن تم مضبوط نہیں ہو...... تمہارا سیکھنا مشکل ہے۔'' وسیم اسے غصہ دلا رہا تھا تاکہ وہ کھل کر باہر آئے اور اس بار اسے جو مکا پڑا تھا وہ بہت زبردست تھا وسیم لڑکھڑا رہا تھا اور اس نے دیوار کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بچالیا تھا۔ عالیہ اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

''ہاں...... یہ بہتر ہے۔'' وسیم نے کہا۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ کمرے میں کوئی اور بھی ہے اس نے مڑ کر دیکھا دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر سمیر کھڑا تھا اس نے اپنے ہاتھ سینے پر باندھے ہوئے تھے اور غصے سے وسیم کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''کمانڈر!'' اچانک وسیم کے منہ سے نکلا اور عالیہ بھی دروازے کی طرف مڑی۔

''سمیر!'' اچانک عالیہ کے منہ سے نکلا اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ سمیر بہت غصے میں ہے۔

''کیسی ہو؟'' سمیر نے مختصراً کہا اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر وسیم کی طرف مڑا۔

''چلو! تم سے بات کرنا ہے۔'' اس نے وسیم کا ہاتھ پکڑا اور اس کے آفس میں لے گیا۔ عالیہ وہیں کھڑی انہیں دیکھتی رہی تھی دروازہ تھوڑا سا کھلا رہ گیا تھا جس میں سے دونوں کی غصے بھری آوازیں باہر آرہی تھیں۔

''تم کیا کررہے ہو؟''

''یہ میرا کام ہے۔'' وسیم نے کہا۔

''تمہارا کام؟ واقعی؟''

''ہاں! یہ میرا پیشہ ہے...... تمہاری نوکری کرنے کے علاوہ۔'' وسیم نے جواب دیا۔ سمیر غصے سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''تو تم یہاں میری جاسوسی کرنے آئے ہو؟ میرے کلائنٹس چیک کرنا چاہتے ہو۔''

''نہیں...... میں یہ پتہ کرنے آیا تھا کہ تم پچھلی دو میٹنگز میں کیوں شریک نہیں ہوئے۔'' سمیر نے جواب دیا۔

''تمہیں پتا ہے کہ آج تمہیں جیکی گروپ کے خلاف خاص مشن پر جانا ہے تاکہ اس گروپ کے بیرونی سپلائرز کا کھوج لگایا جاسکے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' وسیم نے کہا۔

''چند ہی ہفتوں میں شہر کے ایک ویران ہال میں ان کے سپلائرز ملنے والے ہیں مجھے اس کے بارے میں پوری معلومات چاہیے یاد رکھو کسی غلطی کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ ہمیں ایک ہی بار میں سب کو پکڑنا ہے۔'' سمیر نے کہا۔

''سمیر! ہم دونوں جانتے ہیں کہ یہ کام میں بخوبی کرسکتا ہوں۔'' وسیم نے کہا۔

''لیکن ڈریم سینٹر میں چیزیں اس طرح نہیں ہوتی ہیں یہ تم جانتے ہو وہاں ٹیم کے ساتھ مل کر کام کرنا ہوتا ہے اور میٹنگ کے دوران ٹیم لیڈر کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔''

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے آئی ایم سوری' پھر ایسا نہیں ہوگا۔'' وسیم نے کہا۔

''میں تمہارے اتنا کہنے کو کافی سمجھتا ہوں میری آج کی تنبیہہ کو کافی سمجھنا۔''

''ٹھیک ہے...... بس یہی بات تھی؟''

"تم اسے کب سے ٹریننگ دے رہے ہو؟" سمیر نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے کہا۔

"چند ہفتوں سے۔"

"تم اسے ایک کلائنٹ کے طور پر نہیں رکھ سکتے وسیم۔"

"کیوں نہیں رکھ سکتا؟"

"میں نے تمہیں حکم دیا تھا کہ تم اس سے دور رہو اور تمہیں یہ بات ماننا ہوگی۔"

"اس میں میرے جیسی صلاحیتیں ہیں۔" وسیم نے کہا۔

"میں جانتا ہوں۔"

"تو تم نے مجھے اس کے بارے میں کیوں نہیں بتایا؟" وسیم نے کہا۔

"میں نے ضروری نہیں سمجھا۔"

"تو کیا تم ڈریم سینٹر میں ہم لوگوں میں طاقت تقسیم کرنا چاہتے ہو...... اگر ایسا ہوا تو سب کچھ تبدیل ہو جائے گا۔"

"میں اس کو شامل نہیں کرنا چاہتا۔" سمیر نے سختی سے کہا۔

"کیوں نہیں؟"

"میں اسے اس طرز زندگی میں داخل نہیں کرنا چاہتا۔"

"لیکن اس کی صلاحیتیں کہتی ہیں کہ وہ اس زندگی کے لیے بنائی گئی ہے۔"

"میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اس کو ٹریننگ دینا بند کرو اس موضوع پر اب ہماری کوئی بات نہیں ہوگی۔"

"تم اس سے خوف زدہ ہو...... نا؟ کیا کوئی اور ہماری آرگنائزیشن میں میرے جیسا ہے؟"

"وسیم؟" سمیر نے غصے سے کہا۔

"تم مجھ سے حسد کررہے ہو اس لیے مجھے عالیہ سے دور کرنا چاہتے ہو۔" وسیم نے کہا۔

"کیا؟ تم کیا بکواس کررہے ہو۔ میں کیوں حسد کروں گا؟"

"تم اسے پسند کرتے ہو...... میں نے تمہاری آنکھوں میں دیکھا ہے تمہیں اس کا اور میرا قرب برا لگ رہا ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے وسیم بلکہ تم ایک لڑکی کو ٹریننگ دے رہے ہو جو غصے سے بھری ہوئی ہے۔ اس میں نفرت اور انتقام کی آگ جل رہی ہے اور ہمارا مشن نہیں کہ ہم تربیت یافتہ فائٹرز کو سڑکوں پر کھلا چھوڑ دیں۔" سمیر نے سمجھایا۔

"لیکن یہ تو ہوتا ہے...... اور ہو رہا ہے۔"

"تم اسے ایسی مہارت دے رہے ہو جو بہت نقصان دہ ہے اس کے علاوہ اس طرح وہ میری اور ڈریم سینٹر کے اصولوں کی بھی نفی کر رہی ہے اس کی اجازت نہیں دے سکتا...... تم میری بات سمجھ رہے ہو؟" وسیم نے نفی میں سر ہلا دیا وہ جانتا تھا کہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ درست ہے اس نے بھی عالیہ سے پہلی ملاقات میں یہ بات محسوس کی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" وسیم نے کہا۔

"گڈ۔" سمیر نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

"لیکن میں صرف ٹریننگ دینا بند کروں گا۔" وسیم نے کہا اور سمیر چلتے چلتے رک گیا۔ ایک بار پھر اس کی رگوں میں خون کھول اٹھا تھا۔

"تم اس سے ہر حال میں دور رہو گے وسیم۔" سمیر نے تنبیہی انداز میں کہا۔

"کیا وہ ڈریم سینٹر کی حفاظت میں ہے یا......؟" وسیم نے کہا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اس سے بہت کچھ چھپایا جارہا ہو جسے وہ جاننا چاہتا ہو۔

"میں نے عالیہ کی کار یہاں سے کچھ دور کھڑی دیکھی ہے تم خود اسے کار تک چھوڑ آنا یہ علاقہ اندھیرا پھیلنے کے بعد محفوظ نہیں ہوتا۔" سمیر نے وسیم کی بات کا جواب دینے کے بجائے کہا۔

وسیم نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"چند گھنٹوں بعد ہیڈ کوارٹر میں تم سے ملتا ہوں۔" وسیم نے سمیر سے کہا جس پر سمیر مسکرایا وہ سمجھ گیا تھا کہ وسیم اس کی ہدایات پر عمل کرے گا۔

"کوشش کرو کہ خطرات سے دور رہو۔" اس نے ہال سے نکلتے ہوئے عالیہ کو ہدایت دی تھی اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر باہر نکل گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وسیم واپس ہال میں آ گیا تھا۔

"یہ سب کیا معاملہ ہے؟" عالیہ نے اس سے پوچھا۔

"سمیر کا کچھ معاملہ ہے...... خیر وہ سیٹ ہوگیا ہے۔"

"واقعی...... لگ تو یہ رہا تھا وہ تم سے سخت ناراض ہے۔"

"یہ تو اس کی عادت ہے ہم میں اکثر ایسی نوک جھونک ہوتی رہتی ہے۔"

''ڈریم سینٹر میں؟''

''ہاں! ڈریم سینٹر میں۔'' وسیم نے کہا وہ مسکرا دیا تھا عالیہ نے کس خوبی سے اس کا تعلق ڈریم سینٹر سے کنفرم کرلیا تھا۔

''میں تمہیں ٹریننگ نہیں دے سکتا۔'' وسیم نے اچانک کہا۔

''یہ تمہارے باس کا حکم ہے؟''

''یونہی سمجھ لو۔'' وسیم نے کہا اس کے اور عالیہ کے چہروں پر ناگواری کے آثار تھے لیکن دونوں کچھ دیر تک خاموش رہے تھے۔

''اچھا مجھے چلنا چاہیے۔'' عالیہ نے کہا۔

''میں تمہیں کار تک چھوڑ آتا ہوں۔'' وسیم نے کہا اور عالیہ جانے کے لیے مڑی وہ محسوس کرسکتی تھی کہ وہ عین اس کی پشت پر موجود تھا۔ وہ یک دم مڑی اور اس سے ٹکرا گئی وہ اس کے بہت قریب تھا۔ عالیہ نے پیچھے ہٹنا چاہا لیکن کسی چیز نے اسے ایسا نہیں کرنے دیا۔

وسیم اپنے ہاتھ سے اس کا بازو تھامے اسے اور قریب کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ وسیم کی سانسیں اس کے چہرے کو چھورہی تھیں اور عالیہ اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کررہی تھی وسیم کی گرفت مضبوط ہوتی جارہی تھی۔

''رک جاؤ۔'' اچانک عالیہ نے کہا۔

''کیا؟'' جیسے وسیم چونک گیا۔

''اوہ...... وہ...... ہم...... میں...... میرا خیال ہے کہ ہم دونوں ایک جیسے ہیں۔ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔'' وسیم نے بکھری سانسوں کے درمیان کہا۔

''نن...... نہیں...... ایسا نہیں ہے۔'' عالیہ تیزی سے پیچھے ہٹی اور تیزی سے دروازے سے باہر نکل گئی یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا وہ یہ تو جانتی تھی کہ وسیم کی نظروں میں اس کے لیے پسندیدگی کی جھلک نظر آتی تھی لیکن وہ اس حد تک آگے بڑھ جائے گا اس بات کا عالیہ کو اندازہ نہیں تھا۔

جیسے ہی وہ اپنی کار کے قریب پہنچی اور کار کا لاک کھولا اسے قریب ہی کسی کی موجودگی کا احساس ہوا وہ تیزی سے مڑی لیکن تب تک اس کے گال پر ایک زبردست مکا پڑ چکا تھا وہ اس کے لیے تیار نہیں تھی چنانچہ لڑکھڑا گئی۔

''تمہیں پتہ چلا کہ جو کچھ تم نے میرے ساتھ کیا تھا اس کے بعد تمہارا سکون سے رہنا کتنا مشکل ہے۔'' کسی نے کہا اور عالیہ نے سر اٹھا کر دیکھا اس کے سامنے وہی شخص کھڑا تھا جس کو اس نے باکسنگ ہال میں پہلے دن مارا تھا اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا۔

''تم بہت احمق ہو۔'' عالیہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا اور اس پر چھلانگ لگادی وہ اسے ساتھ لیتی ہوئی زمین پر گرگئی تھی اور پھر اس پر مکوں کی بارش کررہی تھی۔

''حمید اٹھو چلو کوئی آجائے گا۔'' اس کا ساتھی چیخا اور حمید عالیہ کی گرفت سے نکل گیا۔

''مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ اس لڑکی کو وسیم نے کیوں جم میں داخلہ دیا اس نے سب کے سامنے میری بے عزتی کی اور وسیم نے اسے وہاں ایک مقام دے دیا اسے یہ سبق سکھانے کی ضرورت ہے کہ اس کی یہاں جگہ نہیں۔'' حمید نے کہا۔

''تم یہاں سے دفع ہوجاؤ...... ابھی۔'' عالیہ نے کہا۔

''اوہو...... ورنہ؟...... ورنہ تم کیا کرلوگی؟''

''تم میرے غصے سے واقف نہیں ہو۔'' عالیہ نے کہا اور حمید ہنسنے لگا اسے حیرت تھی کہ یہ نازک اندام لڑکی اسے للکار رہی تھی۔ اس نے عالیہ کو مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن عالیہ نے ذہانت سے اس کا بازو پکڑ کر موڑ دیا اور اس کے بازو کی ہڈی توڑ دی۔ یہ عالیہ کے لیے نہایت آسان تھا پھر اس نے اس کے بائیں ٹانگ کے ساتھ بھی یہی کیا تھا وہ زمین پر ڈھیر ہوگیا تھا اور تکلیف کی شدت سے کراہ رہا تھا۔ پھر فوراً ہی عالیہ اس کے ساتھی کی طرف پلٹی تھی پھر چند ہی سیکنڈ میں اس نے دوسرے شخص کا بھی یہی حال کیا تھا اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

''میں تیار ہوں...... سمیر۔'' اس نے زیرلب کہا اور کار میں بیٹھ کر کار آگے بڑھادی۔

''عالیہ!'' کسی نے اسے پیچھے سے آواز دی لیکن دیر ہوچکی تھی عالیہ کی کار کافی آگے چلی گئی تھی۔

وسیم نے کچھ آوازیں سنی تھیں تو تیزی سے وہاں پہنچا تھا لیکن وہاں اسے حمید اور اس کے ساتھی کے جسم پڑے ملے تھے اور وہ دونوں کراہ رہے تھے اس نے حمید کا سر اوپر اٹھایا۔

''اگر دوبارہ تم نے عالیہ کو تنگ کیا تو میں تمہیں مار ڈالوں گا۔'' وسیم نے کہا اور واپس باکسنگ سینٹر کی طرف مڑ گیا۔

❀......❀......❀......❀

سمیر کا آفس ڈریم سینٹر میں executive floor پر واقع تھا اور دوسرے offices کے مقابلے میں بڑا تھا اس کے آفس میں دیوار کے ساتھ الماریاں بنی تھیں جن میں کچھ ضروری معاملات کی فائلیں تھیں کمرے کے درمیان میں ایک بڑی سی میز تھی جس کے پیچھے سمیر کی سیٹ تھی اور اس کے پیچھے دیوار میں ایک بڑی سی بک شیلف بنی تھی جس میں کتابیں رکھی تھیں جن میں سے زیادہ تر فائٹنگ تکنیک کی کتابیں تھیں۔ بائیں ہاتھ پر دیوار کے ساتھ بنی cabinates تھیں جو لاک تھیں اس میں ڈریم سینٹر کے ملازمین کی فائلیں تھیں۔ آپریشن فائلز تھیں اور ڈریم سینٹر کا پچھلا بیس سال کا ریکارڈ تھا۔

سمیر اپنی میز کی اوپر کی دراز میں ہمیشہ سگریٹ کا ایک کارٹن اور ایش ٹرے رکھتا تھا عمارت میں اسموکنگ منع تھی لیکن جب ضرورت ہوتی تھی وہ کبھی کبھی اس اصول کو توڑ لیتا تھا۔ اس کے علاوہ پورے آفس میں اس کی ذات کی جھلک نظر نہیں آتی تھی کوئی فوٹو کوئی آرٹ ورک کوئی ڈیکوریشن کی چیز وہاں نہیں تھی جس سے یہ اندازہ ہو کہ وہ کس شخصیت کا مالک ہے اور اس کی پسند ناپسند کیا ہے۔

وہ اپنی میز پر بیٹھا کچھ ضروری فائلیں دیکھ رہا تھا یہ وہ فائلیں تھیں جو حکومت کی منظوری کے بعد اسے دی گئی تھیں جن میں ڈریم سینٹر اور سینٹر کے اہم مقامات پر CCTV کیمرے لگانے کا پروگرام اور منظوری تھی تاکہ شہر میں ہونے والے دہشت گردی کے واقعات پر نظر رکھی جا سکے یہ اقدام سمیر نے ہی اٹھایا تھا اور اس پروجیکٹ کی منظوری حکومت سے حاصل کی تھی آدھے سے زیادہ کام ہو چکا تھا۔ اس کا زیادہ مقصد جیلی گروپ کے خلاف شہادتیں اور ثبوت جمع کرنا تھا۔ جو شہر میں دہشت گردوں کا سب سے بڑا گروپ تھا اور اس کی یہی کوشش تھیں کہ وہ کسی طرح سے ڈریم سینٹر کو اس کے کام سے باز رکھ سکے اس سلسلے میں اس کی طرف سے بھی رکاوٹیں پیدا کی جاتی رہتی تھیں۔

جب سے سمیر اس ادارے کا کمانڈر بنا تھا اسے خلیل کامران سے زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ خلیل کامران ذرا احتیاط سے کام کرنے کا عادی تھا جب کہ سمیر جارحانہ انداز میں کام کرتا تھا وہ چاہتا تھا کہ دشمن کے حملہ کرنے سے پہلے اس تک پہنچ کر اسے نیست و نابود کر دے وہ اس وقت بھی اپنی مختلف پروجیکٹس کی فائلوں میں اپنی Technical structure کو فائنل کر رہا تھا کہ اس کے فون کی گھنٹی بجی۔

''کمانڈر سمیر؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''کمانڈر بول رہا ہوں؟'' سمیر نے جواب دیا۔

''میرے پاس دو افراد موجود ہیں جو آپ سے ملنے پر بضد ہیں...... گورنمنٹ کی طرف سے آئے ہیں اور کہتے ہیں آپ سے ملنا ضروری ہے۔''

''ان کے نام کیا ہیں؟''

''انسپکٹر نعمان اور ارشد۔''

''ٹھیک ہے بھیج دو لیکن ان پر نظر رکھنا۔''

''ٹھیک ہے۔'' دوسری طرف سے کہا گیا اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔ سمیر نے تیزی سے میز پر پڑی فائلز سمیٹیں اور دراز میں رکھ دی تھیں اس کا ارادہ باقی کام ان انسپکٹر کے جانے کے بعد کرنے کا تھا۔ چند لمحوں بعد اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تھی اور سمیر نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تھا انہیں اندر بلایا تھا اور بیٹھنے کے لیے کہا تھا پھر وہ بھی اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا انہوں نے اپنا معمولی سا تعارف کروایا تھا۔

''تو تم لوگوں کو کیا چیز یہاں کھینچ لائی ہے؟'' سمیر نے پوچھا۔

''کمانڈر سمیر ہم یہاں آپ کو یہ بتانے آئے ہیں کہ ڈریم سینٹر زیر تفتیش ہے۔'' نعمان نے کہا۔

''دلچسپ۔'' سمیر نے کہا۔

''دلچسپ؟ اس سے آپ کی کیا مراد ہے کمانڈر آپ کو اندازہ ہے کہ یہ کتنا سیریس معاملہ ہے کمانڈر۔'' اس بار بھی نعمان ہی بولا تھا۔

''ہاں اگر میں تمہارے الفاظ کی تائید کروں تو ہاں...... ہاں یہ معاملہ سنجیدہ ہے۔'' سمیر نے کہا اس کا انداز طنزیہ تھا اس پر نعمان اور ارشد نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا وہ جانتے تھے کہ سمیر بلا کی تیز نظر اور صلاحیتیں رکھتا ہے اور

وہ اس کے لیے تیار بھی ہو کر آئے تھے لیکن اس وقت سمیر کا رویہ پریشان کرنے کے لیے کافی تھا۔

''ہمیں کچھ غیر مبہم سے ثبوت ملے ہیں کہ ڈریم سینٹر ملکی دہشت گردی میں کسی حد تک ملوث ہے۔ دھماکے عمارتوں کو نقصان پہنچاتا ہے اور کچھ رپورٹس دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا ادارہ کچھ غیر قانونی سرگرمیوں اور بغیر لائسنس ہتھیاروں کے کام میں بھی ملوث ہے۔''

نعمان نے کہا تو سمیر نے ایک ٹھنڈی اور گہری سانس لی۔ اس کے خیال میں ڈریم سینٹر کے لیے بہت غلط وقت تھا جب کہ اسے گورنمنٹ کی investigation کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ چند ہی ہفتوں بعد وہ جیکی گروپ کے کچھ اہم لوگوں پر ہاتھ ڈالنے والے تھے اس وقت گورنمنٹ کی طرف سے انہیں کسی اور کام میں انوالو کرنا اچھا نہیں تھا اس طرح ان کی توجہ بٹ جاتی اور وہ اپنی ذمہ داری پورے طور پر نہیں نبھا سکتے تھے۔ ڈریم سینٹر کے خلیل کامران کے زمانے سے کچھ بیرونی سپلائرز کے ساتھ معاہدے تھے جن پر اب بھی کام ہو رہا تھا وہ تعداد میں چند ہی تھے لیکن جیکی گروپ انہیں بھی ختم کرانا چاہتا تھا تا کہ اس کا مقابلہ نہ کیا جا سکے۔

''یہ سب جیکی گروپ کا پروپیگنڈہ ہے انسپکٹرز۔'' سمیر نے کہا۔

''کچھ بھی سہی لیکن ہمیں تحقیقات کے لیے کہا گیا ہے۔'' نعمان نے کہا۔

''کیا میں تمہاری بات صحیح سمجھ رہا ہوں؟ کیا گورنمنٹ میرے ادارے پر الزام لگا رہی ہے کہ میں غلط کاموں میں ملوث ہوں جب کہ ہم ان کی مدد کرنے کے لیے کام کرتے ہیں؟''

''آپ درست کہہ رہے ہیں لیکن......'' نعمان بات ادھوری چھوڑ کر اپنے ساتھی کی طرف دیکھنے لگا۔

''کمانڈر! ہم آپ کی اور آپ کے ادارے کی عزت کرتے ہیں اور اس کام کی بھی جو آپ نے گورنمنٹ کی مدد کے لیے کیا اور شہریوں کو مختلف مواقع پر تحفظ فراہم کیا لیکن یہ آپ کے کام کا طریقہ ہی ہے جس پر سوال اٹھ رہے ہیں۔''

''آپ دونوں نے کبھی جنگی صورت حال میں کام کیا ہے؟'' سمیر نے کہا تو دونوں افراد نے نفی میں سر ہلایا۔

''میں اسی انداز میں کام کرتا ہوں۔'' سمیر نے کہا۔

''میں اسی طریقے سے یہ ادارہ چلا رہا ہوں جیسے پہلے اسے چلایا جاتا رہا ہے' اس شہر میں دہشت گردوں نے آگ لگا رکھی ہے کسی کی جان و مال محفوظ نہیں گورنمنٹ بے بس نظر آتی ہے اور سب سے زیادہ دہشت گردی کی کارروائیاں جیکی گروپ کر رہا ہے ہم مزید انتظار نہیں کر سکتے ورنہ حالات ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ میں ایک ضروری آپریشن کرنے کے لیے چند کاغذات پاس کروانے کے لیے ہفتوں انتظار نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ دہشت گرد اب تک پورے شہر کو قابو نہیں کر سکے ہیں اور ہم سے خوف زدہ ہیں' اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں بار بار ان پر فتح ملتی ہے' ہم جنگ کی صورت حال میں ہیں' یہ بنیادی ٹریننگ کا سوال نہیں بلکہ یہ ایک حقیقت ہے جس کا ہمیں سامنا ہے۔'' سمیر نے کہا۔

''آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں ہمیں اس سے انکار نہیں لیکن ڈریم سینٹر تحقیقات کی زد میں ہے آپ سے تعاون کی درخواست ہے آنے والے ہفتے میں آپ کی انتظامیہ کی طرف سے کال آئے گی آپ کو شہر کی حدود سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔'' نعمان نے کچھ کاغذات سمیر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''کیا یہ کوئی مذاق ہے؟'' سمیر نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ مذاق نہیں ہے ہم جب تک نہیں جا سکتے جب تک آپ اس پر دستخط نہ کریں۔''

''ہاں تمہارے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے یا پھر......؟'' نعمان نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ سمیر نے غصے سے اس کی طرف دیکھا اور ان کاغذات پر دستخط کر کے ان کی طرف بڑھا دیے۔

''تمہارے پاس اس جگہ سے باہر جانے کے لیے صرف پندرہ سیکنڈ ہیں۔'' سمیر نے غصے سے کہا اور کمرے کا دروازہ کھول دیا وہ دونوں فوراً ہی باہر چلے گئے تھے سمیر تیزی سے اپنی سیٹ پر واپس آیا اور ایک نمبر ڈائل کیا تھا۔

''حفیظ میں بلڈنگ میں اسموکنگ کر رہا ہوں...... ضروری اقدامات کر لو۔'' اس نے کہا۔

''دوبارہ۔ میں صورت حال دیکھتا ہوں سمیر۔'' حفیظ نے دوسری طرف سے جواب دیا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد حفیظ سمیر کے کمرے میں پہنچا تھا حفیظ صدیقی ڈریم سینٹر میں سیکورٹی برانچ کا ہیڈ تھا تمام معاملات اور ہتھیار اس کی ذمہ داری تھے وہ اپنے کام کا ماہر نہایت ذہین اور بااعتماد شخص تھا۔ سمیر کو اس پر مکمل اعتماد تھا اور حفیظ نے کبھی بھی کارکردگی کے معاملے میں سمیر کو ناامید نہیں کیا تھا۔

''کیا معاملہ کچھ زیادہ گھمبیر ہے؟'' حفیظ نے سمیر کے کمرے میں قدم رکھتے ہی اس کے ہونٹوں میں دبے سگریٹ کو دیکھتے ہوئے کہا وہ جانتا تھا سمیر عام طور پر سگریٹ نہیں پیتا تھا لیکن کچھ خاص معاملات اور مشکل صورت حال میں اسموکنگ کرتا تھا اور اس وقت وہ چہرے سے خاصا پریشان لگ رہا تھا۔ حفیظ اس کے سامنے رکھی کرسی پر آ بیٹھا۔

''وہ لوگ گئے؟'' سمیر نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''تمہیں پتہ ہے کہ ہم اگلے ہفتے جیکی گروپ کے خلاف کارروائی کرنے جارہے ہیں۔'' سمیر نے کہا۔

''ہاں میں جانتا ہوں۔''

''ہمیشہ کی طرح ہمارے کام میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے پھر ہمارے دشمن سرگرم ہوگئے ہیں اور وہ ہمارے اقدام کو غیر موثر بنانا چاہتے ہیں اس بار انہوں نے گورنمنٹ کی پشت پناہی حاصل کی ہے جو ظاہر ہے کہ وقت کے ساتھ ناکام ہوجائے گی اور ہم ان کے الزامات کو جھوٹ بھی ثابت کردیں گے لیکن اس میں وقت تو لگے گا جو ہمارے پاس نہیں ہے..... تمام انتظامات ہوچکے ہیں اب یہ کارروائی روکی نہیں جاسکتی۔''

''آپ کیا چاہتے ہیں۔'' حفیظ نے کہا۔

''جو میٹنگ آج رات ہونی ہے اسے کل پر کردو میں کچھ حقائق جمع کرنا چاہتا ہوں میں اب کارروائی سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔'' سمیر نے کہا۔

''میں میٹنگ کے اراکین کو مطلع کردیتا ہوں۔'' حفیظ نے جواب دیا۔

''مجھے چند گھنٹوں کے لیے ڈسٹرب نہ کرنا۔'' سمیر نے کہا تو حفیظ اثبات میں سر ہلاتا ہوا کمرے سے نکل گیا تھا اور اپنے پیچھے دروازہ بند کردیا تھا۔

❁...... ❁...... ❁...... ❁

حفیظ صدیقی جیسے ہی سمیر کے کمرے سے باہر نکلا تھا سمیر نے کرسی کی پشت گاہ سے سر ٹکایا تھا۔ چند گہری گہری سانسیں لی تھیں اور اپنے دشمن کے اسسٹنٹ ساجد کے دماغ میں پہنچ گیا تھا۔ سمیر نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو مشقوں کے ذریعے مزید بہتر بنالیا تھا وہ ہر اس شخص کے دماغ میں پہنچ کر اس کی سوچوں کو پڑھ سکتا تھا جس سے زندگی میں ایک بار بھی مل لیا ہو۔

ساجد اس وقت اپنے کمرے میں تھا اور سونے کی تیاری کررہا تھا سمیر نے اس کے ذہن میں جاکر کچھ الفاظ دہرائے۔

''جیکی...... ویران ہال...... اہم میٹنگ۔'' ان الفاظ کے ساتھ ہی ساجد کے دماغ میں اس ملاقات کا منظر واضح ہوگیا جو ایک روز قبل ہی اس کی جیکی سے ہوئی تھی اور اس نے میٹنگ کے بارے میں سوچنا شروع کردیا سمیر اس کی ایک ایک سوچ کو پڑھ رہا تھا۔

''میں اور باس جب ملے تو وہاں چار اور لوگ بھی موجود تھے جو اس میٹنگ کا حصہ بننے والے تھے یہ میٹنگ دو دن بعد ویران ہال میں ہونے والی ہے اور اس میں شہر میں اگلے ماہ ہونے والی تخریبی کارروائیوں کا تعین کیا جانے والا ہے۔ کہاں کہاں حملے کرنا ہیں۔ کس کس کو نشانہ بنانا ہے۔ کیسے شواہد چھوڑنے ہیں...... کن کو مشکوک بنانا ہے۔''

''سب سے اہم ٹارگٹ کون ہوگا۔'' سمیر نے ساجد کے دماغ میں جملے ڈالے۔

''عالیہ...... اہم ہے...... باس نے کہا تھا کہ وہ خطرناک ثابت ہوسکتی ہے لیکن ابھی اسے راستے سے نہیں ہٹانا ہے وقت کا انتظار کرنا ہے۔'' ساجد نے سوچا اور سمیر پر حقیقت آشکار ہوگئی۔

ویران ہال میں ہونے والی میٹنگ کے اہم پوائنٹ اس کو پتا چل چکے تھے اور اسے اب میٹنگ کو ناکام بنانے کے بجائے کاغذات حاصل کرنے تھے جن میں دہشت گردی کرنے والے علاقوں کی نشان دہی کی گئی ہوگی۔ اب سمیر کو اپنا آئندہ لائحہ عمل بنانے میں بہت مدد مل سکتی تھی اس

نے ٹرانس سے واپس آ کر پھر اپنی میز کی دراز سے فائلیں نکال لی تھیں اور ان کی ورق گردانی میں مصروف ہو گیا تھا۔

❀ ...... ❀ ...... ❀ ...... ❀
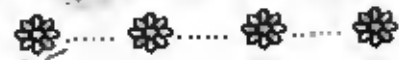
ویران محل کے ہال میں ہونے والی جیکی گروپ کی میٹنگ کی تمام تفصیلات تو سمیر ساجد کے ذہن میں داخل ہو کر حاصل کر ہی چکا تھا پھر ان معلومات کو بنیاد بنا کر وہ خود رات کی تاریکی میں اس ویران حویلی میں داخل ہوا تھا اور با آسانی ان کاغذات تک رسائی حاصل کر لی تھی جن میں شہر میں آئندہ ہونے والی دہشت گردی کی کارروائیوں کی پوری تفصیل موجود تھی اب سمیر کو صرف اس تفصیل کے مطابق اپنے لوگوں کی ڈیوٹیاں ان مقامات پر لگانا تھیں جو ان کاغذات میں ظاہر کیے گئے تھے اور یہ کام اسے ان تاریخوں سے پہلے کرنا تھا جو دہشت گردی کی کارروائی کے لیے مقرر کی گئی تھیں۔

پھر بڑی مہارت اور دانش مندی سے سمیر نے یہ آپریشن ناکام بنایا تھا اس نے تقریباً دس مقامات سے بارودی مواد پھٹنے سے پہلے ہی برآمد کروالیا تھا اور دو مقامات پر دشمن وہ مواد رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا اس کے علاوہ ایک مقام سے ایک مشتبہ آدمی کو بھی پکڑا تھا جس نے پولیس کی موجودگی میں اقرار کیا تھا کہ وہ جیکی گروپ سے تعلق رکھتا ہے اور اسے بھاری معاوضے پر تخریبی کارروائیوں کے لیے حاصل کیا گیا تھا۔

''آپ کا بہت شکریہ سمیر صاحب آپ کی وجہ سے ہم شہر میں ایک بہت بڑی دہشت گردی کی کارروائی سے بچ گئے ہیں اگر یہ سازش کامیاب ہو جاتی تو نہ جانے کتنی جانیں ضائع ہو جاتیں اور یہ شہر تو شاید کھنڈر ہی بن جاتا۔'' انسپکٹر نے سمیر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

''ہم تو وعدے کے مطابق اپنا فرض ادا کر رہے ہیں لیکن ہمیں خواہ مخواہ مختلف موقعوں پر تنگ کیا جاتا ہے کیا ہماری وفاداری پر کوئی شک ہے؟'' سمیر نے انسپکٹر سے کہا۔

''کیوں سمیر صاحب ایسی کیا بات ہو گئی کہ آپ کو شکایت کا موقع ملا؟''

''پچھلے دنوں آپ کے دو انسپکٹر ڈریم سینٹر آئے تھے اور انہوں نے کچھ کاغذات پر میرے دستخط کروانے تھے حکومت ڈریم سینٹر کی تلاشی لینا چاہتی ہے ان کا خیال ہے کہ ہمارے پاس غیر قانونی اسلحہ ہے۔''

''اس بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن آپ ہوم منسٹر سے بات کر سکتے ہیں۔''

''ہاں وہ تو میں کر ہی لوں گا ذرا ادھر سے فارغ ہو جاؤں۔'' سمیر کا اشارہ موجودہ صورت حال کی طرف تھا۔

''جی اگر میری کوئی ضرورت پڑے تو میں حاضر ہوں۔'' انسپکٹر نے کہا اور سمیر اس سے مصافحہ کر کے مسکراتا ہوا رخصت ہو گیا۔

''اس رات وہ دیر تک جاگتا رہا تھا وہ جانتا تھا کہ سمیر کی طرف سے ہونے والے اقدامات سے جیکی باخبر ہو چکا ہو گا اور وہ اب اس کے لیے مزید مشکلات پیدا کرے گا اس خیال کے آتے ہی اس نے ایک ہنگامی میٹنگ بلانے کے لیے ناصر محمود کو ہدایات دی تھیں اور خود اپنے تمام سیکورٹی اہل کاروں کی لسٹ لے کر ان کی ڈیوٹیاں مختلف مقامات پر لگانے بیٹھ گیا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ ذرا سی بھی غلطی یا غفلت کی وجہ سے جیکی کو کوئی کامیاب دہشت گردی کرنے کا موقع ملے اور وہ شہر کا امن خراب کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

❀ ...... ❀ ...... ❀ ...... ❀
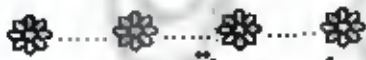
وہ شہر کی ایک مشہور شاہراہ تھی جس پر جا بجا ریسٹورینٹ ہوٹل اور اسٹریٹ فوڈ کے اسٹال موجود تھے رات کافی ہو چکی تھی لیکن اس شاہراہ کی رونق اسی طرح قائم تھی جیسے دن میں ہوتی تھی ان میں سے ایک ریسٹورنٹ میں کچھ دہشت گرد موجود تھے جو عام شہری لباس میں تھے لیکن خان جی ریسٹورنٹ کا مالک شہریار خان جانتا تھا پر وہ منہ سے ان کے خلاف کچھ بول نہیں سکتا تھا اسے ان کی فرمائش پوری کرنے کے لیے شراب کا اسٹاک بھی رکھنا پڑتا تھا حالانکہ پورے ملک میں اس کی خرید و فروخت پر پابندی تھی لیکن کئی لوگ غیر قانونی طور پر یہ دھندا کرتے تھے اس کے پیچھے بھی مافیا کا ہاتھ تھا۔

''ہمیں مزید بوتلیں چاہئیں۔'' ان دہشت گردوں میں سے ایک نے کاؤنٹر پر آ کے شہریار خان سے کہا وہ نشے میں جھوم رہا تھا کیونکہ پچھلے ایک گھنٹے سے وہ اور اس کے

ساتھی مسلسل پی رہے تھے وہ دیکھنے میں ان کا لیڈر لگ رہا تھا چہرے پر داڑھی تھی اور جسمانی طور پر خاصا صحت مند تھا۔

''میں مزید نہیں دے سکتا۔'' شہریار خان نے کہا۔

''کیوں؟ کیوں نہیں دے سکتے؟'' اس نے گالی دیتے ہوئے کہا۔

''تمہاری حالت ایسی نہیں ہے شراب پی کر تم یہاں ہنگامہ کرو گے ابھی پچھلے ہفتے ہی میں اچھی خاصی رقم کا جرمانہ بھر چکا ہوں۔'' شہریار خان نے ناگواری سے کہا اور اس شخص نے پیچھے بیٹھے ہوئے اپنے تین ساتھیوں کی طرف ہنس کر دیکھا انداز ایسا ہی تھا جیسے شہریار خان کا مذاق اڑا رہا ہو یہ چاروں جیکی گروپ سے تعلق رکھتے تھے اور چند گھنٹے پہلے شہر میں فائرنگ کرکے اور دہشت پھیلا کر اس ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے تھے۔

''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا ہے ہمیں منع کررہے ہو؟'' داڑھی والے شخص نے کہا۔

''نن...... میں مجبور ہوں...... مجھ پر بھی کچھ پابندیاں ہیں۔'' شہریار خان نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا اس کے ساتھ ہی اس شخص نے اپنی جیب سے ایک تیز دھار چاقو نکال لیا تھا اور ایک بار پھر داد طلب نظروں سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا تھا جو نشے میں قہقہے لگا رہے تھے۔

''میرے پاس مزید بوتلیں نہیں ہیں۔'' شہریار نے کہا یہ ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ ہے میرے پاس زیادہ اسٹاک نہیں ہے۔ شہریار نے کہا اس کی نظریں چاقو پر ٹکی تھیں۔

''تو میرا خیال ہے ہمیں تمہاری مزید ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے کہا اور آگے بڑھ کر ایک ہاتھ سے اس کے بال دبوچ لیے اور اسے آگے کی طرف کھینچا۔

''بتاؤ تم اپنے چہرے کا کیسا میک اپ کروانا پسند کرو گے؟'' اس شخص نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا تیز دھار چاقو اس کے چہرے کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

شہریار کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں اور وہ اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے جدوجہد کرنے لگا پھر اس سے پہلے کہ کسی کی سمجھ میں کچھ آتا اس دہشت گرد کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور وہ تکلیف سے چیخ پڑا شہریار بھی اس کی گرفت سے نکل کر پیچھے ہٹ گیا تھا اور حیرت سے اس شخص کی طرف دیکھ رہا تھا جس نے کچھ لمحے پہلے اسے اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا لیکن اب اس شخص کے ہاتھ میں ایک چاقو پیوست تھا وہ تیزی سے کاؤنٹر کے پاس سے ہٹ گیا تھا اور درد سے کراہ رہا تھا۔

ریسٹورنٹ میں موجود تمام لوگوں کی نظریں دروازے کی طرف اٹھ گئی تھیں جہاں ایک خوبصورت لڑکی کھڑی تھی اس کی سیاہ زلفیں اس کے کاندھوں پر لہرا رہی تھیں اس نے بلیک لیدر کی پینٹ اور جیکٹ پہنی ہوئی تھی اس نے اپنے ہاتھ میں پہنے ہوئے دستانے سے ایک اور چاقو نکال لیا تھا وہ دستانے خود ایک ہتھیار تھے جن میں دھات کے ناخن لگے ہوئے تھے وہ لڑنے والے انداز میں کھڑی ہوئی تھی اور کسی بھی حملے کا جواب دینے کے لیے تیار تھی۔

''میں نے سنا ہے کہ تم لوگوں کا گروپ سارا دن شہر میں فائرنگ اور قتل و غارت کرنے کے بعد یہاں رکا ہوا ہے۔'' اس نے کاؤنٹر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا پھر وہ زخمی شخص کی طرف بھی۔

''تمہارے یہاں آنے کا کوئی مقصد نہیں تھا مجھے یقین ہے۔'' اس لڑکی نے غصے سے کہا۔

''تو نے جو کہا ہے اس کے لیے میں تجھے ماردوں گا چھوڑوں گا نہیں۔'' زخمی شخص نے غصے سے کہا اور لڑکی مسکرا دی وہ اس پر جھک گئی۔

''کیا واقعی؟'' لڑکی نے اس کے کان میں سرگوشی کی اور پھر انتظار کیے بغیر اس نے چاقو سے ایک اور وار اس کے زخمی ہاتھ پر کیا تھا اور وہ تڑپتا ہوا فرش پر گر گیا تھا اب اس لڑکی کے ہاتھ میں دو چاقو تھے اس نے دوسرا وار کرتے ہوئے نہایت پھرتی سے اپنا پہلا پھینکا ہوا چاقو بھی اس کے ہاتھ سے کھینچ کر نکال لیا تھا اور اب زخمی شخص اپنے دوسرے ہاتھ کی مدد سے اپنے زخمی ہاتھ سے بہنے والا خون روکنے کی کوشش کررہا تھا ساتھ ہی درد کی شدت سے کراہ بھی رہا تھا پھر وہ اس کے تینوں ساتھیوں کی طرف مڑی تھی۔

''Come on boys'' اس نے انہیں للکارا تھا اور چاقو ہوا میں لہراتے تھے اور وہ تینوں اس کی طرف لپکے تھے عالیہ ان کی طرف دیکھ کر حقارت سے مسکرا رہی تھی اسے تو بہت عرصے سے اس موقع کا انتظار تھا کہ وہ کب اپنے والد کے قاتلوں سے بدلہ لے سکے گی۔ ان سب کو چن چن

کرکتے کی موت مارنا چاہتی تھی اس نے چاہا تھا کہ سمیر اس سلسلے میں اسے ڈریم سینٹر میں شامل کرلے اور اسے اس کارروائی کا حصہ بنالے جو اس کے والد کے قاتلوں کو انجام تک پہنچانے کے لیے کی جارہی تھی لیکن سمیر نے سختی سے انکار کردیا تھا اور اب عالیہ نے خود ہی اپنے طور پر یہ کام کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔

❀.....❀.....❀.....❀

سمیر بلڈنگ کے اندر گراؤنڈ پارکنگ لاٹ میں کھڑا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا اس نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا آج رات پری پٹیرول بریفنگ کی میٹنگ شروع ہونے میں صرف دس منٹ رہ گئے تھے ناصر محمود اور حفیظ صدیقی آچکے تھے جو میٹنگ ہال میں چلے گئے تھے اسے وسیم چارلی کا شدت سے انتظار تھا جو ابھی تک نہیں پہنچا تھا اس کے بعد ملیحہ شاہ آئی تھی جو اس ٹیم کا حصہ تھی لیکن زیادہ کام اپنی مرضی سے کرتی تھی۔

"کیا وسیم چارلی آگیا؟" اس نے آتے ہی پوچھا سمیر جانتا تھا وہ چارلی کی منظور نظر عورتوں میں سے ہے۔

"نہیں ابھی نہیں۔" سمیر نے مختصر سا جواب دیا۔

"اور ہاں ایک بار پھر بتادوں کہ تم چارلی سے اپنے معاملات کو ڈریم سینٹر سے الگ رکھو تو بہتر ہے۔" سمیر نے کہا۔

"سوری کمانڈر۔" ملیحہ نے دھیمے سے کہا۔

"میں اس سلسلے میں چارلی سے بھی بات کروں گا۔" سمیر نے کہا اور ملیحہ اثبات میں سر ہلاتی آگے بڑھ گئی تھی وہ جانتا تھا کہ چارلی کی عادت خواتین سے بے جا بے تکلف ہونے اور ان پر جملے کسنے کی ہے ملیحہ اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتی تھی اور سمیر ڈریم سینٹر کے ماحول کو خراب کرنا نہیں چاہتا تھا وہ اکثر چارلی کو اس کی حرکتوں پر باز رکھنے کی ہدایات دیتا رہتا تھا۔

کچھ ہی دیر میں چارلی کے علاوہ سارے ممبرز پہنچ گئے تھے سمیر بھی آخر میں بریفنگ روم میں آگیا تھا وہاں دیواروں کے ساتھ میزیں لگی تھیں اور اوپر کے حصے میں کیبنٹس لگی تھیں جن میں مختلف قسم کے ہتھیار رکھے ہوئے تھے اس کمرے میں سمیر اور ناصر محمود ہفتے میں ایک بار اپنے ممبرز کے ساتھ میٹنگ کرتے تھے اور انہیں سیکورٹی کے حساب سے ان کی ذمہ داریاں سمجھاتے تھے سمیر جیسے ہی بریفنگ روم میں داخل ہوا اس کی نظر شازیہ احمد پر پڑی جو اس کمیٹی کے ممبرز میں سب سے کم عمر تھی وہ اٹھارہ سال کی تھی اور ابھی حال ہی میں ان میں شامل ہوئی تھی ناصر محمود اس کی تربیت کررہا تھا وہ ابھی خطرناک صورت حال میں گھبرا جاتی تھی لیکن اپنی ذمہ داری پوری کرنے کی کوشش ضرور کرتی تھی۔

"پریشان مت ہونا آج میں کسی کے ساتھ تمہاری ڈیوٹی لگاؤں گا۔" سمیر نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

میٹنگ میں سمیر نے تمام ممبرز کو ان کی ذمہ داریاں سونپی تھیں اس نے سب کے جوڑے بنادیئے تھے جو ایک دوسرے کی مدد کے ساتھ آج کی کارروائی میں حصہ لینے والے تھے اس کے بعد انہیں اپنی اپنی پسند کے ہتھیار چننے کے لیے اجازت دے دی تھی۔

"ایک بات یاد رکھنا ہمارا کام حکومتی اداروں کی مدد کرنا ہے ان کا کام آسان بنانا ہے ان کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کرنا نہیں مجھے کسی سے کوئی شکایت کا موقع نہیں ملنا چاہیے۔" سمیر نے آخر میں سب کو تنبیہہ کی تھی سب سے آخر میں وسیم چارلی آیا تھا اس وقت سمیر اپنے ممبرز کو آخری احکامات دے رہا تھا۔

"آج رات کی پٹرولنگ بہت اہم ہے شہر میں دہشت گردی کا واقعہ ہوچکا ہے آپ سب کے پاس تین گھنٹے ہیں اور چھ سیکٹر میں کارروائی کرنا ہے آپ جوڑیوں کی صورت میں علاقے میں بکھر جائیں گے یاد رہے یہ علاقہ زیادہ آبادی والا علاقہ ہے شہریوں سے بات کرنا اور پتہ کرنا کہ اگر کوئی جنگی گروپ کی نشاندہی کرے تو نوٹ کرنا مجھے انہی پر شبہ ہے اگر ایسا ہو تو فوراً ناصر محمود اور حفیظ صدیقی کو اطلاع دینا گرفتاری کی صورت میں بھی یہی عمل کرنا ہوگا اور ہمیشہ کی طرح اپنے اصولوں اور دی گئی ہدایات پر عمل کرنا اور جب تک دشمن آپ پر حملہ نہ کرے آپ نے کوئی کارروائی نہیں کرنا ہے تمہیں اپنے ہتھیاروں سے زیادہ اپنے دماغ کا استعمال کرنا ہے۔"

"کمانڈر..... کیا آپ ہمارے ساتھ ہوں گے؟"

"ہاں..... میرا پارٹنر وسیم چارلی ہوگا۔" سمیر نے وسیم

چارلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا وہ جانتا تھا کہ سمیر اس کے ساتھ اس لیے رہنا چاہتا ہے کہ اسے کنٹرول میں رکھ سکے ورنہ اکثر وہ دی ہوئی ہدایات کی پروا نہیں کرتا اور اپنی مرضی سے کارروائی کرتا تھا۔ آخر میں سمیر نے ایک پیپر ناصر محمود کے ہاتھ میں تھما دیا تھا جس میں لوگوں کی ذمہ داریاں لکھی تھیں اور ان کے مطابق ناصر کو ان پر چیک رکھنا تھا اور سب لوگ اپنی ایئر فون ڈیوائس کو آن رکھیں گے تاکہ کسی بھی لمحے کسی بھی صورت حال سے ایک دوسرے کو باخبر رکھ سکیں۔'' اس نے کہا۔

سمیر اور چارلی اس وقت شہر کی مصروف ترین شاہراہ پر موجود تھے جس پر ہوٹل اور ریسٹورنٹ بنے ہوئے تھے لیکن رات کافی گزر گئی تھی اور اس پر یہاں خاموشی کا راج تھا۔

''تمہارے اور ملیحہ شاہ کے درمیان کیا چل رہا ہے؟'' سمیر نے چارلی سے پوچھا۔

''کچھ خاص نہیں۔''

''وہ تو خاصی اپ سیٹ نظر آ رہی تھی۔'' سمیر نے کہا۔

''میری اور اس کی کچھ بے تکلف ملاقاتیں ہوئی تھیں اور مجھ سے کچھ زیادہ ہی توقعات لگا بیٹھی بس یہی کہانی ہے۔''

''کیا یہ کہانی کا انجام ہے؟'' سمیر نے ذومعنی انداز میں پوچھا۔

''ہاں۔'' چارلی نے مختصر جواب دیا۔

''اس بات کو یقینی بناؤ کہ یہ کہانی کا انجام ہی ہو میں ڈریم سینٹر میں کوئی بکھیڑا نہیں چاہتا خاص طور سے ان حالات میں جن سے ہم اب دوچار ہیں۔'' سمیر نے کہا۔

''میں جانتا ہوں میں خیال رکھوں گا۔''

''گڈ اس کا مطلب ہے کہ آئندہ بریفنگ میں بھی تم وقت پر آ جایا کرو گے؟''

''ٹھیک ہے میں سمجھ گیا۔'' چارلی نے کہا۔

''تمہیں پتہ ہے نا چارلی تھوڑے ہی دن میں تم اپنے وعدے بھول جاتے ہو۔'' سمیر نے کہا تو چارلی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اپنی ذاتی زندگی کو ڈریم سینٹر سے دور رکھو تمہارے اوپر تمام خواتین ایجنٹس سے دور رہنے کی پابندی ہے اس پر ابھی سے عمل ہوگا اگر آئندہ تم نے میرے حکم سے انحراف کیا تو میں تمہیں اس آرگنائزیشن سے نکال دوں گا یہ تمہارے لیے آخری وارننگ ہے۔''

باتیں کرتے ہوئے وہ خان ریسٹورنٹ کے سامنے آ گئے تھے چارلی سمجھ گیا تھا کہ سمیر اسے ملیحہ یا شازیہ سے دور رہنے کی وارننگ اس لیے دے رہا ہے کہ شاید اسے عالیہ کی قربت کا طعنہ دینا چاہتا ہے آخر کو وہ چپ نہ رہ سکا اور اس نے اپنے دل کی بات سمیر سے کہہ دی۔

''اگر میں تم سے یہ کہوں کہ میں عالیہ کے قریب ہونا چاہتا ہوں تو؟ اس سے تم پریشان نہیں ہو گے؟'' چارلی نے کہا اور بغور سمیر کو دیکھنے لگا وہ اس کا ردعمل دیکھنا چاہتا تھا لیکن سمیر بھی ماہر تھا اس نے کسی قسم کے غصے یا ناراضگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔

''نہیں مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' سمیر نے اطمینان سے جواب دیا وہ عالیہ سے بالکل لاتعلقی ظاہر کر رہا تھا لیکن اسے اپنے اندر غصہ محسوس ہو رہا تھا اس نے چارلی کے باکسنگ سینٹر میں عالیہ کو اور چارلی کو فائٹ کرتے دیکھا تھا ان کی قربت کے کئی مناظر اس کی آنکھوں میں گھوم گئے وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا وہ عالیہ کو پسند کرتا تھا لیکن اس نے یہ بات عالیہ پر بھی ظاہر نہیں کی تھی وہ اپنے والد کی وجہ سے صدمے کی کیفیت میں تھی اور اسے ذرا سی بھی جھوٹی تسلی دینے والا اس سے فائدہ اٹھا سکتا تھا اور چارلی ایسی ہی شخصیت کا مالک تھا اس سے پہلے کہ عالیہ اس کے چنگل میں پھنسے سمیر اسے چارلی کی پہنچ سے محفوظ کر دینا چاہتا تھا۔

چلتے چلتے سمیر نے ایک ہوٹل کی کھڑکی کے شیشوں سے اندر جھانکا وہاں کچھ خاص نہیں تھا عام تھکے ہارے لوگ بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے وہ چارلی کے ساتھ آگے بڑھا اچانک چند قدم کے فاصلے پر کھڑی سفید رنگ کی کار پر سمیر کی نظر پڑی اور وہ ٹھٹک گیا۔

''تمہیں پتہ ہے یہی وجہ تو ہے کہ عالیہ مجھے پسند ہے۔'' چارلی نے سمیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا سمیر وہ کار دیکھ کر پہچان گیا تھا وہ جیکی کی کار تھی لیکن وہ رات کے اس پہر میں وہاں کیا کر رہے تھے یہ سوال سمیر کے ذہن میں ابھرا تھا۔

''وہ بہت معصوم اور سیدھی ہے خوفزدہ ہے تمہیں پتہ ہے؟'' چارلی نے کہا وہ ابھی تک عالیہ کے بارے میں

بات کر رہا تھا۔
''ہاں میں جانتا ہوں اور اسی لیے تم سے کہہ رہا ہوں کہ تم اس سے دور رہو اور تمہیں میری بات کی پروا نہیں ہے چارلی۔'' سمیر نے تیز لہجے میں کہا۔
''ارے تم تو برا مان گئے؟''
''شٹ اپ بکواس مت......'' سمیر نے کہا۔
''تو تم مانتے ہو کہ تم اس کی پروا کرتے ہو؟'' چارلی نے کہا۔
''ارے تم احمق...... میں اس کی بات کر رہا ہوں۔'' سمیر نے کار کی طرف اشارہ کیا۔
''اندر ریسٹورنٹ میں چلو...... چیک کرو کیا معاملہ ہے؟''
''مگر کچھ نہ ہوا؟'' چارلی نے کہا۔
''تو اسے اس بات پر وارننگ دی جا سکتی ہے کہ وہ اتنی دیر تک ریسٹورنٹ کھولے کیوں بیٹھا ہے جب کہ سب کو جلدی کاروبار بند کرنے کی ہدایت کی جا چکی ہیں۔'' سمیر نے اپنا پستول نکالتے ہوئے کہا سمیر نے بھی گن مستعدی سے پکڑ لی تھی۔
''لگتا ہے آج رات ہم نے خود ہی کسی ہنگامے کو دعوت دے دی ہے۔'' چارلی نے کہا۔
پھر دونوں ایک ساتھ ہی ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے تھے اور ان کی نظریں ایک ساتھ ریسٹورنٹ کے فرش پر پڑی چار لوگوں کی لاش پر پڑی تھی۔
''یہ کیا مصیبت ہے؟'' سمیر بڑبڑایا اور اسی وقت شہریار ریسٹورنٹ کے اندرونی حصہ سے باہر آ گیا۔
''سمیر...... چارلی؟'' اس نے انہیں مخاطب کیا۔
''یہاں کیا ہوا ہے؟'' سمیر نے پوچھا۔
''میرا خیال ہے وہ لڑکی تم میں ہی سے تھی۔'' شہریار نے کہا۔
''کون؟'' سمیر اور چارلی نے ایک ساتھ پوچھا۔
''اس لڑکی نے میری جان بچائی ہے۔''
''کس نے جان بچائی ہے؟'' چارلی نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر پوچھا اور سمیر لاشوں کے قریب دوزانو بیٹھ کر ان کا جائزہ لینے لگا۔
''یہ زندہ ہیں ان کی نبض چل رہی ہے۔'' سمیر نے کہا۔
''میں نہیں جانتا کہ وہ کون تھی لیکن اس نے کسی پیشہ ور کی طرح چاروں کو چت کر دیا بالکل ایسے ہی جیسے تم لوگ کرتے ہو۔'' شہریار نے اپنی بات مکمل کی۔ سمیر بغور جسموں کا جائزہ لے رہا تھا اس کی نظر ایک کے ہاتھ پر پڑی جس کا رنگ نیلا پڑ رہا تھا اور خون زیادہ بہہ گیا تھا ہاتھ میں سوراخ گہرا تھا۔
''وہ کیسی تھی اس کا حلیہ بتاؤ؟''
''گہرے بال تھے گہرے کالے وہ جوان تھی گوری رنگت بہت خوبصورت اور اس نے لیدر کا لباس پہنا ہوا تھا پینٹ اور جیکٹ۔'' شہریار نے حلیہ بتایا۔
''ایسی ہی عورت مجھے پسند ہے۔'' چارلی نے سمیر کو چڑانے والے انداز میں کہا۔
''اس کے پاس کوئی ہتھیار تھا؟'' سمیر نے چارلی کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔
''کوئی گن نہیں تھی بس دو چاقو تھے وہ بہت ماہر تھی اور کم عمر ہونے کے باوجود اس نے چشم زدن میں چاروں کو چت کر دیا اس کا قد پانچ فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔''
''عالیہ۔'' چارلی کے منہ سے نکلا۔
''اسے تو کوئی نقصان نہیں پہنچا؟'' سمیر نے پوچھا۔
''نہیں اس کو ہاتھ لگانے کا موقع ہی نہیں ملا۔'' شہریار خان نے ہنستے ہوئے کہا۔
''احمق لڑکی۔'' سمیر نے کاؤنٹر پر غصے سے ہاتھ مارا وہ سوچ رہا تھا کہ عالیہ نے وہ حد پار کر لی ہے جو اس نے مقرر کی تھی اور اس نے خلیل کامران سے اس کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا۔
لیکن اس کی یہ بھی ڈیوٹی تھی کہ وہ اسے پی سی او ڈریم سینٹر آرگنائزیشن سے دور رکھے۔
''چارلی فون کر کے گاڑی منگواؤ اور ان چاروں کو یہاں سے اٹھواؤ۔'' سمیر نے کہا اور چارلی نے فوراً ہی تعمیل کی اس نے کال کر دی تھی اور پھر سمیر کو دیکھنے لگا تھا جو موقع واردات کا جائزہ لے رہا تھا شاید وہ کوئی ایسا ثبوت ڈھونڈ رہا تھا جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ یہ کارروائی عالیہ نے کی ہے حالانکہ ان دونوں کو یقین تھا کہ وہ عالیہ ہی ہو سکتی ہے لیکن عالیہ بغیر ثبوت کے اس بات کو ہرگز ماننے والی نہیں

تھی۔

''میں اس سے بات کروں گا سمیر۔'' چارلی نے کہا۔

''اب دیر ہو چکی ہے۔'' سمیر نے جواب دیا۔

''نہیں میرا یہ خیال نہیں۔''

''دیکھو اس کا ہاتھ دیکھو کتنی مہارت سے اسے نشانہ بنایا گیا ہے۔'' سمیر نے کہا اور چارلی نے بغور اس شخص کے ہاتھ کا معائنہ کیا جو زخمی تھا واقعی وہ نشانے کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''میرا خیال ہے تم نے اس کی اچھی ٹریننگ کی ہے۔'' سمیر نے چارلی سے کہا۔

''یہ بات چھوڑو سمیر یہ دیکھو کہ وہ کتنی ماہر ہے ہم اسے اپنی ٹیم میں شامل کر کے اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔'' چارلی نے مشورہ دیا۔

''میں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔'' سمیر نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''ہو سکتا ہے کہ تمہارے پاس کوئی راستہ نہ رہے اگر جیکی کو اس واقعے کی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ عالیہ کو اپنے دشمنوں کی فہرست میں پہلے نمبر پر رکھے گا اور تمہیں مجبوراً عالیہ کی بات ماننا پڑے گی ورنہ اس کی حفاظت نہیں کر سکو گے۔'' چارلی نے کہا اور سمیر نے اس کا گریبان پکڑ کر اپنے قریب کرتے ہوئے سرگوشی کی۔

''کسی کو بھی اس بات کی خبر نہیں ہونا چاہیے یہاں جو بھی کچھ ہوا ہے اس کی ذمہ داری تمہارے اور میرے اوپر عائد ہوتی ہے یہ علاقہ ہماری ڈیوٹی میں تھا سمجھ گئے؟''

''بالکل سمجھ گیا اب تم کیا کرو گے؟'' چارلی نے پوچھا۔

''اسے روکوں گا۔'' سمیر نے کہا اس کا اشارہ عالیہ کی طرف تھا چارلی کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

❁......❁......❁......❁

حفیظ صدیقی کے سامنے میز پر بہت سی تصویریں پڑی تھیں اور وہ سمیر کے طرف سے دیئے گئے پروجیکٹ پر کام کر رہا تھا سمیر نے سیکورٹی ممبرز کی تعداد بڑھانے کے لیے کہا تھا اور وہ ویٹنگ لسٹ سے چن چن کر ماہر اور اچھے لوگوں کی ایک نئی فہرست ترتیب دے رہا تھا وہ کمپیوٹر پر ان کی پروفائلز دیکھتا جا رہا تھا کہ اچانک اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔

''آ جاؤ۔'' اس نے اپنی کرسی پر سیدھے بیٹھتے ہوئے کہا۔

دوسرے ہی لمحے ناصر محمود کمرے میں داخل ہوا تھا اس کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے۔

''دیکھو ناصر اگر یہ معاملہ ہتھیاروں کی ترسیل کا ہے تو میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا جب تک کہ سمیر سے بات نہ کر لوں؟'' حفیظ کامران نے کہا۔

''نہیں یہ وہ معاملہ نہیں ہے لیکن بہت اہم معاملہ ہے۔'' ناصر محمود نے کہا۔

''سمیر نے مجھے اس آپریشن کی دیکھ بھال کی ذمہ داری دی ہے میرے سامنے ایک حیرت انگیز بات آئی ہے۔'' ناصر محمود نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذات حفیظ صدیقی کو تھماتے ہوئے کہا۔

''اوہ خدایا!'' کاغذات پر نظر پڑتے ہی اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''ہے نا حیرت کی بات؟'' ناصر محمود نے کہا۔

''ہاں ہے تو۔''

''کیا سمیر کو اس بارے میں کچھ پتہ ہے؟'' حفیظ نے ناصر محمود سے پوچھا۔

''ابھی تک تو نہیں' وہ اپنے آفس میں نہیں ہے کیا تمہیں پتہ ہے وہ کہاں ہے؟''

''وہ کہہ رہا تھا کہ اسے کچھ ضروری کام ہے وہ چند گھنٹوں میں واپس آ جائے گا۔'' حفیظ نے بتایا۔

''لیکن میرا خیال ہے کہ اس معاملے کے لیے ہم انتظار نہیں کر سکتے۔''

''ہاں تم ٹھیک کہتے ہو میرا بھی یہی خیال ہے۔'' حفیظ صدیقی نے کہا پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اس نے کمرہ لاک کیا اور پھر آ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا پھر اس نے سمیر کو کال ملائی تھی۔

سمیر اس وقت عالیہ کے گھر سے کچھ فاصلے پر تھا اور وہ ایک قریبی ہوٹل کی طرف جا رہا تھا جو کچھ سنسان علاقے میں قائم تھا اور جہاں جیکی گروپ کے لوگوں کے ملنے کی توقع تھی فون کی بیل سننے کے بعد سمیر نے کار ایک طرف روک دی تھی۔

"سمیر بات کر رہا ہوں۔"
"ہمیں کچھ تصاویر ملی ہیں جو ناصر محمود نے مجھے دکھائی ہیں یہ کچھ سی سی ٹی وی کیمروں کی تصاویر ہیں ان میں ایک اجنبی کے ہیولے آئے ہیں جو ہم میں سے نہیں لیکن کارروائیوں میں ملوث ہے۔"
"اوہ۔" سمیر کے کہا وہ دل میں سوچ رہا تھا کہ عالیہ والا انداز اختیار ہو گیا ہے۔
"ہمارے سامنے جو تصاویر ہیں انہیں جھٹلایا نہیں جا سکتا۔" حفیظ نے کہا۔
"کیا اس اجنبی کی کوئی شناخت ہوئی ہے؟" سمیر نے پوچھا وہ دعا مانگ رہا تھا کہ جو وہ سوچ رہا ہے ویسا نہ ہو۔"
"ابھی تک تو نہیں لیکن ناصر اس پر کام کر رہا ہے ایک بات یقینی ہے کہ وہ کوئی عورت ہے لیکن اس کا چہرہ واضح نہیں ہے۔"
"اوہ۔" سمیر نے منہ سے بے ساختہ نکلا وہ جانتا تھا کہ چاہے وہ کبھی سے بھی حقیقت چھپائے لیکن حفیظ سے نہیں چھپا سکتا اسے حفیظ کو کچھ نہ کچھ بتانا ہوگا تاکہ اس کا اعتماد حاصل کر سکے۔
"سنو حفیظ...... میں اس معاملے کو خود دیکھوں گا۔"
"کیا؟" حفیظ کے لہجے میں حیرت تھی۔
"میں یہ معاملہ خود دیکھوں گا۔" سمیر نے دہرایا۔
"کیا تم اس بارے میں جانتے ہو؟" حفیظ نے پوچھا۔
"ہاں معافی چاہتا ہوں تمہیں بتا نہیں سکا در اصل اس کا موقع ہی نہیں ملا میں سوچ رہا تھا کہ شاید یہ اتنا آگے نہ بڑھ سکے۔"
"تم جانتے ہو وہ کون لڑکی ہے؟"
"ہاں۔" سمیر نے کہا چند لمحے دونوں طرف خاموشی رہی سمیر جانتا تھا کہ حفیظ کو اس بات سے کچھ دکھ ہوا ہو گا کہ سمیر نے اسے اعتماد میں نہیں لیا۔
"او کے اگر تمہیں میری مدد کی ضرورت ہو تو کال کر لینا۔" حفیظ نے کہا۔
"ہاں ضرور۔" سمیر نے مختصر جواب دیا اور فون آف کر دیا۔
چند لمحوں بعد سمیر ہوٹل شان میں بیٹھا ہوا تھا اس کے سامنے عالیہ بیٹھی تھی میز پر شراب کی بوتل تھی اور عالیہ ایک پیگ لینے کے بعد دوسرا انجیز رہی تھی اس کے سیاہ کلر کے بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اس نے بلو جینز اور وائٹ شرٹ پہنی ہوئی تھی۔
"مجھے تمہارے وہی سنہرے بال پسند ہیں جو تمہاری اصل پہچان ہیں۔" سمیر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ اسی وقت ہوٹل کی ویٹرس وہاں آ گئی اس کے ہاتھ میں شراب کی نئی بوتل تھی جو عالیہ نے کچھ دیر پہلے منگوائی تھی۔
"اوہ سمیر! تمہیں تو کافی عرصے بعد دیکھا ہے؟" ویٹرس نے کہا۔
"ہاں تم کیسی ہو؟" سمیر نے جواب دیا۔
"میں ٹھیک ہوں۔" ویٹرس نے کہا اور بوتل میز پر رکھ دی۔
"اچھا ہوا تم اسے کمپنی دینے یہاں آ گئے اتنی خوبصورت عورت کو یوں اکثر اکیلے اتنی کثرت سے شراب پیتے مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔" ویٹرس نے کہا اور وہاں سے چلی گئی عالیہ نے سگریٹ کا ایک کش لیا اور سمیر پر دھواں چھوڑ دیا۔
"تم یہاں کیسے آ گئے؟" عالیہ نے پوچھا اور اپنا خالی گلاس پھر بھرنے لگی۔
"میرا خیال ہے تم کافی پی چکی ہو۔" سمیر نے تنبیہ کی۔
"نہیں ابھی نہیں۔" عالیہ نے جواب دیا اور گلاس سے ایک گھونٹ بھر لیا سمیر نے اس سے گلاس لینے کی کوشش کی لیکن اس نے سمیر کا ہاتھ جھٹک دیا۔
"اگر تم نہیں پیتے ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی بھی نہیں پی سکتا۔"
"تم کیا سمجھتی ہو اس کے پینے سے تمہیں ان لوگوں کی یاد نہیں آئے گی جنہیں تم نے بری طرح سے مارا اور زخمی کیا ہے۔" سمیر نے اس کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔
"میری جاسوسی کر رہے ہو؟" تمہارے باڈی گارڈ مجھے اس ہفتے تلاش ہی کرتے رہے جب جب میں اپنے گھر سے چھپ کر نکلی؟" عالیہ نے بتایا۔
"تم ایسا نہیں کر سکتیں تمہیں پتہ ہے جیکی گروپ کو بھی

تمہارا پتہ چل گیا ہے انہوں نے تمہارے پیچھے لوگ لگا دیئے ہیں۔''

''تو پھر کیا......؟ تم مجھے یہاں دھمکی دینے آئے ہو کہ میں گھر میں بند رہوں؟'' عالیہ نے غصے سے کہا۔

''ہاں میں تمہیں باہر سڑکوں پر دیکھنا نہیں چاہتا یہ تمہارے لیے خطرناک ہے۔'' سمیر نے کہا اور عالیہ نے دوسرا سگریٹ جلا کر ایک کش لیا۔

''تمہیں میرا شکر گزار ہونا چاہیے۔'' عالیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''شکر گزار؟ کس سلسلے میں؟''

''میں دشمن سے لڑنے میں تمہاری مدد جو کر رہی ہوں۔'' عالیہ نے طنزیہ کہا۔

''نہیں تم غلط کہہ رہی ہو تم دشمن کی چالوں کو نہیں سمجھتی ہو تمہیں نہیں پتہ کہ تم نے کس سے مقابلہ مول لیا ہے تمہیں خطرے کا اندازہ نہیں ہے۔''

''مجھے پروا بھی نہیں ہے۔'' عالیہ نے بے پروائی سے کہا۔

''تمہیں پتہ ہے تم نے جس شخص کو زخمی کیا ہے وہ کون ہے؟''

''میں جاننا بھی نہیں چاہتی۔''

''وہ جیکی کے ایک اسسٹنٹ کا بھائی ہے۔'' سمیر نے کہا لیکن عالیہ نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا بلکہ ایک اور پیگ بھر کر پی گئی پھر سمیر نے سختی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور اس پر مزید جھک گیا۔

''میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تمہیں ڈریم سینٹر جوائن نہیں کرنے دوں گا لیکن پھر تم چارلی تک پہنچ گئیں میں نے چارلی کو تمہیں ٹریننگ دینے سے منع کیا تھا تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ میں تمہیں یہ ٹریننگ کرنے دوں گا؟'' سمیر عالیہ کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا لیکن عالیہ کے چہرے پر غصہ نہیں تھا۔

''کیا ہم ایک دوسرے کے لیے دشمن بن چکے ہیں؟'' عالیہ نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''اگر ہم دشمن ہوتے تو میں تمہیں دوبارہ وارننگ نہ دے رہا ہوتا عالیہ' میں تمہاری حفاظت کرنے کی پوری کوشش کر رہا ہوں۔'' سمیر نے کہا اور عالیہ نے غصے سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔

''مجھے اپنی حفاظت کے لیے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے تیز لہجے میں کہا۔ عالیہ نے جواب دیا اور سمیر کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا اس نے عالیہ کو سبق سکھانے کا فیصلہ کر لیا وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

''ان کا بل میرے حساب میں ڈال دینا۔'' اس نے وہیں کھڑے کھڑے ویٹرس کو مخاطب کر کے کہا اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا پھر سمیر چند لمحے عالیہ کو گھورتا رہا تھا اس نے ایک بار پھر عالیہ کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا تھا۔

''چلو میرے ساتھ چلو۔'' اس نے کہا اور گھسیٹنے والے انداز میں اسے باہر لے جانے لگا عالیہ نے زیادہ مزاحمت نہیں کی تھی وہ بہت زیادہ پی چکی تھی اور اس میں مزید جھگڑنے کی سکت نہیں تھی سمیر اسی تیزی سے عالیہ کو باہر لے گیا تھا اور اپنی کار کا دروازہ کھول کر اسے اندر بیٹھا دیا تھا پھر خود بھی اس کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا عالیہ نشے میں مدہوش ہو رہی تھی۔

''مجھے خوشی ہے کہ خلیل کامران تمہیں اس حالت میں دیکھنے کے لیے یہاں موجود نہیں۔'' سمیر نے غصے سے کہا۔

''خاموش ہو جاؤ۔'' عالیہ نے کپکپاتی آواز میں کہا وہ صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی اور سمیر کے لیے یہ اچھا موقع تھا وہ اس کے خود ساختہ حصار کو توڑ سکتا تھا جو اس نے اپنی حفاظت کے لیے اپنے ذہن کے گرد بنایا ہوا تھا اور جس کی وجہ سے سمیر اس کی سوچیں نہیں پڑھ سکتا تھا۔

''تم کیا سمجھتی ہو کیا خلیل کامران نے اس لیے موت کو گلے لگایا تھا کہ اس کی بیٹی ملک کے دہشت گردوں کی نظر میں آ جائے انہیں اپنا دشمن بنا کر اپنے پیچھے لگائے انہوں نے ڈریم سینٹر میں کام اس لیے کیا کہ وہ دوسروں کی مدد کر سکیں اور تم...... تم سڑکوں پر گھوم رہی ہو ان کی نظروں میں آ گئی ہو...... اور یہ سب کچھ تم خلیل کامران کے نام پر کر رہی ہو...... یہ جان کر کہ ان کی روح تڑپ رہی ہو گی عالیہ۔''

''میں نے کہا چپ ہو جاؤ۔'' عالیہ نے چیخنے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز اس کے ہی حلق میں پھنس کر رہ گئی تھی۔

''وہ مر چکے ہیں اور دنیا کی کوئی طاقت انہیں واپس نہیں لا سکتی چاہے تم کتنے ہی جیکی گروپ کے لوگوں کو سزا

دے لو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ اب واپس نہیں آ سکتے عالیہ۔'' سمیر نے کہا اور عالیہ اس کے کندھے سے لگ کر سسکیاں لینے لگی۔

''چپ ہو جاؤ..... خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔'' وہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔ سمیر خاموش ہو گیا تھا۔

''تم سمجھ ہی نہیں سکتے کہ مجھے کیا محسوس ہوتا ہے۔'' عالیہ نے سسکتے ہوئے کہا۔

''عالیہ!'' سمیر نے اس کی تھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا وہ ایک معصوم بچہ لگ رہی تھی جو خوفزدہ ہو اور سہارے کی تلاش میں ہو۔

''انہوں نے میرے ڈیڈی کو مار دیا..... وہ منظر میری آنکھوں میں محو نہیں ہوتا جب وہ خون میں لتھڑے ہوئے پڑے تھے مجھے ہر بار وہی تکلیف محسوس ہوتی ہے جو اسٹیشن پر انہیں دیکھ کر ہوئی تھی میں نہیں بھول سکتی۔ تم اس بات کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔'' عالیہ نے کہا سمیر نے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا اس کے بال درست کیے اور اس کے آنسو پونچھے۔

''میں سمجھ سکتا ہوں۔'' سمیر نے آہستہ سے کہا اور عالیہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''تم کیسے سمجھ سکتے ہو؟''

''میں بھی ایک حادثے میں اپنے ماں باپ کھو چکا ہوں ...... بہت پہلے تب میں اٹھارہ سال کا تھا اور میری پرورش ایسے ہوئی تھی کہ میں ان پر ہی انحصار کرتا تھا میری حفاظت کرنے والا کوئی نہیں تھا تب خلیل کامران نے مجھے سہارا دیا تھا حوصلہ دیا تھا اور دنیا سے لڑنے کے قابل بنایا تھا میں ان کے احسانات بھول نہیں سکتا مجھے انہوں نے اس مقام پر پہنچایا جہاں میں آج ہوں اور وہ مجھے تمہاری ذمہ داری سونپ کر گئے ہیں جو میں ہر حال میں پوری کروں گا۔''

''تمہارے والدین کا انتقال کیسے ہوا تھا؟'' عالیہ نے پوچھا تو سمیر اسے دیکھنے لگا۔

''میں بہت چھوٹا تھا جہاں رہتا تھا وہاں بہت کم لوگ رہتے تھے دور دور گھر بنے ہوئے تھے اور میرا گھر جہاں واقع تھا وہ جگہ چنار کے بڑے بڑے درختوں والے جنگل سے قریب تھی اتنی قریب کہ میں کتابیں لے کر وہاں یوں پڑھنے چلا جاتا تھا جیسے گھر کے صحن میں جا رہا ہوں دن یونہی گزر رہے تھے لیکن جس روز میری اٹھارویں سالگرہ تھی اس روز ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔''

''کیا واقعہ؟'' عالیہ نے پوچھا وہ اسی طرح سمیر کے کندھے سے سر ٹکائے بیٹھی تھی۔

''اس روز میں اپنی والدہ کے ساتھ ایک سپر اسٹور میں خریداری کرنے گیا تھا وہاں مجھے ایک عجیب سا شخص دکھائی دیا وہ سیاہ لباس میں تھا اور مسلسل میرا پیچھا کر رہا تھا مجھے اس سے خوف آ رہا تھا کیونکہ میں نے اس کے ذہن کو پڑھ لیا تھا وہ مجھے مارنا چاہتا تھا۔''

''گویا تم اس وقت بھی ذہن پڑھنے کی صلاحیت رکھتے تھے؟'' عالیہ نے پوچھا۔

''ہاں یہ صلاحیت خداداد ہے میں نے اپنے بچپن میں بھی بہت لوگوں کو حیران کیا تھا۔ پھر نہ جانے کیسے ایک خطرناک گروہ میرا دشمن ہو گیا اس شخص کا تعلق اسی گروہ سے تھا اس نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا میں اپنے ڈیڈی کے ساتھ جنگل میں تھا اس نے مجھ سے کہا تھا کہ تم آگے جا کر ہمارے لیے مصیبت بن جاؤ گے ہم تمہاری صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا سکتے تھے لیکن ایسا ہو نہیں سکتا تم ہمیشہ ہمارے خلاف بن جاؤ گے تم بدی کی قوتوں کا ساتھ نہیں دو گے چنانچہ تمہیں ختم کر دینا ہی بہتر ہے اس وقت تو میرے ڈیڈی نے مجھے بچا لیا تھا لیکن بعد میں وہ مجھے تو بچانے میں کامیاب ہو گئے لیکن خود اس شخص کے ہاتھوں مارے گئے۔

''اوہ...... اور تمہاری والدہ؟''

''وہ بھی ...... ان دونوں کو عین میری سالگرہ کے دن قتل کر دیا گیا میں اس وقت کا سے میں تھا کیونکہ میری آنٹی نے مجھے یہی بتایا تھا اور انہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ میرے والد ذریم سینٹر کی حقیقت سے واقف تھے اور انہوں نے خلیل کامران سے میرے لیے بات کر لی تھی ان کا خیال تھا کہ میں یہاں ان کے سائے میں محفوظ رہوں گا میری آنٹی نے یہاں کا فون نمبر اور پتہ مجھے دیا تھا اور میں اپنے والدین کی موت کے بعد یہاں آ گیا تھا۔''

''میں نہیں جانتی تھی کہ تم بھی میری طرح دکھی ہو...... میں سمجھتی تھی میرا ہی غم بڑا ہے لیکن تمہارے بارے میں جان کر بہت دکھ ہوا۔''

''تمہارے ڈیڈی نے مجھے سہارا دیا ایک باپ کی طرح میری دیکھ بھال کی ٹریننگ کی اور میری صلاحیتوں کو مزید جلا بخشی اس قابل بنادیا کہ آج ان کی جگہ ذمہ داریاں سنبھال رہا ہوں تو کیا میں انہیں دیئے گئے ایک وعدے کو پورا نہ کروں؟'' سمیر نے عالیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اس نے محسوس کیا کہ اس کے گرد لپٹے ہوئے عالیہ کے بازوؤں کی گرفت اور مضبوط ہوگئی ہے اور عالیہ نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔

''مجھے افسوس ہے میں شرمندہ ہوں۔'' عالیہ نے آہستہ سے کہا تو سمیر نے بھی اسے بازوؤں میں لے لیا دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے تھے سمیر نے محسوس کیا تھا کہ عالیہ کی ٹینشن کسی حد تک کم ہوگئی تھی تب ہی وہ چپکے سے اس کے ذہن میں داخل ہوگیا عالیہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی اور جب اس کی سوچیں سمیر نے پڑھیں تو اس پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ عالیہ پہلے دن سے ہی اسے چاہتی ہے وہ اس کے قریب رہنا چاہتی ہے اور اس کی موجودگی میں خود کو محفوظ سمجھتی ہے۔

''تم مجھ سے چھپاتی رہیں؟'' سمیر نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''کیا؟'' عالیہ نے انجان بن کر پوچھا۔

''وہی جو میں اب پڑھ رہا ہوں۔ تم نے مجھے کبھی اپنے ذہن تک پہنچنے کی اجازت ہی نہیں دی کیوں؟ تمہاری تربیت کس نے کی دوسروں سے اپنے ذہن کو محفوظ کرلینا ایک تربیت یافتہ فرد ہی کرسکتا ہے۔''

''تمہارا اشارہ ٹیلی پیتھی کی طرف ہے۔''

''ظاہر ہے۔''

''میرے ڈیڈی نے میرے بچپن سے ہی میرے لیے اس کا اہتمام کیا تھا وہ مجھے ہر لحاظ سے مضبوط بنانا چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے پڑھائی کے ساتھ ساتھ مجھے فائٹنگ اور ٹیلی پیتھی بھی سکھائی تھی۔ مجھے معلوم ہے تم نے پہلے دن ہی مجھ تک پہنچنے کی کوشش کی تھی۔''

''تم بہت ہوشیار ہو۔'' سمیر نے کہا اور عالیہ مسکرادی۔

''تم میرے والد کے احسان مند ہو اسی لیے تم نے ڈریم سینٹر کو جوائن کیا؟''

''ہاں ایک وجہ تو یہ تھی لیکن ایک اور بھی وجہ تھی وہاں میں خود کو محفوظ سمجھتا ہوں۔'' سمیر نے کہا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کو بانہوں میں لیے بیٹھے تھے اور اس بات سے مطمئن تھے کہ انہوں نے ایک دوسرے کے دکھ کو سمجھ لیا ہے۔

''اس کے علاوہ کوئی اور وجہ؟''

''ہاں مجھے ڈریم سینٹر کی یہ بات بھی پسند تھی کہ وہ عام لوگوں کی حفاظت کرنے میں حکومت کا ساتھ دیتا ہے ایسے لوگ جو خود اپنی حفاظت نہیں کرسکتے۔''

''پھر مجھے کیوں منع کرتے ہو؟'' عالیہ نے پوچھا اور سمیر نے آہستگی سے اس کو خود سے الگ کردیا۔

''یہ جگہ تمہارے لیے مناسب نہیں ہے۔'' سمیر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا عالیہ اسے والہانہ انداز میں دیکھ رہی تھی اور سمیر کے دل کی کیفیت بھی عجیب تھی لیکن وہ اب ایک کمانڈر تھا اور عالیہ خلیل کامران کی بیٹی تھی اسے بہرحال عالیہ سے ایک حد تک رہنا تھا اور اس کے کمانڈر نے اسے عالیہ کی حفاظت کی ذمہ داری دی تھی جو اسے پوری کرنا تھی اسے اپنے جذبات پر قابو رکھنا تھا اس نے اپنے دل کو سمجھایا اور پچھلی سیٹ سے اتر کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا عالیہ اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''مجھے افسوس ہے کہ اس آدمی کا ہاتھ زخمی کیا۔'' کچھ دیر بعد عالیہ نے کہا۔

''دراصل مجھے بہت عجلت میں اسے قابو کرنا پڑا ورنہ وہ ہوٹل کے مالک کو زخمی کرچکا ہوتا اس کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا اسے سبق سکھانا میرے لیے مشکل نہیں لیکن میں اسے جان سے نہیں مارنا چاہتی تھی۔''

''عالیہ تم ایک خطرناک عورت ہو۔'' سمیر نے آہستگی سے کہا۔

''میں تمہیں ایک بات اور بتانا چاہتی ہوں سمیر وہ یہ کہ وسیم چارلی کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔'' عالیہ نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

''یہ بات تم مجھے کیوں بتارہی ہو؟''

''بس یونہی..... میں چاہتی ہوں کہ اگر تمہیں کوئی غلط فہمی ہے تو اصل بات تمہارے علم میں آجائے۔'' عالیہ نے کہا وہ ابھی بھی اس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

معروف مصنف و کالم نگار مشتاق احمد قریشی کے قلم سے ایک اور شاہکار
پیہم خیال
مشتاق احمد قریشی
شائع ہو گئی ہے

"ٹھیک ہے اب ہمیں یہاں سے چلنا چاہئے۔" سمیر نے کہا اور کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی اور عالیہ نے ایک گہرا سانس لے کر کار کی سیٹ سے ٹیک لگالی تھی وہ سوچ رہی تھی کہ کیا سمیر اس کے دل کی کیفیت کے بارے میں جان چکا ہے یا جان کر بھی انجان بن رہا ہے۔

❁......❁......❁......❁

"Come on come on" سمیر نے غصے سے میز پر ہاتھ مار کر کہا وہ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا تھا خلیل کامران کے انتقال کے بعد یکے بعد دیگرے کئی اہم معاملات کھل کر سامنے آئے تھے عالیہ کا جارحانہ رد یہ ایک اہم پروجیکٹ کو فائنل کرنا ہتھیاروں کی سپلائی کے بارے میں گورنمنٹ کی طرف سے دی جانے والی وارننگ اور ڈریم سینٹر کے روزانہ کے معاملات کے فرائض ان سب میں وہ ایسا الجھ گیا تھا کہ خلیل کامران کے قاتلوں کو ڈھونڈنے کا کام پیچھے رہ گیا تھا۔

آج اس نے سوچا تھا کہ اس سلسلے میں کچھ کام کرے گا اور پچھلے کئی گھنٹوں سے وہ اپنے دفتر میں بند تھا اور کام میں مصروف تھا اس کے سامنے کئی فائلیں کھلی پڑی تھیں اس وقت وہ ایک خاص نام کے بارے میں معلومات جمع کر رہا تھا جو اس نے جیکی کے منہ سے سنا تھا۔ "منصور" وہ ڈریم سینٹر کے ڈیٹا بیس میں وہ نام ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا بڑی مشکل سے اسے ایک نام ملا تھا "منصور احمد" لیکن یہ وہ نام نہیں تھا جس کی اسے تلاش تھی پھر سمیر نے Details کا بٹن دبایا تھا تاکہ اس نام کے بارے میں تفصیل جان سکے لیکن وہ حیران رہ گیا تھا جب اسے ایک error message دیکھنے کو ملا۔

Your current id does not allow to access this page

"یہ کیا؟" سمیر نے حیرت سے کہا۔ ایک کمانڈر کی حیثیت سے اسے کمانڈ کلیرنس حاصل تھی یہ ناممکن تھا کہ اسے کسی قسم کی انفارمیشن تک رسائی حاصل نہ ہو۔ اس نے میز پر رکھے اپنے فون پر نظر ڈالی وہ آج رات حفیظ سے رابطہ نہیں کر سکتا تھا اس نے کمپیوٹر بند کر دیا اور ٹھنڈی سانس لے کر کرسی کی پشت گاہ سے سر ٹکا دیا۔

کچھ ہی دیر میں اس کی آنکھوں میں نیند اتر آئی تھی اور وہ خوابوں کی وادی میں پہنچ گیا تھا اس نے نیند کے دوران کرسی پر بیٹھے ہی بیٹھے کئی بار پہلو بدلا اسے اپنا آبائی گھر نظر آرہا تھا جہاں پولیس کے آفیسرز ادھر ادھر دوڑتے پھر رہے تھے وہ ایک کمرے میں سہما ہوا کھڑا تھا اس کے سامنے جگہ جگہ خون کے دھبے پڑے تھے ڈرائنگ روم میں کچن میں کچن کے سامنے رکھی ٹیبل پر ہر جگہ دیواروں پر بھی خون کے چھینٹے پڑے تھے پھر اچانک منظر بدل گیا سمیر نے پھر کرسی پر بیٹھے بیٹھے بے چینی سے پہلو بدلا اس پر اسے ریلوے اسٹیشن کا منظر نظر آرہا تھا جیکی گروپ کے غنڈے رائفلوں اور گنوں سے لیس اس پر خلیل کامران پر گولیاں برسا رہے تھے اس نے اور خلیل کامران نے جیکی کے کئی لوگوں کو زخمی کیا تھا پھر اچانک جیکی نے گولی ماری تھی جو خلیل کامران کو لگی تھی اور وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا تھا اسی لمحے عالیہ نے پھرتی سے چاقو پھینکا تھا جو جیکی کے ہاتھ میں لگا تھا پھر ریلوے اسٹیشن کے فرش پر ہر طرف خون ہی خون بکھر گیا تھا اس کے ہاتھوں میں بھی خون لگا تھا اور عالیہ اپنے ڈیڈی پر جھکی رو رہی تھی۔

"عالیہ...... عالیہ...... سنو وہ اب دنیا میں نہیں...... سنو۔" وہ زور سے چیخا تھا اور اچانک اس کی آنکھ کھل گئی تھی وہ کمرے میں اکیلا تھا اور اس کی میز پر فائلیں پڑی تھیں۔

❁......❁......❁......❁
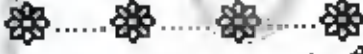
ابھی صرف صبح کے نو بجے تھے شمالی علاقہ جات کا واحد سوئمنگ کلب لوگوں سے پر رونق تھا یہ واحد کلب تھا جہاں اس علاقے میں آنے والے سیاح گرمی کی تمازت میں سوئمنگ پولز میں لطف اٹھانے آتے تھے گرمی کا موسم تھا اور گرمی اپنے عروج پر تھی چنانچہ لوگوں کی تعداد عام دنوں کے مقابلے میں آج کچھ زیادہ ہی تھی۔

کلب کے پارک کے سینٹر میں ایک بہت بڑا سوئمنگ پول تھا جس کے ایک کونے میں خوبصورت سا آبشار بھی بنایا گیا تھا اس کے چاروں طرف خاصا سبزہ موجود تھا جو اس کی دلکشی کو بڑھا رہا تھا آہستہ آہستہ لوگوں کی آمد بھی بڑھ رہی تھی اور وہ جوڑوں کی صورت میں اپنی اپنی پسندیدہ جگہوں پر آرام کرنے کی غرض سے بیٹھ رہے تھے لڑکیاں تیراکی کے مختصر لباس میں اپنے فرینڈز کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔

ایک سیاہ تیراکی کے لباس میں عالیہ بھی وہاں موجود تھی اس نے گھاس پر تولیہ بچھایا ہوا تھا اور اس پر نیم دراز تھی کانوں میں ایئر فون لگائے وہ میوزک سننے میں محو تھی آنکھوں پر دھوپ کا سیاہ چشمہ لگا تھا اور وہ اپنے اطراف سے بے خبر تھی اچانک اسے اپنے کاندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس ہوا اور اس نے پلٹ کر دیکھا کہ کس نے اس کا سکون برباد کیا ہے اس کے سامنے وسیم چارلی کھڑا تھا اس نے باتھنگ گاؤن پہنا ہوا تھا وہ اس وقت ایک جنگجو فائٹر کے بجائے کہ عام سا انسان لگ رہا تھا لیکن پھر بھی عالیہ کو متوجہ کیے بغیر نہ رہا تھا۔

''میرا پیچھا کررہے ہو؟'' عالیہ نے بیٹھتے ہوئے کہا اس نے کان سے ایئر فون بھی نکال دیا تھا۔

''نہیں یہ اتفاق ہے میں تو بس انجوائے کرنے آیا تھا۔'' چارلی نے کہا اس کی نظریں عالیہ کے نیم برہنہ جسم پر تھیں اور وہ دل ہی دل میں اس کے خوبصورت جسم کی تعریف کررہا تھا۔

''واقعی میرا تو خیال ہے کہ تم لوگوں کے پاس اتنا وقت تو نہیں ہوتا۔''

''یہ سمیر کے احکامات ہیں اس کا خیال ہے کہ جسمانی صحت کے ساتھ ساتھ ذہنی صحت کا بھی خیال رکھنا چاہیے اور میں اس کی تقلید کرتا ہوں۔'' چارلی نے کہا اس کی نظریں مسلسل عالیہ کے جسم پر مرکوز تھیں۔

''میرا خیال ہے کہ تمہیں شاید منظر سے غائب کردیا گیا ہے میں نے کچھ دن پہلے تمہاری کارروائی کا منظر ایک ہوٹل میں دیکھا تھا۔'' وسیم نے کہا۔

''وہ میری ایک غلطی تھی۔'' عالیہ نے جواب دیا۔

''یعنی تمہارے اندر تبدیلی کردی گئی ہے۔'' چارلی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب..... تمہارا اس بات سے کیا مطلب ہے؟'' عالیہ نے پوچھا لیکن چارلی اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اس کے قریب بیٹھ گیا۔

''میرے یوں آنے سے تم بے آرام تو نہیں ہوگئیں؟'' اس نے پوچھا لیکن عالیہ فوراً کھڑی ہوگئی پھر اس نے اپنی چیزیں سمیٹ لی تھیں۔

''جارہی ہو؟'' چارلی نے اس کے راستے میں آتے ہوئے کہا۔

''ہاں دھوپ زیادہ تیز ہوگئی ہے۔'' عالیہ نے جواب دیا۔

''یا تم میرے ساتھ بیٹھنا نہیں چاہتیں؟ یا پھر سمیر سے قریب ہو؟'' چارلی نے ایک ساتھ دو سوال کردیے تھے اور عالیہ اسے ناگواری سے دیکھنے لگی تھی۔

''نہیں۔'' عالیہ نے کہا۔

''تم جھوٹ بول رہی ہو..... میں محسوس کررہا ہوں کہ تم اس کے قریب ہوتی جارہی ہو لیکن اس کے بارے میں تمہیں ایک اہم بات بتاؤں؟ وہ بھی عورتوں سے بے تکلف نہیں ہوتا میں جب سے اسے جانتا ہوں اس کے ساتھ کسی عورت کا نام نہیں سنا بچپن میں اس کے والدین کا قتل ہوا تھا اور وہ اس صدمے اور خوف سے ابھی تک نہیں نکل سکا تو میرا خیال ہے کہ تم بھی کبھی اسے نہیں پاسکو گی..... میرا یقین کرو۔'' چارلی نے کہا۔

''آخر تم مجھے یہ سب کیوں بتارہے ہو اور اس پر یقین کرنے کے لیے کیوں مجبور کررہے ہو؟''

''اس لیے کہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں اور سمیر نے اس بات کو محسوس کرلیا ہے اسی لیے وہ نہیں چاہتا کہ تم ڈریم سینٹر جوائن کرو کیونکہ اس طرح تمہیں میرے قریب رہنے کا موقع مل سکتا ہے۔''

''تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے چارلی اور فی الحال میں نے خود کو ہر چیز سے الگ رکھنے کا فیصلہ کیا ہے جیکی گروپ سے ڈریم سینٹر سے تم سے..... '' عالیہ نے کہا۔

''اور سمیر سے؟'' چارلی نے پوچھا۔

''ہاں..... ہر چیز سے۔'' عالیہ نے کہا اور آگے بڑھ گئی۔

❀......❀......❀......❀

سمیر پچھلی پوری رات بے آرام رہا تھا وہ سو نہیں سکا تھا اس وقت بھی اس کی کیفیت ٹھیک نہیں تھی اس نے میز پر رکھے فون سے حفیظ کامران کا نمبر ڈائل کیا۔

''ہیلو حفیظ' کل رات میرے ساتھ عجیب واقعہ ہوا میں کمپیوٹر پر کچھ کام کررہا تھا کہ اچانک کچھ انفارمیشن میرے لیے بلاک ہوگئی۔'' سمیر نے حفیظ کو بتایا۔

''یہ ناممکن ہے یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' سمیر نے جواب

دیا۔
''لیکن ایسا ہوا ہے...... وہ انفارمیشن میرے لیے ضروری ہے۔''
''اچھا error message کیا آرہا تھا؟'' حفیظ نے پوچھا۔

Your current id does not allow to access this page

''تم کون سی انفارمیشن ڈھونڈ رہے تھے؟''
''میں ڈیٹا بیس سے منصور احمد کے بارے میں انفارمیشن لینا چاہتا تھا جس کے بارے میں میرا خیال ہے کہ وہ جیکی گروپ کا بڑا آلہ کار ہے۔'' سمیر نے بتایا اور اسے دوسری طرف سے کمپیوٹر کیز پر انگلیاں چلنے کی آواز سنائی دی۔
''واؤ۔'' اچانک اسے حفیظ کی آواز سنائی دی۔
''میں نے ابھی تمہاری id سے sigin کیا تم ٹھیک کہہ رہے ہو انفارمیشن بلاک ہوگئی ہے پھر میں نے اپنی id استعمال کی لیکن اس نے بھی کام نہیں کیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے میں یہ بھی نہیں ڈھونڈ پا رہا کہ یہ انفارمیشن کس شخص نے بلاک کی ہے بس صرف اتنا پتہ چل رہا ہے کہ یہ کام کسی نامعلوم شخص نے کیا ہے لیکن وہ کون ہے اس کا نام show نہیں ہو رہا۔'' حفیظ نے تفصیل سے بتایا۔
''کیا تم بھی اس تک پوری رسائی حاصل نہیں کر سکتے جب کہ تمہیں پورے administration کے اختیار حاصل ہیں۔ سمیر نے پوچھا۔
''مجھے اس کا اختیار ہے لیکن میں بھی یہ نہیں کر پا رہا۔'' حفیظ نے کہا۔
''تم اسے توڑ سکتے ہو؟'' ہیک کر سکتے ہو؟ جو بھی ہو کرو۔'' سمیر نے کہا۔
''مجھے حیرت ہے کہ تم ایسی بات کہہ رہے ہو...... مجھے چوبیس گھنٹے دو میں تمہیں تمہاری مطلوبہ انفارمیشن نکال کر دیتا ہوں۔'' حفیظ نے اسے یقین دلایا۔
''چوبیس گھنٹے؟''
''اچھا چلو بارہ گھنٹے...... بارہ گھنٹے میں' میں یہ کام کر لوں گا۔''
''ٹھیک ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس بات کا علم میرے' تمہارے اور ناصر محمود کے علاوہ کسی اور کو نہ ہو۔'' سمیر نے کہا۔
''ٹھیک ہے۔'' حفیظ نے جواب دیا اور سمیر نے فون بند کر دیا۔

دوسرے روز دوپہر کے وقت ناصر محمود اس کے آفس میں داخل ہوا تو سمیر میز پر کئی فائلیں کھولے بیٹھا تھا۔
''کیا کوئی خاص بات ہے۔'' سمیر نے ناصر محمود سے پوچھا۔
''ہاں! حفیظ نے تمہارا کام کر دیا ہے۔''
''مجھے امید تھی کہ وہ یہ کام کرلے گا لیکن اتنے کم وقت میں کرلے گا اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔''
''وہ بتا رہا ہے یہ میسج غلطی سے نہیں آرہا تھا وہ جان بوجھ کر لگایا گیا تھا اور یہ ڈیٹا بہت پہلے بلاک کیا گیا تھا لیکن یہ پتہ نہیں چل رہا کہ یہ کام کس نے کیا' کرنے والے کی id بھی کافی عرصہ ہوا expire ہو چکی لیکن ایک حیرت انگیز بات ہے۔''
''کیا؟'' سمیر نے جلدی سے پوچھا۔
''یہ پتہ چل گیا ہے کہ یہ ڈیٹا کب بلاک کیا گیا یہ اسی دن بلاک کیا گیا تھا جس دن خلیل کامران کی موت ہوئی تھی۔'' ناصر محمود نے کہا اور سمیر حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔
''کیا اب انفارمیشن تک پہنچا جا سکتا ہے؟''
''ہاں لیکن ایک حیرت کی بات ہے کہ جب تم سرچ کر رہے تھے تو جو مشکل تمہیں پیش آرہی تھی وہ اس میں پیدا کی گئی تھی تاکہ ان لوگوں کے نام ظاہر نہ ہو سکیں جو خلیل کامران کے قتل میں جیکی کے آلہ کار بنے تھے وہ شخص منصور احمد ہے ایک ریٹائرڈ فوجی اس کے ساتھ اس کے اور بھی کئی ساتھی ہیں جو بہترین تربیت یافتہ لوگ ہیں اور معاوضے پر کوئی بھی انہیں حاصل کر سکتا ہے وہ ان لوگوں کے لیے کام کرتے ہیں جو انہیں زیادہ معاوضہ دیتے ہیں اور ان کے گروپ کا کوئی نام نہیں ہے جیکی کئی بار ان سے معاہدے کر کے مختلف کام کروا چکا ہے وہ کبھی ناکام نہیں ہوتے وہ کوئی نشانی نہیں چھوڑتے ان کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا انہیں روکا نہیں جا سکتا ان میں سے کبھی کوئی پکڑا نہیں گیا۔''
''کیا جیکی نے ان سے جو معاہدے کیے ان میں سے

کچھ افراد کے نام معلوم ہو سکے ہیں؟'' سمیر نے پوچھا لیکن ناصر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''کیا وہ عالیہ کو بھی نشانہ بنانا چاہتے ہیں؟'' سمیر نے پوچھا تو ناصر محمود نے اثبات میں سر ہلایا اور سمیر نے ایک ٹھنڈا سانس لے کر کرسی کی پشت گاہ سے کمر ٹکا دی۔

''مجھے یہی ڈر تھا۔'' اس نے افسردگی سے کہا۔

''اس کا نام منصور احمد کرمانی ہے اور اگلے آپریشن کے لیے اسے ہی چنا گیا ہے۔'' ناصر محمود نے بتایا وہ سوچ رہا تھا کہ سمیر اس انفارمیشن کے ملنے کے بعد کیا کرے گا وہ اس سے یہ انفارمیشن چھپا بھی نہیں سکتا تھا لیکن وہ دیکھ رہا تھا کہ سمیر خاصا ڈسٹرب ہو گیا تھا۔

''اگر چاہو تو آج رات یہاں ہونے والی میٹنگ کینسل کر دو۔'' ناصر نے مشورہ دیا۔

''نہیں میں ٹھیک ہوں۔'' سمیر نے اطمینان سے کہا۔

''کیا یہ معلوم ہوا کہ یہ ڈیٹا کس نے بلاک کیا تھا؟'' سمیر نے پوچھا۔

''ہاں لیکن......'' ناصر نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''لیکن کیا؟ تم مجھے بتانا نہیں چاہتے؟'' سمیر نے ناصر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ دراصل۔''

''دیکھو ناصر...... میں ہر بات سچ سچ جاننا چاہتا ہوں مجھ سے کچھ مت چھپاؤ...... اگر جانتے ہو تو مجھے نام بتاؤ کہ وہ کون شخص ہے۔'' سمیر نے کہا۔

''وہ...... کمال کامران ہے...... اس نے ہی ڈیٹا بلاک کیا تھا اور مقصد وہی جانتا ہوگا۔'' ناصر نے کہا۔ سمیر کو لگا جیسے وہ جانتا ہے لیکن بتانا نہیں چاہتا۔

''اچھا...... ٹھیک ہے میں کمال کامران سے ہی پوچھ لوں گا۔'' سمیر نے کہا وہ جانتا تھا کہ خلیل کامران کی موت کے بعد جب وہ کمال کامران سے ملتا تھا تو اس کا رویہ خاصا بدلا ہوا تھا اور اس کی باتوں سے سمیر کو رقابت کی بو آتی تھی اس نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ سمیر کے ڈریم سینٹر کا کمانڈر بننے سے حاسد تھا کیونکہ خلیل کامران کا بھائی ہونے کے ناتے اس کے دل میں کمانڈر بننے کی خواہش برسوں سے پل رہی تھی۔ وقتی طور پر سمیر نے کمال کامران کو ڈریم سینٹر کے ٹریننگ سیکشن کا انچارج بنا دیا تھا اور وہ اپنی ذمہ داریاں وہاں ادا کر رہا تھا اس کے بعد اس نے کبھی سمیر کے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کیا تھا۔

سمیر فوراً ہی اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا اور فائلیں بند کر کے دراز میں رکھ دیں۔

''کیا ابھی اس کے پاس جا رہے ہیں؟'' ناصر محمود نے پوچھا۔

''ہاں میرا خیال ہے کہ یہ اتنا اہم معاملہ ہے کہ اسے بعد کے لیے نہیں چھوڑا جا سکتا۔''

''لیکن......'' ناصر محمود کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''میں بھی ساتھ چلوں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہوں...... لیکن جب میں اس سے بات کر رہا ہوں تو تم مداخلت مت کرنا۔'' سمیر نے تنبیہ کی پھر وہ دونوں ہی ڈریم سینٹر سے ٹریننگ ونگ جانے کے لیے روانہ ہو گئے تھے ٹریننگ ونگ بھی گھنے جنگل کے درمیان ایک مضبوط اور بلند و بالا عمارت میں قائم تھا سمیر نے عمارت کے گیٹ کے سامنے کار روک دی تھی اور گیٹ کی ڈیوٹی پر موجود سیکورٹی گارڈ آگے بڑھا تھا۔

''commander sameer requesting entery۔''

سمیر نے گارڈ سے کہا اور اس کی طرف ڈریم سینٹر کا id بڑھا دیا گارڈ نے کارڈ لے کر دیکھا تھا اور سر کو اثبات میں جنبش دیتے ہوئے کارڈ اسے واپس کر دیا تھا۔

''خوش آمدید کمانڈر۔'' گارڈ نے کہا اور سمیر نے مسکرا کر اسے جواب دیا پھر گیٹ کھلا تھا اور کار اس میں داخل ہو گئی تھی۔ اس ٹریننگ ونگ میں یہاں سے متعلق آفیسرز کے دفاتر تھے اس کے علاوہ یہاں ٹریننگ حاصل کرنے والوں کے رہائشی کوارٹرز بنے ہوئے تھے اور اس سے الگ تھلگ ٹریننگ ہال تھا جہاں اس وقت کمال کامران موجود تھا سمیر سیدھا اس کے پاس ہی گیا تھا۔

''کیا بات ہے سمیر اچانک کیسے آنا ہوا؟'' کمال نے اسے دیکھ کر کہا اسے سمیر کا یوں بغیر اطلاع دیئے آنا اچھا نہیں لگا تھا اس بات کو سمیر نے بھی محسوس کیا تھا۔

''مجھے بتاؤ تم جیکی اور منصور احمد کے بارے میں کیا جانتے ہو؟'' سمیر نے پوچھا۔

''تم کیا کہہ رہے ہو؟ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' کمال

نے کہا۔

❀......❀......❀

''اس بات سے انکار مت کرنا کیونکہ یہ تمہارے گلے میں اٹک جائے گی۔ تم جانتے ہو تم نے مجھے بلاک کیا تھا اور حفیظ صدیقی کے آنے سے پہلے یہ اختیارات تمہارے پاس تھے۔'' سمیر نے غصے سے کہا۔

''ہاں! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' کمال نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

''اور یہ خلیل کامران اور میرا مشترکہ فیصلہ تھا لیکن اس بات کو کافی دن ہوگئے۔''

''لیکن تمہیں اندازہ ہے کہ اس عرصے میں میں کتنی ذہنی اذیت سے گزرا ہوں مجھے پتہ تھا کہ جیکی کے ساتھ کوئی اور بھی ملوث ہے لیکن مجھے پتہ نہیں چل رہا تھا۔ میں کتنا پریشان رہا اصل قاتل تک پہنچنے کے لیے تمہیں کچھ اندازہ ہے؟''

''لیکن ہمارا خیال تھا کہ تمہارے حق میں یہی بہتر ہوگا۔'' کمال نے کہا۔

''تمہیں چاہیے تھا کہ تم مجھے اس کے بارے میں بتاؤ۔''

''دیکھو سمیر تمہاری تربیت شروع ہی سے اس انداز میں کی گئی کہ تمہیں آگے چل کر کمانڈر بننا ہے اور ہم تمہارے لیے کوئی بھی خطرہ لینے کو تیار نہیں تھے۔'' کمال نے وضاحت کی۔

''خطرہ......؟ خلیل کامران مجھے اپنے والد کی طرح عزیز تھا۔'' سمیر نے غصے سے کہا اور کمال کا گریبان پکڑ لیا وہ اسے مکا مارنے ہی والا تھا کہ ناصر محمود نے اسے پکڑ لیا۔

''کیا کر رہے ہو سمیر...... چھوڑو...... چھوڑ دو۔'' ناصر نے کمال کو چھڑاتے ہوئے کہا۔ سمیر پیچھے ہٹ گیا تھا۔

''ٹھیک ہے مجھے سب کچھ سچ بتاؤ۔'' اس نے کمال سے کہا۔

''پہلے تم میرے ایک سوال کا جواب دو۔'' کمال نے کہا اور سمیر نے حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

''بولو؟''

''تمہارے اور میری بھتیجی کے درمیان کیا چل رہا ہے؟'' کمال نے پوچھا۔

''خلیل کامران نے مجھے اس کی حفاظت کی ذمہ داری دی ہے اور میں وہ ادا کر رہا ہوں۔''

''لیکن میں نے کچھ اور محسوس کیا ہے؟'' کمال نے ذو معنی انداز میں کہا۔

''تم خواہ مخواہ چیزوں سے غلط مطلب نکالتے ہو۔'' سمیر نے بے پرواہی سے کہا۔

''تم اسے ڈریم سینٹر سے دور رکھنے کی کوشش کر رہے ہو جب کہ وہ یہاں رہتے ہوئے کام کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔'' کمال نے کہا۔

''یہاں کی زندگی بہت مشکل ہے عالیہ کے لیے خطرہ مول نہیں لے سکتا۔'' سمیر نے کہا۔

''میں تمہیں عالیہ کے ساتھ دیکھنا نہیں چاہتا۔'' کمال نے غصے سے کہا۔

''مجھے منصور احمد کے بارے میں بتاؤ؟'' سمیر نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔

''وہ ایک ریٹائرڈ فوجی ہے اور اپنے جیسے لوگوں کے ایک گروپ کے ساتھ کام کرتا ہے اس کی پارٹی کا کوئی نام نہیں ہے۔'' کمال نے کہا۔

''یہ سب تو میں جانتا ہوں۔'' سمیر نے کہا۔

''کیا تمہیں یہ پتہ ہے کہ جیکی نے خلیل کامران کو مارا؟'' سمیر نے کہا۔

''میں جانتا ہوں۔'' کمال نے کہا۔

''مجھے تم سے پوری معلومات چاہیے۔ مجھے اس کی پروا نہیں ہے کہ تم کیا بہتر سمجھتے ہو تمہارے فیصلے میرے ہونگے۔ تمہارا کوئی فیصلہ نہیں ہوگا اگر آئندہ تم نے کوئی بھی انفارمیشن مجھ سے چھپائی تو ہم ایک ساتھ کام نہیں کرسکیں گے۔'' سمیر نے کہا۔

''سمیر...... میری بات سنو؟'' کمال نے کچھ کہنا چاہا لیکن سمیر نے اپنی بات جاری رکھی۔

''مجھے تمہاری رشتہ داریوں کی بھی کوئی پروا نہیں ہے...... وہ وقت ختم ہوگیا۔ اب سب کچھ بدل چکا ہے یہ بات کبھی مت بھولنا کمال کہ اب ڈریم سینٹر میں اختیار میرا ہے اگر مجھے کرنا پڑا تو میں تمہیں یہاں سے نکال بھی سکتا ہوں۔'' سمیر نے غصے سے کہا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔

''دوبارہ کبھی مجھ سے سوال مت کرنا۔'' سمیر نے کمال

کے قریب سے گزرتے ہوئے کہا اور وہاں سے نکل گیا ناصر اس کے پیچھے تھا وہ کچھ دیر کے لیے کمال کے قریب رکا تھا۔

''ہتھیار ڈال دو تم اس سے جیت نہیں سکتے۔'' ناصر محمود نے کمال سے کہا اور سمیر کے قریب پہنچ گیا۔

''اب تم کیا کرو گے...... منصور احمد اور اس کے ساتھیوں کے سلسلے میں؟'' اس نے سمیر سے پوچھا۔

''انہیں ڈھونڈیں گے۔'' سمیر نے جواب دیا۔

❀......❀......❀......❀

ٹریننگ ونگ سے واپسی پر سمیر نے ناصر محمود کو ڈریم سینٹر میں چھوڑا تھا اور خود اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ راستے میں وہ کمال کے بارے میں سوچتا رہا تھا بہت سے واقعات نے اسے الجھا دیا تھا وہ کمال پر بھروسا نہیں کر سکتا تھا اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ وہ موقع ملتے ہی سمیر کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا اس نے راستے کے ایک طرف کار روک دی اور جیب سے سگریٹ نکال کر سلگائی اچانک اس کے ذہن میں عالیہ کا سراپا ابھر آیا اس نے سوچا شاید وہ اسے چاہنے لگا ہے تب ہی خطرے کو اس سے دور رکھنا چاہتا ہے لیکن دوسرا خیال اس کے دل میں یہی آیا کہ یہ اس کی ذمہ داری بھی ہے اچانک اس کی کار کے شیشے پر ایک دستک ہوئی اور اس نے چونک کر دیکھا عالیہ اس کے سامنے کھڑی تھی اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا وہ سمجھا یہ بھی اس کا تصور ہے اس نے بلو جینز اور فیروزی شرٹ پہنی ہوئی تھی اور اس کے سنہرے بال اس کے شانوں پر لہرا رہے تھے۔

''کیا سوچ رہے ہو کہ میرے گھر میں داخل ہو جاؤ یا یہاں سے ایسے ہی گزر جاؤ۔'' عالیہ نے مزاحیہ انداز میں کہا تب سمیر کو احساس ہوا کہ وہ عالیہ کے گھر سے چند قدموں کے فاصلے پر کار رو کے کھڑا تھا۔

''ارے مجھے احساس ہی نہیں ہوا' شاید میں کچھ پریشان ہوں...... پھر طبیعت بھی ٹھیک محسوس نہیں ہو رہی۔'' سمیر نے کہا اور عالیہ نے محسوس کیا کہ وہ کچھ افسردہ اور فکر مند ہے۔

''آؤ...... آ جاؤ...... کار کو یہیں چھوڑ دو جب جاؤ تو لے جانا۔'' عالیہ نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا اور وہ کار سے باہر آ گیا پھر اس نے عالیہ کے ساتھ قدم ملا کر اس کے گھر کی طرف چلنا شروع کر دیا تھا اور عالیہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں یہاں ہوں؟'' سمیر نے پوچھا۔

''سیکورٹی گارڈ نے تمہاری کار دیکھی تھی اس نے ہی مجھے بتایا ہے۔'' عالیہ نے جواب دیا۔

''اچھا!'' سمیر نے کہا پھر گھر کی پورچ میں پہنچ کر وہ سیکورٹی گارڈ کے قریب گیا تھا۔

''میں آج رات یہاں ہوں تم چھٹی کرو۔'' سمیر نے کہا۔

''یس کمانڈر۔'' گارڈ نے سلوٹ کرتے ہوئے کہا اور گارڈ نے سوالیہ نظروں سے عالیہ کی طرف دیکھا۔ عالیہ نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا تھا جس کے بعد سمیر عالیہ کے ساتھ گھر میں داخل ہو گیا تھا۔

''بیٹھو۔'' عالیہ نے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور خود کچن کی طرف بڑھ گئی۔ کچھ لمحوں بعد وہ ہاتھوں میں دو کولڈ ڈرنک پکڑے واپس آ گئی تھی اور کولڈ ڈرنک میز پر رکھ دیئے تھے یہاں پہلے سے گلاس رکھے تھے سمیر نے گلاسوں میں مشروب انڈیلا تھا اور ایک گلاس عالیہ کی طرف بڑھا دیا تھا۔

''خیریت ہے آج یہاں کیسے آ گئے؟'' عالیہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''پتہ نہیں...... آج کا دن بہت تھکا دینے والا تھا۔'' سمیر نے کہا۔

''بس میں...... میں کسی خیال میں تھا ادھر نکل آیا۔'' سمیر نے کہا۔

''یا تم آج رات تنہا نہیں گزارنا چاہتے تھے؟'' عالیہ نے اس کے قریب کھسکتے ہوئے کہا۔

''ہاں! شاید ایسا ہی ہے۔'' سمیر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا آج کے معاملات پر کچھ بات کرنا چاہو گے؟'' عالیہ نے کہا۔

''ہاں......'' سمیر نے کہا لیکن وہ ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا آج کے جو بھی معاملات تھے ان کی انفارمیشن بہت راز داری چاہتی تھی اور عالیہ بہر حال کمال کی بھتیجی تھی اور وہ نہیں

چاہتا تھا کہ وہ عالیہ سے کمال کی کوئی برائی کرے اب خاندان میں کمال کے علاوہ عالیہ کا کوئی نہیں تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ عالیہ کو اس سے بھی دور کردے۔

''میں چاہتا تو ہوں...... لیکن ایسا کر نہیں سکتا۔'' سمیر نے کہا اور عالیہ اس کی مشکل سمجھ گئی وہ جانتی تھی کہ سمیر کا عہدہ اور کام ایسا نہیں کہ وہ ہر کسی سے اپنی انفارمیشن شیئر کرسکے۔

''کوئی بات نہیں سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' عالیہ نے اطمینان دلانے والے انداز میں کہا پھر وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی تھی اور سمیر نے اپنا سر صوفے کی پشت گاہ سے لگا دیا تھا اسے بہت سکون مل رہا تھا۔

''کیا میں تمہارے لیے کچھ کرسکتی ہوں؟'' عالیہ نے پوچھا اور سمیر نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

عالیہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی سمیر اسے والہانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا اسے بھی عالیہ کی نظروں میں اپنے لیے چاہت نظر آئی تھی جو اس نے پہلے بھی محسوس کی تھی۔

پھر عالیہ نے آہستہ سے اپنا سر اس کے کاندھوں پر رکھ دیا تھا اور سمیر نے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا تھا وہ دونوں کافی دیر تک اسی طرح بیٹھے رہے تھے پھر عالیہ نے آگے بڑھ کر ٹی وی آن کردیا تھا اور وہ دونوں ایک دوسرے کو بانہوں میں لیے خاموشی سے ٹی وی دیکھتے رہے تھے پر نہ جانے کب انہیں نیند آ گئی تھی اور وہ سکون کی وادی میں پہنچ گئے تھے۔

صبح سمیر کی آنکھ کھلی تو وہ اطراف کا جائزہ لے کر حیران رہ گیا تھا۔

''میں کہاں ہوں؟'' اس نے خود سے سوال کیا تھا پھر اسے یہ سمجھنے میں چند لمحے لگے تھے کہ وہ عالیہ کے گھر میں تھا اور سو گیا تھا وہ اٹھنا چاہ رہا تھا کہ اسے کسی کی قربت کا احساس ہوا عالیہ اس کے پہلو میں بے خبر سو رہی تھی وہ تیزی سے کھڑا ہوا تو عالیہ کی آنکھ کھل گئی۔

''کیا ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

''میں معافی چاہتا ہوں...... مجھے نیند آ گئی تھی۔'' سمیر نے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔'' عالیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''عالیہ ایسا پہلی اور آخری بار ہے...... آئندہ احتیاط کرنا۔'' اس نے عالیہ سے کہا لیکن عالیہ نے کوئی جواب نہیں دیا بس اسے مسکراتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''جاؤ منہ ہاتھ دھولو...... میں کافی بناتی ہوں۔'' کچھ دیر بعد عالیہ نے کہا اور خود کچن میں چلی گئی پھر کچھ ہی دیر گزری تھی کہ عالیہ کو دروازے پر دستک سنائی دی اور اس نے تیزی سے کچن کی ایک دراز سے ایک تیز دھار چاقو نکال لیا اور دروازے کی طرف بڑھی اس نے سوچا کہ سیکیورٹی گارڈ واپس آیا ہوگا لیکن پھر بھی اس نے احتیاطاً چاقو پر گرفت مضبوط رکھی تھی اور دروازہ کھول دیا تھا اس کے سامنے وسیم چارلی کھڑا تھا اور عالیہ کے ہاتھ میں چاقو کو دیکھ رہا تھا۔

''میرا خیال ہے مجھے یہاں دیکھ کر تمہیں برا تو نہیں لگا ہوگا۔'' چارلی نے کہا اور اسے پیچھے ہٹاتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔

''تم یہاں کیا کررہے ہو؟'' عالیہ نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''مجھے تمہاری یاد آ رہی تھی۔'' چارلی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تم کیوں آئے ہو؟''

''گارڈز کہاں ہیں؟'' چارلی نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''وہ سمیر کے جانے کے بعد آئیں گے۔'' عالیہ نے جواب دیا۔

''یہ دلچسپ بات ہے کہ اس نے رات یہاں گزاری ہے؟'' چارلی بولا۔

''اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔'' عالیہ نے غصے سے جواب دیا۔

''آخر چکر کیا ہے؟'' چارلی بولا۔

''وہ میرا دوست ہے۔''

''میری بات سنو! میں تمہیں اپنے دماغ سے نہیں نکال سکا۔''

''تو میں کیا کروں؟'' عالیہ نے کہا اور چارلی اس کے بہت نزدیک آ گیا۔

''وہ تم سے پیار نہیں کرسکتا...... یہ اس کے مزاج کے خلاف ہے۔'' چارلی نے تنبیہی انداز سے کہا۔

''وہ صرف میرا دوست ہے۔'' عالیہ نے جواب دیا اور اسی وقت سمیر کچن میں داخل ہوا۔
''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اس نے غصے سے چارلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''میں یہاں عالیہ سے کچھ بات کرنے آیا تھا۔'' سمیر نے کہا۔
''کیا بات کرنے آئے تھے؟'' سمیر نے پوچھا وہ اس کا ذہن پڑھ چکا تھا کہ سمیر جھوٹ بول رہا ہے۔
''اور تم نے یہاں رات گزاری...... ہے نا...... آخر کیوں؟''
''ایسا نہیں ہے۔'' عالیہ نے مداخلت کی۔
''چارلی تم لیٹ ہو رہے ہو تمہیں جانا چاہیے۔'' سمیر نے کہا۔
''لیٹ تو تم بھی ہو رہے ہو کمانڈر۔ تمہیں بھی چلنا چاہیے۔'' چارلی نے اس کے ہی انداز میں کہا۔
''میری کار باہر موجود ہے میں تمہیں لفٹ دے دوں گا۔'' سمیر نے کہا وہ نہیں چاہتا تھا کہ چارلی وہاں عالیہ کے ساتھ اکیلا رہ جائے۔
''میرے پاس بھی کار ہے۔'' چارلی نے کہا۔
''ٹھیک ہے تو چلو...... میں تمہارے پیچھے ہی آتا ہوں۔'' سمیر نے کہا اور چارلی دروازہ کھول کر باہر نکل گیا سمیر بھی اس کے پیچھے ہی باہر نکلا تھا۔
''اگلی بار کار سے راستہ بلاک مت کرنا۔'' چارلی نے سمیر کی کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
اور تم بھی اگلی بار اس طرح یہاں آنے کے بارے میں مت سوچنا۔'' سمیر نے جواب دیا۔

❀......❀......❀......❀

عالیہ شاپنگ کر کے واپس اپنی کار کی طرف آ رہی تھی جو اس نے شاپنگ سینٹر سے کچھ فاصلے پر کھڑی کی تھی اس کے ہاتھوں میں کچھ شاپرز تھے پچھلے کئی ہفتوں سے وہ بہت پرسکون تھی اور سمیر اور چارلی کے بارے میں اسے کوئی اطلاع نہیں تھی شاید اس دن گھر پر ہونے والی بدمزگی کی وجہ نہیں سمجھا تھا مگر وہ جانتی تھی کہ چارلی آرام سے بیٹھنے والا شخص نہیں تھا اسے جب بھی موقع ملے گا وہ کوئی نہ کوئی شرارت کرے گا۔
وہ اپنی کار کے قریب پہنچی ہی تھی کہ اسے احساس ہوا جیسے اسے کوئی دیکھ رہا ہے اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا پارکنگ لاٹ میں بہت سے لوگ شاپرز کے ساتھ موجود تھے پھر ایک شخص پر عالیہ کی نظر پڑی جو اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا پھر دوسرا اور پھر تیسرا اسے کئی مشکوک لوگ نظر آئے۔
''اوہ خدایا!'' وہ بڑبڑائی اور تیزی سے اپنی کار کی طرف بڑھی اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا اس نے سوچا کہ ڈریم سینٹر کی سیکورٹی اسے تحفظ دے سکتی ہے اس نے اپنے فون کے لیے ہاتھ بڑھایا وہ جانتی تھی کہ دشمن اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے پھر اس نے چار لوگوں کو مزید اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا وہ کار کے اور اس کے درمیان کھڑے تھے عالیہ کے ہاتھ سے اس کے شاپرز اور فون نیچے گر گئے اور وہ پیچھے مڑی پیچھے بھی ان کے ساتھی موجود تھے چند لمحوں میں ان آٹھ لوگوں نے اسے گھیر لیا تھا۔
''جیکی نے تمہیں پیغام بھیجا ہے۔'' ان میں سے ایک نے کہا عالیہ اسے پہچان گئی وہ ساجد تھا جس نے کچھ ہی عرصے پہلے قبرستان کے علاقے میں سمیر سے لڑائی کی تھی۔
''تمہیں ہماری لڑائی میں نہیں کودنا چاہیے تھے۔'' اس شخص نے کہا۔
''لیکن تمہارے ساتھیوں کو ایک سبق دینا ضروری تھا۔'' عالیہ نے اسی کے لہجے میں جواب دیا۔
''ٹھیک ہے ساتھیو اس کا کام تمام کردو۔'' ساجد نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا پھر وہ بڑی دلچسپی سے اپنے سات ساتھیوں کو عالیہ کی طرف بڑھتے دیکھ رہا تھا۔
پہلا حملہ آور عالیہ کے پاس پہنچا اور اس نے اپنی ٹانگ گھما کر عالیہ کی کمر پر ماری لیکن عالیہ نے تیزی سے اس کی ٹانگ پکڑ کر گھمائی اور وہ نیچے گر گیا اس کے ساتھ ہی عالیہ نے اس کے پیٹ پر ایک کک ماری تھی اور وہ زمین سے اٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ ابھی وہ مڑی ہی تھی کہ دوسرے حملہ آور نے اسے پکڑ لیا اور اسے باڈی لاک لگانے کی کوشش کی تو عالیہ نے پیچھے اچھل کر اس کے سر پر ٹکر ماری جو ذرا سی خطا ہو کر اس کی ٹانگ پر لگی اور وہ عالیہ کو چھوڑ کر زمین کی طرف جھک گیا لیکن پھر تیسرے حملہ آور نے عالیہ پر چھلانگ لگائی تھی۔
''تم نہتی ہو تم جیت نہیں سکتی۔'' ان میں سے ایک نے

کہا۔

''اب تم کیا کرو گی؟'' ساجد نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ اسی وقت ساجد نے دیکھا کہ سمیر اپنی سیکورٹی ٹیم کے ساتھ وہاں پہنچ گیا تھا اور چند لمحوں میں انہوں نے حملہ آوروں کو ہر طرف سے گھیر لیا تھا۔

''یہاں سے بھاگ جاؤ ساجد اسی میں تمہاری خیریت ہے۔'' سمیر نے کہا۔

''ہم آٹھ ہیں اور تم صرف پانچ۔'' ساجد نے تمسخر اڑانے والے انداز میں کہا۔ تم ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔''

''تم سب کے لیے میں اکیلا ہی کافی ہوں۔'' سمیر نے ساجد کو للکارا اور پھر چشم زدن میں سمیر نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی تھی اور ایک ساتھ دو حملہ آوروں کو ساتھ لیتا ہوا زمین پر آ گیا تھا پھر بڑی پھرتی سے اس نے ایک کا ہاتھ مروڑتے ہوئے اس میں ہتھکڑی ڈال دی تھی اور دوسرے کو چارلی نے ایک گھونسا مار کر گرا دیا تھا پھر چارلی کی نظر عالیہ پر پڑی تھی جو نہتی ایک شخص سے نمٹ رہی تھی اس نے عالیہ کو آواز دی تھی۔

عالیہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا اور چارلی نے ایک چاقو اس کی طرف اچھال دیا تھا جسے عالیہ نے ہوا ہی میں پکڑ کر ایک وار اس شخص کے چہرے پر کیا تھا اور وہ اپنا گال پکڑ کر دوسری طرف پلٹ گیا تھا دیکھتے ہی دیکھتے ان پانچ لوگوں نے دشمن کے آٹھ لوگوں کو ڈھیر کر دیا تھا اور ساجد کو سمیر نے ہتھکڑی لگا دی تھی۔

''چارلی! فوراً یہ جگہ صاف کرواؤ۔'' سمیر نے کہا وہ لڑائی کی کوئی نشانی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

''یہ چاقو بہت بہترین ہے۔'' عالیہ نے اس چاقو کو بڑی مہارت سے فضا میں لہراتے ہوئے کہا اور سمیر اسے دیکھتا رہ گیا اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ عالیہ چاقو زنی میں ماہر تھی اور نہایت پھرتیلی بھی کہ اسے زیر کرنا ممکن نہیں تھا۔

''میرے پاس ایسے ایک درجن ہیں۔'' چارلی نے کہا۔

''ان میں سے پانچ مجھے دے دو۔'' عالیہ نے فرمائش کر دی اور تب ہی سمیر اس کے قریب آ گیا۔

''مجھے عالیہ سے کچھ بات کرنا ہے۔'' اس نے چارلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور وہ وہاں سے ہٹ گیا۔

''تمہارا شکریہ سمیر کہ تم میری مدد کے لیے آئے۔'' عالیہ نے کہا۔

''تمہاری سمجھ میں آیا کہ انہوں نے تم پر کیوں حملہ کیا؟'' سمیر نے پوچھا

''تم جیسی کی نظروں میں آ چکی ہو ہمیں اس حملے کی چند گھنٹے پہلے اطلاع ملی تھی میں نے تمہیں کتنا سمجھایا لیکن تم نہیں مانیں...... تم کسی بھی وقت کہیں بھی چل دیتی ہو...... میں چوبیس گھنٹے تمہاری حفاظت نہیں کر سکتا۔'' سمیر نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

''وہ بار بار تمہارے پیچھے آتے رہیں گے۔''

''کیا؟ تم نے کیا کہا......؟'' عالیہ نے پوچھا۔

''تمہاری مداخلت کی وجہ سے سب کچھ بدل گیا ہے اب ہمارے سامنے صرف دو راستے ہیں ایک تو یہ کہ تم شہر چھوڑ دو اور دوسرا یہ کہ میں تمہیں ڈریم سینٹر میں شامل کر لوں۔''

''میرا خیال ہے کہ میرے ڈریم سینٹر میں شامل ہونے کے تم سب سے زیادہ مخالف تھے؟'' عالیہ نے کہا۔

''میں ہر حال میں تمہیں زندہ دیکھنا چاہتا ہوں...... تمہیں ابھی یہ فیصلہ کرنا ہوگا اب سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ اگر ڈریم سینٹر جوائن کرو گی تو میرے احکامات پر سختی سے عمل کرو گی کوئی سوال نہیں پوچھو گی اور تمہیں اپنی تمام مہارتوں کو بھی چھپانا ہوگا اپنی ساری ماہرانہ چالیں ان پر ظاہر مت کرو اگر میں نے محسوس کیا کہ تم میرے احکامات سے انحراف کر رہی ہو تو میں تمہیں فیلڈ سے ہٹا دوں گا اور تم اپنی باقی تمام زندگی ڈیسک کے پیچھے بیٹھ کر کام کرتے ہوئے گزار دو گی۔'' سمیر کی بات پر عالیہ نے اثبات میں گردن ہلائی تھی۔

''اگر تم یہاں سے جانے کا فیصلہ کرتی ہو تو میں با حفاظت کہیں پہنچا دوں گا اور تم کسی بھی صورت میں دوبارہ شہر میں داخل نہیں ہو سکو گی اور نہ ہی یہاں کے کسی شخص سے رابطے میں رہو گی۔ مجھ سے بھی نہیں کم از کم شروع کے کئی سال تک...... اب بولو تم کیا چاہتی ہو عالیہ؟'' سمیر نے کہا اور عالیہ کچھ دیر تک اسے دیکھتی رہ گئی وہ جانتی تھی کہ پہلا فیصلہ اس کی ساری زندگی بدل دے گا لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کی دل کی آواز کیا کہہ رہی ہے۔

''میں یہاں ہی رہوں گی۔'' عالیہ نے کہا۔

''اوکے۔''

''میں آرگنائزیشن میں رہ کر تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔''

عالیہ نے سمیر کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔

''جب تم ٹریننگ سے واپس آؤ گی تو تم ڈریم سینٹر کی سیکورٹی سروس کی ایک ایجنٹ ہوگی۔'' سمیر نے کہا۔

''میں تمہارا کمانڈر ہوں گا ہماری دوستی کی ثانوی حیثیت ہوگی میں تمہارے ساتھ ویسا ہی سلوک کروں گا جیسے دوسرے ایجنٹ کے ساتھ کرتا ہوں تم میری بات سمجھ رہی ہو میں کیا کہہ رہا ہوں؟''

''ٹھیک ہے جیسا تم چاہو گے ویسا ہی ہوگا۔'' عالیہ نے کہا۔

''تم سیکورٹی میں اپنے گھر جاؤ گی۔ اپنی کار میں انتظار کرو میں کال کرتا ہوں وہ سات منٹ میں یہاں پہنچ جائیں گے۔'' سمیر نے کہا۔

''میں عالیہ کو گھر پر چھوڑ دوں گا میرا ٹائم بھی آف ہونے والا ہے۔'' چارلی نے کہا۔

''نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے سیکورٹی اسے کور کرے گی۔'' سمیر نے جواب دیا اور چارلی بُرا سا منہ بنا کر باقی لوگوں کے ساتھ اس ٹرک میں سوار ہوگیا جو انہیں لینے آیا تھا۔ وہاں صرف عالیہ اور سمیر رہ گئے تھے پھر سیکورٹی کے آنے پر عالیہ ان کے ساتھ روانہ ہوگئی تھی۔

❀.......❀.......❀.......❀

سمیر ڈریم سینٹر میں اپنے آفس میں موجود تھا اور ناصر محمود، حفیظ صدیقی اور ڈاکٹر طلحہ بھی وہاں موجود تھے وہ ایک روز قبل ہونے والے عالیہ کے واقعے پر بات کررہے تھے سمیر نے انہیں بتایا تھا کہ وہ کیسے اچانک موقع پر پہنچ گیا تھا اور عالیہ کی مدد کی تھی۔

''یہ تو بہت پریشانی کی بات ہے۔'' ناصر محمود نے کہا۔

''ہاں! لیکن بہر حال ہمیں حالات کا سامنا کرنا ہے عالیہ کی حفاظت میری ذمہ داری ہے اور میں اسے اپنے طور پر نباہ رہا ہوں لیکن جب وہ میرے ساتھ تعاون نہیں کرے گی تو اس کی حفاظت کرنا میرے لیے مشکل ہوگا۔''

''پھر اب کیا سوچا ہے؟'' حفیظ صدیقی نے پوچھا۔

''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ عالیہ کو ڈریم سینٹر کی ٹیم میں شامل کرلیا جائے۔'' سمیر نے کہا۔

''کیا؟'' ڈاکٹر طلحہ نے حیرت سے کہا۔

''تم اس ڈریم سینٹر کی ٹیم میں شامل نہ کرنے کے باغی تھے؟'' ناصر محمود نے کہا۔

''ہاں! اس طرح بھی میں اسے مسائل سے دور رکھنا چاہتا تھا لیکن اب یہ ممکن نہیں ہے پچھلے ایک دو ناخوش گوار واقعات کی وجہ سے عالیہ دشمن کی نظر میں آچکی ہے اب وہ ہمارے ساتھ شامل ہوکر ہی محفوظ ہوسکتی ہے کیونکہ چوبیس گھنٹے ہماری نظر کے سامنے ہوگی۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو اگلا قدم کیا ہوگا؟'' حفیظ صدیقی نے پوچھا۔

''ویسے تو وہ خاصی ماہر فائٹر ہے لیکن پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ اس کی مزید ٹریننگ کی جائے تاکہ ہم بلاخوف اسے اپنے مشن میں شامل کرسکیں۔'' سمیر نے کہا۔

''اور اسے ٹریننگ دینے کے لیے تم کس کا نام تجویز کرو گے؟'' ناصر محمود نے کہا۔

''ہمارے پاس بہت اچھے فائٹر موجود ہیں یہاں پر لوگوں کو ٹریننگ بھی دے رہے ہیں ان میں سے ہی کسی کو منتخب کروں گا۔'' سمیر نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' حفیظ صدیقی نے جواب دیا۔

''تم عالیہ کی ڈیٹا فائل مرتب کرلو اور دستخط کے لیے مجھے بجھوا دو۔'' سمیر نے حفیظ سے کہا۔

''اوکے۔'' حفیظ نے جواب دیا پھر وہ واپسی کے لیے کھڑا ہوگیا تھا اور ناصر محمود اور ڈاکٹر طلحہ بھی اس کے ساتھ ہی کمرے سے رخصت ہوگئے تھے ان کے جانے کے بعد سمیر نے کرسی کی پشت گاہ سے سر ٹکالیا تھا اور عالیہ کی صورت اس کے ذہن میں ابھر آئی تھی سمیر نے ایک گہری سانس لی تھی اور عالیہ کے ذہن میں پہنچ گیا تھا لیکن اسے اپنی موجودگی کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ اس وقت ڈریم سینٹر کی ایک پرانی عمارت کی چھت پر موجود تھی جو بالکل خالی پڑی تھی اور اس کے ساتھ وسیم چارلی تھا سمیر ان دونوں کو وہاں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا اسے احساس ہی نہیں تھا کہ عالیہ چارلی کے اتنے قریب ہوگئی ہے۔

''تمہارا شکریہ عالیہ کہ تم نے میری بات مان لی اور میرے ساتھ یہاں تنہائی میں ملنا منظور کرلیا۔'' چارلی نے

عالیہ سے کہا۔
''میں بھی ایسے کسی موقع کی تلاش میں تھی چارلی۔''
عالیہ نے جواب دیا جس پر سمیر کو حیرت ہوئی۔
''اس کا مطلب ہے میں سمجھوں کہ تم نے میری دوستی اور محبت کو قبول کرلیا ہے؟'' چارلی نے ہنستے ہوئے پوچھا۔
''ظاہر ہے ورنہ اس وقت میں یہاں تمہاری خواہش پر کیسے آجاتی۔''
''اوہ عالیہ..... تم کتنی عجیب ہو کبھی حد سے زیادہ خطرناک نظر آتی ہو کبھی موم کی طرح ملائم، نرم ہوجاتی ہو کبھی میری دشمن بن جاتی ہو اور کبھی مجھ پر مہربان ہوجاتی ہو۔'' چارلی شاعری کے موڈ میں نظر آرہا تھا۔
''ہم یہاں کھلی چھت پر محفوظ نہیں ہیں یہاں دور دور سے کوئی بھی دیکھ سکتا ہے دیکھو شہر کی ساری ہی عمارتیں اور سڑکیں نظر آرہی ہیں۔'' عالیہ نے کہا۔
''ہاں لیکن ہم اتنی اونچائی پر اور دوری پر ہیں کہ ہمیں دوربین سے ہی دیکھا جاسکتا ہے۔''
''میرے گارڈز کو شک نہ ہوجائے کہ میں تمہارے ساتھ آئی ہوں۔'' عالیہ نے خدشہ ظاہر کیا۔
''انہیں پتہ نہیں چلے گا..... تم نے دیکھا نہیں اس روز میں تمہارے گھر آیا تھا اور گارڈز بے خبر تھے۔'' چارلی نے کہا اور سمیر کا خون کھول اٹھا۔
''میں تم سے محبت کرتا ہوں..... اور تمہیں اپنانا چاہتا ہوں..... تم جانتی ہو میں کیسا فائٹر ہوں اور ناقابل تسخیر ہوں..... مجھ سے بہتر تمہاری حفاظت کون کرسکتا ہے؟'' چارلی نے عالیہ کے قریب آتے ہوئے کہا اور پھر اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنے سینے سے لگالیا عالیہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی اور سمیر حیران رہ گیا تھا پچھلی بار تو وہ سمیر سے پیار جتا رہی تھی اور اس وقت چارلی کو بے وقوف بنا رہی تھی۔
''چارلی! اگر اس بارے میں سمیر کو پتہ چل گیا تو وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔'' عالیہ نے کہا۔
''اسے کیسے پتہ چلے گا؟ نہ تم بتاؤ گی نہ میں۔'' چارلی نے اس کے گالوں کو چھوا اور اس پر جھکتا چلا گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ اس کے ہونٹوں کا بوسہ لے اس کا سیل فون چیخ اٹھا تھا۔
''اوہ شٹ۔'' اس نے جھنجلا کر کہا اور عالیہ کو چھوڑ کر جیکٹ کی جیب سے فون نکالا اور دوسری طرف سے سمیر بول رہا تھا جس نے عین موقع پر کال کرکے اسے عالیہ سے دور کردیا تھا۔
''ہیلو سمیر کیا بات ہے؟'' چارلی نے کہا۔
''تم کہاں ہو؟'' سمیر نے پوچھا۔
''میں قریب ہی موجود ہوں۔'' چارلی نے مبہم سے جواب دیا۔
''تمہارے ساتھ کوئی ہے؟'' سمیر نے پوچھا تو چارلی اس سوال پر چونکا۔
''ہم..... میں اکیلا ہوں۔''
''فوراً ڈریم سینٹر آجاؤ۔'' سمیر نے حکم دیا۔
''لیکن کیوں؟ میٹنگ تو شام میں ہے۔'' چارلی نے توجیہہ پیش کی۔
''ہاں لیکن کچھ ایمرجنسی ہے آجاؤ۔'' سمیر نے کہا۔
''ٹھیک ہے میں آدھے گھنٹے میں آتا ہوں۔'' چارلی نے کہا اور فون بند کردیا اس کا موڈ آف ہوگیا تھا اور آنکھوں سے غصہ جھانک رہا تھا۔
''کیا ہوا!'' عالیہ نے انجان بنتے ہوئے پوچھا حالانکہ گفتگو سن کر اسے اندازہ ہوگیا تھا۔
''سمیر ڈریم سینٹر بلا رہا ہے مجھے ابھی جانا ہوگا۔'' چارلی نے کہا۔
''کوئی خاص بات ہے؟''
''پتہ نہیں..... اس نے کہا ہے کوئی ایمرجنسی ہے جلدی بلا رہا ہے۔'' چارلی نے بتایا۔
''ٹھیک ہے..... پھر ہماری ملاقات ختم۔'' عالیہ نے اداسی سے کہا۔
''نہیں..... ختم کیوں؟ ہم پھر ملیں گے..... بہت جلد..... تم جانتی ہو میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔''
''نہیں میں نہیں جانتی۔'' عالیہ نے مزاحیہ انداز سے کہا۔
''چلو میں تمہیں تمہارے گھر ڈراپ کروں پھر ڈریم سینٹر جاؤں گا۔'' چارلی نے کہا۔
''میں چلی جاؤں گی۔''
''نہیں میں تمہیں اکیلا نہیں جانے دوں گا۔'' چارلی

نے کہا اور اس کے ساتھ عمارت کے نچلے حصے میں جانے کے لیے لفٹ میں سوار ہو گیا۔

❀......❀......❀......❀
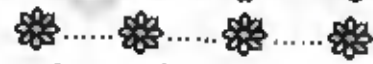
جب وہ ڈریم سینٹر پہنچا تو سمیر اس کا منتظر ہی تھا اور اپنے کمرے میں بیٹھا سگریٹ کے کش لے رہا تھا چارلی کو دیکھ کر اس کی پیشانی پر بل پڑے تھے اس کے سمجھانے کے باوجود چارلی عالیہ سے دور نہیں ہوا تھا۔

''کیا بات ہے تم ٹھیک تو ہو؟'' سمیر نے اسے دیکھتے ہوئے کہا وہ روزمرہ سے مختلف لگ رہا تھا۔

''ہاں...... میں ٹھیک ہوں۔'' چارلی نے کہا لیکن سمیر کی نظریں اس کے بازوؤں پر تھیں جہاں ناخنوں کے تازہ کھرونچے بنے ہوئے تھے جو کچھ ہی دیر پہلے عالیہ کے جذبات میں بہہ جانے پر اس کی کلائیوں کو زور سے پکڑنے پر بنے تھے۔

''نہیں کیا ہوا ہے؟ دیکھو تمہارے ہاتھوں پر تازہ کھرونچے کیسے بنے ہیں...... کسی سے لڑائی جھگڑا تو نہیں ہوا؟'' سمیر نے پوچھا اور چارلی کو اپنی بے پروائی پر غصہ آ گیا اس نے سوچا اسے یہاں آنے سے پہلے اپنا بھی بھرپور جائزہ لینا چاہیے تھا۔

''ارے نہیں...... یہ کچھ نہیں ہے۔'' چارلی نے بے پروائی سے کہا۔

''تم سچ کہہ رہے ہو کوئی لڑائی تو نہیں ہوئی؟'' سمیر نے تصدیق چاہی۔

''دیکھو تم جانتے ہو کہ ہمارے اصولوں میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اگر کسی کے ساتھ کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آئے تو وہ فوراً ادارے کو رپورٹ کرے۔'' سمیر نے کہا۔

''میں جانتا ہوں...... لیکن یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔'' چارلی نے کہا۔

''تمہیں یقین ہے؟'' سمیر نے کہا پھر اس نے سگریٹ کا لمبا کش لیا تھا۔

''عالیہ کہاں ہے؟'' اس نے اچانک پوچھا تو چارلی چونک گیا۔

''کیا؟'' اس نے حیرت سے کہا وہ سوچ رہا تھا کہ سمیر اس سے عالیہ کے بارے میں کیوں پوچھ رہا ہے کہیں وہ جان تو نہیں گیا کہ وہ عالیہ کے پاس سے آ رہا ہے۔

''میرا مطلب ہے کہ کل کے واقعے کے بعد تمہاری بات عالیہ سے ہوئی وہ کیسی ہے؟'' سمیر نے کہا۔

''وہ ٹھیک ہے۔'' چارلی نے جلدی سے کہا۔

''تمہاری کار کہاں ہے؟'' سمیر نے اگلا سوال کر دیا۔

''میرے گھر پر...... میں نے یہاں تک واک کر کے آنا مناسب سمجھا۔'' چارلی نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے کل ساجد کو موقع واردات سے پکڑا تھا آج اس سے کچھ معلومات اگلوانا ہیں۔ یہ کام میں اور تم کریں گے وہ investigation room میں ہے آؤ چلو۔'' سمیر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں جب investigation room میں پہنچے تو ساجد وہاں موجود تھا اسے چند لمحے پہلے ہی وہاں لایا گیا تھا اس کے ہاتھوں میں آہنی کڑیاں لگی تھیں اور ہاتھ میز پر رکھے تھے وہ ایک کرسی پر بیٹھا تھا اور میز کے دوسری طرف دو کرسیاں رکھی تھیں۔

''وہ مجھ سے کچھ اگلوا نہیں سکے تو اب تم دونوں کو بھیجا ہے۔'' ساجد نے حقارت سے کہا۔

''شکر کرو کہ یہ جیلی کا پوچھ کچھ کا کمرہ نہیں ہے ورنہ اب تک تم آدھے مر چکے ہوتے۔'' سمیر نے کہا اور سمیر اور چارلی کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے۔

''تم لوگوں کو شرم آنا چاہیے ایسی حرکتیں کرتے ہوئے لوگوں کی نظریں تم پر لگی ہیں۔'' ساجد نے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔

''تمہاری گرفتاری ریکارڈ میں نہیں ہے اس کا کہیں اندراج نہیں ہے اس کمرے میں کوئی کیمرہ نہیں ہے کوئی شیشہ نہیں ہے...... کچھ نہیں۔'' سمیر نے کہا۔

''تم اس کمینے شخص کو یہاں کیوں لائے ہو؟'' ساجد نے چارلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ میرے گھر پر میری بیوی کے ساتھ بے تکلف ہو چکا ہے۔'' ساجد کے چہرے پر غصہ تھا۔

''جب کہ تم باہر کہیں رنگ رلیاں منا رہے تھے۔'' چارلی نے اسی کے انداز میں جواب دیا اور ساجد اسے مارنے کے لیے اٹھا لیکن سمیر نے اسے پکڑ کر بٹھا دیا ساجد کی نظر اچانک چارلی کے ہاتھوں پر بنے کھرونچوں پر پڑی۔

''تمہیں کیا ہوا ہے؟ لگتا ہے کسی عورت نے تمہیں کھرونچے مارے ہیں یہ ناخنوں کے نشان ہیں۔''
''یہ ایک بلی کے پنجے ہیں۔'' چارلی نے بات بنائی۔
''اور گردن پر لپ اسٹک بھی بلی نے لگائی ہے۔'' ساجد نے ہنستے ہوئے کہا اور چارلی نے اچھل کر اس کی گردن دبوچ لی۔ سمیر نے پھر ساجد کو چھڑایا لیکن چارلی نے بیٹھے بیٹھے ایک زوردار مکا ساجد کے منہ پر مارا تھا۔
''چارلی کیا کر رہے ہو؟'' سمیر نے کہا وہ سوچ رہا تھا کہ چارلی کبھی بھی پوچھ گچھ کے دوران اتنا جارحانہ رویہ نہیں رکھتا تھا۔
''مجھے بتاؤ تم حادثے کے بارے میں کیا جانتے ہو؟'' سمیر نے ساجد سے پوچھا جو اپنی ناک سے بہنے والا خون صاف کر رہا تھا۔
''تم نے لڑائی کو انجام تک پہنچا تو دیا تھا۔'' ساجد نے کہا۔
''نہیں میں جانتا ہوں بات ختم نہیں ہوئی ہے۔ یہ بتاؤ کہ تمہاری ناکامی کی صورت میں تمہاری جگہ کس کو کام دیا جائے گا؟'' سمیر نے پوچھا۔
''مجھے نہیں معلوم۔''
''سوچ کر بتاؤ۔'' سمیر نے غصے سے کہا۔
''تم انہیں نہیں روک سکتے۔'' ساجد نے تنبیہی انداز میں کہا۔
''کیوں نہیں روک سکتے؟'' چارلی نے پوچھا لیکن اس کی بات کا ساجد نے کوئی جواب نہیں دیا۔
''ساجد!'' سمیر نے غصے سے اسے آواز دی۔
''میں جواب کا انتظار کر رہا ہوں۔''
''عالیہ اتنی خوب صورت ہے کہ اسے بھولا نہیں جاسکتا۔'' ساجد نے سمیر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور ایک ہی لمحے میں سمیر تیزی سے اپنی کرسی سے اٹھا اور ساجد پر چھلانگ لگادی وہ اس کے ساتھ ہی فرش پر گرا تھا اور چارلی حیرت سے سمیر کو دیکھ رہا تھا عام طور پر وہ پوچھ گچھ میں اتنا جارحانہ رویہ نہیں استعمال کرتا تھا۔
''بتاؤ..... میرے سوال کا جواب دو۔'' سمیر نے ساجد کے بال مٹھی میں پکڑ کر کھینچے۔
''میں جیکی گروپ کا سب سے سینئر ممبر ہوں اگر میں کسی آپریشن میں ناکام ہوتا ہوں تو تمہارے خیال میں میرے علاوہ کوئی ہے جو یہ کام کر سکے گا؟'' اس نے الٹا سمیر سے پوچھا۔
''کوئی بھی جس کی صلاحیتیں تم سے زیادہ ہو؟'' چارلی نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔
''میں نے اتنے سال جیکی کے لیے کام کیا اور اب وہ سمجھتا ہے کہ وہ لوگ مجھ سے بہتر ہیں مجھ سے اچھا کام کر سکتے ہیں جو وہ ان ریٹائرڈ فوجیوں کو درمیان میں لایا ہے۔'' ساجد نے کہا۔
''منصور احمد وہ کہاں ہے؟ کیا وہ اس وقت شہر میں ہے؟'' سمیر نے پوچھا۔
''وہ اس لڑکی کو مار دے گا..... کوئی ان لوگوں کو نہیں روک سکتا۔'' ساجد نے کہا اور چارلی نے اس کے پیٹ پر ایک زوردار مکا مارا۔
''وہ کہاں ہے۔'' سمیر نے سوال دہرایا۔
''میں نہیں جانتا۔'' ساجد نے کہا اور چارلی نے پھر اسے مارا اس بار مکا پڑنے سے ساجد کی پسلی ٹوٹنے کی آواز آئی تھی اور وہ بری طرح کراہ رہا تھا۔
''جہاں تک مجھے پتہ ہے وہ ابھی یہاں نہیں پہنچا اس کی ٹیم کہیں اور کسی کام میں مصروف ہے میں نہیں جانتا کہ کہاں اور جاننا بھی نہیں چاہتا۔'' ساجد نے بتایا۔
''کتنا عرصہ لگے گا؟'' سمیر نے پوچھا۔
''کم از کم ایک مہینہ۔'' ساجد نے جواب دیا۔
''میں انہیں کیسے ڈھونڈوں گا جب وہ یہاں آئیں گے تو جیکی انہیں کہاں کام دے گا؟'' سمیر نے پوچھا۔
''تم ان کی خاک کو بھی نہیں چھو سکتے۔''
''وہ کہاں کارروائی کریں گے؟''
''میں نہیں جانتا۔'' ساجد نے کہا۔
''ٹھیک ہے..... چلو چارلی۔'' سمیر نے واپس مڑتے ہوئے کہا چارلی بھی اس کے ساتھ ہی واپس مڑا تھا۔
''او چارلی..... وہ عورت جو کوئی بھی ہے جس نے تمہارے ہاتھوں پر کھرونچے بنائے ہیں میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔'' ساجد نے کہا اور چارلی نے اپنی جیکٹ سے پستول نکالی اور اس کے گھٹنے پر فائر کر دیا تھا اور ساجد کراہتا ہوا فرش پر گر گیا تھا۔

"اب ڈھونڈنا اس عورت کو۔" چارلی نے غصے سے کہا اور پھر کمرے سے نکل گیا تھا سمیر کچھ لمحے کھڑا ساجد کو دیکھتا رہا تھا اور پھر کمرے سے نکل گیا تھا باہر دو سیکورٹی گارڈ بھاگتے ہوئے ان کی طرف آئے تھے۔

"ہم نے فائر کی آواز سنی تھی؟" سمیر سے انہوں نے کہا جس پر سمیر نے اثبات میں گردن ہلائی اور انہیں کمرے میں جانے کا اشارہ کیا۔

❀......❀......❀......❀

سمیر اپنے کمرے میں بیٹھا تھا اور اس کے سامنے ناصر محمود بیٹھا بغور اس کی طرف دیکھ رہا تھا اس کی میز پر رکھے وائرلیس کانفرنس ڈیوائس سے اس کے بہترین فائٹر بشیر احمد کی آواز آرہی تھی جو پچھلی فائٹنگ کے ردعمل کی رپورٹ دے رہا تھا جو دہشت گردوں سے ان کی ہوئی تھی۔

"پچھلی لڑائی نے دہشت گردوں پر ہماری دھاک بٹھادی ہے۔" بشیر احمد نے کہا۔

"کبھی بھی دشمن کو کمزور نہیں سمجھنا چاہیے۔" سمیر نے جواب دیا جس پر ناصر محمود نے اثبات میں سر ہلایا تھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"میں صحیح کہہ رہا ہوں..... وہ سب خوف زدہ محسوس ہوتے ہیں..... انہیں تمہاری صلاحیتوں کا اندازہ نہیں تھا اب انہیں ڈر ہے کہ تم ان پر بازی لے جانے کی صلاحیت رکھتے ہو۔"

"انہیں ابھی میری صلاحیتوں کا اندازہ نہیں ہے کیونکہ ابھی تو میں نے ان کا مظاہرہ بھی نہیں کیا۔"

"ان میں آدھے تو خاصے ناامید نظر آتے ہیں اور کچھ کا خیال ہے کہ تمہارے ساتھ ایک بے نام معاہدہ کرلیا جائے۔" بشیر نے اسے بتایا۔

"دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے..... میرا کسی دہشت گرد سے کوئی معاہدہ کرنے کا ارادہ نہیں ہے بس انہیں ختم کرنے میں دلچسپی رکھتا ہوں۔" سمیر نے سخت لہجے میں کہا۔

"بہت خوب..... میں تمہارا معترف ہوں۔" بشیر نے کہا۔

"ہمارے لیے یہ شرم کا مقام ہے کہ معاملات یہاں تک آگئے ہیں انہیں بہت پہلے ان کے انجام کو پہنچ جانا چاہیے تھا۔" سمیر نے کہا۔

"ہاں! خلیل کامران کو بھی ایسے ہی اقدامات کرنا چاہیے تھے کہ وہ اسے چیلنج کرنے کے قابل نہیں تھے۔"

"ہوں! مجھے ٹریننگ ونگ کے بارے میں بتاؤ؟" سمیر نے کہا کیونکہ بشیر وہاں کا انچارج تھا۔

"ہمارے پاس جو نئے فائٹر آتے ہیں جن کو ٹریننگ دینا ہے سات ڈیسک اسٹاف میں ہیں اور صرف دو فیلڈ آپریشن کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تمہارے بنائے ہوئے قانون کے مطابق۔"

"اب وہ تین ہوگئے ہیں۔" سمیر نے جواب دیا۔

"تیسرا کون ہے؟" ناصر محمود نے پوچھا اس کے ہاتھ میں قلم تھا اور وہ تفصیلات لکھتا جارہا تھا۔

"عالیہ خلیل کامران۔" سمیر نے جواب دیا اور ناصر محمود حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"اوخدایا!" بشیر کی آواز اسپیکر سے آئی۔

"خلیل کامران کی بیٹی؟" ناصر محمود نے کہا۔

"ہاں وہی۔" سمیر نے مختصر جواب دیا۔

"میرا خیال تھا کہ تم تو اس کی حفاظت کررہے تھے؟" ناصر محمود نے کہا اس کے چہرے پر اب بھی حیرت کے آثار تھے۔

"ہاں ایسا ہی ہے لیکن اس پر حملہ ہوا ہے..... تم جانتے ہو کہ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم وہاں وقت پر پہنچ گئے..... شاید آئندہ ایسا نہ ہوسکے..... وہ لوگ اب بھی سرگرم ہیں اور ہر بار اسے نشانہ بنانے کی کوشش کریں گے اور عالیہ کو حفاظت کی اب زیادہ ضرورت ہے۔ سیکیورٹی گارڈز کی حفاظت کافی نہیں ہے عالیہ خود بہت ہی ماہرانہ ٹریننگ کی صلاحیتوں کی مالک ہے اور وہ ہمارے لیے ایک بہترین سرمایہ ثابت ہوسکتی ہے۔"

"سمیر! میں اس کی بہترین تربیت کرسکتا ہوں لیکن ہمارے لیے کچھ خطرات بھی ہوسکتے ہیں اگر تربیت پانے کے بعد وہ ایک اور وسیم چارلی بن گئی تو ہمارے لیے مشکل ہوسکتی ہے کیونکہ وہ اکثر اپنی صلاحیتوں کے گھمنڈ میں آتے سے اکڑ جاتا ہے اور حکم عدولی کرتا ہے۔" بشیر احمد نے کہا۔

"اوہ! میں ایسا نہیں چاہتا اس طرح ہمیں ایک وقت میں دو سر پھروں سے واسطہ پڑ جائے گا۔" ناصر نے کہا۔

''تم پریشان مت ہو...... وہ حکم عدولی نہیں کرے گی میں اس سے بات کر چکا ہوں ...... بشیر تم اس کو ٹریننگ ونگ میں داخل کرلو اور اس کی تربیت کرو۔'' سمیر نے کہا۔

''ٹھیک ہے میں کام شروع کرتا ہوں۔'' بشیر نے جواب دیا۔

''پھر بات ہوگی۔'' سمیر نے کہا اور کال کاٹ دی پھر وہ ناصر محمود کی طرف مڑا تھا۔

''یہ ٹھیک رہے گا۔'' ناصر محمود نے کہا۔

''ہاں دیکھتے ہیں۔'' سمیر نے جواب دیا۔

''ساجد کی طرف سے کوئی نئی خبر؟'' سمیر نے پوچھا تو ناصر نے نفی میں سر ہلایا۔

''وہ بہت کچھ جانتا ہے...... وہ جانتا ہے کہ اس دہشت گردی کو کیسے روکا جاسکتا ہے ہمیں اپنی طرف سے تفتیش کا آغاز کردینا چاہیے۔'' سمیر نے کہا۔

''تمہارے ذہن میں کیا ہے؟''

''وسیم چارلی کہاں ہے۔'' سمیر نے پوچھا۔

''کچھ پتہ نہیں آج وہ ڈیوٹی پر بھی حاضر نہیں ہے۔'' ناصر نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے اس کا پتہ لگاتا ہوں۔''

''کیا تم چارلی سے کہو گے کہ اس سے مزید پوچھ گچھ کرے؟''

''ہم دونوں ہی کریں گے۔'' سمیر نے کہا۔

''کیا میڈیکل ایڈ کو تیار رکھنے کی ضرورت ہے؟'' ناصر محمود نے پوچھا وہ جانتا تھا کہ جب سمیر اور چارلی ایک ساتھ کسی سے پوچھ گچھ کرتے ہیں تو اس کی ضرورت ہمیشہ پیش آتی ہے۔

عالیہ کو ڈریم سینٹر کے ٹریننگ ونگ میں پہنچے ہوئے چند ہی منٹ ہوئے تھے گیٹ پر موجود سیکورٹی گارڈ نے اسے ٹریننگ ونگ کی بیرک میں پہنچا دیا تھا جہاں باقی نئے ٹریننگ حاصل کرنے والے بھی ٹھہرتے تھے وہ سب کالی ٹریک پہنے ہوئے تھے اور بلیک ہی جیکٹ بھی تھی عالیہ کو سیکورٹی گارڈ نے جو ہدایات بتائی تھیں وہ ان پر عمل کر رہی تھی اسکے کاندھے پر ایک جم بیگ پڑا تھا اس میں اس کی ضروریات کی تمام چیزیں موجود تھیں وہ کچھ فیلنگ پینٹ کی ہوئی بیرکس کے قریب پہنچی تھی جو ٹین کے ڈبوں کی شکل میں بنی تھیں اور ان کے چاروں طرف لمبی لمبی گھاس اگی ہوئی تھی وہ دھیرے سے مسکرادی۔

وہ ایک بیرک جس پر Def-3 لکھا ہوا تھا اس میں داخل ہوگئی اس نے چاروں طرف گھوم کر جائزہ لیا وہاں کوئی پریشان کرنے والی چیز نہیں تھی کمرے میں دو بیڈ دیواروں کے ساتھ آمنے سامنے لگے تھے جن کے درمیان میں لوہے کی پارٹیشن تھی ہر بیڈ کے ساتھ درازوں والی ایک ایک میز رکھی تھی اچانک اسے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اور اس نے پلٹ کر دیکھا۔

''ہائے!'' عالیہ کے سامنے اس سے عمر میں تین سال بڑی ایک لڑکی کاندھے پر جم بیگ ڈالے کھڑی تھی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے اس کی طرف دیکھ رہی تھی اس نے سر کے بالوں کو پونی ٹیل کی شکل میں باندھا ہوا تھا اس کی رنگت سانولی تھی اور آنکھوں کا رنگ براؤن تھا اس نے بلیو ٹراؤزر اور بلیک جیکٹ پہنا ہوا تھا وہ خاصی خوش شکل تھی اور شاید اسے اس بات کا احساس بھی تھا اس کے انداز میں اعتماد اور کسی حد تک غرور کا عنصر شامل تھا۔

''سرینہ مشتاق۔'' اس نے اپنا بیگ نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

''عالیہ خلیل۔'' عالیہ نے اپنا تعارف کرایا۔

''تم سے مل کر خوشی ہوئی۔'' سرینہ نے کہا وہ کمرے کا جائزہ لیتی جا رہی تھی۔

''کچھ خاص جگہ نہیں ہے۔'' اس نے کہا اور عالیہ کی طرف مڑی۔

''تم کون سا بیڈ لوگی؟''

''کوئی بھی۔'' عالیہ نے جواب دیا۔

''گڈ۔'' وہ مسکرائی اور اس نے اپنا بیگ کمرے کے آخری حصے میں لگے بیڈ پر رکھ دیا اور خود بھی بیڈ پر بیٹھ کر اچھلنے لگی وہ اس کی مضبوطی اور آرام دہ ہونے کو چیک کر رہی تھی اور عالیہ اپنا بیگ کھول کر اپنی چیزیں درازوں میں رکھ رہی تھی اچانک اس کے ہاتھ سے کپڑے میں لپٹی ہوئی کوئی چیز نیچے گری عالیہ نے اسے اٹھالیا اور کھولا وہ تیز دھار چاقو تھا جو چند دن پہلے ہی اسے چارلی نے دیا تھا عالیہ اسے ہاتھ میں لے کر مہارت سے گھمانے لگی۔

''بہت ماہر ہو۔'' سرینہ نے کہا وہ اس کے قریب آ گئی

تھی۔
''یہ تمہیں کہاں سے ملا؟''
''ایک دوست نے دیا ہے۔'' عالیہ نے جواب دیا۔
''کیا وہ دوست کوئی لڑکا ہے؟'' سرینہ نے پوچھا۔
''ہوسکتا ہے۔'' عالیہ نے مبہم سا جواب دیا اور پھر وہ دونوں ہنس پڑی تھیں عالیہ کو بہت اچھا لگا وہ بہت عرصے بعد کھل کر ہنسی تھی۔
عالیہ خود کو ایک عام سی لڑکی محسوس کر رہی تھی جو اپنی دوست کے ساتھ اپنے کسی چاہنے والے کا تذکرہ کر رہی ہو۔
''لڑکیو!'' اچانک کمرے میں ایک آواز گونجی انہوں نے مڑ کر دیکھا کمرے میں ایک نوجوان لڑکا داخل ہو رہا تھا وہ گنجا تھا اس کی آنکھوں میں چمک تھی اس نے بھی کیمو فلیگ پینٹس پہنی ہوئی تھی اور کالی ٹی شرٹ تھی اور بھاری فوجی جوتے پہنے تھا۔
''میرا نام تنویر ارمان ہے۔'' اس نے کہا تو عالیہ اور سرینہ نے بھی اپنا تعارف کروایا اس نے عالیہ کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔
''تم...... عالیہ ہو...... عالیہ خلیل؟'' اس نے کہا۔
''میں حیران تھا کہ تم دیکھی ہوئی کیوں لگ رہی ہو تم وہی ہو نا جسے جیکی گروپ نے مطلوب قرار دیا ہے۔ اور تم وہ واحد شہری ہو جو ڈریم سینٹر کی طرف سے کسی فائٹ میں حصہ لے چکی ہے۔''
''خوشی ہوئی کہ میں مشہور ہوگئی ہوں۔'' عالیہ نے اس کی بات پر ہنستے ہوئے کہا۔
''تمہارے ساتھ ٹریننگ کا مزہ آئے گا۔'' تنویر نے کہا اور مصافحے کے لیے عالیہ کی طرف ہاتھ بڑھایا پھر وہ تینوں ہنسنے لگے تھے پھر اچانک لاؤڈ اسپیکر کی تیز آواز پر چونکے تھے۔
''اٹینشن تمام ممبرز وومنٹ میں فزیکل ٹریننگ ونگ کے ارینا ہال میں جمع ہو جائیں۔'' یہ آواز بیرک میں لگے اسپیکر سے آ رہی تھی۔
''چلو جلدی کرو۔'' سرینہ نے عالیہ اور تنویر سے کہا اور وہ اپنا سامان بیرک میں چھوڑ کر ٹریننگ ونگ کے ارینا ہال کی طرف چل پڑے۔
کچھ ہی دیر بعد عالیہ سرینہ اور تنویر ارینہ ہال کے سینٹر میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے اور اپنے انسٹرکٹر کا انتظار کر رہے تھے۔
''ابھی تھکے ہوئے آئے ہیں فوراً ہی یہاں بلا لیا۔'' سرینہ نے منہ بنا کر کہا۔
''یہ تو ہوگا...... ہم یہاں آرام کرنے تو نہیں آئے۔'' عالیہ نے ہنس کر جواب دیا۔
''کم از کم ایک گلاس پانی تو پینے دیا ہوتا۔'' تنویر نے اپنا خیال ظاہر کیا۔
''بعد میں سب کر لینا۔'' عالیہ نے کہا۔
''قسمت ساتھ نہیں دے رہی۔'' سرینہ نے جملہ کسا۔
''صبح بخیر رنگروٹس۔'' ہال میں داخل ہوتے ہوئے ایک شخص نے بلند آواز میں کہا اور ان لوگوں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا وہ ایک صحت مند جسم کا مالک اور لمبا چوڑا شخص تھا جو ان کی طرف آ رہا تھا اس کے سر کے بال سفید تھے اور وہ خاصا چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔ وہ آ کر ان کے سامنے کھڑا ہوگیا اور باری باری ان کا جائزہ لینے لگا عالیہ پر اس کی نظر زیادہ دیر تک جمی رہی تھیں اسے عالیہ کے حلیے میں ایک تبدیلی نے حیران کر دیا تھا اس کے بالوں کا کلر تبدیل ہو کر سیاہ ہو چکا تھا۔ جب کہ خلیل کامران کی تدفین کے وقت ان کا کلر سنہری تھا اور اس کے انداز سے اعتماد جھلک رہا تھا اور یہ یقیناً وسیم چارلی سے لی گئی ٹریننگ کا حصہ تھا جو اس نے ادارے کی اجازت کے بغیر لی تھی۔
''میں ڈریم سینٹر ٹریننگ ونگ میں تم لوگوں کو خوش آمدید کہتا ہوں اس جگہ کی ساری ذمہ داری میں اور میرا اسسٹنٹ حامد علی نبھاتے ہیں۔ میرا نام بشیر احمد ہے۔ تمام رنگروٹس کو دو ہفتے کی تربیت دی جاتی ہے۔ میں تمہیں دو ہفتے ڈریم سینٹر کے لیے ٹریننگ دوں گا اس ٹریننگ میں ذہنی اور جسمانی دونوں طرح کی تربیت شامل ہے جب تم لوگ یہاں سے جاؤ گے تو فائٹ کرنے کے لیے تیار ہو چکے ہو گے اور ہمارے ہیڈ کوارٹرز میں فیلڈ آپریشن ڈویژن میں کام کرو گے۔ ہمارے کمانڈر میر کی نگرانی میں میں تمہیں عام شہری سے ایک ماہر فوجی میں تبدیل کر دوں گا

اگر کسی کو کوئی سوال کرنا ہے تو کر لو۔"

"میں ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔" تنویر نے کہا۔

"ہاں پوچھو؟" بشیر نے کہا اور تنویر حیران رہ گیا کہ بشیر کو اس کا نام پہلے سے پتہ تھا۔

"میرے دوست گورنمنٹ کے لیے کام کرتے ہیں لیکن ان کا کہنا ہے کہ ڈریم سینٹر کو شاید اپنی کارروائیاں بند کرنا پڑیں گیا ایسا ہی ہے اگر ایسا ہے تو پھر فیلڈ پریشر کا کیا ہوگا اور ہماری تربیت کا کیا فائدہ؟" اس سوال پر بشیر کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے لیکن اس نے کوئی ردعمل نئے رنگروٹس پر ظاہر نہیں کیا تھا اسے سرینہ اور تنویر کے چہرے پر الجھن کے آثار نظر آئے تھے لیکن عالیہ مطمئن کھڑی تھی اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ یا بشیر اسے محسوس نہیں کر سکا تھا۔ وہ دھیرے سے مسکرایا اور اس نے دل میں سوچا کہ عالیہ بالکل اپنے والد خلیل کامران کی طرح مضبوط اعصاب کی مالک ہے۔

"تم ٹھیک کہتے ہو گورنمنٹ کے لوگ باتیں کر رہے ہیں اور اس سے ہی پتہ چلتا ہے کہ ایک خفیہ انفارمیشن کیسے پبلک ہوگئی ہے۔"

"میں معافی چاہتا ہوں جناب۔" تنویر نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

"یہ درست ہے کہ کچھ مسائل ہیں جن پر کام ہونے کی ضرورت ہے لیکن یہ بات اپنے ذہن میں بٹھا لو کہ ڈریم سینٹر بند نہیں ہوگا کمانڈر سمیر اس سلسلے میں حکومت سے حکام بالا سے بات کر رہے ہیں اور جلد ہی کسی نتیجے پر پہنچ جائیں گے اور ایسا کوئی معاہدہ ہو جائے گا جس پر دونوں پارٹیاں مطمئن ہوں گی اہم اطلاعات کو بغیر متاثر کیے تمہیں صرف اتنی بات بتا سکتا ہوں۔" بشیر نے کہا۔

"شکریہ جناب۔" تنویر نے کہا اور انسٹرکٹر بشیر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اب کام کی طرف آجاؤ' ٹریننگ کا پروگرام چھ حصوں پر مشتمل ہے۔ جسمانی فٹنس' نہتے لڑنے کی تربیت' ہتھیاروں کی تربیت' اسنیپر کی تربیت' ذہنی اور نفسیاتی تربیت اور فیلڈ آپریشن۔ اس پہلے ہفتے میں ہم جسمانی فٹنس کی تربیت پر کام کریں گے جس میں نہتے لڑنے کی تربیت اور فیلڈ ایکسر سائز شامل ہوگی۔ دوسرے ہفتے میں ٹیکنیکل ٹریننگ ہوگی جو فیلڈ آپریشن سے متعلق ہوگی جس میں ہتھیار' مہارت' پیٹرولنگ' ٹریننگ کے بارے میں بتایا جائے گا اور آخری دن تم لوگوں کو ایک نفسیاتی مہارت کا امتحان دینا ہوگا۔ جس میں تمہارا انٹرویو بھی ہوگا جو میں لوں گا تم لوگ چاہو تو مجھے میرے نام سے پکار سکتے ہو اور میں یہ حق رکھتا ہوں کہ تمہیں جس نام سے چاہوں پکاروں۔" بشیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

اچانک ہال کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور کچھ فوجی اندر داخل ہوئے وہ وردیاں پہنے ہوئے تھے اور ہتھیاروں سے لیس تھے ان کی تعداد بارہ تھی۔

"اب میں تمہیں تمہارے فرضی دشمن سے ملواتا ہوں۔ ہماری تربیت کے دوران یہ تمہارے مخالف ہوں گے یہ اپنے فن کے بہت ماہر ہیں۔ بہترین تربیت یافتہ ہیں ہم ایسی سچویشن پیدا کریں گے جو نقلی تو ہوگی لیکن اصل سے ملتی جلتی ان سچویشنز میں تم لوگوں کو اپنی مہارتیں دکھانا ہوں گی اور ایک دوسرے کا مقابلہ کرنا ہوگا۔" بشیر نے کہا پھر وہ ان سے رخصت ہوگیا تھا اور وہ سب اپنی اپنی بیرکوں میں چلے گئے تھے۔

❀……❀……❀……❀

"ہر جگہ ہمارے سی سی کیمرے لگ چکے ہیں جو ان تمام علاقوں کو کور کر رہے ہیں۔ جہاں جہاں جیکی گروپ ایکٹو ہے یہ پورے شہر کا نقشہ ہے۔" حفیظ صدیقی نے لیپ اسکرین پر سمیر کو نقشہ دکھاتے ہوئے کہا۔

"گڈ!" سمیر نے کہا حفیظ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھا تھا اور میز پر اس کا لیپ ٹاپ رکھا تھا۔

"میں چاہتا ہوں جو کوئی اجنبی بھی اس ایریا میں داخل ہو اس کی تمام تفصیلات مجھ تک پہنچ جائیں اس لیے تم سٹی فیشل ڈیٹا بیس کی خدمات لے سکتے ہو ہمیں یہ کام ابھی سے شروع کرنا ہے اور اگلے دو ماہ تک ہم اس پر کام کریں گے...... کیا تمام کیمرے ورکنگ میں ہیں؟" سمیر نے پوچھا۔

"ہاں! بالکل ورکنگ میں ہیں...... میرا سارا اسٹاف

بھی الرٹ ہے یہ بہت مشکل کام ہے کہ اس طرح سارے شہر اور اس کے چپے چپے اور ایک ایک شخص کو مانیٹر کیا جائے۔'' حفیظ نے کہا۔

''ہاں! لیکن ہمیں یہ کرنا ہے؟''

''ہو جائے گا کمانڈر آپ فکر نہ کریں۔'' حفیظ نے یقین دہانی کروائی۔

''اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے کہ منصور احمد کو ڈھونڈ نکالا جائے وہ اور اس کے گروہ کے لوگ ایسا لگ رہا ہے جیسے بلوں میں چھپے ہوئے ہیں۔'' سمیر نے کہا وہ جانتا تھا کہ اس نے حفیظ سے جو کام کرنے کے لیے کہا ہے وہ کتنا مشکل ہے لیکن ساجد بھی اپنی زبان کھولنے پر تیار نہیں تھا۔

مانیٹرنگ ہال کی دیواروں پر چاروں طرف ٹی وی اسکرین لگے ہوئے تھے جن میں شہر کے مختلف علاقوں کے مناظر نظر آرہے تھے سمیر کو یقین ہوگیا کہ وہ جلد ہی دشمن کا کھوج نکالیں گے۔ وہ مانیٹرنگ روم سے نکل کر اپنے آفس کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ ایک کوارٹر سے گزرا ہی تھا کہ اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی تو اس نے اپنی جیب سے فون نکالا اور ڈسپلے پر نظر پڑتے ہی اس نے ایک گہری سانس لی۔

''اوہ کمال۔'' وہ بڑبڑایا اور کال ریسیو کی۔

''میں کمال بول رہا ہوں۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

''ہاں بولو۔'' سمیر نے کہا۔

''مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی یہ تم نے کیا کیا؟'' سمیر کو کمال کی غصہ سے ڈوبی آواز سنائی دی۔

''میں اپنے آفس میں پہنچ کر کال کرتا ہوں۔'' سمیر نے کہا اور سیل فون بند کر کے جیب میں واپس رکھ لیا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ کمال کامران غصے میں ہے اور کس بات نے اسے پریشان کر دیا ہے اور وہ اسی سلسلے میں اس سے بات کرنا چاہ رہا ہے۔

اپنے آفس میں پہنچ کر اس نے دروازہ بند کیا تھا اور کچھ دیر اپنی کرسی پر پرسکون بیٹھا رہا تھا پھر اس نے میز پر

نماز کی عظمت

حضرت حسنؓ نے فرمایا کہ نمازی کے لئے تین خصوصی عزتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ وہ جب نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو اس کے سر سے آسمان تک رحمت الٰہی گھٹا بن کر چھا جاتی ہے اور اس کے اوپر انوار بارش کی طرح برستے ہیں۔ دوسری یہ کہ فرشتے اس کے چاروں طرف جمع ہو جاتے ہیں اس کو گھیرے میں لے لیتے ہیں۔ تیسری یہ کہ ایک فرشتہ پکارتا ہے کہ اے نمازی اگر تو دیکھ لے کہ تیرے سامنے کون ہے تو کس سے بات کر رہا ہے تو خدا کی قسم تو قیامت تک سلام نہ پھیرے۔

قدرت انعام...... چکوال

رکھے فون پر کمال کا نمبر ڈائل کیا تھا اور دوسری طرف سے اسے کمال کامران کی غصے سے بھری آواز سنائی دی تھی۔

''میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ تم عالیہ کو اس سارے جھمیلے سے الگ رکھو۔''

''تو پھر؟''

''تم نے اسے رنگروٹ بنا کر ٹریننگ ونگ میں بھیج دیا ہے؟''

''ہاں بھیج دیا ہے پھر؟''

''میں اسے اس سارے جھگڑے سے دور رکھنا چاہتا ہوں۔''

''اب تو یہ ہو چکا۔'' سمیر نے قطعی انداز میں کہا۔

''تو اسے ختم کرواور اسے واپس بلاؤ۔''

''میں ایسا نہیں کر سکتا۔'' سمیر نے سختی سے انکار کر دیا۔

''تم کر سکتے ہو...... تمہارے اختیارات ہیں...... تم کمانڈر ہو۔''

''یہ سچ ہے...... میں کمانڈر ہوں...... میں ہی کمانڈر ہوں...... تم نہیں ہو۔''

''تم کیا کہہ رہے ہو؟'' کمال نے پوچھا۔

''میں کہہ رہا ہوں کہ تمہیں میرے احکامات کی عزت کرنی چاہیئے۔ میں نے عالیہ کو رنگروٹ بنا دیا ہے اس بات

کو قبول کر لو کمال۔'' سمیر نے کہا۔

''قبول کر لو...... اسے مان لوں؟ نہیں...... ہرگز نہیں تم اپنے آرڈرز کو کینسل کر دو سمیر۔''

''کمال! میرے پاس ان فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔''

''یہ فضول باتیں ہیں؟'' کمال نے کہا۔

''ہاں! یہ فضول باتیں ہیں...... ہم اس وقت اہم کام کر رہے ہیں۔''

''مجھے اس کی پروا نہیں ہے...... یہ میرے خاندان کا سوال ہے۔'' کمال نے کہا۔

''خاندان؟'' اگر خاندان ہی کا سوال ہے تو تم خلیل کامران کی موت کے بعد اب تک کہاں ہو؟'' تم کہاں تھے جب وہ اس دکھ کی شدت سے اکیلے لڑ رہی تھی اور تم کہاں تھے جب جیکی گروپ نے اسے مارنے کی کوشش کی...... تم کہاں تھے جب اسے کسی کے سہارے کی شدید ضرورت تھی۔'' سمیر کی آواز تیز ہوتی جا رہی تھی اور وہ کھڑا ہو گیا تھا۔

''تم جانتے ہو مجھے بھی خطرہ تھا اور میں شہر میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔'' کمال نے کہا۔

''فون کال؟ تم فون تو کر سکتے تھے کمال...... میں جانتا ہوں کہ تم ایک غیر جذباتی سے آدمی ہو کمال تمہیں کسی کے دکھ کی پروا نہیں اور یہ بات بھی تمہارے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔''

''خلیل بھی یہ نہیں چاہتا تھا۔'' کچھ دیر خاموشی کے بعد کمال نے کہا۔

''وہ عالیہ کو اس سیاست سے دور رکھنا چاہتا تھا اس نے تمہیں اس کی حفاظت کے لیے کہا تھا۔'' کمال نے اسے یاد دلایا اور سمیر نے غصے سے اپنی میز پر مکا مارا۔

''میں اس کی حفاظت ہی کر رہا ہوں۔'' سمیر نے غصے سے کہا۔

''تمہاری سمجھ میں میری بات کیوں نہیں آتی کمال؟ وہ جیکی گروپ کی نظروں میں آ چکی ہے اب وہ انہیں مطلوب ہے سمجھے؟ وہ جتنی میرے قریب رہے گی محفوظ رہے گی...... میرے سامنے یہی ایک واحد راستہ تھا۔'' سمیر نے کہا۔

''وہ شہر چھوڑ کر بھی تو جا سکتی تھی...... وہ ہاسٹل جا کر اپنی تعلیم بھی جاری رکھ سکتی تھی تم نے اسے سمجھایا کیوں نہیں؟''

''وہ اتنی بچی نہیں ہے ایک بالغ لڑکی ہے اور اپنا اچھا برا سمجھتی ہے وہ واپس نہیں جانا چاہتی تھی وہ سمجھتی ہے کہ اسے یہاں ہم سب کی مدد حاصل ہے ہم سب اس کا خیال رکھ سکتے ہیں۔ میں ناصر اور ویم چارلی۔''

''ویم چارلی......؟ کیا وہ اس سے رابطے میں ہے؟''

''ہاں...... وہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔'' سمیر نے کہا۔

''کیا وہ ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں؟'' کمال نے پوچھا۔

''یہ میں نہیں جانتا...... یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔'' سمیر نے کہا وہ اس سلسلے میں مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''اس عورتوں کے شیدائی کو عالیہ سے دور ہی رکھو۔'' کمال نے کہا۔

''میں اسے تنبیہ کر چکا ہوں اس کے علاوہ میں کچھ اور نہیں کر سکتا میں ڈریم سینٹر کے اندر ہونے والے معاملات کو کنٹرول کر سکتا ہوں لیکن اس کی دیواروں سے باہر کیا ہوتا ہے اس کا تعلق مجھ سے نہیں۔''

''سمیر!'' کمال نے غصے سے کہا۔

''کمال! ہم بہت وقت ضائع کر چکے...... مجھے ضروری کام ہیں۔'' سمیر نے کہا اور فون بند کر دیا پھر وہ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اسے شدید غصہ تھا وہ جانتا تھا کہ اس کے منع کرنے کے باوجود چارلی عالیہ سے ملتا تھا لیکن وہ سمیر سے چھپا رہا تھا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)